مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240)

فہرست مضامین

جلد--۱۱

جلد--۱۲

جلد ---- ۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم!

کتاب الصّلوٰۃ!

کتاب الطہارۃ میں امام بخاریؒ نے پاکی سے متعلق تمام احکام تفصیل سے ذکر کئے، جو نماز کے لئے شرط تھی، اب کتاب الصلوٰۃ شروع کی ہے جو اسلام کی اعظم و اکمل عبادات ہے، اور اس کو عقائد و ایمانیات کے بعد دوسرا درجہ و مرتبہ حاصل ہے، جس طرح ظاہری جسم، لباس و جگہ کی پاکی نماز کیلئے ضروری ہے، اسی طرح قلب و روح کی پاکیزگی و جلا بھی نہایت ضروری و اہم ہے، اُسی کی طرف اِس سے اشارہ ہوا کہ سیر ملکوت و ملاءِ اعلیٰ کے سفر سے قبل جس میں نمازیں فرض ہوئیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور حضور اکرم ﷺ کے سینہ مُبارک کو کھول کر قلب مبارک کو نکالا[1] اور اس کو آبِ زمزم سے دھویا، پھر ایمان و حکمت سے معمور طشتِ طلائی سے (جو اپنے ساتھ لائے تھے) ایمان و حکمت کا سارا خزینہ لے کر قلب مبارک میں منتقل کر دیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: حدیث الباب میں واقعہ معراج[2] کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس بارے میں دو قول ہیں۔ کہ اسراء کی رات معراج ہی کی رات ہے یا الگ ہے، امام بخاریؒ نے یہی حدیث پوری تفصیل کے ساتھ کتاب الانبیاء میں بھی ذکر کی ہے (باب ذکر ادریس علیہ السلام ص ۴۷۰) اور اُن کے نزدیک اسراء و معراج ایک ہی رات کے دو قصے ہیں، سفر کا پہلا حصہ اسراء کہلایا جو بیت اللہ سے بیت المقدس تک طے ہوا، اور دوسرا حصہ معراج کہلاتا ہے۔ جس میں بیت المقدس سے آسمانوں کی طرف عروج ہوا ہے اس میں متعدد اقوال ہیں کہ یہ واقعہ کب پیش آیا، لیکن مشہور قول بارھویں[3] سال نبوت کا ہے۔

---

[1] یہ شبہ نہ کیا جائے کہ کسی انسان کے قلب کو باہر نکالنا اور کچھ وقفہ تک اس پر عمل جراحی وغیرہ کرنا ممکن نہیں کہ ذرا سی دیر بھی حرکت قلب بند ہونے یا اس کے جسم سے الگ ہونے پر موت طاری ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کو ناممکن و محال قرار دینا درست نہیں اور اب تو یورپ و امریکہ میں قلب پر عمل جراحی کے کامیاب تجربات کئے جارہے ہیں اور ہندوستان میں بھی ایسے واقعات ہو رہے ہیں، ۲۶ اگست ۱۹۶۷ء کے الجمعیۃ میں خبر شائع ہوئی کہ ۲۴ اگست ۱۹۶۷ء کو صفدر جنگ ہسپتال دہلی میں پانچ گھنٹہ تک دل کا کامیاب آپریشن کیا گیا تھا۔ "مولف"

[2] واقعہ معراج کا ذکر علامہ شبلیؒ نے اپنی سیرۃ النبی جلد اوّل میں نہیں کیا، البتہ حضرت سیّد صاحبؒ نے تیسری جلد میں اسکو پوری تفصیل سے دیا ہے، اگرچہ وہ بعض اہم اختلافی امور میں کوئی فیصلہ کن تحقیق پیش نہ کر سکے۔

[3] سیرۃ النبی (ص ۱۱۲) میں واقعہ معراج پانچویں سال نبوت میں اور سید صاحب نے حاشیہ میں اپنی تحقیق نبوت کے نویں سال کی لکھی ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ پھر محترم سیّد صاحبؒ نے ہی تیسری جلد۳ ۴۰۳ میں امام بخاری اور ابن سعد کی رائے کے تحت ہجرت سے کچھ ہی زمانہ پہلے خواہ وہ ایک سال ہو یا اور کچھ کم و بیش معراج کا زمانہ متعین کیا ہے اور لکھا کہ ہمارے نزدیک قرآن مجید سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ معراج اور ہجرت کے درمیان کوئی زمانہ حائل نہ تھا، بلکہ معراج درحقیقت ہجرت ہی کا اعلان تھا۔ پھر لکھا کہ اگر عام و مشہور و معمول بہ رجب کی تاریخ اختیار کی جائے تو ہجرت سے ایک سال سات مہینے پیشتر کا واقعہ تسلیم کرنا ہوگا۔ پھر ۶۹ ۳۴۴ میں لکھا:۔ اس بیان سے یہ بھی واضح ہوگا کہ معراج ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا واقعہ ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ معراج آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے خدا کی وہ نشانی تھی جس کے نہ تسلیم کرنے پر عذاب الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر فرمایا:۔ پانچوں نمازیں لیلۃ المعراج ہی میں فرض ہوئیں اور پہلے جو پڑھی جاتی تھیں وہ نفلاً ادا ہوتی تھیں، یا کچھ پہلے سے بھی فرض تھیں؟ عام طور سے پہلا قول لیتے ہیں لیکن میرے نزدیک محقق یہ ہے کہ دونمازیں[۱] فجر وعصر کی معراج سے قبل بھی فرض تھیں ان پر تین نمازوں کا اضافہ معراج میں ہوا ہے پہلے قول پر بہت سی احادیث میں رکیک تاویلات کرنی پڑیں گی، کیونکہ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ معراج سے قبل بھی فجر وعصر کی نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔ جن کے لئے تداعی بھی ہوتی تھی، جہر واخفا کا التزام اور جماعت وصف بندی کا اہتمام بھی تھا، یہ ساری باتیں فرض نمازوں کے لئے ہوتی ہیں۔ نفل میں نہیں، اس لئے ان دونوں نمازوں کو بھی فرض ہی سمجھا جاتا تھا۔

اسراء معراج وسیرِ ملکوتی!

امام بخاریؒ نے کتاب الصلوٰۃ کے شروع میں واقعہ اسراء ومعراج کی مفصل حدیث ذکر کی ہے، اس لئے ہم بھی اس واقعہ کی تفصیلات پیش کرتے ہیں نیز مرقاۃ شرح مشکوٰۃ شریف ۵۴۳/۷ میں مذکور ہے کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ کو دو مقام ایسے حاصل ہوئے، جن پر اولین وآخرین غبطہ کریں گے، ایک دنیا میں شب معراج کے اندر، اور دوسرا عالم آخرت میں جس کو مقامِ محمود کہتے ہیں اور حضور اکرم ﷺ سے ان دونوں مقام میں امت مرحومہ[۲] ہی کی فکر واہتمام شان نقل ہوئی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) پھر ۳۴۴/۷ میں لکھا:۔ جس طرح ہجرت سے کچھ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر خدا کی ہم کلامی نصیب ہوئی اور احکام عشرہ عطا ہوئے اسی طرح آنحضرت ﷺ کو بھی ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج ہوئی اور احکام دوازدہ گانہ عطا ہوئے، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت کے بعد فرعونیوں پر بحرِ احمر کی سطح پر عذاب نازل ہوا۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے بعد صناویدِ قریش پر بدر کے میدان میں عذاب آیا۔ اور جس طرح فرعون کی شامی مملکت پر بنی اسرائیل قابض ہوئے تھے اسی طرح مکہ معظمہ کی حکومت بھی ہجرت کے بعد آپ کو عطا کی گئی۔

ناظرین نے ملاحظہ کیا کہ علامہ شبلی ایسے مشہور ومعروف مورخ ومحقق نے جو اپنی پوری مطالعہ وریسرچ کے بعد واقعہ معراج کو نبوت کے پانچویں سال میں بتلایا تھا، اور وہیں حاشیہ پر حضرت سید صاحبؒ نے اپنی تحقیق نبوت کے نویں سال کی ظاہر کی تھی، تیسری جلد میں ان کی تحقیق بالکل بدل کر بارہویں سال نبوت کی ہوگی جو ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی بھی رائے ہے۔

اس مقام پر اپنی اس تمنا کو ظاہر کرنا ہے کہ کاش! حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ میں سے کوئی متبحر ومتیقظ عالم سیرۃ مبارکہ پر پوری تحقیق ومطالعہ کے بعد سیرۃ النبی جیسی ضخیم تالیف مرتب کر کے شائع کرے۔ واللہ الموفق۔ "مؤلف"

[۱] سیرۃ النبی ص ۱۱۲/۲ میں ہے کہ نماز نفل کے تہجد ہو جانے کے بعد فجر مغرب اور عشاء تین وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔ معراج میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔

[۲] اس سے مراد امت محمدیہ ہوتی ہے، علامہ قسطلانیؒ نے مواہب میں خصائص امت محمدیہ کے باب میں اوسط طبرانی سے حدیث انسؓ نقل کی:۔ امتی امة مرحومة تدخل قبورها بذنوبها وتخرج من قبورها لاذنوب عليها تمحص عنهما باستغفار المومنين لها (میری امت امتِ مرحومہ ہے کہ قبور میں گناہوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے اور بغیر گناہوں کے نکلے گی، کیونکہ اس کے گناہ استغفارِ مومنین کی وجہ سے بخش دیئے جائیں گے) علامہ زرقانیؒ نے اس کی شرح میں لکھا کہ اس امت کو مرحومہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی خاص رحمت متوجہ ہے یا اس کے افراد ایک دوسرے پر رحمت وشفقت کرتے ہیں، (حدیثِ مذکور سے یہ بھی اشارہ ہوا کہ مرنے والے کے لئے خاص طور سے استغفار اور حقوق العباد کی ادائیگی یا معافی کرانے کا اہتمام کرنا چاہیے تا کہ مردوں کو عذابِ قبر وآخرت سے نجات مل سکے) علامہ زرقانیؒ نے لکھا کہ ابوداؤد وغیرہ میں حدیث ہے کہ یہ میری امت امتِ مرحومہ ہے۔ اس پر آخرت میں عذاب نہ ہوگا، چونکہ اس پر دنیا میں جو فتنے، زلزلے، بلائیں، اور مظلومانہ قتل وغارت کے حادثات پیش آئے، وہی سب عذابِ اخروی کا بدل ہو گئے الخ (شرح المواہب ۵۱۴۰/۱)

علامہ موصوف نے یہ بھی تنبیہ کی کہ یہ حال اکثریت کا ہوگا، ورنہ ظاہر ہے کہ امتِ محمدیہ کے بھی کچھ لوگ عذابِ آخرت کے مستحق ضرور رہ جائیں گے۔ اور ان کو عذاب بھی ہوگا۔ پھر حضور علیہ السلام کی شفاعت کے بعد نجات پائیں گے۔

مستدرک حاکم ۴۹/۴ میں حدیث ہے:۔ ان عذاب هذه الامة جعل فى دنيا ها (اس امت کا عذاب اس کی دینا ہی میں کر دیا گیا ہے) مؤلف

ذکر مواہب لدنیہ!

علامہ محدث قسطلانیؒ کی کتاب مواہب لدنیہ سیرۃ رسول اکرم ﷺ میں سب کتب سیر میں سے اوسع واوثق ہے جس کی بہترین شرح علامہ محدث زرقانی مالکیؒ نے کی ہے، یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں طبع ہوکر شائع ہوئی ہے۔شرح المواہب میں معراج کا واقعہ چھٹی جلد کی ابتداء سے ۱۲۸ صفحہ تک پھیلا ہوا ہے علامہ قسطلانیؒ نے لکھا کہ شب اسراء میں رسول اکرم ﷺ کو جو معراج اعظم حاصل ہوئی، وہ دس معراجوں پر مشتمل ہے، سات معراج ساتوں آسمانوں تک، آٹھویں سدرۃ المنتہیٰ تک، نویں مستویٰ تک، جہاں آپ نے اقلامِ قدرت کی آوازیں سنیں، دسویں عرش، رفرف اور رؤیت باری جل مجدہٗ کے لئے، جہاں آپ کلام باری وخطاب خصوصی سے بھی مشرف ہوئے۔اس کے بعد ہجرت کے دس سالوں میں ان ہی دس معراجوں سے مناسبت رکھنے والے حالات رونما ہوئے ہیں (جن کا ذکر آگے آئیگا) اور اسی لئے ہجرت کے سالوں کا اختتام بھی آپ کی وفات مقدسہ پر ہوگیا، جو درحقیقت لقاءِ خداوندی، انتقال آخرت ودارالبقاء اور آپ کی روح مقدس ومکرم کی مقعدِ صدق کی طرف معراج اعلیٰ کا پیش خیمہ تھی جس کے بعد حضور کو حسب وعدۂ خداوندی مرتبہ وسیلہ ومنزلہ رفیعہ حاصل ہونے والا ہے، جس طرح معراج اسراء کے خاتمہ پر آپ کو لقاء وحاضری حظیرۃ القدس کا شرف حاصل ہوا ہے (شرح المواہب ۲۱۲)۔

پھر لکھا:۔امام ذہبی نے لکھا کہ حافظ عبدالغنی مقدسی نے دو جلدوں میں اسراء کی احادیث جمع کی تھیں، مجھے باوجود تلاش کے وہ نہ مل سکیں، اور شیخ ابواسحٰق ابراہیم نعمانی (تلمیذ حافظ ابن حجرؒ) نے بھی اسراء کے بارے میں ایک جامع کتاب لکھی تھی، وہ بھی مجھے اس تالیف کے وقت نہ مل سکی (علامہ زرقانیؒ نے لکھا کہ مجھے اس کا مطالعہ میسر ہوا ہے) حافظ ابن حجرؒ نے بھی اپنی فتح الباری میں احادیث سے کافی ذخیرہ جمع کردیا ہے، جن کے ساتھ مباحث دقیقہ فقہیہ اور اسرار ومعانی بیان ہوئے ہیں (علامہ زرقانیؒ نے لکھا کہ علامہ قسطلانی نے اکثر چیزیں اسی سے لی ہیں) اور سیر نبویہ اور مناقب محمدیہ سے واقفیت حاصل کرنے والوں کے لئے شفاءِ قاضی عیاضؒ سے بھی استغناء نہیں ہوسکتا۔

راویانِ معراج: پھر لکھا کہ احادیث اسراء کی روایت کرنے والے یہ صحابہ[1] ہیں:۔

(۱) **حضرت عمرؓ:** آپ سے روایت مسند احمد وابن مردویہ میں ہے۔ (۲) **حضرت علیؓ:** مسند احمد ومردویہ۔

(۳) **حضرت ابن مسعودؓ:** مسلم، ابن ماجہ، مسند احمد، بیہقی، طبرانی، بزار، ابن عرفہ، ابویعلیٰ۔ (۴) **حضرت ابن عمرؓ:** ابوداؤد، بیہقی۔

(۵) **حضرت ابن عباسؓ:** بخاری، مسلم، نسائی، احمد بزار، ابن مردویہ، ابویعلی، ابونعیم۔

(۶) **حضرت ابن عمرو بن العاصیؓ:** ابن سعد وابن عساکر۔ (۷) **حضرت حذیفہ بن الیمانؓ:** ترمذی، احمد وابن ابی شیبہ۔

(۸) **حضرت عائشہؓ:** بیہقی، ابن مردویہ، وحاکم (صحت کا بھی حکم کیا) (۹) **حضرت ام سلمہؓ:** طبرانی، ابویعلی، ابن عساکر وابن اسحٰق۔

(۱۰) **حضرت ابوسعید خدریؓ:** بیہقی، ابن ابی حاتم، ابن جریر۔ (۱۱) **حضرت ابوسفیانؓ:** دلائل ابی نعیم۔

(۱۲) **حضرت ابوہریرہؓ:** بخاری، مسلم، احمد، ابن ماجہ، ابن مردویہ طبرانی، ابن سعد وسعید بن منصور (مختصراً) ابن جریر، ابن ابی حاتم، بیہقی وحاکم (مطولاً)۔ (۱۳) **حضرت ابوذرؓ:** بخاری ومسلم۔ (۱۴) **حضرت مالک بن صعصعہؓ:** بخاری، مسلم، احمد، بیہقی، ابن جریر وغیرہم۔

(۱۵) **حضرت ابوامامہؓ:** تفسیر ابن مردویہ۔ (۱۶) **حضرت ابوایوب انصاریؓ:** بخاری ومسلم فی اثناء حدیث ابی ذرؓ۔

(۱۷) **حضرت ابی بن کعبؓ:** ابن مردویہ۔ (۱۸) **حضرت انسؓ:** بخاری، مسلم، احمد، ابن مردویہ، نسائی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، بیہقی، طبرانی، ابن سعد، بزار۔ (۱۹) **حضرت جابرؓ:** بخاری، مسلم، طبرانی، ابن مردویہ۔ (۲۰) **حضرت بریدۃؓ:** ترمذی وحاکم وصححہ۔

---

[1] صاحب مواہب نے اسماءِ صحابہ لکھے ہیں اور شرح زرقانیؒ نے ان کتب حدیث کے نام جن میں وہ روایات مذکور ہوئیں۔

(۲۱)حضرت سمرة بن جندبؓ: ابن مردویہ۔ (۲۲)حضرت شداد بن اوسؓ: بزار، طبرانی، بیہقی وصححہ۔
(۲۳)حضرت صہیبؓ: طبرانی ومردویہ۔ (۲۴)حضرت ابوحبہ بدریؓ: ابن مردویہ۔
(۲۵)حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ: ابن مردویہ۔ (۲۶)حضرت ام ہانیؓ: طبرانی۔
(۲۷)حضرت[1] سہیل بن سعدؓ: ابن عساکر۔ (۲۸)حضرت عبداللہ بن اسعد بن زرارةؓ: بزار، بغوی وابن قانع۔
(۲۹)حضرت ابوالحمراءؓ: طبرانی۔ (۳۰)حضرت ابولیلیٰ انصاریؓ: طبرانی وابن مردویہ۔
(۳۱)حضرت عبدالرحمٰن بن قرطؓ: سعید بن منصور۔ (۳۲)حضرت ابوبکر صدیقؓ: ابن دحیہ۔
(۳۳)حضرت عبدالرحمٰن بن عابسؓ: ابن دحیہ۔ (۳۴)حضرت ابوسلمہؓ: ابن دحیہ۔
(۳۵)حضرت عیاضؓ: ابن دحیہ۔ (۳۶)حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ: ابوحفص نسفیؒ۔
(۳۷)حضرت عثمان بن عفانؓ: ابوحفص نسفیؒ۔ (۳۸)حضرت ابوالدرداؓ: ابوحفص نسفیؒ۔
(۳۹)حضرت ابوسلمیٰؓ: (راعی النبی علیہ السلام) ابوحفص نسفیؒ۔ (۴۰)حضرت ام کلثومؓ: (بنت النبی علیہ السلام) ابوحفص نسفیؒ۔
(۴۱)حضرت بلال بن حمامہؓ: ابوحفص نسفیؒ۔ (۴۲)حضرت بلال بن سعدؓ: ابوحفص نسفیؒ۔
(۴۳)حضرت ابن الزبیرؓ: ابوحفص نسفیؒ۔ (۴۴)حضرت ابن ابی اوفیؓ: ابوحفص نسفیؒ۔
(۴۵)حضرت اسامہ بن زیدؓ: ابوحفص نسفیؒ۔

اس کے بعد علامہ زرقانیؒ نے لکھا کہ یہ سب ۴۵ صحابہ کرام ہیں جن سے اسراء کا قصہ مروی ہے اور تفسیر حافظ ابن کثیرؒ میں بھی کافی وشافی حدیثی ذخیرہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسراء پر اہل اسلام کا اجماع واتفاق ہے اور صرف زنادقہ وملحدین نے اس کا انکار کیا ہے۔
یرید ون لیطفئو انوراللہ با فواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکا فرون (شرح المواہب ص۱۴ ج۶)

معراج کتنی بار ہوئی؟

حضرت شیخ اکبرؒ نے فتوحاتِ مکیہ میں لکھا کہ حضور اکرم ﷺ کو ۳۴ بار معراج ہوئی۔ جن میں سے ایک بار بیداری میں عروج مع الجسم تھا (اسی میں پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا ہے) باقی سب مجرد روح کو حاصل ہوئیں، جو معراج اعظم جسمانی کے لئے بطور تمہید وتکمیل تھیں۔
حضرتِ اقدس علامہ تھانویؒ نے نشر الطیب ۸۱ میں لکھا:۔ علماء نے لکھا ہے کہ عروج روحانی آپ کو کئی بار ہوا ہے، یعنی اس معراج (جسمانی) سے پہلے خواب میں عروج ہوا ہے۔ جس کی حکمت یہ لکھی ہے کہ تدریجاً اس معراج اعظم کی استعداد و برداشت ہو سکے یعنی جس طرح منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے پہلے آپ بہت دن تک رویائے صادقہ دیکھتے رہے۔ اور ملأ اعلیٰ کی چیزوں سے مناسبت پیدا ہو جانے پر باقاعدہ وحیِ الٰہی کا سلسلہ شروع ہوا، اسی طرح ملاءِ اعلیٰ کے نشانہائے قدرت اور آیاتِ عظیمہ کا برائی العین مشاہدہ کرنے سے قبل بھی ان کا روحانی ومنامی مشاہدہ کرادینا مناسب تھا، اور معراجِ اعظم کی معاریج عشرہ کے بعد مدنی زندگی میں جو دس سال تک بھی مشاہداتِ روحانی ومنامی کرائے جاتے رہے، وہ سب گویا بطور تکملہ تھے۔ یا بمقتضائے روح اعظم واقدس نبوی تھے۔ علیٰ صاحبھا الف الف تحیات وتسلیمات۔ جن حضرات نے تعددِ معراج سے انکار کیا ہے، بظاہر انکی مراد تعددِ معراج جسمانی کا انکار ہے، معراجِ روحانی یا منامی کے منکر وہ بھی نہیں ہیں واللہ تعالیٰ اعلم۔

[1] یہاں سے علامہ زرقانیؒ نے نام بڑھائے ہیں (مؤلف)

معراج میں رؤیت ہوئی یا نہیں؟

اس بارے میں اختلاف اور تفصیلی بحث تو آگے آئے گی، یہاں اجمالاً اتنی بات ذکر کی جاتی ہے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ احادیث مرفوعہ اور آثار سے ثابت ہے، کہ دونوں قسم کی رؤیت حضور اکرم ﷺ کو حاصل ہوئی ہے پہلی قلبی، دوسری عینی[1]، جس طرح بعثت میں ہوا کہ پہلے رؤیا کے ذریعہ حضور اکرم ﷺ کی باطنی وروحانی تربیت کی گئی۔ پھر ظاہری طور سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا الخ حضرت عثمانیؒ نے اس مسئلہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری تحقیق آپ کے قلم سے لکھوا کر اپنی شرح مسلم مذکور میں درج کی ہے، اور اس سے زیادہ وضاحت مشکلات القرآن میں ہے، نیز حضرتؒ نے درس بخاری شریف میں قولہ تعالیٰ:۔ وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا کے تحت یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے:

وحی کی صورت کبھی تو قلب کو مسخر کرنیکی ہوتی ہے، یعنی مسخر کر کے اس میں القاء کرنا (کلام خفی) یا کلام مسموع ہو لیکن ذات نظر نہ آئے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی، اور شاید یہی معراج میں ہوئی ہو،

پھر فرمایا کہ من وراء حجاب میں حجاب سے مراد تجلی کا حجاب ہے، اور مسلم میں حجابہ النور ہے، حالانکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ حجاب میں سے نظر نہ آئیگا، مسلم کے ایک نسخہ میں حجابہ النار بھی ہے مگر حوض میں نور ہی ہے، اور لوکشف لاحرقت سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره من خلقه دلالت کرتا ہے کہ نہ دنیا میں کشف ہے نہ آخرت میں بلکہ ہمیشہ حجاب رہیگا، کیونکہ قید دنیا کی تو نہیں ہے، پس من وراء حجاب یہی نور کا حجاب ہوگا، پھر فرمایا کہ میرے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رؤیت ہوئی ہے مگر برداشت نہ کر سکے اور حضور علیہ السلام نے برداشت کرلیا معراج میں، یا تو مرتبہ بلند تھا، لیکن افضل یہ ہے کہ وہ عالم ہی دوسرا تھا اس لئے برداشت کرلیا یہ بھی فرمایا کہ معراج میں کلام تو من وراء حجاب میں داخل ہوگا اور رؤیت دوسرے وقت ہوئی ہوگی۔

ذکر فتوحاتِ مکیہ! اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ میں فصوص سے راضی نہیں ہوں، البتہ فتوحات کو امت کیلئے بہتر ومفید سمجھتا ہوں اُس میں ہے:۔

ولقد تجلى للذى، قدجاء فى طلب القبس   فرائه نارآو هو نور، فى الملوك وفى العسس

---

[1] حافظ ابن تیمیہؒ اور رؤیت عینی! آپ نے رؤیت عینی کا انکار کرتے ہوئے لکھا:۔ عثمان بن سعید داری نے عدم رؤیت پر صحابہ کا اتفاق نقل کیا ہے، اور حضرت ابن عباسؓ کا قول رؤیت اس نقل کے خلاف نہیں، اور خود حضور اکرم ﷺ سے بھی یہ ارشاد صحت کو پہنچ گیا ہے کہ میں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ کو دیکھا ہے مگر اس کا تعلق واقعہ اسراء سے نہیں ہے بلکہ مدینہ طیبہ کے زمانہ سے ہے، جبکہ حضور صبح کی نماز میں صحابہ کرام کے پاس دیر سے پہنچے تھے، پھر اُس رات میں ہونے والی خواب کی رؤیت سے اُن کو خبردار کیا تھا اور اسی پر بنا کر کے امام احمدؒ نے کہا کہ ہاں! رسول اکرم ﷺ نے حق تعالیٰ کا دیدار ضرور کیا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی حق ہوتے ہیں اور ضرور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے، لیکن امام احمدؒ اس کے قائل نہ تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے رب کو اپنے سر کی آنکھوں سے بیداری میں دیکھا ہے اور جس نے امام احمدؒ سے اس کو نقل کیا، اس نے غلطی کی ہے (زادالمعاد ۲ ۳۰ برحاشیہ شرح المواہب)

یہ بھی آگے لکھا ہے کہ ایسی غلطی خود اصحاب امام احمدؒ سے ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک امام احمدؒ رؤیت عینی ہی کے قائل تھے اور یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کیونکہ امام احمدؒ رؤیت کے بارے میں سوال کرنے والوں کو راٰہٗ راٰہٗ (دیکھا۔ دیکھا) اتنی بار فرمایا کرتے تھے جتنی ان کے سانس میں گنجائش ہوسکتی تھی، اگر وہ صرف رؤیت منامی وقلبی کے قائل تھے تو اتنی شدت وتاکید کی کیا ضرورت تھی؟ خواب یا دل کی رؤیت میں اشکال ہی کیا تھا؟ اور قلبی ومنامی رؤیت کا شرف تو بہت سے اولیاء اللہ کو بھی حاصل ہوا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ اور معراجِ جسمانی!: حافظ موصوف اگرچہ رؤیت عینی کے قائل نہ تھے، مگر معراج جسمانی کے قائل تھے اور حافظ ابن قیمؒ نے زادالمعاد میں مستقل فصل میں اسراء ومعراج کا ذکر کیا ہے اور لکھا:۔ صحیح یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو جسد مبارک کے ساتھ مسجد حرام سے بیت المقدس لیجایا گیا، اور وہاں سے اسی رات میں آسمانوں کی طرف عروج کرایا گیا الخ (زادالمعاد ۲۹۹ ۳) علامہ مبارکپوریؒ نے لکھا:۔ احادیث صحیحہ کثیرہ سے وہی قول ثابت ہے، جس کو معظم سلف وخلف نے اختیار کیا کہ حضور اکرم ﷺ کی اسراء جسد وروح کے ساتھ بیداری میں بیت المقدس تک اور وہاں سے آسمانوں کی طرف ہوئی، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ کے اس شعر کوذکر کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ آپ نے رؤیت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضرت شیخ اکبرؒ ہی کی رائے کو اختیار کیا ہے، اور روح المعانی ۹۵؍۲ میں ہے کہ شیخ اکبر قدس سرہ، رؤیت بعد الصعق کے قائل تھے، اور انہوں نے ذکر کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست حضرت حق جل وعلا نے قبول فرمائی تھی میرے نزدیک آیت اس بارے میں غیر ظاہر ہے، اور رؤیت بعد الصعق کے قائل قطب رازی بھی تھے، الخ آگے صاحب روح المعانی نے دونوں طرف کے دلائل ذکر کر کے اپنی رائے عدم حصول رؤیت موسیٰ علیہ السلام لکھی ہے۔

تقریب معراج! حق تعالیٰ جل ذکرہ نے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت السموات والارض دکھائے تھے۔ یعنی کائنات عالم کے مخفی نظام اور اندرونی نظم ونسق کا مشاہدہ کرایا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اپنے ایک مقبول بندہ (حضرت خضر علیہ السلام) کے ذریعہ اپنی خاص مشیت کے تحت واقع ہونے والے حوادث کے مخفی اسباب ومصالح پر مطلع فرمایا تھا، اوران کو اپنے بلا واسطہ کلام اور نعمت دیدار سے بھی مکرم ومشرف کیا تھا۔ اسی طرح سید المرسلین علیہ السلام کو بھی ان تشریفات سے سرفراز کرنا نہایت موزوں تھا۔

اس کے علاوہ چونکہ خاتم الانبیاء علیہ السلام کے زمانہ نبوت میں مادی ترقیات بام عروج پر پہنچنے والی تھیں، اور زمین وخلا، کی ہر چیز علم وتحقیق اور ریسرچ کی زد میں آنے والی تھی، نہایت مناسب تھا کہ آپ کو نہ صرف علوم اولین وآخرین سے ممتاز وسربلند کیا جائے بلکہ زمین وخلاء کے علاوہ سموات وفوق السموات کے جہانوں سے بھی روشناس کرادیا جائے، اوراُن سے بھی آگے ان مقامات عالیہ تک لیجایا جائے، جہاں تک انسانوں، جنوں اور فرشتوں میں سے کسی فرد کو بھی رسائی میسر نہیں ہوئی، چنانچہ آپ کو معراج اعظم کا شرف عطا ہوا، جو معاریج عشرہ پر مشتمل تھا

معراج سماوی اور جدید تحقیقات!

جیسا کہ ہم نے نطق انور میں جدید تحقیقات کی تفصیل بتلا کر واضح کیا ہے کہ ان کی ساری ریسرچ کا دائرہ زمین اوراس کے خلاء تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) یہی حق وصواب ہے، جس سے عدول وتجاوز کرنا جائز نہیں، اور کوئی ضرورت نہ تاویل کی ہے، نہ نظم قرآن مجید اور اس کے مماثل الفاظ حدیث کو مخالف حقیقت معانی پہنانے کی، اور ایسی تاویل وتحریف کا کوئی داعیہ بھی بجز استبعاد عقلی کے نہیں ہے، حالانکہ بہ لحاظ قدرت خداوندی یہ امر نہ مستحیل ہے نہ مستبعد، پھر اگر کچھ عقول اتنی بات کے ادراک سے بھی قاصر ہوں، توان کے فیصلہ کی قدر وقیمت معلوم ہے، اور اگر یہ سب واقعہ محض خواب کا ہوتا جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ آپ کی اسراء فقط روح کے ساتھ ہوئی اور انبیاء کے خواب بھی حق ہیں، تو آپ کے بیان واقعہ پر کفار آپ کی تکذیب نہ کرتے، اور وہ لوگ بھی تردد وشک میں نہ پڑتے، جن کو اس وقت تک ایمان کامل کیلئے شرح صدر نہیں ہوا تھا، کیونکہ خواب میں تو انسان بسا اوقات مستبعد ومحال چیزیں دیکھتا ہے اور کوئی بھی ان کا انکار نہیں کرتا (تحفۃ الاحوذی ۵؍۱۳)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی معراج جسمانی کو جمہور محدثین، فقہاء ومتکلمین کا مذہب قرار دیا اور اسی کو احادیث صحیحہ سے ثابت بتلایا حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا: حضور اکرم کی اسراء مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ وغیرہ تک جسد مبارک کے ساتھ اور بیداری میں ہوئی ہے الخ (حجۃ اللہ البالغۃ ۲؍۲۰۶)

حضرت عائشہؓ کی رائے! اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حافظ ابن قیمؒ نے (زاد المعاد ۲؍۳۳۰) جو حضرت عائشہؓ کی طرف اسراء روحی کا قول منسوب کر کے، تاویل کی سعی کی ہے وہ شایان شان اکابر نہیں، اور یہ نسبت بھی ان کی طرف صحیح نہیں ہے جیسا کہ ہم بتلائینگے۔ وہ بھی معراج جسمانی ہی کی قائل تھیں، صرف رؤیت عینی کو مستبعد خیال کرتی تھیں، اور ہم حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق سے رؤیت عینی کے زیادہ صحیح وصواب ہونے کو بھی بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وبہ نستعین (مؤلف)۔

لہ نوری سال روشنی کی رفتار کے لحاظ سے مقرر کیا گیا ہے، جو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے، یعنی اس رفتار سے روشنی ایک سال میں جو فاصلہ طے کرتی ہے، اس کو نوری سال (Light Year) کہتے ہیں۔ چاند کا زمین سے فاصلہ دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے اس لئے طلوع ہونے پر اس کی روشنی زمین پر ڈیڑھ سیکنڈ سے کم میں پہنچ جاتی ہے۔

سورج ہم سے ۹ کروڑ ۲۱ لاکھ میل دور ہے، لہٰذا اس کی روشنی بعد طلوع ہم تک آٹھ منٹ میں آجاتی ہے۔ بعض ستارے ہم سے اتنی دور ہیں کہ ان کی روشنی دو ہزار برس میں زمین تک پہنچتی ہے۔ یعنی جو روشنی اُن کی اس وقت ہمیں نظر آرہی ہے وہ دو ہزار قبل وہاں سے روانہ ہوئی تھی اور بعض ستارے ایسے بھی دریافت ہوئے ہیں، جن کی روشنی زمین تک کئی کروڑ برس میں آتی ہے جو چیز ہم سے ایک نوری سال دور ہے وہ گویا ہم سے ساٹھ کھرب میل دور ہے۔ اس سے ہم خلائی وسعتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

محدود ہے اور خلاء کی لا متناہی وسعتوں میں لا تعداد ستاروں کے کہکشاں پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سے کہکشاں سیدیم اینڈ رومیدہ ہم سے آٹھ لاکھ پچاس ہزار نوری سال دور ہے اور اس کا قطر ۴۵ ہزار نوری سال ہے۔ اور ایک ستارہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے، جس کا فاصلہ زمین سے آٹھ سو مہا سنگ میل ہے، پھر یہ بھی نطق انور میں ثابت کیا گیا تھا کہ ہمارے اکابر نے اس پورے خلائی نظام اور اس کی تمام وسعتوں کو آسمانِ دنیا کے نیچے تسلیم کیا ہے، اور جو فاصلہ ہماری زمین سے آسمان دنیا تک ہے۔ اِتنا ہی فاصلہ اس سے دوسرے آسمان تک ہے، اسی طرح ساتویں آسمان تک، اور اس کے اوپر کا سارا علاقہ جناتِ عدن کا ہے، جن کے اوپر بطور چھت کے عرش اعظم ہے اور ان دونوں کے درمیان کا فاصلہ خدا ہی جانتا ہے کتنا ہے۔ امام مالکؒ کا ارشاد پہلے ذکر ہوا ہے کہ یہ علوم نبوت پچاس ہزار سال کی مسافت سے اُتر کر ہم تک آئے ہیں، اس سے ملا اعلیٰ تا فرش خاک کا فاصلہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس سال کی بڑائی معلوم نہیں، بظاہر وہ روحی یا سماوی سال، نوری سال سے بھی لاکھوں گنا بڑا ہوگا نور و برق کی سرعتِ رفتار کا اندازہ تو ہم نے معلوم کرلیا، مگر روح کی سرعتِ رفتار کا اندازہ نہیں کر سکتے، اتنا معلوم ہے کہ حضور اکرم علیہ پر ۲۰ سال کے عرصہ میں (کہ عہد نبوت میں سے تین سال فترتِ وحی کے ہیں) چوبیس[1] ہزار مرتبہ ملا اعلیٰ سے وحی کا نزول ہوا ہے، اور بعض دفعہ ایک دن میں دس دس بار بھی نزول ہوا ہے اور جب کوئی ضرورت پیش آتی تھی یا خدمت نبوی میں کوئی استفسار پیش کیا جاتا تھا تو آن کی آن میں وحی کا نزول ہو جاتا تھا، اسی کی طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ارشاد کرتے ہوئے کفارِ مکہ سے فرمایا تھا کہ تم لوگ حضور علیہ السلام کے ایک رات کے اندر مسجدِ اقصیٰ تک آنے اور جانے پر شبہ کر رہے ہو جبکہ میں تو ان پر صبح و شام میں نزول وحی پر یقین لا چکا ہوں، یعنی جو قادرِ مطلق اپنے رسول پر اتنی دور و دراز و بے پایاں مسافت سے آن کی آن میں اپنے پیغام و احکام اتارتا رہتا ہے۔ وہ میرے علم و یقین کی رو سے اس پر بھی ضرور قادر ہے کہ اپنے برگزیدہ رسول کو کم سے کم وقت میں بڑی سے بڑی مسافت طے کرادے۔ یا شدید القویٰ روح امین حضرت جبریل علیہ السلام جب پلک جھپکنے میں ملا اعلیٰ سے وحی خداوندی لیکر زمین پر آجاتے ہیں تو اس میں کیا استبعاد ہے کہ بحکمِ خداوندی وہ رسولِ اکرم علیہ کو بھی اپنے ساتھ ایسی ہی سرعت کے ساتھ سفرِ معراج و اسراء کرادیں۔

رہی یہ بات کہ ایک مادی جسم کیلئے اتنی سرعتِ سیر کیوں کر ممکن ہوئی، تو یہ استبعاد بھی آجکل کی ایجادات سریع السیر ہوائی جہازوں اور راکٹوں وغیرہ کے ذریعہ ختم ہو گیا ہے۔ پھر نہایت بھاری مادی اجسام کی قدرتی سرعتِ سیر پر نظر کی جائے۔ تب بھی اس اشکال کی کوئی اہمیت نہیں رہتی جس زمین پر ہم بستے ہیں وہ کتنی بھاری ہے کہ اس کا صرف قطر ہی ۷۹۲۷ میل کا ہے، اور محور تقریباً ۲۴ ہزار میل کا، یہ زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے، اور اس کے علاوہ وہ (مع چاند کے) سورج کے گرد بھی اپنی مدار پر چکر لگا رہی ہے، جس کی رفتار ۵۸ ہزار میل فی گھنٹہ ہے (یعنی فی منٹ ایک ہزار میل یا فی سیکنڈ ۱۷ میل تقریباً)۔

سورج زمین کی نسبت سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے، جس کا قطر تقریباً دس ارب میل کا ہے، اور محور تیس ارب ۹۱ کروڑ ۵۳ لاکھ کا ہے، ہم روزانہ[2] دیکھتے ہیں کہ طلوع کے وقت سورج کا پورا گولہ دو تین منٹ کے اندر افق سے اُبھر آتا ہے اور اسی طرح غروب کے وقت افق سے اُتر جاتا ہے۔ گویا وہ صرف دو، تین منٹ میں دس ارب تیس کروڑ ۵۱ لاکھ میل کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ جب ایسے بھاری مادی اجسام کی سرعتِ کسیر قابل انکار نہیں تو انسان کے ایسے ہلکے پھلکے جسم کے لئے کیا حیرت کی بات ہے؟ جیسا کہ عرض کیا گیا بقول امام مالکؒ زمین سے ملا اعلیٰ تک کی مسافت پچاس ہزار سال کی ہے جہاں سے علوم وحی و نبوت اُترتے رہے ہیں، اور حضور اکرم علیہ کو جہاں تک معراج ہوئی ہے، وہ اس سے بھی کہیں اوپر ہے۔

---

[1] علامہ محدث نوویؒ نے شرح بخاری شریف میں تفسیر ابن عادلؒ کے حوالہ وعہدہ سے لکھا کہ حضرت ادریس علیہ السلام پر ۴ بار وحی اتری ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ۱۰ بار، حضرت آدم علیہ السلام پر ۱۲ مرتبہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ۴۱ مرتبہ حضرت نوح علیہ السلام پر ۵۰ مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ۴۰۰ مرتبہ اور حضرت سید المرسلین علیہ پر ۲۴۰۰۰ ہزار مرتبہ (شروح البخاری ص ۴۲)۔

[2] صاحبِ روح المعانی نے تفسیر سورہ نمل میں عرش بلقیس کے پلک جھپکنے سے قبل ملکِ یمن سے ملکِ شام پہنچ جانے اور پل بھر میں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت طے کر لینے کا استبعاد رفع کرتے ہوئے لکھا کہ ہر شخص جانتا ہے سورج پلک جھپکنے میں ہزاروں میل طے کر لیتا ہے، حالانکہ عرش بلقیس کی نسبت سورج کے عظیم جسم کے لحاظ سے ذرہ کی نسبت پہاڑ کے ساتھ ہے، (روح المعانی ص ۱۹۲۵)۔

صاحب روح المعانی نے لکھا:۔حقائق الحقائق میں ہے کہ مکہ معظمہ سے اس مقام تک مسافت جہاں حق تعالیٰ نے (معراج میں) آپ پر وحی کی ہے، بقدر تین لاکھ سال کے ہے، اور ایک قول پچاس ہزار سال کا بھی ہے، پھر صاحب روح المعانی نے یہ بھی تصریح کردی ہے

لہ اس تین لاکھ سال کی مسافت کا اندازہ ہمارے دنیا کے سالوں سے نہ کیا جائے، کیونکہ یہاں کا سب سے بڑا سال نوری سال (Light Year) کہلاتا ہے، جو دنیا کی روشنی اور نور کے لحاظ سے متعین کیا گیا ہے اور اپ ٹو ڈیٹ سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ صرف ہماری دنیا کی کائنات ہی ۱۳ارب نوری سال کی مسافت تک پھیلی ہوئی ہے، جس کا مشاہدہ دوربینوں کی مدد سے حاصل ہورہا ہے، اور ہمارے اکابر علماء دیوبند نے بھی جدید تحقیق کو قابل قبول مان کر، تمام نجوم وسیاروں کو آسمان دنیا کے نیچے تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

تو ظاہر ہے اس کے اوپر سات آسمانوں اور ان کے درمیانی فاصلوں پھر ان سے اوپر عرش وکرسی تک مسافتوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ اور جو کچھ کسی نے کیا بھی ہے، وہ عظیم ترین سال کے لحاظ ومعیار سے؟ اس گتھی کو سلجھانا ابھی تو نہایت دشوار ومحال ہی معلوم ہوتا ہے۔ ولعل الله يحديث بعد ذلك امرا۔ اگر کہا جائے کہ قرآن مجید میں تو ایک دن ہزار یا پچاس ہزار سال کی برابر بتلا دیا گیا ہے، ہم عرض کرینگے کہ اس کو حق تعالیٰ نے ہمارے عدّ وشمار کے لحاظ سے بتلایا ہے جو زمانہ کی ترقی اور ازدیادِ معلومات وانکشافات کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے۔

پہلے ہم دو شہروں کے یا ملکوں کے بعد وفاصلہ کو اس زمانہ کی سواریوں کے لحاظ سے بتلاتے تھے کہ ان کے درمیان دو دن یا چار دن کی مسافت ہے، پھر ریلوں، موٹروں کا دور آیا تو ان کی رفتار کے اعتبار سے شمار کرنے لگے، اب ہوائی جہازوں کا زمانہ آیا تو انکی سرعتِ رفتار کے لحاظ سے دور دراز ملکوں کے بعد مسافت کو سمجھانے لگے۔

پھر جب خلائی نجوم وسیارات کا مشاہدہ دوربینوں کے ذریعہ ہونے لگا اور خلائی پرواز کے منصوبے بھی بننے لگے تو نجوم وسیاروں کے بعد مسافت کو شمار کرنے کیلئے ہم نے نوری سال بنایا، جس کا ایک ہی دن اربوں کا ہے۔

اسی سے سمجھ لیا جائے کہ جب ہمارے اس مادی عالم میں اس قدر بے پناہ وسعت ہے، تو اس عالم گرد ووراء جتنے وسیع ولامحدود عالم ہیں ان کا طول وعرض کیا ہوگا، اور وہاں کے فاصلوں کو سمجھانے کیلئے وہاں کی سریع ترین چیزوں کی سرعتِ رفتار کے لحاظ سے کتنا بڑا دن اور سال ہوگا۔

یہاں کے علم الحساب میں پہلے ہم سنکھ دس سنکھ مہا سنکھ تک جاتے تھے، لیکن جب آگے ضرورت پڑی تو انگلستان والوں نے ملیون (million) کی اصطلاح نکالی جو دس لاکھ کی برابر قرار دیا گیا، پھر امریکہ والوں نے ترقی کر کے بلیون (Billion) کا استعمال کیا، جو ایک ہزار ملیون یعنی ایک ارب کے برابر ہوا۔ ہم نے نطق انور میں اس سلسلہ کی کچھ جدید معلومات نقل کی تھیں۔ اس وقت مزید فائدہ کیلئے الجمعیۃ جمعہ ایڈیشن مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۶۷ء نیز بمبئی کے ماہوار Sciencetoday ماہ جنوری ۱۹۶۷ء اور ہفتہ وار السٹر ٹیڈ ویکلی مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۷ء سے چند چیزیں نقل کرتے ہیں۔ جن سے کائنات ارضی کی عظیم وسعت اور حق تعالیٰ کی عظیم ترین قدرت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) دوربین کی ایجاد سے قبل خلاء کے صرف دو ہزار تک ستارے شمار ہو سکے تھے، اور اب بھی دوربین کے بغیر ایک جگہ سے اتنے ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔

(۲) ۱۹۳۸ء میں دو امریکی ہیئیت دانوں نے ۳۵ سال کی محنت شاقہ کے بعد ایک فہرست تیار کی ہے، جس میں ان تمام ستاروں کا ذکر کیا جو دنیا کے مختلف حصوں سے نظر آتے ہیں وہ تعداد دس ہزار ہوئی۔ (۳) اس کے بعد چھوٹی دوربین کی مدد سے ۳۳ ہزار ستارے نظر آنے لگے۔ (۴) فن دوربینی میں مزید ترقی ہوئی تو دوربین کے ذریعہ دور ترین نہایت ہی مدھم روشنی والے ستارے بھی دیکھے جانے لگے اور ان میں فوٹو گرافک پلیٹیں بھی لگادی گئیں، تا کہ ستاروں کی تصاویر بھی اُتاری جا سکیں، اس وقت اس طرز کی ساری دنیا میں دو عظیم دوربینیں ہیں، ایک ماؤنٹ ولسن نامی رصد گاہ میں نصب ہے، دوسری ماؤنٹ پالومر نامی رصد گاہ میں، اور یہ دونوں امریکہ کی ریاست کیلیفورنیا میں ہیں۔

(۵) ولسن دوربین کے آئینہ کا قطر سو انچ کا ہے، وزن سوٹن اور جن پرزوں سے اسے حرکت دی جاتی ہے صرف ان کا وزن ساڑھے چودہ ٹن ہے چالیس موٹر اس دوربین کو حرکت دینے کیلئے استعمال ہوتے ہیں یہ دوربین ۱۹۱۲ء سے کام شروع ہو کر ۱۹۲۱ء میں تیار ہوئی۔ اس دوربین سے اُن ستاروں کے جھرمٹ کی تصاویر اُتاری گئیں جو ہم سے آٹھ کروڑ نوری سال کے فاصلہ پر ہیں، اور ایک نوری سال سے وہ فاصلہ مراد ہے جو روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار کے ساتھ ایک سال میں طے کرتی ہے۔

سائنس ٹوڈے میں روشنی کی رفتار فی سیکنڈ تین لاکھ کلومیٹر لکھی ہے۔ جو تقریباً ایک لاکھ چھیاسی ہزار کے برابر ہے۔ یہ دوربین بہ نسبت ہماری آنکھ کے ڈھائی لاکھ گنا زیادہ روشنی جمع کر سکتی ہے۔ وہ کائنات میں ۴۵ کروڑ نوری سال کی گہرائی تک اُتر گئی اور اس کے ذریعہ تقریباً ڈیڑھ ارب ستاروں کی تصاویر اتار لینا ممکن ہو گیا۔

(۶) مذکورہ دوربین سے جدید اہل ہیئت کی تشنگی نہ بجھی، کیونکہ وہ خیال کرتے تھے کہ خلاء میں ستاروں کی تعداد ۲۰ ارب کے قریب ہے اور کائنات کا قطر چھ ارب نوری سال کے برابر ہے، اس لئے اس سے بھی بڑی دوربین بنانے کا تہیہ کیا گیا، اور ۶۵ لاکھ ڈالر کے صرفہ سے گیارہ سال کے عرصہ میں دوسری عظیم تر دوربین بنائی گی، اس کا افتتاح ۳ جون ۱۹۴۸ء میں ہوا، جس سے انسان پر آسمان تک کی چیزوں کے مشاہدوں کیلئے دروازے کھل گئے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اس سے بھی دورترین ستاروں کے جھرمٹ اور کہکشانوں کی تصاویر لی جا چکی ہیں، اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔اس کی مدد سے ستاروں کے ایسے جزیرے دریافت کئے جاچکے ہیں جو ہم سے ستر کروڑ نوری سال کے فاصلہ پر ہیں۔اس دوربین کے صرف ڈھانچہ کا وزن ۱۲۵ٹن ہے،اس کے ٹیوب کی لمبائی ستر فٹ،قطر بیس فٹ سے زیادہ اور دوربین کا مجموعی وزن آٹھ سوٹن ہے۔

یہ پالومر دوربین دنیا کی سب سے بڑی دوربین تو ہے مگر سب سے اونچی نہیں ہے اور دنیا کی سب سے بلند رصد گاہ فرانس اور اسپین کے درمیان ایک پہاڑ ڈومیڈی نامی پر ہے،جس کی بلندی دس ہزار فٹ ہے،اگرچہ اس کا قطر صرف ۲۴ انچ ہے۔

تاہم سائنسدانوں کا یہ بھی اعتراف ہے کہ تمام ستاروں کا شمار کر لینا کسی کے بس کی بات نہیں کیونکہ اربوں کھربوں ستارے اس وسیع کائنات کی زینت ہیں یہ وما یعلم جنود ربك الا هو کی تصدیق نہیں تو اور کیا ہے؟!

(۷) السٹرئیڈ ویکلی بمبئی مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۷ء کے ایڈیٹوریل زیر عنوان کوالیسرز کی پہیلی لکھا:۔

(1) کوالیسرز کی روشنی تو ستاروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے مگر وہ بہ نسبت galancies (کہکشانوں) کے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔

(2) حال ہی میں چند کوالیسرز سیارے دریافت ہوئے ہیں،جو ہم سے ۸ ہزار تا ۱۰ ہزار ملیون میل (۸ ارب تا ۱۰ ارب) نوری سال دور ہیں۔

(3) ایک کوالیسرز ایسا بھی دریافت ہوا ہے جو ہم سے ۱۳ ہزار ملین میل (۱۳ارب) نوری سال دور ہے۔اس جدید انکشاف سے ظاہر ہوا کہ کائنات کا قطر صرف ۲۰ ارب نوری سال نہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔

(4) ان کے علاوہ اور بھی کوالیساروں کا وجود مشاہدہ میں آرہا ہے،جن کی لال شاعوں کی طاقت بہت زیادہ معلوم ہوئی ہے بہ نسبت سابقہ مشاہدوں کے۔

(5) کوالیسرز اپنی نورانی طاقت سے دس ہزار ملین (۱۰ارب) سورجوں کے برابر روشنی پھینکتے ہیں۔

(6) علم نجوم کے ماہرین کا یقین ہے کہ ساری کائنات ہر وقت سرگردانی کی حالت میں ہے،کبھی بڑھ جاتی ہے،کبھی سکڑ جاتی ہے،اسّی ملین سالوں سے یہی تغیر کا سلسلہ جاری ہے،جس کا صحیح نتیجہ ریڈیوانرجی،دوربینوں اور شارٹر برقی لہروں کے ذریعہ کوالیساروں کے وسیع و گہرے مطالعہ کے بعد ہی اخذ کیا جاسکتا ہے۔

(۸) شبستان اردو ڈائجسٹ دہلی ماہ نومبر ۱۹۶۷-۱۱۸ میں لکھا۔ ہمارا سورج اور اس کے سیارے ہماری کہکشاں کا محض ایک خوردبینی حصہ ہیں جو اوسط درجہ کی کہکشاں ہے اس میں دس کھرب ستارے ہیں جو اوسطاً اتنے ہی چمکدار ہیں جتنا ہمارا سورج اور خود ہماری کہکشاں بظاہر ایسی لاتعداد کہکشانوں میں سے صرف ایک ہے،اب ریڈیوٹیلسکوپ خلاء میں لکھو لکھا نوری سال آگے تک سن سکتی ہیں اور یہ کتنی ہی دور تک کیوں نہ کھوجتی ہوتی چلی جائیں،ہر طرف یہی کہکشائیں برآمد ہوتی چلی جاتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ستاروں کی تعداد انسانی دماغ کی گرفت سے کہیں زیادہ پرے ہیں۔اور خلاء اتنی عظیم ہے کہ یہ جہاں تہاں ہی آباد ہیں۔

مشہور ماہر فلکیات ڈاکٹر اومبرس جس نے ۱۸۱۵ء کا دمدار ستارہ دریافت کیا تھا۔اُس وقت کائنات کی وسعت سے متحیر تھا لیکن اس کو کائنات کی ناقابل یقین وسعت اور خلائی گہرائیوں میں ان گنت کھربوں روشنی دینے والے ستاروں کے متعلق آج کا علم حاصل ہوتا تو کس قدر حیرت میں پڑتا۔

(۹) ہمارا اردو ڈائجسٹ دہلی ماہ دسمبر ۱۹۶۷ء ص ۱۳۳ میں زیر عنوان خلائی تحقیقات لکھا:۔اس میں شک نہیں کہ پچھلے چند سالوں کی تحقیقات کے نتیجہ کے طور پر انسان خلا میں کام کرنے کے قابل ہوگیا ہے،اور وہ بہت جلد چاند پر اُترنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن کائنات کی بے پناہ وسعتوں کو دیکھتے ہوئے اس کے دوسرے عزائم غیر معمولی نظر آتے ہیں،مثال کے طور پر نظام شمسی کے سب سے دور واقع سیارے پلوٹو کو ہی لیجئے! ایک خلائی جہاز کو جو زمین سے ۲۶ ہزار میل کی رفتار سے روانہ ہو،پلوٹو تک پہنچنے کے لئے ۴۶ سال درکار ہوں گے۔یہ تو نظام شمسی کی حدود کا اندازہ ہے،اگر ہم اس سے آگے بڑھیں تو پڑوس میں قطب تارہ نظر آئے گا،جس کا زمین سے فاصلے کا اندازہ یوں لگا سکتے ہیں کہ اس کی روشنی ہم تک پہنچنے میں دو سو سال لگتے ہیں،(جبکہ نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ سے سورج کی روشنی ۸ منٹ میں آجاتی ہے) پھر قطب ستارے سے آگے تو کائناتی فاصلے اس قدر طویل ہو جاتے ہیں کہ بعض دور دراز ستاروں سے روشنی کو زمین تک پہنچنے میں کروڑوں سال لگ جاتے ہیں۔کائنات کی ان وسعتوں کو دیکھتے ہوئے روشنی کی تیز رفتاری بھی بہت کم معلوم ہوتی ہے،جبکہ موجودہ نظریات کی رو سے روشنی سے زیادہ تیز رفتاری حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اور یہ بات انسانی تجسس کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہوگی۔

لمحہ فکریہ! اس کے بعد سوچئے کہ نبی الانبیاء سرور دو عالم ﷺ شب معراج کے نہایت قلیل عرصہ میں اس ساری وسیع و عظیم کائنات دنیا وملکوت الارض کا مشاہدہ کرتے ہوئے عظیم ترین کائنات سماوی اور ملکوت السموات کا برائی العین مشاہدہ فرمانے کے لئے آسمانوں پر تشریف لے گئے،پھر ان سے بھی آگے بڑھ کر ملاء اعلیٰ کی اُن لامحدود بلندیوں سے سرفراز ہوئے،جہاں تک کبھی کوئی فرشتہ اور کوئی نبی مرسل بھی نہیں پہنچا۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عليك وعلى آلك واصحابك الف الف تسليمات وتحيات مباركة طيبة! مؤلف

کہ آپ کا معراج جسمانی والا سفر بطور طیِ مسافت طے نہیں ہوا، الخ (روح المعانی ۱۵/۱۱) یعنی جس طرح بطور کرامت یا خرقِ عادت اولیاء[1] اللہ کے لئے طیِ زمان یا طیِ مسافت کی صورتیں ظاہر ہوتی ہیں، وہ بھی نہ تھی، بلکہ اس میں نہایت غیر معمولی سرعتِ سیر اور قدرتِ کاملہ ہی کا مظاہرہ مقصود تھا۔

اس تقریب و رفعِ استبعاد کے بعد خاص طور سے اہل اسلام کو اپنی علم و یقین کی پختگی کے لئے قرآن مجید میں بیان کیا ہوا ملکہ سبا کا واقعہ بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ اس کا تخت[2] پلک جھپکنے میں یمن سے شام پہنچ گیا تھا، اور حق تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے واقعہ اسراء میں جس[3] اہمیت و شان

---

[1] حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا:۔ خود میرے زمانہ میں متعدد ایسی بزرگ ہستیاں موجود ہیں جو آن کی آن میں مسافت بعیدہ پر پہنچ جاتی ہیں (الجواب الصحیح ۲۰)۔

[2] تفسیر ابن کثیر ۳/۳۶۰ اور ۳/۳۶۲ میں عرشِ بلقیس کی صفات مفصل درج ہیں، مثلاً یہ کہ وہ اس کا نہایت عظیم الشان بیش قیمت تخت تھا، جس پر بیٹھ کر وہ دربار کرتی تھی، وہ پورا سونے کا تھا، جس پر یاقوت و زبرجد جڑے ہوئے تھے۔ اس کے پائے لالی و جواہر کے ساتھ مرصع تھے اس کی لمبائی ساٹھ گز اور چوڑائی چالیس گز تھی اس پر اعلیٰ قسم کے دیباج و حریر کا فرش بچھایا جاتا تھا، یہ تخت ایک عظیم الشان بڑے محل کے اندر سات محلات کے اندر محفوظ تھا، جو سب مقفل رہتے تھے، اور مزید حفاظت کے لئے فوجی پہرہ دار مقرر تھے، صاحبِ روح المعانی نے ۱۹/۲۰۱ میں لکھا کہ بلقیس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملاقات کیلئے سفر کے وقت اس تخت کی حفاظت کے خاص انتظامات کئے تھے اور جب وہ آپ سے صرف ایک فرسخ (تین میل) کے فاصلے پر آ گئی تو آپ نے اس تخت کو اپنے پاس منگوانے کی بات کی، جس پر آپ کے ایک متبع عفریت جن نے کہا کہ آپ اپنی اس مجلس سے نہیں اُٹھیں گے کہ میں اُس کو حاضر کردونگا۔

اس پر دوسرے عالم کتاب نے لکھا کہ آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے یعنی ابھی آن کی آن میں حاضر کرتی ہوں، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ نے ادھر نظر کی تو مذکورہ بالا تختِ بلقیس آپ کے پاس موجود تھا۔

علم کتاب سے کیا مراد ہے؟ تفہیم القرآن ۳/۵۷۷ میں ہے کہ اس شخص کے پاس کوئی غیر معمولی علم تھا اور یہ شخص علم کی طاقت سے اُس (تخت) کو ایک لحظہ میں اُٹھا لایا اب رہی بات کی ڈیڑھ ہزار میل سے ایک تخت شاہی پلک جھپکتے کس طرح اُٹھ کر آ گیا، تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ زمان و مکان اور مادہ و حرکت کے جو تصورات ہم نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنا پر قائم کئے ہیں، ان کے جملہ حدود صرف ہم ہی پر منطبق ہوتے ہیں، خدا کے لئے نہ یہ تصورات صحیح ہیں اور نہ وہ ان حدود سے محدود ہے۔ اس کی قدرت ایک غیر معمولی تخت تو درکنار سورج اور اس سے زیادہ بڑے سیاروں کو آن کی آن میں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرا سکتی ہے، جس خدا کے صرف ایک حکم سے یہ عظیم کائنات وجود میں آ گئی ہے، اس کا ایک ادنیٰ اشارہ ہی ملکہ سبا کے تخت کو روشنی کی رفتار سے چلا دینے کے لئے کافی تھا، آخر اسی قرآن میں تو یہ ذکر بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے بندے محمد ﷺ کو مکہ سے بیت المقدس لے بھی گیا، اور واپس بھی لے آیا۔

تفسیر ابن کثیر ۳/۳۶۴ میں ہے:۔ اس عالم کتاب نے وضو کر کے دعا کی تھی، مجاہد نے کہا یاذا الجلال والاکرام کہہ کر تمنا کی تھی، زہری نے کہا کہ یا الٰھنا و آلہ کل شیء الھا واحد الا الہ الا انت ائتنی بعد شھا کہا تھا کہ فوراً خدا کے حکم سے وہ تخت جگہ سے غائب ہوا، زمین میں اُترا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حضور پہنچ گیا۔

صاحبِ روح المعانی نے لکھا ہے:۔ کہا گیا ہے کہ وہ علم خدا کے اسم اعظم کا تھا، جس کی برکت و اثر سے دعا قبول ہو جاتی ہے اور وہ یاحی یاقیوم ہے بعض نے کہا یا ذاالجلال والاکرام ہے، بعض نے اللہ الرحمن کہا اور بعض نے عبرانی میں آھیا شراھیا بتلایا (روح المعانی ۱۹/۲۰۴)

ارض القرآن ۲/۶۶ میں ہے:۔ اسم اعظم کا یہودی تخیل کہ وہ جادو منتر کی طرح کوئی سریع التاثیر مخفی لفظ ہے، جس کے تکلم کے ساتھ ہر کام ہو جائے، اسلام میں نہیں، البتہ بعض اسمائے الٰہیہ کے ساتھ دعائے مستجاب سے انکار نہیں، مگر اس کے لئے تو خود پیغمبر وقت سب سے زیادہ موزوں ہونا چاہیے۔

اگر جادو منتر کی تاثیرات ناقابل انکار ہیں تو خدائے برتر کے کسی اسم اعظم کی زود تاثیری سے کیوں انکار ہے؟ اور پیغمبر کی موجودگی میں اس کے کسی صحابی سے اگر ایسی کرامت ظاہر ہوگی ہو تو کیا اشکال ہے، صاحب ارض القرآن، سید صاحبؒ کے پیرو مرشد حضرت تھانویؒ نے لکھا کہ امتی کی کرامت نبی کا معجزہ ہوتا ہے اسی لئے اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے شکر ادا کیا۔ پھر بعض مفسرین نے تو یہ قول حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کا قرار دیا ہے اور حضرت تھانویؒ نے لکھا کہ وجود متعددہ سے جو تفسیر کبیر میں مذکور ہیں یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے۔ (تفسیر بیان القرآن ۱۹/۶۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تفہیم القرآن ۳/۵۷۶ میں جو امام رازیؒ کی تفسیری توجیہ مذکور کو سیاق و سباق سے غیر مطابق بتلایا ہے درست نہیں۔ وللتفصیل محل آخر ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مؤلف

[3] تفہیم القرآن ۵۸۹ میں ہے کہ سبحان الذی اسریٰ سے بیان کی ابتداء کرنا بتا رہا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا خارق عادت واقعہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت سے رونما ہوا، ظاہر ہے کہ خواب میں کسی شخص کا اس طرح کی چیزیں دیکھ لینا یا کشف کے طور پر دیکھنا یہ اہمیت نہیں رکھتا کہ اسے بیان کرنے کے لئے اس تمہید کی ضرورت ہو کہ تمام کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو یہ خواب دکھایا، یا کشف میں یہ کچھ دکھایا، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے ذکر کیا ہے، اور سورۂ نجم میں معراج سمٰوات و سیر ملکوتی کے جس قدر حالات بیان فرمائے ہیں وہ ایک مومن کے لئے نہایت کافی ووافی ہیں، پھر احادیث صحیحہ قویہ کا گراں قدر ذخیرہ اور ۴۵ صحابہ کرامؓ کا اس واقعہ عظیمہ کو روایت کرنا بھی اس کے ثبوت و وقوع کی بہت بڑی حجت و دلیل ہے۔

ضروری تنبیہ! جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا حضور علیہ السلام کے لئے اسراءِ منامی و روحانی کے واقعات بھی پیش آئے ہیں، اور بقول شیخ اکبرؒ ۳۳ بار ایسی صورت ہوئی ہے، ان میں آپ کو عالم برزخ کے مشاہدات بھی کرائے گئے ہیں اور بعض نے چونکہ اُن کو بھی لیلۃ الاسراءِ کے ذیل میں روایت کیا، پھر اہل سیر نے ان واقعات و مشاہدات کو بھی جسمانی لیلۃ الاسراء والمعراج کے ضمن میں نقل کر دیا ہے، حالانکہ ان کا تعلق اسراءِ رات منامی و روحانی کی راتوں سے تھا، اس لئے محققین اہل سیر نے اُن کو اس کے ساتھ ذکر نہیں کیا، اور ہم بھی صرف جسمانی واقعہ اسراء و معراج ہی پر اکتفا کریں گے (جس میں نماز کی فرضیت ہوئی ہے اور اس محل و مقام کے مناسب ہے) ان شاء اللہ تعالیٰ و بہ نستعین!

باب کیف فرضت الصلوة فی الاسراء وقال ابن عباس حدثنی ابو سفیان بن حرب فی حدیث هر قل فقال یامرنا یعنی النبی صلی اللہ علیه وسلم بالصلوٰة والصدق والعفاف.

شب معراج میں نماز کس طرح فرض کی گئی' حضرت ابن عباسؓ نے کہا۔ مجھ سے ابوسفیان بن حرب نے ہرقل کی حدیث میں بیان کیا کہ وہ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز اور صدقہ اور پرہیز گاری کا حکم دیتے ہیں

حدثنا یحیی بن بکیر قال ثنا اللیث عن یونس عن ابن شهاب عن انس ابن مالک قال کان ابو ذر یحدث ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال فرج عن سقف بیتی و انا بمکة فنزل جبریل علیه السلام ففرج صدری ثم غلسه بمآء زمزم ثم جآء بطست من ذهب ممتلئ حکمة و ایماناً فافرغه فی صدری ثم اطبقه' ثم اخذ بیدی فعرج بی الی السمآء فلما جئت الی السمآء الدنیا قال جبرئیل علیه

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) پھر یہ الفاظ بھی کہ ایک رات اپنے بندے کو لے گیا جسمانی سفر پر صریحاً دلالت کرتے ہیں۔ خواب کے سفر یا کشفی سفر کیلئے یہ الفاظ کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے، لہذا ہمارے لئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو کرایا۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن ۶۹ج ۲/۳ میں سلف و خلف کے خلاف یہ صورت سمجھی ہے کہ، حضور اکرم ﷺ کو معراج کے سارے حالات کا مشاہدہ ایسی حالت میں کرایا گیا کہ آپ نہ سوتے تھے نہ جاگتے تھے، اور اس کے استدلال میں صحیحین کی حدیث کے یہ الفاظ پیش کر دیئے ہیں کہ اس وقت میں ایسی حالت میں تھا کہ نہ سوتا تھا نہ جاگتا تھا بین النائم و الیقظان آپ نے لکھا کہ اس سے معلوم ہو گیا کہ اس معاملہ کو نہ تو ایسا معاملہ قرار دے سکتے ہیں جیسا ہمیں جاگتے میں پیش آیا کرتا ہے نہ ایسا جیسا سوتے میں دیکھا کرتے ہیں اور ان دونوں حالتوں میں سے ایک مختلف قسم کی حالت تھی، اور ہماری تعبیرات میں اس کے لئے کوئی تعبیر نہیں ہے حالانکہ تمام محدثین نے حدیث مذکورہ کی تشریح میں تصریح کر دی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی یہ کیفیت سفر معراج سے قبل بیان کی ہے۔ خود سفر اسراء و معراج یا اس کے مشاہدات کی حالت کے بارے میں نہیں فرمائی، اور جو لوگ معراج جسمانی یا اس کے بحالت بیداری ہونے سے منکر ہیں، وہی اس ابتدائی جملہ سے فائدہ اُٹھانے کی سعی کر سکتے ہیں، پھر آگے مولانا آزاد نے حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد رؤیا عین اربها کو پیش کر کے مزید لکھا کہ اس ارشاد نے تو سارا مسئلہ ہی حل کر دیا اور وہ حقیقت آشکارا ہو گی جس کی طرف ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں، یعنی جو کچھ پیش آیا تھا تو رؤیا، لیکن کیسے رؤیا؟ ویسے ہی رؤیا جیسے عالم خواب میں ہم دیکھا کرتے ہیں؟ نہیں، رؤیا عین ایسی رؤیا جس میں آنکھیں غافل نہیں ہوئیں، بیدار ہوتی ہے، جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے، یہ کہ جیسے آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کے ارشاد مذکور کا مطلب اکابرِ علماءِ امت محدثین نے کیا سمجھا اور مولانا آزاد نے اس کے برخلاف کیا سمجھا اور سمجھانے کی کوشش؟ غالباً محتاج وضاحت نہیں ہے، معراج اعظم کے پورے واقعہ کو نیند و بیداری کی درمیانی حالت کا قصہ قرار دینا ہمارے نزدیک نقل و عقل دونوں کے خلاف ہے کیا کوئی عقل بھی باور کر سکتی ہے کہ بغیر مکمل بیداری کے حضور ﷺ کے قلب مبارک کا شق بھی ہوا۔ اور مسجد اقصیٰ پہنچ کر انبیاء علیہم السلام کی امامتِ صلوٰۃ بھی فرمائی اور آسمانوں کا سفر بھی فرمالیا، فرضیتِ نماز کا حکم و خواتیم سورۂ بقرہ والی آیات کا تحفہ بھی لے آئے، واپسی پر پھر مسجد میں نماز ادا فرمائی، اور راستہ کے قافلوں کا حال دیکھتے ہوئے مکہ معظمہ بھی تشریف لے آئے، اور یہ سب گویا صرف ایک خواب کے عینی مشاہدات تھے، درحقیقت جسمانی طور پر نہ کہیں گئے نہ آئے، اس سے زیادہ یہاں کچھ لکھنا بے ضرورت ہے۔ مؤلف

السلام لخازن السمآء افتح قال من هٰذا قال هٰذا جبرئیل قال هل معک احدقال نعم معی محمد فقال ء ارسل الیہ قال نعم فلما فتح علونا السمآء الدنیا فاذا رجل قاعد علیٰ یمینہ اسودۃ و علیٰ یسارہ اسودۃ اذا نظر قبل یمینہ ضحک و اذانظر قبل شمالہ بکیٰ فقال مرحباً بالنبی الصالح والابن الصالح قلت لجبریل من هٰذا قال هٰذا ادم و هٰذہ الا سودۃ عن یمینہ و شمائلہ نسلم بنیہ فاهل الیمین منهم اهل الجنۃ والاسودۃ التی عن شمالہ اهل النار فاذانظر عن یمینہ ضحک و اذا نظر قبل شمالہ بکیٰ حتی عرج بی الی السمآء الثانیہ فقال لخازنها افتح فقال لہٗ خازنها مثل ماقال الاول ففتح قال انس فذکر انہ وجد فی السمٰوٰت ادم وادریس و موسیٰ و عیسیٰ و ابراهیم ولم یثبت کیف منازلهم غیر انہ ذکر انہ وجدادم فی السمآء الدنیا و ابراهیم فی السمآء السادسہ قال انسؓ فلما مرجبریل علیہ السلام بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم بادریس قال مرحباً بالنبی الصالح والا خ الصالح فقلت من هٰذا قال هٰذا ادریس ثم مرت بموسیٰ فقال مرحباً با لنبی الصالح والا خ الصالح قلت من هٰذا قال هٰذا موسیٰ ثم مرت بعیسیٰؑ فقال مرحباً بالنبی الصالح والا خ الصالح قلت هٰذا قال هٰذا عیسیٰ ثم مررت بابراهیم قال ابن شهاب فاخبرنی ابن حزم ان ابن عباس و اباحبۃ الانصاری کانا یقولان قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم عرج بی حتی ظهرت لمساویً اسمع فیہ صریف الاقلام قال ابن حزم و انس بن مالک قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ففرض اللہ عزوجل علیٰ امتی خمسین صلوٰۃ فرجعت بذلک حتی مررت علیٰ موسیٰ فقال مافرض اللہ لک علیٰ امتک قلت فرض خمسین صلوٰۃً قال فارجع الیٰ ربک فان امتک لاتطیق فرجعت فوضع شطرها فرجعت الیٰ موسیٰ قلت وضع شطرها فقال راجع ربک فان امتک لاتطیق ذلک فرجعت فوضع شطرها فرجعت الیہ فقال ارجع الیٰ ربک فان امتک لاتطیق ذلک فراجعتہٗ فقال هی خمس و هی خمسون لایبدل القول الذی فرجعت الیٰ موسیٰ فقال راجع ربک فقلت استحییت من ربی ثم انطلق بی حتی انتهی بی الی السدرۃ المنتهیٰ و غشیهآ الوان لاادری ماهی ثم ادخلت الجنۃ فاذا فیها حبآئل اللؤلؤ واذا ترابها المسک

ترجمہ: ۔یحییٰ بن بکیر، لیث، یونس، ابن شہاب، انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں، کہ ابوذر بیان کیا کرتے تھے، کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا (ایک شب) میرے گھر کی چھت پھٹ گئی۔ اور میں مکہ میں تھا، پھر جبرائیل علیہ السلام اُترے، اور انہوں نے میرے سینہ کو چاک کیا، پھر اسے زم زم کے پانی سے دھویا، پھر ایک طشت سونے کا حکمت وایمان سے بھرا ہوا لائے۔ اور اسے میرے سینہ میں ڈال دیا، پھر سینہ کو بند کر دیا، اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور مجھے آسمان پر چڑھا لے گئے جب میں دنیا کے آسمان پر پہنچا تو جبرائیل علیہ السلام نے آسمان کے داروغہ سے کہا کہ (دروازہ) کھول دے۔ اُس نے کہا کون ہے، وہ بولے جبریل علیہ السلام ہے، پھر اس نے کہا، کیا تمہارے ساتھ کوئی (اور بھی) ہے جبریل نے کہا، ہاں! میرے ہمراہ محمد ہیں، اس نے کہا، کیا وہ بُلائے گئے تھے، جبریل نے کہا ہاں! جب دروازہ کھول دیا گیا، تو ہم آسمان دنیا کے اوپر چڑھے، یکا یک ایک ایسے شخص پر (نظر پڑی) جو بیٹھا ہوا تھا، اس کے داہنے جانب کچھ پرچھائیاں، اور اس کے بائیں جانب (بھی) کچھ پرچھائیاں تھیں، جب وہ اپنی داہنی جانب دیکھتے تو ہنس دیتے، اور جب بائیں طرف دیکھتے تو رو دیتے تھے، انہوں نے (مجھے دیکھ کر) کہا کہ مَرحبا یا لنبی الصالح والا بن الصالح میں نے جبریل سے پوچھا کہ یہ کون ہیں، انہوں نے کہا، یہ آدم ہیں

اور یہ لوگ اُن کے داہنے اور بائیں ان کی اولاد کی روحیں ہیں، داہنی جانب جنت والے ہیں اور بائیں جانب دوزخ والے، اسی سبب سے جب وہ اپنی داہنی طرف نظر کرتے ہیں تو ہنس دیتے ہیں اور جب بائیں طرف دیکھتے ہیں تو رونے لگتے ہیں، یہاں تک کہ مجھے دوسرے آسمان تک لے گئے اور اس کے داروغہ سے کہا کہ (دروازہ) کھول دے، تو داروغہ نے اس قسم کی گفتگو کی جیسی پہلے نے کی تھی، پھر (دروازہ) کھول دیا گیا حضرت انسؓ کہتے ہیں، پھر ابوذرؓ نے ذکر کیا، کہ آپ نے آسمانوں میں حضرت آدم، اور ادریس اور موسیٰ اور عیسیٰ اور ابراہیم (علیہم السلام) کو پایا۔ اور یہ نہیں بیان کیا، کہ ان کی منازل کس طرح ہیں، سوا اس کے کہ انہوں نے ذکر کیا ہے، کہ آدم کو آسمان دنیا میں۔ اور ابراہیم علیہ السلام کو چھٹے آسمان میں پایا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں، پھر جب جبریل علیہ السلام حضور علیہ السلام کو لے کر حضرت ادریسؑ کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا۔ مرحباً بالنبی الصالح والاخ الصالح (آپ فرماتے ہیں) میں نے (جبریل سے) پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ جبریل نے کہا یہ ادریسؑ ہیں، پھر میں موسیٰؑ کے پاس گزرا، تو انہوں نے (مجھے دیکھ کر) کہا مرحباً بالنبی الصالح والاخ الصالح، میں نے (جبریل سے) پوچھا یہ کون ہیں؟ جبریل نے کہا، یہ موسیٰ ہیں، پھر میں عیسیٰؑ کے پاس سے گزرا تو انہوں نے کہا مرحباً بالنبی الصالح والاخ الصالح میں نے (جبریل سے) پوچھا یہ کون ہیں؟ جبریل نے کہا یہ عیسیٰؑ ہیں، پھر میں ابراہیم کے پاس سے گزرا۔ تو انہوں نے کہا مرحباً بالنبی الصالح والابن الصالح میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ جبریل نے کہا یہ ابراہیمؑ ہیں، ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے ابن حزم نے خبر دی کہ ابن عباس اور ابوحبہ انصاری کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، پھر مجھے اور اوپر چڑھایا گیا، یہاں تک کہ میں ایک ایسے بلند مقام میں پہنچا، جہاں (فرشتوں کے) قلموں کی (کشش کی) آواز میں نے سُنی، ابن حزم اور انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں، جب میں یہ فریضہ لے کر لوٹا اور موسیٰ علیہ السلام پر گزرا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ نے آپ کے لئے آپ کی امت پر کیا فرض کیا میں نے کہا کہ پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ انہوں نے (یہ سنکر) کہا کہ اپنے رب کے پاس لوٹ جایئے! اس لئے کہ آپ کی امت (اس قدر عبادت کی) طاقت نہیں رکھتی، تب میں لوٹ گیا تو اللہ نے اس کا ایک حصہ معاف کر دیا، پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس لوٹ کر آیا اور کہا کہ اللہ نے اس کا ایک حصہ معاف کر دیا۔ حضرت موسیٰ نے پھر وہی کہا کہ اپنے پروردگار سے رجوع کیجئے، کیونکہ آپ کی امت اس کی بھی طاقت نہیں رکھتی، پھر میں نے رجوع کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ایک حصہ اور معاف کر دیا، پھر میں اُن کے پاس لوٹ کر آیا (اور بیان کیا) تو وہ بولے کہ آپ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ جایئے کیونکہ آپ کی امت (اس کی بھی) طاقت نہیں رکھتی، چنانچہ پھر میں نے اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ اچھا (اب) یہ پانچ نمازیں (رکھی جاتیں) ہیں، اور یہ (درحقیقت باعتبار ثواب کے) پچاس ہیں، میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی، پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کر آیا۔ انہوں نے کہا، پھر اپنے پروردگار سے رجوع کیجئے، میں نے کہا (اب) مجھے اپنے پروردگار سے (بار بار کہتے ہوئے) شرم آتی ہے، پھر مجھے روانہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ میں سدرۃ المنتہیٰ پہنچایا گیا۔ اور اس پر بہت سے رنگ چھا رہے تھے، میں نہ سمجھا کہ یہ کیا ہیں، پھر میں جنت میں داخل ہو گیا، تو (کیا دیکھتا ہوں کہ) اس میں موتی کی لڑیاں ہیں اور اس کی مٹی مشک ہے۔

تشریح! امام بخاریؒ نے اسراء و معراج سے متعلق گیارہ جگہ روایات ذکر کی ہیں، سب سے پہلی یہ حدیث الباب ہے جو کسی قدر مختصر ہے اور ۲۲۱ میں بھی ایسی ہی ہے ۴۵۵ و ۴۵۷ میں کسی قدر مفصل ہے، ۴۷۱ و ۴۸۷ و ۵۰۴ و ۵۵۰ و ۸۱۰ میں زیادہ مختصر ہے، ۵۴۸ (باب المعراج) اور ۱۱۲۰ (کتاب التوحید) میں سب سے زیادہ تفصیل ہے۔

ص ۱۱۲۰ والی مفصل روایت شریک میں اگرچہ محدثین نے کلام کیا ہے، مگر جن وجود سے کلام ہوا ہے، ان کے شافی جوابات حافظ ابن حجر وغیرہ نے دیدیئے ہیں، اور اس امر سے بھی اس کی صحت و اہمیت ہماری نظر میں زیادہ ہے کہ حافظ ابن قیمؒ نے اسُی کی بنا پر دنو و تدلّی کو

حضرت حق جل وعلا سے متعلق اور شبِ معراج میں مانا ہے۔ جبکہ وہ سورۂ نجم کے دنو وتدلّی کو حضرت جبریل علیہ السلام سے متعلق اور ارضی واقعہ بتلاتے ہیں، ہمارے حضرت شاہ صاحب علامہ کشمیریؒ نے اس کو بھی واقعہ معراج سے متعلق ہونے کو راجح قرار دیا ہے، اور آپ نے آیاتِ سورۂ نجم سے ہی معراج میں رؤیتِ عینی کا بھی اثبات کیا ہے، ہم آپ کی اس تحقیق کو آخر میں رؤیت کی بحث میں ذکر کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ترتیب واقعات معراج!

احادیث وآثارِ متعلقہ معراج میں واقعات کی ترتیب مختلف ملتی ہے، اسی لئے کتبِ سیرت میں بھی وہ اختلاف آ گیا ہے، ہم نے خصوصیت سے بخاری ومسلم کی روایات کے پیشِ نظر جو ترتیب راجح سمجھی ہے۔ اسی کے مطابق واقعات کو یہاں ذکر کرتے ہیں۔ واللہ الموفق للصواب والسداد:

تفصیل واقعات معراج!

(۱) **شق سقف البیت**:۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامِ مکہ معظمہ کے زمانہ میں (شب اسراءِ ومعراج میں) میرے گھر کی چھت[۱] کھلی اور حضرت جبریل[۲] علیہ السلام اس میں سے اُترے، (بخاری ۵۰)۔

شق صدر مبارک! حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کو گھر سے بیت اللہ شریف کے پاس حطیم میں لے گئے، جہاں آپ کے چچا حمزہ اور چچا

---

[۱] حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو یکبارگی اور براہِ راست آسمان سے حضور علیہ السلام تک پہنچنا تھا، تا کہ دوسرے طریق سے پہنچنے میں ملاقات ومناجات کی تاخیر واقع نہ ہو اور اس امر کا بھی اشارہ تھا کہ حضور علیہ السلام کی یہ طلبی بلاتقررِ وقت ومیعاد ہوئی ہے۔ اور اس طرف بھی اشارہ کیا کہ آپ کو اوپر کی طرف صعود کرانا ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ اس طرح آنے کا راز آئندہ پیش آنے والے واقعہ شق صدر کی تمہید ہو، گویا حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کو اپنے خصوصی معاملہ لطف وکرم کی توقع دلاتے ہوئے آپ کی دل جمعی وتقویتِ قلب کے لئے یہ دکھلا دیا کہ جس طرح چھت پھٹ کر فوراً متصل اور اپنی اصلی حالت پر ہوگئی، اسی طرح آپ کے شق صدر کی صورت بھی پیش آئے گی، واللہ تعالیٰ اعلم (فتح ۱/۱۳۱ ۱۴)۔

محقق عینی نے لکھا:۔ درمیان چھت سے فرشتوں کے داخل ہونے اور دروازہ سے داخل ہونے کی حکمت یہ تھی کہ جس بارے میں وہ آئے تھے، اس کی صحت وصداقت دل میں اچھی طرح اُتر جائے۔ (عمدہ ۲/۱۹۸)

حضرت تھانویؒ نے یہ حکمت لکھی کہ ابتداءِ امر ہی سے حضور ﷺ کو معلوم ہو جائے کہ میرے ساتھ کوئی خارق عادت معاملہ ہونے والا ہے۔ (نشر الطیب)

[۲] حدیثِ مسلم شریف میں ہے:۔ اُتیت فانطلقوا بی الی زمزم (فرشتے میرے پاس آئے اور مجھے زمزم کی طرف لے گئے)۔

دوسری حدیث میں ہے کہ شبِ اسراء میں آپ کے پاس تین نفر آئے، بخاری شریف ۵۰۴ (باب کان البنی صلے اللہ علیہ وسلم تنام عینه ولا ینام قلبه) میں ہے کہ شبِ اسراء میں وحی سے قبل تین نفر آپ کے پاس آئے، اور سب آپ سے متعارف ہوئے اس وقت اتنی ہی بات ہوئی، پھر دوسری بار ایک رات میں وہ سب آئے اور آپ سے متعلق امور کا انصرام واہتمام مع، عروجِ سماء حضرت جبریل علیہ السلام کے ذمہ ہوا۔ (فتولاہ جبرئیل ثم عرج بہ الی السماء)

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے:۔ یہ تینوں فرشتے تھے مگر مجھے ان کے ناموں کی تحقیق نہ ہو سکی (فتح الباری ۵/۳ ۶/۷) دوسری جگہ لکھا:۔ مجھے ان تینوں کے نام صراحت سے نہیں ملے، لیکن وہ فرشتوں میں سے تھے، اور غالباً یہ فرشتے وہی تھے جن کا ذکر اوائل کتاب الاعتصام (بخاری ۱۰۸۱) کی حدیثِ جابرؓ میں گزر چکا ہے، جس میں فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، میں نے وہاں واضح کیا تھا کہ ان فرشتوں میں جبرئیل ومیکائیل تھے، طبرانی کی حدیثِ انسؓ سے بھی معلوم ہوا کہ ایک بار حضرت جبرئیل ومیکائیل آئے اور بات کر کے چلے گئے، پھر دوسری بار تین نفر آئے اور انہوں نے حضور علیہ السلام کو پشت کے بل لٹایا الخ (فتح ۳۶۸)

محقق عینیؒ نے لکھا:۔ وہ تینوں فرشتے میرے نزدیک جبرئیل، میکائیل واسرافیلؑ تھے، کیونکہ میں نے بہت سی کتابوں میں جو خاص طور سے واقعہ معراج پر لکھی گئی ہیں، دیکھا کہ وہ تینوں فرشتے براق لیکر حضور اکرم علیہ السلام کے پاس اُترے تھے (عمدہ ۱۶/۱۱۶)

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ شریک کی دونوں روایاتِ بخاری میں جو تین نفر کے آنے کا ذکر ہے اس میں بھی وہ منفرد نہیں ہیں، اور حافظ نے حدیثِ جابرؓ سے اس کی تائید پیش کر دی ہے، جس طرح حافظ نے دوسرے محدثین کے تفردِ شریک بالروایۃ پر لکھا کہ اُن کے دعوائے تفرد میں نظر ہے کیونکہ شریک کی موافقت کثیر بن خنیس نے کی ہے اور اُس روایت کی تخریج سعید بن یحییٰ بن سعید الاموی (م ۲۴۹ھ تہذیب ۹۷) نے کتاب المغازی میں اپنے طریق سے کی ہے (فتح الباری ۱۲/۳۹۷)۔

زاد بھائی جعفر بن ابی طالب سو رہے تھے، چونکہ اس وقت آپ پر نیند کا اثر تھا، آپ بھی ان دونوں کے بیچ میں لیٹ گئے اور آنکھ لگ گئی، لیکن آپ کی آنکھیں سوتی تھیں اور دل جاگتا تھا۔ (فتح الباری ونسائی)

حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کو بیدار کر کے چاہ زمزم کے پاس لے گئے اور آپ کا سینہ مبارک اوپر سے اسفل بطن تک چاک کیا، قلبِ مبارک نکال کر سونے کے طشت میں رکھ کر آب زمزم سے دھویا، پھر ایک اور طشت میں رکھا جو ایمان وحکمت سے معمور تھا اور قلب مبارک کو پوری طرح ایمان وحکمت اور اس کے نور سے بھر دیا، پھر اس کے اصل مقام میں رکھ کر سینہ مبارک کو برابر کر دیا (بخاری نسائی وفتح الباری)۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔ شق صدر کا وقوع اگرچہ پانچ بار مروی ہے مگر صحیح ثبوت چار بار ہی کا ہے، اوّل بچپن کے زمانہ کا حضرت حلیمہؓ کے پاس (۴۔۵ سال کی عمر میں) جس میں علقہ (دمِ غلیظ جو قلب کے اندر ام المفاسد واصل المعاصی ہوتا ہے) نکال دیا گیا اور فرمایا گیا کہ یہ شیطان کا حصہ تھا، چنانچہ آپ کا زمانہ طفولیت بھی اکمل احوال پر گزرا اور آپ اثراتِ شیطانیہ سے محفوظ رہے۔ دوسرا شق دس سال کی عمر میں ہوا، تیسرا بعثت کے وقت (چالیس سال کی عمر میں) جبکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام غارِ حرا میں وحی لائے تھے، چوتھا یہ شب معراج کا تھا، تاکہ آپ کے اندر اس رات میں پیش آنے والے امور کے مشاہدہ اور مناجاتِ خداوندی کے لئے استعداد پیدا ہو سکے (پانچواں بیس سال کی عمر والا واقعہ محدثین وارباب سیر کے نزدیک ثابت نہیں ہے)

حافظ ابن قیمؒ نے اسبابِ شرح صدر حسی ومعنی کا بیان پوری تفصیل سے زاد المعاد میں کیا ہے، جو قابل مطالعہ ہے (فتح الباری ۳/۱۴ اور فتح الملہم ۱/۳۲۲)۔

شق صدر اور سیرۃ النبی!

حضرت علامہ مولانا محمد بدر عالم صاحبؒ نے ترجمان السنہ جلد چہارم ۱۵۹ میں لیلۃ المعراج میں شقِ صدر کے عنوان سے دو حدیث ذکر کی ہیں، پہلی بحوالہ مشکوٰۃ ۵۲۶ جو بخاری شریف باب المعراج (ص ۵۴۸) کی طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ دوسری بخاری ۲۲۱ کی ہے۔ تیسرے حوالہ کا اضافہ احقر کرتا ہے کہ بخاری شریف ۱۱۲۰ کی طویل ومفصل حدیثِ معراج میں اس طرح ہے کہ تین نفر (فرشتے) حضور علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور آپ کو اُٹھا کر بئرِ زمزم کے پاس لے گئے، پھر آگے کے کام کی انجام دہی ان تینوں میں سے صرف حضرت جبرائیل سے متعلق ہوئی انہوں نے آپ کے سینہ مبارک کے اوپر کے حصہ سے نیچے تک کا[1] چاک کر کے اندر کا حصہ خالی کر دیا اور اس کو اپنے ہاتھ سے آبِ زمزم کے ذریعہ دھویا تا آنکہ آپ کے اندر کا پورا حصہ منقّی ومصفّی کر دیا، پھر ایک سونے کا طشت لایا گیا جو ایمان وحکمت سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے آپ کے صدر مبارک کو حلق مبارک کی رگوں تک بہرہ اندوز کر دیا، پھر اس چاک کو (مثل سابق) بند کر دیا۔ اسکے بعد آپ کو معراج سماوی کرائی گئی۔

یہ تینوں بخاری شریف کی صحیح ترین روایات ہیں۔ جس میں واقعہ شق صدر کی پوری صراحت وتفصیل موجود ہے، لیکن سیرۃ النبی جلد سوم ۴۸۴ طبع چہارم میں حضرت سید صاحبؒ نے شقِ صدر یا شرحِ صدر کے عنوان سے ایک طویل بحث لکھی ہے، جس میں کئی تفردات اختیار کئے ہیں مثلاً:۔ (۱) کبارِ محدثین حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے چار مرتبہ شقِ صدر کو صحیح وثابت قرار دیا ہے، مگر سید صاحب نے صرف ایک بار کو صحیح بتلایا یعنی بچپن کے واقعہ کو، حالانکہ دو بار کو تو اکثر محدثین واہل سیر نے تسلیم کیا ہے، امام بخاریؒ کی تین صریح وصحیح احادیث میں شقِ صدر کا معراج سے قبل ہونا ابھی ذکر ہوا ہے۔

---

[1] ہم نے یہ ترجمہ من نحرہ الی لبتہ کا کیا ہے، کیونکہ نحر سینہ کے اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں اور لبۃ سینہ کا وہ حصہ ہے جہاں پر ہار لٹکتا ہے، اہل لغت اور صاحب مجمع البحار وحافظ ابن حجرؒ نے یہی معنی بیان کئے ہیں، مگر محقق عینیؒ نے داؤدی سے لبہ کے دوسرے معنی عانہ کے بھی نقل کئے اور محدث ابن التین نے بھی اسکو ترجیح دی ہے بظاہر اس لئے کہ یہ معنی دوسری روایات سے زیادہ مطابق ہوگا، یعنی اوپری سینہ سے پیڑو کے مقام تک چاک کیا گیا (عمدہ ۱۷۱/۲۵) مطبوعہ حاشیہ بخاری ۱۱۲۰ میں وھوالاشبہ فی الرداخ چھپ گیا ہے، صحیح وھوالاشبہ وفیہ الرد ہے کما لایخفیٰ، نیز اس جگہ عمدۃ القاری کی عبارت بھی ناقص وموہم درج ہوئی ہے۔ مؤلف

(۲) حضرت سید صاحبؒ نے حافظ ابن حجرؒ وغیرہ پر یہ ریمارک بھی کیا کہ یہ حضرات ہر اختلافِ روایت کو ایک نیا واقعہ تسلیم کر کے مختلف روایتوں میں توفیق و تطبیق کی کوشش کرتے ہیں (۳/۴۸۵) حافظ ابن حجرؒ وغیرہ اکابر محدثین کے متعلق ایسی کچی بات کہنا ہمارے نزدیک حضرت سید صاحب کی شانِ تحقیق سے نہایت بعید ہے۔

(۳) مسلم شریف میں ذکر شدہ بچپن کے واقعہ شق صدر کو حماد بن سلمہ کے سوءِ حفظ کا نتیجہ قرار دے کر مجروح کر دیا۔

(۴) معراج میں شق صدر کو تسلیم کرتے ہوئے اسے روحانی عالم کا واقعہ قرار دیا۔

(۵) شق صدر کی ضعیف روایتیں یہ عنوان قائم کر کے بے ضرورت بہت سی روایتیں غیر صحاح ستہ کی پیش کر کے ان کے رواۃ ومتون میں کلام کیا ہے۔ جس سے خواہ مخواہ صحیح و ثابت واقعہ کی صحت بھی ناظرین کے قلوب میں مشکوک و مشتبہ ہو جاتی ہے۔

(۶) شق صدر کی صحیح کیفیت کا عنوان قائم کر کے بخاری، مسلم و نسائی سے قوی روایت نقل کی، تو اسی کے ساتھ شق صدر کی حقیقت کے عنوان سے علمائے ظاہر و صوفیائے حقیقت بیں کا اختلاف نمایاں کر دیا، پھر لکھا کہ ہمارے نزدیک صحیح اصطلاح شرح صدر ہے جس کا دوسرا نام علم لدنی ہے اور آیت الم نشرح وغیرہ سے اس کی تائید پیش کی، ہمارے نزدیک حضرت سید صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ان تفردات میں لغزش ہوئی ہے، اور شق صدر کو شرح صدر و علم لدنی پر پوری طرح سے منطبق کر دینا تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا، حضرت علامہ عثمانیؒ نے الم نشرح لک صدرک کے تفسیری فوائد میں لکھا:۔

کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا کہ اُس میں علوم و معارف کے سمندر اُتار دیئے، اور لوازم نبوت و فرائض رسالت برداشت کرنے کو بہت بڑا وسیع حوصلہ دیا کہ بے شمار دشمنوں کی عداوت اور مخالفوں کی مزاحمت سے گھبرانے نہ پائیں (تنبیہ) احادیث و سیر سے ثابت ہے کہ ظاہری طور پر بھی فرشتوں نے متعدد مرتبہ آپ کا سینہ چاک کیا، لیکن مدلول آیت کا بظاہر وہ معلوم نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت العلامۃ المحدث صاحب التفسیر المظہریؒ نے آیہ الم نشرح کی تفسیر میں لکھا: ہم نے آپ کا سینہ کھول دیا، کہ اس میں ایسا ایسے علوم حقہ اور معارف دینیہ مُبصرَہ بنور اللہ سما گئے، جن تک عقلِ عقلا کی رسائی ممکن نہیں ہے، نیز اس میں توجہ حضور تام الی اللہ کو ضرورتِ دعوت و تبلیغ کے لئے توجہ الی الخلق کے ساتھ جمع کر دیا، جو مرتبہ نزول کی چیز ہے، لہٰذا حالتِ نزول میں بھی آپ کو فی الحقیقت انقطاع عن اللہ نہ ہوگا، جس سے آپ کا دل غمگین ہو۔ اس کے بعد لکھا کہ حضور اکرم ﷺ کے لئے شرح صدر کا وقوع ظاہری صورت میں بھی دوبارہ ہوا ہے، ایک مرتبہ بچپن میں جس کی روایت مسلم شریف میں ہے، اور دوسری مرتبہ شبِ معراج میں، جس کی روایت بخاری و مسلم میں ہے الخ (تفسیر مظہری ۱۰/۲۹۰) اس سے معلوم ہوا کہ شرح صدر کی ایک صورت شق صدر والی بھی ہے، مگر یہ مدلول آیت کا نہیں، جس طرح شق صدر ثابت بالا حادیث کا مدلول صرف معنوی شرح صدر نہیں ہے۔

غرض آیت شرح صدر اور احادیث شق صدر دونوں کے مدلول الگ الگ ہیں۔ اور صاحب ترجمان السنۃ نے اس بارے میں جو نقد صاحبِ[1] سیرۃ النبی پر کیا ہے، وہ بجا و درست ہے، والحق احق ان یقال۔

---

[1] حضرت سید صاحبؒ کے جن تفردات اور طرزِ تحقیق پر نقد کیا گیا ہے، ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ انہوں نے اس کے بڑے حصہ سے رجوع فرمالیا تھا، اور ایک بار ان کا رجوع معارف میں شائع بھی ہو گیا تھا، مگر یہ ادارہ دار المصنفین اعظم گڑھ کی بڑی فروگذاشت ہے کہ نہ ان کے رجوع کے مطابق تالیفات میں اصلاح کی اور نہ اسکو ان کی تالیفات کے ساتھ شائع کیا،

ایسی صورت میں حضرتؒ کی کسی سابق تحقیق پر نقد و طعن ہوتا ہے تو اس سے دل کو تکلیف ہوتی ہے، خصوصاً اس لئے کہ راقم الحروف کو حضرت سید صاحبؒ سے ان کی گراں قدر علمی خدمات کی وجہ سے مجلس علمی ڈابھیل ہی کے زمانہ سے قلبی تعلق رہا ہے اور ایک عرصہ تک یہ سعی و تمنا بھی رہی کہ وہ اپنے تفردات سے رجوع فرمالیں، پھر رجوع کی خبر ایک محترم کے نجی خط سے ملی اور معارف میں بھی شائع ہوا تو نہایت مسرت ہوئی پھر آخری زندگی میں حضرت تھانوی قدس سرہ سے جوں جوں موصوف کا تعلق و استفادہ بڑھتا گیا، ان کے خیالات میں مزید تبدیلی ہوتی گئی اور موصوف کی وفات سے صرف ایک ہفتہ قبل (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انکارِ شق صدر کا بطلان! حافظ ابن حجرؒ نے باب المعراج والی حدیث بخاری کے الفاظ فشق مابین هذه الی هذه کے تحت لکھا۔ بعض لوگوں نے شبِ معراج کے شق صدر کا انکار کیا ہے اور کہا کہ یہ صرف بچپن کے زمانہ میں بنی سعد کے یہاں ہوا تھا، لیکن یہ انکار درست نہیں، کیونکہ روایاتِ شق صدر کا توارد ہوا ہے، اور اس کے سوا بعثت کے وقت بھی شق صدر ہوا ہے جیسا کہ ابونعیم نے دلائل میں اس کی تخریج کی ہے، اور ہر بار کے شق صدر کی الگ حکمت ہے، اوّل کی حکمت تو خود مسلم شریف کی روایت ہی میں مذکور ہے کہ آپ کے اندر سے شیطان کا حصہ نکال دیا گیا، جس کی وجہ سے آپ کی زمانہ طفولیت ہی سے اکمل احوال عصمت پر نشو ونما ہوئی اور شیطانی اثرات سے محفوظ رہے، پھر بعثت کے وقت جو شق صدر ہوا وہ آپ کے اکرام میں زیادتی کیلئے تھا تا کہ وحی الٰہی کو قلبِ قوی کے ساتھ اکمل احوال تطہیر میں قبول کریں پھر معراج سماوی کے وقت اس لئے شق صدر ہوا کہ آپ مناجاتِ الٰہی کے واسطے تیار ہوسکیں، اور ممکن ہے انفراجِ سقفِ بیت کی حکمت بھی اس طرف اشارہ کرنا ہو کہ اس کے بعد آپ کا شق صدر ہوگا اور وہ بھی سقف کی طرح بغیر معالجہ وضرر کے اصل حالت پر جُڑ جائے گا، آگے حافظ نے لکھا کہ جو بھی رقِ عادت امور روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہیں شق صدر، دل کا سینہ سے نکالنا وغیرہ، ان کو اسی طرح تسلیم کر لینا واجب وضروری ہے اور ان کو حقیقی معانی ومطالب سے پھیرنا صحیح نہیں، کیونکہ قدرتِ الٰہیہ سے یہ سب کچھ ہوسکتا ہے اور اسکے لحاظ سے کوئی امر بھی محال و ناممکن نہیں ہے، اسی لئے علامہ قرطبیؒ نے بھی المفہم میں لکھا کہ شب معراج کے شق صدر کا انکار نا قابل التفات ہے کیونکہ اس کے روایت کرنے والے سب مشاہیر ثقہ ہیں، پھر وہی لکھا جو ہم ذکر کر چکے ہیں (فتح الباری ۱۴۲/۷)۔

دوسری جگہ کتاب التوحید بخاریؒ والی حدیث پر حافظؒ نے لکھا کہ منکرین شق صدر کا رد میں پہلے کر چکا ہوں اور یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ اس کا ثبوت روایتِ شریک کے علاوہ بھی صحیحین میں حدیثِ ابی ذرؓ سے ہے، اور یہ کہ شق صدر کا وقوع بعثت کے موقع پر بھی ہوا ہے جیسا کہ ابوداؤد طیاسی نے اپنی مسند میں اور ابونعیم وبیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے، نیز شق صدر مبارک کا وقوع حضور اکرم ﷺ کی دس سال کی عمر میں بھی حدیثِ ابی ہریرہ سے ثابت ہوا ہے۔ یہ روایت عبداللہ بن احمد کی زیادات المسند میں ہے۔

شفا میں یہ بھی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے قلب مبارک کو دھویا تو فرمایا کہ یہ قلب سدید ہے، جس میں دیکھنے والی دو آنکھیں اور سُننے والے دو کان ہیں۔ (فتح الباری ۳۶۹/۱۳)

محقق عینیؒ نے بھی عمدہ ۱۷/۲۵ میں اسی طرح منکرین شق صدر کا رد کیا ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو فتح الملہم ۳۲۲/۲ اور ترجمان السنۃ ۱۵۹/۴)

ظاہر ہے ایسے کبار محققین ومتقنین فی الحدیث کے اثباتِ شق صدر کے بعد انکار وتاویل کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور سیرۃ النبی ایسی بلند پایہ معیاری وتحقیق کتاب میں اس قسم کی غلطیوں کا باقی رہ جانا اور برابر چھپتے رہنا نہایت تکلیف دہ امر ہے۔

رحمۃ للعالمین (مصنفہ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوریؒ) اور قصص القرآن میں شق صدر پر بحث وتحقیق نہیں کی گئی۔

(۳) رکوب براق! حافظ ابن حجرؒ نے ثم اتیت بدابة دون البغل وفوق الحمار (بخاری) کی شرح میں لکھا:۔ بُراق، مشتق ہے بریق سے، کیونکہ اس کا رنگ سفید تھا، یا برق سے کہ اس کے وصفِ سرعتِ سیر کی طرف اشارہ ہے (یعنی وہ برق رفتار تھا) یا برقاء سے لیا گیا، کیونکہ شاۃ برقاء وہ ہوتی ہے، جس کی سفید اون میں کچھ سیاہ حصہ بھی ہوتا ہے اور وہ باوجود اس کے بھی سفید بھیڑوں میں شمار ہوتی ہے، دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ مشتق نہ ہو، بلکہ اسم جامد ہو، براق کے ذریعہ سفر کرانے کی حکمت یہ تھی کہ کسی سواری پر سوار ہو کر جانا مانوس طریقہ ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) جو ملاقات احقر کی ہوئی، اس سے بھی مندرجہ بالا خیال کی تائید وتوثیق ہی ہوئی ہے، اس لئے یہ چند سطور اپنے علم واطمینان کے مطابق حضرت سیدؒ صاحب نور اللہ مرقدہ کے بارے میں لکھی گئیں، لیکن ظاہر ہے کہ سیرۃ النبی وغیرہ میں جو چیزیں اب تک چھپ رہی ہیں اور برابر ان کے تراجم بھی دوسری زبانوں میں چھپ رہے ہیں، اُن سے جو غلط فہمی پھیل رہی ہے اس کا ازالہ صحیح گرفت اور نقد ہی سے ہوسکتا ہے۔ جو اہل علم وتحقیق کا حق ہے۔ جزاهم الله خير الجزاء۔ مؤلف

، چنانچہ بادشاہانِ دنیا کسی اپنے مخصوص آدمی کو بلاتے ہیں تو اس کیلئے سواری بھیجا کرتے ہیں، ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ حضور علیہ السلام کے لئے طیِ ارض کر کے بلالیا جاتا۔ محقق عینیؒ نے امور مذکورہ کے علاوہ لکھا کہ میرے دل میں فیض الٰہی سے یہ بات آئی کہ طیِ ارض کی فضیلت میں تو اولیاءِ کرام بھی شریک ہیں، یہ سواری انبیاءِ علیہم السلام ہی کے ساتھ مخصوص ہے، جو اپنے سوار کو پلک جھپکنے میں مسافاتِ بعیدہ طے کرادیتی ہے اور اسکی صورت نہ گھوڑے کی ہے نہ خچر کی، اس لئے کہ ان دونوں کا استعمال خاص طور سے حرب وخوف کی حالت میں بھی ہوا کرتا ہے اور یہ سفر معراج ہر لحاظ سے خیر وسلامتی کا سفر تھا۔

محدث ابن ابی جمرہؒ نے شرحِ بخاری میں لکھا:۔ اس سفر مقدس کیلئے براق کی خصوصیت اس لئے تھی کہ اس جنسِ براق کا آج تک کوئی مالک نہیں ہوا نہ اس کا استعمال کرسکا بخلاف دوسری اجناس دواب کے کہ لوگ ان کو خریدتے ہیں مالک بنتے ہیں اور اُن کا استعمال کرتے ہیں، لہذا ایسی نادر ومخصوص سواری کا آپ کے لئے متعین ہونا آپ کے خصوصی شرف وفضل کو ظاہر کرتا ہے۔

محقق عینیؒ نے اس کو نقل کر کے لکھا:۔ اس سے بظاہر معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کے سوا دوسرے انبیاءِ علیہم السلام براق پر سوار نہیں ہوئے، یہی قول ابن دکا ہے۔ مگر یہ روایتِ ترمذی کے خلاف ہے، جس میں ہے کہ شبِ اِسراء میں زین ولگام کے ساتھ براق پیش ہوا، اس کی شوخی کی وجہ سے حضور علیہ السلام کو اس پر سوار ہونے میں دشواری ہوئی، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس سے کہا، یہ کیا حرکت ہے؟ واللہ! آج تک حضور سے زیادہ برگزیدہ کوئی بھی تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے اس پر وہ عرق ندامت میں شرابور ہوگیا، امام ترمذی نے اس حدیث حسن کو غریب کہا اور محدث ابن حبان نے تصحیح کی، نسائی اور ابن مردویہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ رکوبِ براق کا شرف حضور علیہ السلام سے پہلے اور انبیاءِ علیہم السلام کو بھی حاصل ہوا ہے، ایسا ہی مضمون حدیث اِبی سعید میں ابن اسحاق کے یہاں بھی ہے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہم السلام، حضرت ہاجرہؓ وحضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ملنے کیلئے براق ہی پر سوار ہو کر مکہ معظمہ جایا کرتے تھے، کذافی العمدہ، اور فتح الباری میں بحوالہ مغازی ابن عائذ حضرت سعید بن المسیب سے نقل کیا کہ براق ہی وہ سواری تھی جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل کی ملاقات کو جایا کرتے تھے اور بحوالۂ کتاب مکۃ للفاکی والا زرقی لکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام براق پر سوار ہو کر حج کے لئے جایا کرتے تھے، اوائل الروض للسہیلی سے نقل کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب حضرت ہاجرہؓ واسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ معظمہ لیکر گئے تھے تو ان کو بھی براق ہی پر سوار کیا تھا۔ حافظؒ نے لکھا کہ یہ سب آثار اور دوسرے بھی ہیں۔ جن کو ہم نے طوالت کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں کیا، ایک دوسرے کو قوت پہنچاتے ہیں (عمدہ ۲۴۴/۱۷ فتح ۱۴۴ بہجۃ النفوس ۱۸۶/۳) علامہ محدث زرقانیؒ نے الروض ۹/۱ سے ایک واقعہ کا حوالہ نقل کیا جو علامہ طبری کی روایت سے ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اجداد میں سے معد بن عدنان کو بھی براق پر سوار کر کے ارضِ شام پہنچایا گیا اور یہ بطور حفاظت واکرام اس لئے کیا گیا تھا کہ ان کی صلب سے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا ظہور ہونے والا تھا (شرح المواہب ۳۸/۶) علامہ محدث قسطلانیؒ نے اس موقع پر لکھا کہ شبِ معراج میں حضور اکرم ﷺ کا براق پر سوار ہونا اس طرح ہوا کہ وہ آپ کیلئے زین ولگام سے مزین ہو کر آیا تھا، یہ بات دوسرے انبیاءِ علیہم السلام کے لئے منقول نہیں ہوئی ہے، اس کی شرح میں علامہ زرقانیؒ نے بھی لکھا:۔ اس تحقیق پر رکوب براق کو آپ کے خصائص میں سے شمار کرنا مطلقاً نہ ہوگا، بلکہ بحالت زین ولگام ہوگا، لہذا ہر دو قول میں کوئی تضاد نہ رہا۔

وجہ استصعاب! براق نے کیوں شوخی کی؟ جس سے حضور علیہ السلام کو ابتداً سواری میں دشواری پیش آئی، اس کی وجہ محدث ابن المنیر کے نزدیک ایک قول پر تو یہ ہے کہ وہ سوار کرانے کا عادی ہی نہ تھا، مگر دوسرے راجح قول پر جو بھی ذکر ہوا کہ دوسرے انبیاءِ علیہم السلام بھی اس پر سوار ہوتے رہے ہیں، یہ ہے کہ کافی زمانہ گزر جانے کی وجہ سے وہ سواری سے نامانوس ہوگیا تھا، یہ بھی احتمال ہے کہ نبی الانبیاء حضور علیہ السلام کے رکوب کا غیر معمولی عز وشرف حاصل ہونا اس کے لئے ناز وفخر کا موجب بن گیا ہو، جس کا قرینہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے عتاب پر

براق کا ندامت سے پسینے پسینے ہو جانا ہے، تقریباً ایسی ہی صورت رجفہ الجبل میں بھی پیش آئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ ایک دفعہ حضور اکرم علیہ السلام جبل احد پر چڑھے، آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر، عمر و عثمانؓ بھی تھے وہ پہاڑ حرکت میں آ گیا، تو حضور نے اس سے فرمایا:۔ احد ٹھیر جا، کیونکہ تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق، اور دو شہید ہیں (حضرت عمر و عثمانؓ) اس پر وہ فوراً ساکن ہو گیا۔ غرض جس طرح وہ غصہ و شرارت کی حرکت نہ تھی بلکہ غیر معمولی مسرت، خوشی اور فخر و ناز کا اظہار تھا، اسی طرح یہاں بھی ہوا ہوگا (شرح المواہب ۳۸/۶) محقق عینیؒ نے اس قول کو ابن التین کی طرف منسوب کیا ہے۔ (عمدہ ۲۵/ ۱۷)۔

حافظؒ نے لکھا: سُہیلی نے یقین کیا ہے کہ براق کا استعجاب زمانہ دراز گزر جانے ہی کی وجہ سے تھا، کیونکہ زمانہ فترت میں اس پر کوئی سوار نہیں ہوا تھا، یہ نہیں کی پہلے انبیاء علیہم السلام اس پر سوار نہیں ہوئے، اس موقع پر حافظ نے علامہ نوویؒ پر کچھ نقد کیا ہے۔ حافظؒ نے شرف المصطفیٰ کی روایت ابی سعید کے حوالہ سے یہ بھی لکھا کہ حضور علیہ السلام جس وقت براق پر سوار ہوئے تو اس کی رکاب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اور باگ حضرت میکائیل علیہ السلام نے تھامی تھی (فتح ۱۴۴/ ۷)

علامہ زرقانیؒ نے لکھا:۔ یہ بات اس کیلئے منافی نہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے ساتھ سوار ہوئے تھے کیونکہ پہلے رکاب پکڑی ہوگی، پھر آگے سوار ہوئے، اور حضور علیہ السلام آپ کے پیچھے تھے، البتہ وہ روایت معارض ہو سکتی ہے کہ جبرئیل دائیں جانب تھے اور میکائیل بائیں جانب، اگر چہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ابتداء کی حالت ہو اور پھر جبرئیل آپ کے ساتھ آگے سوار ہو گئے ہوں۔ واللّٰہ العلم (شرح المواہب ۳۶/ ۶)

محقق عینیؒ نے اپنے مشائخ ثقات سے براق کے بدکنے کی یہ وجہ بھی نقل کی ہے کہ براق حضور علیہ السلام سے روز قیامت میں آپ کے شرف رکوب کا وعدہ چاہتا تھا اور جب آپ نے اس کا وعدہ فرمالیا تو اس کو سکون و اطمینان حاصل ہو گیا اور یہ توجیہ آیت ولسوف یعطیك ربك فترضی کی اس تفسیر سے مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے لئے چالیس ہزار براق جنت میں تیار رکھے ہیں جو وہاں کی چراگاہوں میں چرتے پھرتے ہیں آگے محقق عینیؒ نے لکھا:۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں حدیثِ ابن مسعودؓ روایت کی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام کو براق پر اپنے پیچھے بٹھایا تھا اور روایت مسندِ حارث میں ہے کہ براق لایا گیا تو حضور علیہ السلام جبرئیل علیہ السلام کے پیچھے سوار ہوئے، اور وہ ان دونوں کو لے کر چلا، اس میں صراحت ہے کہ حضرت جبرئیل آپ کے ساتھ سوار ہوئے تھے واللہ اعلم۔ پھر فانطلق بی جبرئیل کے تحت لکھا:۔ سابق روایت میں فانطلقت مع جبرئیل علیه السلام تھا، لیکن ان دونوں میں کوئی مغایرت نہیں ہے، اور اوّل صلوٰۃ کی حدیث ابی ذرؓ میں ثم اخذ بیدی فعرج بی تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت جبرائیل جس مقصد سے (اس وقت شبِ معراج میں) آئے تھے اس کے بارے میں وہ حضور علیہ السلام کے لئے دلیل و رہنما تھے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا دلیل ہونا بھی حضور علیہ السلام کے ساتھ سوار ہو کر جانے کے منافی نہیں ہے۔ (عمدہ ۲۵☆۱۷)۔

براق پر سوار ہو کر رسول اکرم علیہ السلام بیت المقدس پہنچے، براق اُس قلابہ سے باندھ دیا گیا، جس سے پہلے انبیاء علیہم السلام باندھا کرتے تھے، حضور اکرم علیہ السلام نے مسجدِ اقصیٰ کے اندر قدم رکھا اور دو رکعت نماز پڑھی، یہ نماز جاتے وقت ہوئی، پھر آسمانوں کا سفر ہوا، واپسی میں آپ نے یہاں تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز پڑھی اور اُن کی امامت فرمائی ہے۔ اگر چہ حافظ ابن حجرؒ نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نمازِ جماعت قبل العروج کو ترجیح دی ہے۔ مگر حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ نے بعد العروج یعنی واپسی کے وقت کو صحیح و راجح قرار دیا ہے۔ (فتح الباری ۱۴۶/ ۷ تفسیر ابن کثیر ۲۳/ ۳ طبع مصطفےٰ محمد)

واپسی میں آسمانوں سے انبیاء علیہم السلام بھی آپ کے ساتھ ہی اُترے ہیں اور غالباً صبح کی نماز میں آپ نے امامت فرمائی ہے۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بھی امامت بعد العروج کو ہی ترجیح دیتے تھے (العرف ۵۳۶) مزید وضاحت و تحقیق آگے آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(۴) شراب و دودھ کے دو پیالے! مسجد اقصیٰ میں نماز سے فراغت کے بعد حضور علیہ السلام باہر تشریف لائے تو آپ کو نہایت شدید پیاس کا احساس ہوا، اس پر آپ کے سامنے دو پیالے پیش کئے گئے، ایک میں دودھ تھا۔ دوسرے میں شراب، آپ نے دودھ کا پیالہ اُٹھایا اور خوب سیر ہو کر

پیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا آپ نے فطرت کو پسند فرمایا، اگر شراب کا پیالہ اُٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ (شرح المواہب ۱۹/۶)

(۵) عروج سمٰوٰت: بیت المقدس سے آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ آسمانوں کا سفر فرمایا، یہ سفر براق کے ذریعہ نہیں بلکہ سیڑھی کے ذریعہ ہوا جو لفٹ کی طرح آسمان دنیا کی طرف لے گئی، علامہ آلوسیؒ نے لکھا: بعض نے کہا کہ عروج سماوی بھی براق پر ہوا، مگر صحیح یہ ہے کہ آپ کیلئے معراج نصب کی گئی، جس پر عروج فرمایا ہے، اُس معراج (سیڑھی) کی صفت وعظمت بھی منقول ہوئی ہے۔ (روح المعانی ۹/۱۵)

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا: حضور علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ میں دو رکعتیں تحیۃ المسجد کی پڑھیں پھر آپ کے سامنے معراج لائی گئی جو سُلّم کی طرح تھی، جس میں درجے ہوتے ہیں چڑھنے کیلئے، اس میں چڑھ کر آپ آسمانِ دنیا پر پہنچے، پھر باقی آسمانوں پر بھی اسی کے ذریعہ تشریف لے گئے، ہر آسمان کے مقربین نے آپ کا استقبال کیا، اور آسمانوں پر جو انبیاء علیہ السلام اپنے اپنے مراتب و درجات کے لحاظ سے موجود تھے اُن کو آپ نے سلام کیا اور ملاقاتیں کیں، حتی کہ چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے بھی ملے۔ پھر ان کے مراتب ومنازل عالیہ سے بھی آگے بڑھ کر مقامِ مستویٰ تک پہنچے، جہاں قلموں کی آواز سنائی دیتی تھی، یعنی اقلام قدر[۱] کی جن سے آئندہ پیش آنے والے امور کے تقدیری فیصلے لکھے جاتے ہیں اس کے بعد آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے، الخ (تفسیر ابن کثیر ۲۲/۳)

مراکب خمسہ ومراقی عشرہ

علامہ آلوسیؒ نے لکھا: علائیؒ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا کہ شب معراج میں رسول اکرم ﷺ کو پانچ سواریوں کا اعزاز بخشا گیا (۱) براق بیت المقدس تک (۲) معراج آسمانِ دنیا تک (۳) فرشتوں کے بازو ساتویں آسمان تک (۴) حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بازو سدرۃ المنتہیٰ تک (۵) رفرف، وہاں سے مقام قابَ قوسین تک،

رکوب میں حکمتِ خداوندی آپ کا اعزاز واکرام تھا۔ ورنہ حق تعالیٰ کی قدرت میں تھا کہ آپ کو بغیر کسی سواری وذریعہ کے ہی پلک جھپکنے میں جہاں تک چاہتے پہنچا دیتے، دوسرا قول یہ ہے کہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک براق کے ذریعہ تشریف لے گئے، اور آگے کا سارا سفر جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا صرف معراج سے پورا فرمایا، اور آپ نے اس سفرِ معراج میں دس بلندیاں طے کیں، سات آسمانوں تک، آٹھویں سدرہ تک، نویں مستویٰ تک، دسویں عرش تک۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (روح المعانی ۱۰/۱۵)

امامتِ ملائکہ! ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہر آسمان پر دو دو رکعتیں پڑھیں، جن میں آپ نے فرشتوں کی امامت فرمائی، اسراء وعروج سمٰوٰت سب کچھ ایک رات کے تھوڑے سے حصہ میں ہوا، اور واپسی بھی اسی طرح ہوئی لیکن اُس تھوڑے وقت کی کوئی تعیین نہیں کی گئی، یہ سب جس طرح بھی ہوا ہو، یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو کچھ اس تھوڑے سے وقت میں واقع ہوا وہ حق تعالیٰ کی آیت ونشانیوں میں سے عجیب ترین اور کائنات کے واقعات میں سے نہایت ہی حیرت وتعجب میں ڈالنے والا ہے، الخ (روح ۱۲/۱۵)۔

معراج سماوی سے پہلے اسراء کی حکمت!

معراج سے پہلے بیت المقدس اس لئے لیجایا گیا تاکہ مقاماتِ شریفہ معظّمہ تک رسائی بتدریج ہو، کیونکہ بیت المقدس کا شرف، حضرۃ الٰہیہ کے شرف سے کم درجہ کا ہے، جس کی طرف حضور علیہ السلام نے عروج فرمایا، بعض حضرات نے یہ توجیہ کی کہ حضور علیہ السلام کو مشاہدہ عجائب وغرائب کے لئے تدریجاً آمادہ کرنا تھا، اس لئے کہ گو اسراءِ بیت المقدس میں بھی غرابت تھی مگر اس سے کہیں زیادہ معراج سماوی میں تھی، بعض

---

[۱] سیرۃ النبی ۱۴۷/۳ میں قلمِ قدرت سے ترجمہ کیا گیا ہے، جو مناسب مقام نہیں معلوم ہوتا، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (نے لکھا کہ ملائکہ ان قلموں سے اقدار الٰہی کی کتابت کرتے ہیں مدارج النبوۃ) قاضی عیاضؒ نے لکھا کہ یہ کتابت حق تعالیٰ کے فیصلوں اور اس کی وحی کی ہے، جو لوحِ محفوظ سے نقل کی جاتی ہے، یا جو کچھ رب العزت جل ذکرہ، اپنی مخلوق میں کسی تدبیر کا ارادہ فرماتے ہیں، اس کو قلمبند کیا جاتا ہے مؤلف

نے کہا کہ ارض محشر (شام) کو حضور علیہ السلام کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کر دینا تھا، بعض کی رائے یہ ہے کہ آسمان کا دروازہ جس کو مصعد الملائکہ (فرشتوں کے اوپر چڑھنے کی جگہ) کہا جاتا ہے، چونکہ وہ صخرۂ بیت المقدس کے مقابل ہے، اس لئے وہاں ہو کر عروج ہوا (تاکہ معراج وسلم کے ذریعہ لفٹ کی طرح سیدھے اوپر چڑھ جائیں) وغیرہ توجیہات (روح المعانی ۱۲/۱۵) تفسیر خازنی میں صرف اسراء کے قرآن مجید میں مذکور ہونے کی حکمت وفائدہ ذکر کیا کہ اگر حضور علیہ السلام کے عروج وصعود سموات کا ذکر بھی کیا جاتا تو لوگوں کا انکار شدید ہو جاتا، جب اسراء بیت المقدس کی خبر دی گئی، اور ان کو آپ کی بتلائی ہوئی علامات ودلائل سے اطمینان ہو گیا، تو اس کے بعد حضور علیہ السلام نے ان کو معراج سماوی کی بھی خبر دیدی، اس طرح گویا اسراء کا واقعہ معراج کے لئے بطور توطئہ وتمہید ہو گیا۔ (روح ۱۳/۱۵)

علامہ قسطلانیؒ نے لکھا:۔ روایت ابن اسحٰق میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جب میں بیت المقدس سے فارغ ہوا تو معراج (سیڑھی) لائی گئی (جس پر ارواحِ بنی آدم چڑھ کر آسمانوں پر جاتی ہیں۔ زرقانیؒ) میں نے اس سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں لکھی، اور اسی کی طرف مرنے والا اپنے آخری وقت میں آنکھیں پھاڑ کر اوپر کو دیکھا کرتا ہے[۱]۔ (اگرچہ مرنے والا دنیا میں نابینا ہی ہو کمافی شرح الصدر واپس میت کے لئے موت کے وقت وہ معراج منکشف ہو جاتی ہے، وہ اُس کو دیکھنے لگتا ہے، اور جب روح قبض ہو جاتی ہے، تو اسی معراج کے ذریعہ جہاں تک[۲] اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی ہے، اوپر چڑھ جاتی ہے۔ زرقانیؒ) اور روایتِ کعب میں یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے لئے شبِ معراج ایک سیڑھی چاندی کی دوسری سونے کی لائی گئی، جو معراج تھی، اُن پر آپ اور جبرئیل علیہ السلام چڑھے۔ ایک روایت ابن سعد کی کتاب شرف المصطفیٰ میں یہ بھی ہے کہ شبِ معراج میں آپ کیلئے جنت الفردوس سے معراج لائی گئی تھی، (حدیث میں ہے کہ فردوس اعلیٰ جنت کا حصہ اور وسط میں ہے، جس کے اوپر عرش رحمان ہے اور اسی سے انہار جنت نکلتی ہیں، جب سوال کرو تو حق تعالیٰ سے فردوس ہی کا سوال کیا کرو، رواہ ابن ماجہ وصححہ الحاکم۔ زرقانی) وہ معراج (سیڑھی) پوری طرح موتیوں سے مرصع ہے، اور اس کے داہنے بائیں فرشتے ہوتے ہیں۔ (شرح المواہب ۵۵/۶ وعمدہ ۲۵/۱۷)

ملاقاتِ انبیاء علیہم السلام

آسمانوں پر پہنچ کر انبیاء علیہم السلام سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، جن میں سے خاص طور پر بعض کا ذکر مروی ہے مثلاً آسمان اوّل پر حضرت آدم علیہم

---

[۱] بیہقی سے یہ روایت آگے یہ تفصیل نقل ہوئی ہے، جس میں یہ بھی ہے کہ میت کا اس معراج کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا، اور اُدھر سے نگاہ نہ ہٹانا، اس لئے ہے کہ اس کی روح اُس معراج سے آسمانوں کی طرف چڑھتی ہے اور وہ اس منظر سے بہت خوش ہوتا ہے۔ (شرح المواہب ۵۵/۷)

[۲] دوسری حدیث سے ثابت ہے کہ روح مومن، تن سے جدا ہو کر بارگاہِ عرش الٰہی میں باریاب ہو کر سجدہ کرتی ہے، اور وہاں سے بحکمِ الٰہی حضرت میکائیل علیہ السلام اس کو ارواحِ مومنین کے مستقر میں پہنچا دیتے ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے تفسیر آیت یایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك (سورۂ والفجر) میں نفس مطمئنہ، لوامہ وامارہ کی تشریح فرما کر لکھا:۔ اگرچہ اس بشارت کا اصل وقت تو روز قیامت فزع اکبر کے موقع پر ہی ہوگا، تاہم اس کا نمونہ مومن کے لئے وقتِ وفات بھی ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے سُنا:۔ جب ایماندار آدمی کا وقت موت آپہنچتا ہے تو اس کے سرہانے خوش منظر، عمدہ ومعطر لباس وبدن والے فرشتے آکر کہتے ہیں، اے حق کی یاد وعبادت سے سکون حاصل کرنے والی روح! راحت وآرام کے ساتھ جسم سے باہر آجا کہ تجھ سے خدائے تعالیٰ خوش ہے، یہ ندا سن کر روح مومن نہایت خوشی سے باہر آجاتی ہے، اس وقت ایک عالم اس کی خوشبو سے معطر ہو جاتا ہے اور فرشتے اس کو ریشمی معطر کپڑوں میں ملبوس کر کے عالمِ بالا کی طرف لے جاتے ہیں، آسمانوں کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں، ان کے دربان فرشتے مرحبا کہہ کر استقبال کرتے ہیں، اس کے لئے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں اور عرش بریں تک لیجاتے ہیں تاکہ حق تعالیٰ سبحانہ کے حضور سجدہ کرے حق تعالیٰ حضرت میکائیل علیہ السلام کو حکم فرماتے ہیں کہ اِس روح کو نیک مومن بندوں کے مستقر میں لیجا کر داخل کر دو، اور اس کی قبر کو فراخ وسیع کر دو تاکہ اسکو راحت وآرام پہنچتا رہے، فرشتے اس مردِ مومن سے قبر میں کہتے ہیں کہ آرام واطمینان سے سو جا، جس طرح نئی دلہن سوتی ہے کہ اس کی نیند کوئی خراب نہیں کرتا، اور اس کے برعکس ارواحِ کفار کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے۔ اللھم اجعل ارواحنا آمنة مطمئنة، وارزقنا رحمة واسعة۔

السلام سے، دوم پر حضرت یحییٰ وعیسیٰ علیہم السلام سے، سوم پر حضرت یوسف علیہ السلام سے، چہارم پر حضرت ادریس علیہ السلام سے، پنجم پر حضرت ہارون علیہ السلام سے، ششم پر حضرت موسیٰ علیہم السلام سے، ہفتم پر حضرت ابراہیم علیہم السلام سے، بظاہر ان حضرات کا تذکرہ کسی خاص مناسبت و مشابہت کے تحت ہوا ہے، اور اس بارے میں جن مناسبات، خصوصیات و دیگر احوالِ ملاقات کی تفصیلات، محقق عینی، حافظ ابن حجرؒ، علامہ سہیلی اور محدث ابن المنیر وغیرہ نے ذکر کی ہیں۔ وہ یہاں درج کی جاتی ہیں:۔

حضرت آدم علیہ السلام

جس طرح آپ جنت سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور دنیا میں تشریف لا کر پھر جنت کو واپسی مقدر ہوئی، اسی طرح حضور علیہ السلام مکہ معظّمہ سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور مدینہ طیبہ تشریف لے جا کر پھر مکہ معظمہ کو واپسی ہوئی دونوں کو یکساں جسمانی وروحانی اذیت اُٹھانی پڑی (فتح ۱۴۸/۷ وعمدہ ۲۷/۱۷) حضرت آدم علیہ السلام چونکہ اوّل انبیاء ہیں اس لئے آسمان اول پر ان کا مستقر ہونا بھی مناسب ہے، مروی ہے کہ حضرت آدم وعلیہ السلام نے حضور علیہ السلام کے سلام تحیہ پر جوابِ سلام ومرحبا کہا، اسکے بعد آپ کیلئے دعائے خیر بھی کی۔

حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے داہنی وبائیں جانب بہت سی دھندلی صورتیں جمع تھیں، اور جب وہ دائیں طرف دیکھتے تو ان پر ضحک ومسرت کے آثار ظاہر ہوتے، بائیں طرف نظر کرتے تو گریہ وغم کے آثار ظاہر ہوتے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بتلایا کہ داہنی طرف جنتی ارواح ہیں اور بائیں جانب دوزخی (بخاری شریف) اور حدیث بزار میں یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے داہنی طرف ایک دروازہ ہے جس میں سے خوشبو آتی ہے، اسکی طرف دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور بائیں طرف کے دروازے سے بدبو نکلتی ہے اس طرف دیکھتے ہیں تو مغموم ہوتے ہیں۔ بیہقی میں روایت اس طرح ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ میں حضرت آدم علیہ السلام کے پاس پہنچا، ان کی اولاد کی ارواح سامنے پیش کی جاتی ہیں، مومن کی روح ہوتی ہے تو فرماتے ہیں، روح طیبہ ونفس طیبہ ہے، اس کو علیین میں رکھو، اور جب فاجر اولاد کی روح سامنے لائی جاتی ہے تو فرماتے ہیں کہ روح خبیثہ ونفس خبیثہ ہے، اسکو سجین میں لے جاؤ، حافظؒ نے بزار وبیہقی کی مذکورہ بالا روایات نقل کر کے لکھا:۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد وہ ارواح ہیں جو اجسام سے نکل کر جدا ہوتی ہیں اور نکلنے کے بعد فوراً پیش ہوتی ہیں، قبل اس کے کہ اپنے اپنے مستقر میں داخل ہوں، (فتح ۱۴۷/۷) یہاں حافظ نے اس احتمال کی پسندیدگی ظاہر کی ہے، اور ان دونوں روایات پر کچھ کلام نہیں کیا، حالانکہ ۳۱۵/۱ میں ان کو نقل کر کے تضعیف سند کر چکے ہیں۔

اشکال وجواب: حافظ نے اس اشکال کا جواب دینا چاہا ہے کہ ارواح کفار تو (زمین پر) سجین میں رہتی ہیں، اور ارواح مومنین (آسمانوں پر) نعیم جنت سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں جانب ارواح کفار کے آسمان اوّل پر موجود ہونے کا کیا مطلب ہے؟ قاضی عیاض نے جواب دیا کہ ارواح بنی آدم وقتاً فوقتاً حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہیں۔ قال تعالیٰ النار یعرضون علیھا غدوا عشیا لہٰذا ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام کی ملاقات کا وقت بھی اتفاقاً ان ہی اوقات میں سے پیش آیا ہو، اس پر اعتراض ہوا کہ ارواح کفار تو آسمانوں پر جا بھی نہیں سکتیں۔ قال تعالیٰ لاتفتح لھم ابواب السماء اس کے جواب میں دو احتمال پیش کئے گئے اوّل یہ کہ جنت حضرت آدم علیہ السلام سے دائیں جانب[1] میں اور دوزخ جہت شمال میں ہوگی، اور دونوں آپ کیلئے

---

[1] ہمارے حضرت الاستاد علامہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ العزیز فرمایا کرتے تھے کہ آخرت میں اور بہت سی چیزوں کی طرح جہات بھی بدل جائیں گی یعنی جہتِ فوق جہتِ یمین ہو جائے گی اور جہتِ تحت جہتِ شمال ہو جائے گی۔

اوپر کے قول سے معلوم ہوا کہ اس وقت بھی ہم دنیا والے ملاءِ اعلیٰ کے لحاظ سے اہل شمال ہیں اور اسی لئے ہمیں حکم ہے کہ ایمان واعمال صالح کے ذریعہ اس عالم سے نکل کر اصحاب الیمین سے جا ملیں، جن کا مستقر فوق السموٰت ہے۔

منکشف کی گئی ہوں گی، دوسرا یہ کہ جو ارواح دکھلائی گئیں وہ ہیں جو اُس وقت تک اجسام سے متعلق نہیں ہوئی تھیں، کیوں کہ ارواح کی تخلیق اجسام سے بہت پہلے ہو چکی ہے، اور ان کا مستقر حضرت آدم علیہ السلام کا یمین وشمال ہے، چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو ان کا مستقبل معلوم کرادیا گیا تھا، اس لئے وہ ان کو دیکھ کر اچھے و برے پیش آنے والے نتائج کا تصور فرما کر مسرور یا مغموم ہوتے تھے۔ (عمدہ ۲۰۰/۲ و فتح ۳۱۴/۱)

حضرت یحیٰ وعیسیٰ علیہما السلام

جس طرح حضرت عیسٰی ویحیٰ علیہم السلام کو یہود کی طرف سے ایذائیں پہنچیں، اسی طرح حضور اکرم علیہ السلام کو بھی ہجرت کے بعد یہودیوں سے ایذائیں پہنچیں۔ پھر جس طرح یہودیوں کے ہاتھوں حضرت یحیٰ علیہ السلام کو جام شہادت نوش کرنا پڑا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا کر اُن کے چراغ حیات کا گل کرنے کی سعی کی گئی اسی طرح وہ حضورِ انور ﷺ کی جان لینے کے لئے برابر کوشاں رہے، اور آپ کو برابر تکلیفیں پہنچاتے رہے، دوسرے آسمان پر ان دونوں حضرات سے ملاقات کی مناسب وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ زمانے کے لحاظ سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں آپ سے زیادہ قریب ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام

آپ سے حضور علیہ السلام کی ملاقاتِ شب معراج کی مناسبت یہ ہے کہ آپ کو بھائیوں نے تکالیف پہنچائی تھیں۔ حتیٰ کہ ہلاک کرنے کے لئے کنویں میں ڈالا تھا، اسی طرح حضور اکرم ﷺ کو ابولہب اس کی بیوی وغیرہا اور قوم قریش نے اذیتیں دیں، اور برادرانِ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح ہلاک کرنے کے بھی منصوبے بنائے، لیکن دونوں صورتوں میں مخالفین کو ناکامی ہوئی، پھر جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں پر فوقیت وغلبہ عطا کیا گیا تھا، حضور اکرم ﷺ کو بھی کفار قریش واہل مکہ پر غلبہ نصیب کیا گیا غالبًا اسی مناسبت کے پیش نظر فتح مکہ کے موقع پر حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میں بھی آج تمہارے متعلق وہی کہتا ہوں، جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے لئے کہا تھا، یعنی لاتثریب علیکم الیوم (آج تمہارے ساتھ کسی الزام ومواخذہ کا معاملہ نہیں ہوگا) دوسری مناسبت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تمام امت محمدیہ کا جنت میں داخلہ حضرت یوسف علیہ السلام ہی کی شکل وصورت میں ہوگا۔

حضرت ادریس علیہ السلام

آپ سے حضور اکرم ﷺ کی ملاقات چوتھے آسمان پر ہوئی اگرچہ روایتِ نسائی ۷۸/۱ (کتاب الصلوٰۃ) میں ان کی ملاقات پانچویں آسمان پر اور حضرت ہارون علیہ السلام کی چوتھے پر مروی ہے، مگر حافظ ابن حجرؒ اور محقق عینیؒ نے سب روایتوں پر اسی روایت کو ترجیح دی ہے، جو ہم نے ترتیب میں اختیار کی ہے (فتح ۱۴۷/۷ وعمدہ ۲۶/۱۷)

جس طرح حضرت ادریس علیہ السلام کو رفعتِ مکانی سے نوازا تھا۔ قرآن مجید میں ہے ورفعناہ مکانا علیا، حضور اکرم ﷺ کو بھی اس سے سرفراز کیا گیا۔ محقق عینیؒ نے لکھا کہ بعض علماء نے مکان علی کا مصداق جنت کو قرار دیا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام دخول جنت[1] سے مشرف ہوئے اور حضور علیہ السلام کو بھی شب معراج میں دخول جنت کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں نے اپنے بعض مشائخ ثقات سے

---

[1] آپ کے چوتھے آسمان پر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ذکر ہوئی ہے آپ کی وفات وہیں اور زمین پر آپ کی تربت نہیں ہے کعب احبار سے منقول ہوا کہ سورج کا فرشتہ حضرت ادریس علیہ السلام کا دوست تھا، آپ نے اس سے جنت دیکھنے کی خواہش کی، اس نے حق تعالیٰ سے اجازت حاصل کی، اور اوپر لے گیا، چوتھے آسمان تک پہنچے تھے کہ ملک الموت ملے، انہوں نے تعجب کیا اور کہا کہ مجھے حق تعالیٰ کا حکم ہوا تھا کہ حضرت ادریس علیہ السلام کی چوتھے آسمان پر قبض روح کروں (تعجب اس لئے کہ ایک زمین کے ساکن کی آسمان اور وہ بھی چوتھے آسمان پر قبض روح کی وجہ نہ سمجھ سکے تھے) چنانچہ وہیں پر ان کی روح قبض کی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سُنا کی حضرت ادریس علیہ السلام کو ہمارے رسول اکرم ﷺ کے سفر معراج کی خبر ملی تو انہوں نے حق تعالیٰ سے آپ کے استقبال کی اجازت طلب کی، اجازت ملی تو انہوں نے آپ کا استقبال کیا اور چوتھے آسمان پر پہنچ کر آپ سے ملے (عمدہ ۲۶ع/۱۷) ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ جس طرح حضرت ادریس علیہ السلام نے بادشاہانِ دنیا کو خطوط لکھ کر توحید کی دعوت دی تھی۔ حضور علیہ السلام نے بھی دی ہے۔

حضرت ہارون علیہ السلام

پانچویں آسمان پر آپ سے ملاقات ہوئی، باہمی مشابہت یا مناسبت یہ تھی کہ جس طرح ان کی قوم نے پہلے ایک عرصہ تک ان کو ایذائیں دیں، اور پھر ان کی محبت پر مائل ہوئی، اسی طرح قریش بھی ایک مدت تک حضور علیہ السلام کو ایذائیں پہنچاتے رہے اور بعد کو ایمان ویقین کی دولت سے سرفراز ہوئے پہلے آپ ان کی نظروں میں سب سے زیادہ مبغوض رہے، پھر اس درجہ محبوب ہوگئے کہ آپ سے زیادہ اُن کی نظروں میں کوئی محبوب نہ تھا۔ آپکے پانچویں آسمان پر ہونے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چھٹے پر ہونے اور ساتھ نہ ہونے وغیرہ کی حکمت بھی شرح المواہب ۱/۶ میں ذکر ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

آپ سے حضور اکرم ﷺ کی ملاقات چھٹے آسمان پر ہوئی، جس طرح آپ کو اپنی قوم نے ایذائیں دیں۔ اسی طرح سرورِ دوعالم ﷺ کو بھی اپنی قوم نے اذیتیں پہنچائیں، خود حضور نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صبر واستقامت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کو قوم نے اس سے بھی زیادہ ایذائیں دیں (جو مجھے دی گئیں) لیکن انہوں نے صبر کیا۔

شرح المواہب ۲ع/۶ میں آپ کے چھٹے آسمان پر ہونے کے وجوہ واسباب میں آپ کے خصوصی مناقب وفضائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ مناسبت بھی ذکر ہوئی ہے کہ نبی الانبیاء حضور اکرم ﷺ کے بعد تمام انبیاء ورسل میں سے سب سے زیادہ اتباع آپ ہی کے ہوئے ہیں، لہذا آپ سے حضور علیہ السلام کو زیادہ قرب ومشابہت حاصل ہوئی۔ (تتبعین)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بظاہر تو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی امت سب سے بڑی ہے، بلکہ موجودہ اعداد وشمار سے دنیا میں سب سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) علامہ سہیلی نے کہا کہ اُن کو خصوصیت کے ساتھ آسمانوں تک زندہ اُٹھانے ہی کی وجہ سے حق تعالیٰ نے ورفعناہ مکانا علیا فرمایا ہے، لہذا ان سے بھی اوپر حضرت موسیٰ وابراہیم علیہم السلام سے ملاقات ہونا اس کے منافی نہ ہوا۔ (معلوم ہوا کہ علامہ سہیلی وغیرہ نے حضرت ادریسؑ کے آسمان پر زندہ اُٹھائے جانے کی روایت کو صحیح تسلیم کیا ہے، مگر حافظ ابن حجرؒ نے اس کو اسرائیلیات سے شمار کیا ہے اور کہا کہ اس کا ثبوت طریق مرفوع قوی سے نہیں ہوا) محدث ابن المنیر نے کہا کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں اختلاف ہے آیا اُن کو آسمان کی طرف دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح اٹھایا گیا ہے یا زندگی ہی میں اُٹھالیا گیا تھا، اور وہ اب تک حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرح زندہ ہیں۔ قصص کی روایات میں یہ بھی منقول ہوا ہے کہ کثرت عبادت دیکھ کر حضرتِ ادریس علیہ السلام سے فرشتوں کو بہت محبت ہوگئی تھی، اسی تعلق ومحبت کی بناء پر آپ نے ملک الموت سے ذائقہ موت چکھانے کی خواہش کی تا کہ موت کے وقت موعود پر آسانی ہو، انہوں نے آپ کی خواہش پوری کردی پھر آپ زندہ ہوگئے، اور سوال کیا کہ جہنم کی بھی سیر کرادیں تا کہ خوف وخشیت خداوندی میں اور زیادتی ہو، وہ بھی کرادی گئی تو خواہش کی کہ جنت بھی دکھادیں تا کہ اس کی رغبت وشوق میں ترقی ہو، وہاں بھی باذن الٰہی پہنچ گئے، اور اچھی طرح سیر وسیاحت کے بعد جب آپ سے کہا گیا کہ باہر چلئے تو عرض کیا:۔ اے رب! میں نے موت کا ذائقہ بھی چکھ لیا جہنم میں بھی ہو آیا، اب جنت میں بھی آپ کی اجازت وحکم سے داخل ہوگیا ہوں، آپ کا وعدہ ہے کہ جو اس طرح (تمام مراحل طے کر کے) جنت میں داخل ہوگا، وہ اس سے کبھی نہ نکالا جائے گا۔ اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے خازنِ جنت کو حکم ہوا کہ اس کو رہنے دو کیونکہ سب کچھ میری اجازت ہی سے ہوا ہے، اس طرح آپ جنت میں رہ گئے اور چوتھے آسمان سے آپ کا تعلق قائم کردیا گیا، (جس طرح ہر ایک کا تعلق اپنی تربت سے بھی ہوتا ہے اور اس کی روح کا بھی ایک مستقر ہوتا ہے) انتہی فتأمله (شرح المواہب ۱/۶)

بڑی قوم عیسائیوں کی ہے، اور موسوی قوم بہت کم ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اتباع کا دوران کے بعد آنے والے نبی کے ساتھ ختم ہوگیا، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور خاتم الانبیاء علیہ السلام کی آمد سے ختم ہوگیا، لہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جتنے موسوی لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق نبوت نہیں کی وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت واتباع سے خارج ہوگئے اور آئندہ بھی قیامت ساعت تک خارج ہی رہیں گے اسی طرح حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد سے قیام ساعت تک جتنی بھی عیسائیوں نے آپ کی نبوت کو تسلیم نہیں کیا، وہ سب بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی امت واتباع میں شمار نہیں ہوں گے یہ دوسری بات ہے کہ انکو دنیاوی اصطلاح کے لحاظ سے عیسائی کہا جائے۔ غرض شرعی اصطلاح میں باایمان امتِ حقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبعین وہی تھے، جو حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے قبل ان پر ایمان لائے تھے، اور وہ امت محمدیہ کے علاوہ کسی نبی کی سب سے بڑی امت تھی، اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باایمان امتِ حقہ میں صرف وہی داخل ہوئے ہیں جو خاتم النبیین علیہ السلام کی بعثت سے قبل ان پر ایمان لائے تھے، آپ کی بعثت کے بعد جتنے موسوی وعیسوی لوگوں نے آپ کی نبوت کو تسلیم کرلیا وہ امت محمدیہ میں داخل ہوگئے اور جنھوں نے انکار کیا وہ سب زمرۂ کفار میں داخل ہوگئے، اور وہ درحقیقت نہ موسوی رہے نہ عیسوی، یہ لقب صحیح صرف ان لوگوں کا تھا جو دوسرے بعد والے صاحبِ شریعت نبی کی بعثت سے قبل تک اپنے نبی کے متبع رہے ہیں، زمانہ سابق میں اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے جو بعض احکام میں ان کا غیر اہل کتاب کے مقابلہ میں فرق کیا گیا ہے وہ جدا امر ہے مگر اس کی وجہ سے ان کو باایمان امت حقہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔ (ساتویں آسمان پر) آپ سے حضور علیہ السلام کی ملاقات اس حالت میں ہوئی کہ آپ بیتِ معمور سے اپنی پشتِ مبارک لگائے بیٹھے تھے، یہ اس طرف اشارہ تھا کہ حضور علیہ السلام اپنی عمر کے آخری حصوں میں مناسکِ حج اور تعظیم بیت اللہ الحرام کے خصوصی احکام وہدایات جاری فرمانے والے ہیں (کیونکہ بیتِ معمور ٹھیک بیت اللہ کی سیدھ میں واقع ہے اور آسمانوں میں بسنے والی مخلوقات فرشتوں وغیرھم کے لئے بیت اللہ ہی کی طرح معظم ومحترم ہے (جس میں روزانہ ستر ہزار ایسے فرشتے داخل ہوتے اور نماز پڑھتے ہیں، جن کو دوبارہ اس میں داخل ہونے کا موقع پھر کبھی میسر نہیں ہوتا) یہ سب لطیف مناسبتیں جو ہر آسمان پر ملاقات کرنے والے عظیم المرتبت پیغمبروں کے متعلق بیان ہوئیں، علامہ سہیلیؒ نے لکھی ہیں، ہم نے ان کا خلاصہ منقح کرکے ذکر کردیا ہے۔ محدث ابن المنیرؒ نے اس بارے میں اس سے بہت زیادہ تفصیل لکھی ہے، اس کو ہم نے اس لئے ذکر نہیں کیا کہ اس کا تعلق زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کی باہمی مفاضلت سے ہے، لہذا اس مقام میں میرے نزدیک بہ نسبت تطویل کے صرف اشارہ اولیٰ ہے، ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کے لئے ایک لطیف زائد مناسبت یہ بھی ذکر ہوئی ہے کہ (ہجرت کے بعد) حضور اکرم علیہ السلام کا مکہ معظمہ میں داخلہ ساتویں سال ہوا ہے، جس میں آپ نے بیت اللہ کا طواف فرمایا، اس سے قبل آپ ہجرت کے بعد وہاں تک نہ پہنچ سکے تھے، بلکہ چھٹے سال قصد کرکے مکہ معظمہ کے قریب تک پہنچ بھی گئے تھے تو کفارِ مکہ نے آپ کو (دخول وطواف سے) روک دیا تھا۔ جس کی تفصیل کتاب الشروط میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت محدث ابن ابی جمرہؒ نے حکمتوں ومناسبتوں کا ذکر مثل مندرجہ بالا کرکے آخر میں لکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ (انبیاء علیہما السلام میں سے) حضور اکرم علیہ السلام کے ابِ اخیر تھے، اس لئے مناسب ہوا کہ آخر میں آپ سے ملاقات کرکے اپنے قلب مبارک کے لئے مزید انس وسکون وقوتِ روحانی کی فراوانی حاصل کریں، تاکہ اس کے بعد دوسرے عالم (ملاء اعلیٰ ورفیق اعلیٰ) کی طرف توجہ کریں۔ نیز معلوم ہوا کہ خلیل کا مرتبہ اگرچہ ارفع المنازل یعنی ساری منازل قرب الٰہیہ میں بلند تر ہے، مگر حبیب کا مرتبہ خلیل سے بھی زیادہ بلند وارفع ہے اور اسی لئے

حبیب اللہ نبی اکرم ﷺ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے مرتبہ سے بھی اوپر قاب قوسین او ادنی تک مرتفع ہو گئے (فتح الباری ۱۴۸/ ۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی منزل سماوی

اگر چہ یہاں بخاری شریف کی حدیث الباب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چھٹے آسمان پر ہونا مذکور ہے، مگر حافظؒ نے روایت جماعت کو ترجیح دی ہے، جس سے ساتویں آسمان پر ملاقات ثابت ہوتی ہے، حافظؒ نے لکھا کہ صرف ابوذر اور شریک کی روایت سے چھٹے آسمان پر موجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے باقی ان دونوں کے سوا اور سب روایات سے ساتویں کا ہی ثبوت ملتا ہے، اسی کے ساتھ حافظ نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ روایات میں چونکہ وقت ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیتِ معمور سے پشت لگا کر بیٹھے ہونے کا بھی ذکر ہے تو یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ وہ ساتواں آسمان ہوگا۔ کیونکہ بیت معمور بلا خلاف ساتویں آسمان پر ہے، اور حضرت علیؓ سے جو چھٹے آسمان پر شجرۂ طوبیٰ کے پاس ہونا منقول ہے، وہ اگر ان سے صحیح ثابت ہو تو وہ دوسرا بیت ہے (بیعت معمور نہیں) کیونکہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ہر آسمان میں ایک بیت ہے، جو کعبہ معظمہ کے مقابل ومحاذی ہے، اور ان میں سے ہر ایک فرشتوں سے معمور وآباد ہے، اور یہی بات ربیع بن انس وغیرہ اس قول کے بارے میں کہی جائے گی کہ بیت معمور آسمان دنیا پر ہے، اس کو بھی اوّل بیت پر محمول کریں گے جو بیوتِ سماوات میں سے مقابل ومحاذی کعبہ مکرمہ کے ہے، یہ بھی کہا گیا ہے بیت معمور کا نام ضُراح ہے، بعض نے کہا کہ یہ آسمان دنیا کا نام ہے۔

ایک وجہ ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہونے اور چھٹے پر نہ ہونے کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بقول حضرت انسؓ حضرت ابوذرؓ نے اُن انبیاء علیہم السلام کی منازل کے بارے میں تعیین نہیں کی کس کی منزل واصل مقام کہاں تھا اور انہوں نے صرف وجود کا ذکر کیا تھا، لہذا جن حضرات نے وثوق وتثبت کے ساتھ ہر ایک کی منازل ذکر کی ہیں ان کی بات راجح ہونی چاہئے۔ (فتح ۳۱۵/ ۱) اس کے بعد حافظ نے کتاب التوحید میں روایت ابراہیم فی السادسۃ وموسیٰ فی السابعۃ بفضل کلامہ للہ پر لکھا:۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ساتویں آسمان پر تھے لیکن مشہور روایات سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کا ساتویں آسمان پر ہونا ثابت ہے، جس کی تقویت حدیث مالک ابن صعصعہ کی اس زیادتی سے بھی ہوتی ہے کہ وقت ملاقات وہ بیت معمور سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، تو واقعہ معراج کا تعدد مانا جائے تو کوئی اشکال ہی نہیں، اور ایک مانا جائے تو اس طرح روایات کو جمع کریں گے کہ حالتِ عروج میں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام چھٹے آسمان پر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ساتویں پر، پھر اُترنے کے وقت (یعنی واپسی میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ساتویں پر پہنچ گئے تھے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو فرضیتِ نماز کے بارے میں کچھ بات کی نہیں، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی، اور ساتواں آسمان ہی حضور علیہ السلام کی سب سے پہلی منزل تھی، جس کی طرف اُترتے وقت آپ تشریف لائے ہیں، لہذا مناسب یہی ہے کہ وہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام موجود ہوں جنھوں نے نماز کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی احتمال ہے کہ حضور علیہ السلام کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جاتے وقت چھٹے آسمان پر ہوئی ہو اور وہ آپ کے ساتھ ہی ساتویں آسمان تک چڑھے ہوں تاکہ ان کی فضیلت دوسرے انبیاء پر کلیم اللہ ہونے کی وجہ سے ظاہر کی جائے، اسی کے ساتھ یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ وہاں پہنچ کر نماز کے بارے میں گفتگو ومشورہ (بار بار اور بہ سہولت) ہوتا رہا، (یعنی چھٹے آسمان تک آنے اور جانے میں مسافت ووقت کی طوالت ہوتی وغیرہ) علامہ نووی نے بھی کچھ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ واللہ اعلم عنداللہ تعالیٰ (فتح ۴۱۷/ ۱۳)۔

بیتِ معمور کے متعلق مزید تفصیل

حافظؒ نے باب بدء الخلق میں لکھا:۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے بیتِ معمور کو دیکھا اس میں ہر دن ستر ہزار

فرشتے داخل ہوتے ہیں، جن کو پھر اس طرف لوٹنے کا موقع نہیں ملتا، قتادہؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا بیتِ معمور مسجد ہے آسمان میں مقابل کعبہ معظمہ کے کہ اگر وہ گرے تو ٹھیک اسی پر گرے، اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، جو اس سے نکل کر پھر کبھی اس میں داخل نہیں ہوتے۔

حضرت علیؓ سے سقف مرفوع کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ وہ آسمان ہے اور بیت معمور کے متعلق جواب دیا کہ آسمان میں ایک گھر ہے مقابل بیت اللہ شریف کے جس کی حرمت آسمانوں میں ایسی ہی ہے جیسی اِس کی زمین میں، ہر روز ستر ہزار فرشتے نئے اس میں داخل ہوتے ہیں، اکثر روایات سے اس کا ساتویں آسمان پر ہونا ثابت ہے۔ اور حضرت انسؓ سے مرفوعاً یہ روایت بھی ہے کہ وہ چوتھے آسمان میں ہے، جس پر ہمارے شیخ نے قاموس میں یقین کیا ہے بعض نے کہا کہ وہ چھٹے آسمان پر ہے، بعض نے کہا کہ عرش کے نیچے ہے۔ یہ بھی ایک قول ہے کہ اس کو حضرت آدم علیہ السلام نے زمین پر اُتر کر بنایا تھا، پھر طوفان کے وقت اوپر اُٹھالیا گیا، یہ اُن کے قول سے قریب ہے جو بیت معمور ہی کو کعبہ بتلاتے ہیں، بیت معمور کا نام ضُراح اور ضریح بھی ہے (فتح الباری ۱۹۳/۶)

محقق عینی کی رائے اور حافظ پر نقد

آپ نے لکھا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حضرت ابوذرؓ کے اس قول کا مطلب کہ ان کو حضور علیہ السلام نے چھٹے آسمان پر پایا یہ ہوگا کہ اولاً ان کو چھٹے آسمان پر دیکھا پھر آپ کے ساتھ ہی ساتویں آسمان پر چڑھ گئے ہوں گے[1] نیز ممکن ہے واللہ اعلم کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضور علیہ السلام کی ترحیب وحوصلہ فزائی کے لئے چھٹے آسمان تک تشریف لائے ہوں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (اپنی منزل ووطن چھٹے آسمان سے ساتویں کی طرف لے جانے کی حکمت اوپر حافظ کی تحقیق میں بیان ہو چکی ہے) اس طرح یہ دونوں اولوالعزم پیغمبر آپ کو ساتھ لے کر ساتویں آسمان پر پہنچے ہوں گے، وکفی بہ فخرا وفضلا ورفعۃ اس موقع پر حافظ عینی نے حافظ ابن حجرؒ پر نقد کیا ہے کہ ان کا بیت معمور کو بلا خلاف ساتویں آسمان پر بتلانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس بارے میں خلاف موجود ہے چنانچہ حضرت ابن عباس، مجاہد وربیع کا قول یہ ہے کہ وہ آسمان دنیا پر ہے، حضرت علیؓ نے شجرۂ طوبیٰ کے پاس چھٹے آسمان پر بتلایا، حضرت مجاہد وضحاک نے ساتویں میں قرار دیا اور یہی قول امام بخاریؒ کا بھی ہے۔ لیکن ان سب اقوال میں منافات نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے حق تعالیٰ نے شبِ معراج میں اس کو آسمان دنیا سے چھٹے آسمان کی طرف اٹھوا کر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس پہنچوا دیا ہو، پھر وہاں سے مزید تعظیم واکرام نبوی کی خاطر ساتویں تک بھی پہنچایا گیا ہوتا کہ آپ اس کا متعدد مقامات پر مشاہدہ کریں اور اس کے بعد پھر آسمان دنیا کی طرف واپس کرادیا ہو، تفسیر نسفی میں ہے کہ بیت معمور عرش کے مقابل اور کعبۃ اللہ کی سیدھ میں ہے، جس کی ضراح کہتے ہیں، آسمان میں اس کی حرمت، زمین میں کعبہ کی طرح ہے اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جو اس کا طواف کرتے ہیں اور اس میں نماز پڑھتے ہیں، پھر کبھی اسکی طرف نہیں لوٹتے، اس کا خادم زرین نام کا فرشتہ ہے، اور کہا گیا ہے کہ وہ جنت میں تھا، وہاں سے حضرت آدم علیہ السلام کی وجہ سے زمین پر لایا گیا، پھر طوفان کے وقت آسمان کی طرف اُٹھایا گیا (عمدہ ۱۰۲/۲ طبع استنبول و ۲۸/۱۷ منیریہ)

داخلہ بیت معمور: حافظؒ نے لکھا: بزار کی حدیث ابی ہریرہؓ میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے وہاں کچھ قوموں کو دیکھا، جن کے چہرے نورانی سفید تھے اور کچھ قوموں کو جن کے رنگ نکھرے ہوئے نہ تھے وہ ایک نہر میں داخل ہوئے اور غسل کر کے نکلے تو ان کے رنگ بھی نکھر گئے تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے کہا کہ یہ آپ کی امت کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے نیک اعمال کے ساتھ بروں کا بھی ارتکاب کیا ہے، اموی وبیہقی میں ابوسعید کی روایت یہ بھی ہے کہ وہ سب بھی حضور علیہ السلام کے ساتھ بیت معمور میں داخل ہوئے، اور سب نے اس

---

[1] علامہ نووی نے بھی اس توجیہ کو اختیار کیا ہے (نووی ۹۳/ اکتاب الصلوٰۃ)۔ مؤلف

میں نماز پڑھی، حافظ نے لکھا کہ سابقہ روایات سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ مخلوقات میں سے سب سے زیادہ تعداد فرشتوں کی ہے، کیونکہ تمام جہانوں میں سے کوئی بھی ایک جنس ایسی نہیں ہے، جس کے ہر روز ستر ہزار نئے افراد ایک عمل کو کرتے ہوں، بجز فرشتوں کے، (فتح ۱۵۲/ ۷)

ارشاد ابراہیمی: ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شب معراج میں حضور علیہ السلام سے فرمایا کہ اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہنا اور ان کو اطلاع دینا کہ جنت کی مٹی بہت پاکیزہ اور پانی خوب شیریں ہے، بہشت ایک وسیع چٹیل میدان ہے اور سبحان اللہ و الحمدللہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر کا پڑھنا اس میں درخت لگانا ہے۔

فتح الباری ۱۵۴/ ۷ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضور علیہ السلام سے فرمایا اے میرے بیٹے! آج کی رات میں تم اپنے رب سے ملنے والے ہو، اور تمہاری امت سب امتوں کے آخر میں ہے اور اُن سب سے زیادہ ضعیف بھی ہے، اس لئے اگر تم سے ایسا ہو سکے کہ اپنی ساری حاجت وضرورت کی طلب کو یا (کم سے کم) اس کے بڑے حصہ کو اپنی امت کے حق میں صرف کردو تو ضرور ایسا کر دینا۔

تین اولوالعزم انبیاء سے خصوصی ملاقاتیں

جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کو خصوصی ارشادات سے نوازا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی نمازوں کے بارے میں بار بار آپ کی رہنمائی اور امتِ محمدیہ کی بھی خواہی کا فرض انجام دیا ہے اس کے علاوہ صحیح مسلم شریف و بیہقی وغیرہ میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ میں نے اور جبرئیل نے مسجد اقصیٰ میں داخل ہو کر دو دو رکعت نماز پڑھی اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں دیکھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے ہیں، ان کا بدن چھریرا، بال گھونگریالے تھے، گویا وہ قبیلہ شنوہ میں سے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی کھڑے نماز پڑھ رہے تھے وہ شکل وصورت میں عُروہ بن مسعود ثقفیؓ (صحابی، رئیس طائف) سے زیادہ مشابہ ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی دیکھا کہ کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں اور وہ بہ نسبت دوسرے آدمیوں کے تمہارے صاحب (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) سے زیادہ مشابہ ہیں۔

قیامت کے بارے میں مذاکرہ

ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ شب معراج میں تعیین زمانہ قیامت کے متعلق حضور علیہ السلام کی مذکورہ بالا تینوں حضرات سے گفتگو ہوئی، پہلے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام سے پوچھا گیا اور انہوں نے لاعلمی ظاہر کی، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے معلوم کیا گیا، تو وہ بھی نہ بتلا سکے، اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام سے دریافت کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا کہ قیامت کا ٹھیک زمانہ (یعنی سال، ماہ تاریخ) تو مجھے بھی معلوم نہیں، اس کو علام الغیوب کے سوا کوئی نہیں جانتا، البتہ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ میں قیامت قائم ہونے سے کچھ ہی زمانہ پیشتر دنیا میں آؤں گا اور دجال کو قتل کروں گا۔

ملاقات انبیاء میں ترتیبی حکمت

حضرت اقدس تھانویؒ نے لکھا:۔ مذکورہ بالا روایت میں صاحبِ معراج ﷺ کا حضرت آدم، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت یوسف، حضرت ادریس، حضرت ہارون، حضرت موسیٰ و حضرت ابراہیم علیہم السلام سے ملاقات فرمانے کا ذکر ہے، جو آپ کے استقبال وخیر مقدم کے لئے اپنے اپنے مقام پر موجود تھے، حضرات انبیاء علیہم السلام کی اس ترتیب ابتداء انتہاء اور اوسط کی یہ مناسبت ہے کہ حضرت

ابوالبشر علیہ السلام حضورِ اکرم ﷺ کے پدرِ اوّل اور حضرت خلیل علیہ السلام پدرِ آخر ہیں، اور بیچ کے جملہ پیغمبر آپ کے دینی بھائی تھے، پھر اگر چہ دوسرے جلیل القدر اور اولوالعزم انبیاء بھی آسمانوں پر موجود تھے، لیکن ان نام بردہ حضرات کا انتخاب اس فطری مناسبت کے باعث ہوا، جو ان میں فرداً فرداً اور سید المرسلین ﷺ کے اندر اجتماعی حیثیت سے موجود تھی (نشر الطیب)

ملاقات انبیاء بالاجساد تھی یا بالارواح

شب معراج میں رسول اکرم ﷺ کی جو ملاقاتیں انبیاء سابقین علیہم السلام سے آسمانوں اور بیت المقدس میں ہوئی ہیں، وہ ان کی ارواحِ متمثلہ سے ہوئی ہیں یا اجساد مع الارواح سے؟ علامہ محدث قسطلانیؒ نے لکھا ہے کہ اس بارے میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ آپ نے صرف اُن کی ارواح کو دیکھا اور ان سے ملاقات کی ہے، اور وہ ارواح ہی ان کے اجسام کی صورت میں متشکل ہوگی تھیں بجز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، کیونکہ وہ مع جسم کے آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں، اور بعض نے حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں بھی ایسا ہی کہا ہے، لیکن جن انبیاء نے بیت المقدس میں آپ کے ساتھ نماز پڑھی ہے، خاص ان کے لئے یہی احتمال راجح ہے، کہ وہاں ان سب کی صرف ارواح تھیں، اس لئے کہ حاکم و بیہقی کی ایک حدیث میں ملاقاتِ ارواحِ انبیاء کا ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ارواح کا تشکل اجساد کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رؤیت و ملاقات اجسام مع ارواح سے ہوئی ہے (اس طرح کہ شب معراج میں حضور کی ملاقات کے لئے ان کے اجسام کو قبور میں سے لیجایا گیا، جس سے آپ کی تشریف و تکریم کی گئی، اس کی تائید بیہقی کی حدیث انسؓ سے بھی ہوتی ہے کہ آپ کے لئے حضرتِ آدم اور بعد کے سب انبیاء کو مبعوث کیا گیا، اور آپ نے ان کی امامت کی، بزار و طبرانی کی حدیث میں اس طرح ہے کہ میرے لئے انبیاء کو اُٹھایا گیا، انکو بھی جن کے نام حق تعالیٰ نے ذکر کئے ہیں، اور ان کو بھی جن کے نام نہیں ذکر کئے، اور میں نے ان سب کو نماز پڑھائی، حافظ ابن حجرؒ نے کہا، اسی قول کو ہمارے بعض شیوخ نے اختیار کیا ہے اور اس کے لئے انہوں نے مسلم شریف کی مرفوع روایت سے بھی استدلال کیا ہے جس میں ہے کہ میں نے شب معراج میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا اپنی قبر میں کھڑے ہیں نماز پڑھ رہے تھے، اس سے ثابت ہوا کہ جب حضور علیہ السلام اُن کے پاس سے گزرے ہیں تو اسی وقت ان کو بھی اسراء کرائی گئی، میں کہتا ہوں کہ یہ بات ضروری نہیں اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ ان کی روح کو ارضی جسد کے ساتھ کوئی اتصال و تعلق ہو اور اسی کے باعث زمین پر نماز پڑھی ہو، باوجودیکہ ان کی روح آسمان پر مستقر ہو (زرقانیؒ)

اس کے بعد علامہ قسطلانیؒ نے محدث ابن ابی جمرہ کے بھی پیش کردہ چند احتمال ذکر کر کے لکھا کہ یہ سب وجوہ محتمل ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہے (یعنی **من حیث الاحتمال فی حد ذاته**) کیونکہ سب کچھ قدرتِ الٰہیہ کے تحت ممکن ہے، لیکن باعتبار دلیلِ خارجی کے ترجیح دے سکتے ہیں۔ زرقانیؒ۔

محدث زرقانی رحمہ اللہ اور ردّ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ

علامہ محدث زرقانیؒ نے لکھا کہ پہلے مصنفؒ نے فتح الباری سے رائے نقل کی ہے اور اس سے حافظ ابن قیمؒ کا رد ہو گیا ہے، جنھوں نے کتاب الروح میں اس امر کو ترجیح دی ہے کہ حضور علیہ السلام کی رؤیت و مشاہدہ کا تعلق صرف ارواحِ انبیاء سے تھا کیونکہ ان کے اجساد یقیناً زمین میں ہیں اور وہ قیامت کے دن ہی اُٹھائے جائیں گے، اگر اس سے قبل اٹھائے جاتے تو قیامت سے قبل ہی زمین ان سے شق ہوتی اور پھر وہ نفخ صدر کے وقت بھی موت سے دوچار ہوتے، اور یہ ان کی تیسری بار کی موت ہوتی، جو قطعاً باطل ہے، دوسرے یہ کہ اگر اجساد کی بعثت ہوتی تو پھر وہ قبور کی طرف نہ لوٹتے بلکہ جنت میں پہنچ جاتے، حالانکہ اس میں انبیاء علیہم السلام کا داخلہ حضور اکرم ﷺ سے قبل نہ ہوگا، اور

سب سے پہلے آپ ہی کے لئے جنت کا دروازہ کھلے گا، اور نہ زمین آپ سے پہلے کسی کے لئے شق ہوگی اسی طرح اور بھی حافظ ابن قیمؒ نے طویل بیانی کی ہے، جس میں اُن کے لئے حجت و دلیل کی کوئی قوت نہیں ہے اور اس کا جواب جو ہمارے شیخ نے املا کرایا ہے، حسب ذیل ہے:۔ان کا استدلال جب مکمل ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ارواحِ کو ان کے اجساد فی القبور سے مفارق وجدا تسلیم کر لیا جائے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ سب تو اپنی قبور میں بہ حیات حقیقی زندہ ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، زندگی کا ہر قسم کا تمتع حاصل کرتے ہیں، اور ان کا اپنی قبور سے نکلنا، اور ان میں پھر آنا بھی ایسا خروج نہیں ہے جو بعثت کا مقتضی ہو بلکہ وہ ایسا ہے کہ جیسے ایک انسان اپنے گھر سے کسی ضرورت کی وجہ سے نکلتا ہے کہ اس کو پورا کر کے پھر لوٹ آتا ہے، اسی لئے اسکو اس صورت میں اپنے گھر سے (بالکلیہ) جدا ہونے والا اور مفارق نہیں کہتے، اور گھر سے مفارق وجدا ہونے والا صرف اسی کو کہتے ہیں جو اس کی طرف پھر لوٹ کر نہ آئے، اور قیامت تک کے لئے نکل کھڑا ہو۔اس جواب سے ظاہر ہے کہ حافظ ابن قیمؒ کا استدلال ساقط ہو جاتا ہے (شرح المواہب ۳۷/۶)۔

حیاتِ انبیاء علیہم السلام

علامہ محدث ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ شریف میں لکھا:۔شب معراج میں جو حضور علیہ السلام نے انبیاء علیہم السلام کو سلام کیا اور انہوں نے جوابِ سلام دیا، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ انبیاء در حقیقت زندہ ہیں (مرقاۃ ۴۲۷/۵) پھر آگے لکھا:۔ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو اور زندوں کی طرح موت نہیں آتی، بلکہ وہ تو صرف دار الفنا سے دار البقا کی طرف منتقل ہوتے ہیں، اس بارے میں احادیث و آثار مروی ہیں، اور وہ اپنی قبور میں بھی زندہ ہیں، کیونکہ وہ شہداء سے افضل ہیں، جو اپنے رب کے نزدیک زندہ ہیں (مرقاۃ ۴۲۷/۵)

محقق عینیؒ نے لکھا:۔اگر سوال ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے ان انبیاء علیہم السلام کو آسمانوں پر کس طرح دیکھا جبکہ اُن کے اجسام زمین پر ان کی قبور میں تھے؟ تو جواب یہ ہے کہ ان کی ارواح ان کے جسموں کی شکلوں میں متشکل ہو گئی تھیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس رات میں بطورِ تشریف و تکریم نبی اکرم ﷺ کی ملاقات کیلئے انبیاء کرام کے اجسام بھی حاضر کئے گئے تھے۔اس کی تائید حدیث اِنسؓ سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور بعد کے سب انبیاء آپ کے لئے مبعوث کئے گئے تھے۔جن کی آپ نے امامت فرمائی (عمدہ ۲۶/۱۷)۔حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔روایتِ طبرانی عن انسؓ میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے لئے حضرت آدم علیہ السلام اور بعد کے انبیاء مبعوث کئے گئے، اور آپ نے اس رات میں ان سب کی امامت فرمائی (فتح ۱۳۹/۷)۔

آسمانوں میں انبیاء علیہم السلام کی رؤیت پر اشکال ہوا ہے کہ ان کے جسم تو زمین پر قبروں میں ہیں، جواب میں کہا گیا کہ ان کی ارواح اُن کے اجسام کی صورتوں میں متشکل ہو گئی تھیں یا ان کے اجسام ہی آپ کی ملاقات کے لئے اس رات میں بطور اعزاز و اِکرام کے آسمانوں پر پہنچا دیئے گئے تھے اور اس کی تائید حدیث عبدالرحمٰن بن ہاشم عن انسؓ سے ہوئی ہے جس میں ہے کہ حضرت آدم اور ان کے بعد کے سب انبیاء آپ کے لئے مبعوث کئے گئے تھے، اس کی طرف پہلے باب میں بھی اشارہ ہوا ہے (فتح ۱۴۷/۷)

واضح ہو کہ حافظ نے آگے ۱۴۹ میں عنوانِ تکملہ کے تحت اس بارے میں اختلاف کا حال ذکر کے انبیاء علیہم السلام کے اسراء بالا جساد کے قول کے لئے حدیثِ مسلم کی تائید کو ضعیف قرار دیا ہے، اور وہاں حدیثِ طبرانی مذکور کی تائید کا کچھ ذکر نہیں کیا، اس سے معلوم ہوا کہ حافظ کے نزدیک بھی اسراء بالا جساد والا قول ہی راجح ہے کہ وہ موئد بحدیثِ طبرانی ہے، اور کلام صرف حدیثِ مسلم سے استدلال میں کیا ہے یہی بات غالباً محدث زرقانیؒ نے بھی سمجھی ہے، جس کی وجہ سے لکھا کہ حافظ کی تحقیق سے حافظ ابن قیمؒ کا قول رد ہو گیا، کیونکہ حافظ ابن حجرؒ کی ترجیح مذکور کے برخلاف انہوں نے ملاقاتِ ارواح کو راجح قرار دیا ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

سدرہ کی طرف عروج

ساتوں آسمانوں کی سات معراجوں اور ان کے ملکوت وآیات مشاہدہ کرنے اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی ملاقاتوں کے بعد آٹھویں معراج سدرۃ المنتہیٰ تک ہے، جس کو بعض احادیث میں عروج سے تعبیر کیا گیا ہے اور بعض میں انطلاق سے، محدثین نے لکھا کہ سدرہ کی اصل چونکہ چھٹے آسمان سے شروع ہو کر ساتویں آسمان کے اوپر تک ہے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل موطن ومستقر (ساتویں آسمان) پر آپ کے ملاقات اور داخلہ بیت معمور (کعبہ سماوی) کے بعد جب حضور علیہ السلام سدرۃ المنتہیٰ کی چوٹیوں کی طرف بڑھے ہیں، تو اسکو عروج وانطلاق دونوں سے تعبیر کرنا درست ہے۔

ترتیب واقعات پر نظر

ہم نے چونکہ واقعاتِ معراج میں ترتیب کا بھی لحاظ کیا ہے، جو روایات معراج میں ملحوظ نہیں رہا، اس لئے اوپر کی تفصیل دی گئی ہے، خود امام بخاریؒ کی حدیث الباب اور آئندہ آنے والی حدیث معراج میں ترتیب موجود نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ اور محقق عینیؒ وغیرہ شارحینِ بخاری شریف کو اس پر متنبہ کرنا پڑا۔ حافظ ابن حجرؒ نے ثم اتیت باناء خبر پر لکھا کہ ثم کو یہاں ترتیب کے لئے نہ کہیں گے، بلکہ صرف بمعنی واو (جمع واقعات بلا ترتیب کے لئے) لیں گے۔ تاکہ مختلف احادیث وروایات میں جمع ہو سکے (فتح ۱۵۲/ ۷) حافظؒ کی اس توجیہ کو علامہ زرقانیؒ نے بھی شرح المواہب ۸/ ۶ میں نقل کیا ہے، محقق عینی نے بھی یہ توجیہ کی ہے (عمدہ ۲۹/ ۷)

حدیث الباب کی ترتیب

یہاں حدیث الباب میں عروجِ سدرہ سے قبل عروجِ مستوی کا ذکر ہے یہ امر بھی ترتیب واقعاتِ معراج کے خلاف ہے لیکن حافظ یا عینی نے یہاں کچھ[1] نہیں لکھا، پھر یہاں عروج مستوی کے بعد فرضیتِ صلوٰۃ کا ذکر ہے اور اس کے بعد انطلاق الی السدرہ کو لیا ہے، حالانکہ

---

[1] البتہ حافظؒ نے آخری جلد فتح الباری میں حدیث شریک کے لفظ **ثم علا به فوق ذلك بما لا يعلمه الا الله حتى جاء سدرة المنتهىٰ** پر حسب ذیل اہم نوٹ لکھا:۔ یہ بات جمہور کے خلاف ہے، کیونکہ ان کے نزدیک سدرہ ساتویں آسمان میں ہے۔ اور بعض کے نزدیک چھٹے میں۔ دونوں قول میں جمع کی صورت ہم پہلے لکھ آئے ہیں، اور شاید کی سیاق میں تقدیم وتاخیر ہو گئی ہے۔ اور سدرہ کا ذکر پہلے تھا، پھر اس سے اوپر عروج کا، اس قدر کہ اُس کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور حدیث ابی ذرؓ سے مروی ہے کہ پھر مجھ کو عروج کرایا گیا تا آنکہ میں ایک ایسے میدان پر جا پہنچا جہاں پر قلموں کی کشش کی آواز سنتا تھا (حافظؒ نے اس سے اشارہ کیا کہ وہاں صرف ملاء اعلیٰ کے فرشتے تھے، جن کے لوح محفوظ سے نقل کتابت کی آواز آ رہی تھی۔ فتح ۶ ۳۲ میں قاضیؒ سے نقل کیا کہ عروج مستوی سے حضور علیہ السلام کا مرتبہ سارے انبیاء علیہم السلام سے اوپر دکھلایا گیا، اور ایک حدیث میں حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ اس عروج کے وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھ سے جدا ہو گئے اور سب آوازیں منقطع ہو گئیں معلوم ہوا کہ سدرہ تک نیچے کے رہنے والوں کی آر جار اور چہل پہل رہتی ہے، اوپر کے طبقہ میں مکمل سکوت سکون اور خاموشی رہتی ہے، اور مستوی پر پہنچ کر صرف اقلام کی آوازیں سُنی گئیں اور اوپر عرش تک سارا علاقہ ملاء اعلیٰ کا ہے، سدرہ کے اوپر ہی علاقہ جنت کا بھی ہے، جہاں اب تک حضور کے سوا کوئی نہیں گیا اور قیامت میں بھی سب سے پہلے آپ اور آپ کی امت ہی داخل ہوگی۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس روایت میں جو سدرہ تک کی بلندی کا ذکر ہے۔ اس سے مراد اس کے اعلیٰ حصے ہوں گے اور دوسری روایتوں میں جو سدرہ تک پہنچنے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد اس کے نچلے حصے ہوں گے (فتح الباری ۱۷/ ۳/ ۱۳)۔

یہاں حافظؒ نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک بھی واقعات معراج کے سلسلہ میں سدرہ کا عروج مقدم ہے اور عروج مستوی موخر ہے اس لئے جس روایت میں عروج مستوی مقدم ذکر ہوا ہے وہ عبارت کی تقدیم وتاخیر ہے اور اسی چیز کو راقم الحروف نے بھی نمایاں کیا ہے، وللہ الحمد۔

افسوس ہے کہ سیرۃ النبی جیسی محققانہ کتاب میں معراج اعظم کے عظیم ترین واہم واقعات تک کی ترتیب وبیان میں تسامحات ہو گئے ہیں اور بہت سے واقعات کی تصحیح وتغلیط میں بھی قلم غیر محتاط ہو گیا ہے، کاش! حضرت سیّد صاحبؒ آخر عمر میں اس کے مضامین پر نظر ثانی فرما لیتے جبکہ انہوں نے رجوع واعتراف بھی شائع کر دیا تھا، اور بہت سے تسامحات پر وہ خود بھی متنبہ ہو چکے تھے، ضرورت ہے کہ اب کوئی محقق عالم اس اہم خدمت کی طرف توجہ کرے تاکہ اس عظیم وجلیل تالیف مبارک کے افادات قیمہ سے دنیائے اسلام کو اور زیادہ فائدہ پہنچے۔

اکثر روایات میں سدرہ کے بعد فرضیتِ صلوٰۃ کا بیان ہے، خود امام بخاریؒ جو آگے تین جگہ معراج کی مفصل احادیث لائیں گے، ان میں بھی سدرہ کے بعد ہی نمازوں کی فرضیت کا واقعہ مذکور ہے، ملاحظہ ہو بخاری ۴۵۵ (باب ذکر الملائکہ) اور ۵۴۸ (باب المعراج) اور ۱۱۲۱ (کتاب التوحید) کا یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بجز اس حدیث الباب کے بخاری شریف کی اور کسی روایت میں عروجِ مستوی کا ذکر نہیں ہے، اور مسلم شریف میں بھی حضرت ابوذرؓ والی یہی حدیث الباب مذکور ہے، جس میں عروجِ مستوی کا ذکر اوّل[1]، پھر فرضیتِ صلوات، پھر عروجِ سدرہ کو لیا گیا ہے، اس کے علاوہ باقی احادیثِ مسلم میں بھی فرضیتِ صلوات کا بیان سدرہ کے بعد ہی ہے، روح المعانی ۱۰/۱۵ میں بھی سات معراج سات آسمانوں کی، آٹھویں سدرہ تک، نویں مستویٰ تک اور دسویں عرش تک لکھی ہے، شرح المواہب ۸۹/۶ میں لکھا کہ اِس نویں معراج (معراج الی المستوی) کو نویں سال ہجرت سے یہ مناسبت ہے کہ اس میں غزوۂ تبوک پیش آیا ہے۔ جس میں نبی کریم علیہ نے مدینہ طیبہ سے شام کا سفر کیا ہے۔ اس غزوہ میں صحابہ کی تعداد سب غزوات سے زیادہ تھی، یعنی تیس ہزار تھے اور مسافت بہت دور دراز تھی اسی لئے آپ نے اس کے بارے میں اور غزوات کی طرح توریہ واخفاء سے بھی کام نہیں لیا، بلکہ کھول کر بتلا دیا تھا کہ کہاں جانا ہے تاکہ اسی کے مطابق وہ پوری طرح تیار ہو کر نکلیں، پھر اس قدر تیاریوں کے ساتھ بھی جب سب حضرات تبوک پہنچے تو کفار کے ساتھ کوئی لڑائی کا موقع پیش نہیں آیا، نہ کوئی شہر فتح ہوا، چونکہ فتح ملکِ شام کا ابھی مقرر ومقدر وقت نہیں آیا تھا۔ لہذا سارا عزم وجزم تقدیر خداوندی اور جف القلم **بماھو کائن** کے مقابلہ میں بے کار رہا، اور حضور اکرم علیہ مسلمانوں کے ساتھ کامل وقار وسکینت کے ساتھ مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ آئے، عزم وعزیمت کی ناکامی سے ان کو کوئی بھی اضطراب یا بددلی کی کیفیت حاصل نہ ہوئی۔

درحقیقت علامہ محدث زرقانیؒ نے نویں معراج کی مناسبت نویں سال ہجرت کے عظیم ترین واقعہ غزوۂ تبوک سے بتلا کر بہت بڑی علمی تحقیق پیش کی ہے۔

اقسامِ اقلام! اس کے بعد علامہ محدث قسطلانیؒ نے حافظ ابن قیمؒ کی کتاب اقسام القرآن سے جو اقلام کی بارہ اقسام ذکر کی ہیں وہ بھی مع تشریحات علامہ زرقانیؒ قابل مطالعہ ہیں (۸۹/۶) غرض رواۃِ حدیث کے ثم وثم سے کوئی مغالطہ نہ ہونا چاہیے، گو اصلِ وضع اس لفظ کی ترتیبِ واقعات ہی کے لئے ہے، مگر بسا اوقات رواۃ اس امر کا خیال نہیں کرتے، اور واقعات کی بلا ترتیب میں بھی واوٴ جمع کی طرح اس کا استعمال کر لیتے ہیں، اور ہمارے نزدیک یہی صورت یہاں حدیث الباب میں ہوئی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

اس سلسلہ میں حافظ ابن حجرؒ کا تکملہ (فتح ۱۵۳/۷) بھی ملحوظ رہنا چاہیے، جس میں روایتِ معراج کے فروق ذکر کئے ہیں، اس سے بھی ہماری مندرجہ بالا معروضات کی اہمیت واضح ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وللہ الحمد۔

سدرہ کے حالات وواقعات

حضور اکرم علیہ نے ارشاد فرمایا کہ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لے گئے جو رنگا رنگ تجلیات سے ڈھانپا

[1] اسی روایتِ بخاری ومسلم کا ترجمہ سیرۃ النبی ۶۰۳ میں سب سے پہلے اور بلا کسی تنبیہ کے پیش کیا گیا ہے، پھر بخاری ومسلم کی تمام روایتوں کو ملا کر جامع بیان اس طرح مرتب کیا گیا:۔۔۔۔۔۔ ساتویں آسمان میں داخل ہو کر آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی آپ کو جنت کی سیر کرائی گئی، جس کے گنبد موتی کے تھے اور زمین مشک کی تھی اس مقام تک پہنچے جہاں قلمِ قدرت کی چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی، آگے بڑھ کر آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔۔۔۔۔۔ پھر شاہدِ مستور ازل نے چہرہ سے پردہ اُٹھایا اور خلوت گاہِ راز میں ناز ونیاز کے وہ مقام ادا ہوئے جن کی لطافت ونزاکت الفاظ کے بوجھ کی متحمل نہیں ہوسکتی، **فاوحی الی عبدہ ما اوحی**، اس وقت تین عطیے مرحمت ہوئے، جن میں سے پنج وقتہ نماز کی فرضیت بھی ہے (سیرۃ النبی ۴۱۴/۳)۔

علاوہ اس کے کہ بخاری ومسلم کی روایتِ مذکورہ سے ترتیب اخذ کرنا صحیح نہ تھا، یہ بھی غلطی ہوگئی ہے کہ جامع بیان میں دخولِ جنت کو عروجِ مستوی وعروجِ سدرہ دونوں سے مقدم کر دیا گیا، حالانکہ صحیحین میں دخولِ جنت کا ذکر ان دونوں کے بعد ہے، مقدم کسی جگہ بھی نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ مؤلف

ہوا تھا، کسی کی طاقت نہیں کہ ان (تجلیات) کی حقیقت کا ادراک کر سکے اور اس وقت کے اس (سِدرہ) کے حسن و جمال اور آب و تاب کی کیفیت بیان کر سکے (بخاری و مسلم و سورۂ نجم) بعض روایات کے مطابق بظاہر دیکھنے میں وہ ڈھانپنے والے سونے کے پروانے یا فرشتے تھے، غرض وہ (سِدرہ کی چوٹیاں) اس وقت حق تعالیٰ کی خصوصی تجلیات و انوار و برکات کا مظہر بن گئی تھیں، کیونکہ وہاں کلام الٰہی اور احکامِ فرضیتِ صلوٰۃ کی جلوہ ریزیاں ہونے والی تھیں۔

سِدرہ بیری کا درخت ہے، جس کی جڑ چھٹے آسمان پر ہے اوپر کی شاخیں ساتویں آسمان کے اوپر تک پہنچتی ہیں، حدیثِ مسلم میں ہے کہ عالم بالا سے جو احکام و اخبار آتے ہیں وہ پہلے سدرہ تک پہنچتے ہیں اور وہاں سے ملائکہ زمین پر لاتے ہیں، اسی طرح دنیا سے جو اعمال خیر وغیرہا اوپر چڑھتے ہیں وہ بھی سدرہ تک جا کر رُک جاتے ہیں، پھر وہاں سے اوپر چڑھ جاتے ہیں، گویا وہ نیچے اور اوپر کے درمیان حدِ فاصل ہے کہ اوپر والے اس سے نیچے نہیں آتے، اور نیچے والے اس سے اوپر نہیں جاتے، حدیثِ ترمذی میں ہے کہ رسول اکرم علیہ السلام کے سوا کوئی متنفس اس حد سے آگے نہیں جا سکا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ سدرہ پر تمام دنیا کا علم منتہیٰ ہوتا ہے، اِس سے اوپر کا کسی کو علم نہیں، حتیٰ کہ فرشتوں کو بھی اس سے اوپر کی معلومات حاصل نہیں، اور چونکہ یہ بیری کا درخت اوپر و نیچے کی منتہیٰ پر ہے۔ اسی لئے اس کو سدرۃ المنتہیٰ کہتے ہیں، اور اسی کے پاس جنت کا علاقہ ہے، (جیسا کہ ہم نے نطق انور جلد اوّل میں حضرت علامہ کشمیریؒ وغیرہ سے تحقیق نقل کی ہے کہ ساتویں آسمان کے اوپر جنتوں کا علاقہ ہے، جن پر بطور چھت عرش رحمٰن ہے۔

معراج کے انعامات

مسلم شریف میں حدیث ہے کہ شب معراج میں نبی اکرم علیہ السلام کو تین چیزیں عطا کی گئیں، پانچ نمازیں، سورۂ بقرہ کی آخری آیات اور بشرطِ عدم شرک کبائر معاصی کی بخشش۔ پانچ نمازوں کی عطاء سے مراد اُن کی فرضیت ہے، سورۂ بقرہ کی آخری آیات آمن الرسول سے ختم سورہ تک، جن میں اس امت کے لئے حق تعالیٰ کی کمالِ رحمت، تخفیفِ احکام، مغفرت کی بشارت، اور کافروں کے مقابلہ میں وعدۂ نصرت کا بیان ہوا۔ اور مراد عطاءِ مضمون مذکور ہے کیونکہ نزول کے لحاظ سے تو ساری سورۂ بقرہ مدینہ ہے، اور معراج مکہ معظمہ میں ہوئی اور ممکن ہے کہ یہ آیات شب معراج میں بلا واسطہ حضور علیہ السلام پر نازل ہوئی ہوں، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے مدینہ میں اُتریں تو مصحف میں لکھی گئیں (کذا فی اللمعات شرح المشکوٰۃ للشیخ عبدالحق المحدث الدہلویؒ)۔

علامہ سندھیؒ نے کہا:۔ یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ ان امور کی عطاء کا فیصلہ تو شب معراج ہی میں کر دیا گیا اور آپ کو بتلا دیا گیا تھا، پھر فرمان کا ضابطہ کا نزول بعد کو ہوا، کبائرِ معاصی کی مغفرت کا وعدہ معراج کا تیسرا بڑا انعام و اکرام تھا، حافظ ابنِ حجرؒ نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں موحدین اہل کبائر کو آخرت میں عذاب ہوگا ہی نہیں، کیونکہ یہ بات تو اجماعِ اہلِ سنت سے ثابت شدہ ہے، لہذا مراد یہ ہے کہ مشرکین و کفار کی طرح ہمیشہ کا عذاب ہوگا لیکن اس توجیہ پر اعتراض ہوا کہ اس صورت میں امتِ محمدیہ کی کوئی خصوصیت وفضیلت ثابت نہ ہوئی، جواب یہ ہوسکتا ہے کہ مراد امتِ محمدیہ کا غالب و اکثر حصہ ہے، جس کی مغفرت ہو جائیگی، کہ یہ امتِ مرحومہ ہے اور حق تعالیٰ کا فضل و کرم اس پر خاص ہے۔ واللہ اعلم (فتح الملہم ۳۳۷/۱)۔

نوعیت فرض صلوات

امام نسائیؒ نے ۶ ۷ امیں کتاب الصلوٰۃ شروع کر کے پہلے شبِ معراج کی مفصل حدیث مالک بن صعصعہ والی ذکر کی ہے، پھر باب کیف فرضت الصلوٰۃ لائے، پھر باب کم فرضت فی الیوم واللیلۃ، اسی طرح آگے بیعت علی الصلوات، محافظ علی الصلوات فضیلتِ صلوات خمس حکم تارک الصلوٰۃ، محاسبہ علی الصلوٰت وغیرہ ابواب تفصیل و اہتمام شانِ صلوۃ کے لئے قائم کئے ہیں، ایک حدیث کا ٹکڑا یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام

فرماتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ساتویں آسمان پر ملاقات کرنے کے بعد جب ہم اس سے اوپر سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو وہاں مجھے ایک کہر جیسی چیز نے ڈھانپ لیا اور میں سجدہ میں گر گیا، اُس حالت میں میں نے یہ ارشادِ باری سُنا:۔ میں نے جس دن آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا تھا، اسی روز تم پر اور تمہاری امت پر پچاس نمازیں قائم کی تھیں، اب تم اور تمہاری امت ان کو قائم کرو یہ سُن کر میں لوٹ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا، انہوں نے کچھ نہ پوچھا، پھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا تو وہ سوال کر بیٹھے کہ حق تعالیٰ نے تم پر اور تمہاری امت پر کتنے فرض عائد کئے ہیں؟ میں نے کہا پچاس نمازوں کا حکم ہوا ہے، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہ آپ ان کو قائم کر سکیں گے، نہ آپ کی امت، لہذا اپنے رب کے پاس لوٹ کر تخفیف کی درخواست کیجئے! میں لوٹ کر اپنے رب کے پاس گیا تو اس نے دس نمازیں کم کر دیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پھر لوٹنے کی ہدایت کی، میں نے لوٹ کر بارگاہِ خداوندی میں پھر درخواست پیش کی تو دس نمازیں اور کم کر دیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو پھر بھی انہوں نے لوٹ کو جانے کا حکم دیا، میں پھر درخواست تخفیف لے کر گیا تو دس نمازیں اور کم کر دی گئیں، یہاں تک کہ اس طرح بار بار کی درخواست پر پانچ نمازوں کا حکم رہ گیا اُس پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے کہ پھر جا کر اور کمی کرائیے، کیونکہ بنی اسرائیل پر صرف دو نمازیں فرض ہوئی تھیں، وہ اُن کو بھی ادا نہ کر سکے تھے، میں پھر درخواست لے کر گیا تو میرے رب عزوجل نے فرمایا:۔ میں نے آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے وقت تم پر اور تمہاری امت پر پچاس ہی نمازیں فرض کی تھیں، پس اب پچاس کی جگہ پانچ نمازیں ضرور پڑھو، یہ سُن کر میں سمجھا کہ اتنی مقدار ضرور ہی باقی رہے گی، اور لوٹ کر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، تو وہ پھر فرمانے لگے کہ لوٹ کر جاؤ، میں نے کہا کہ اس کو تو میں حق تعالیٰ کا آخری فیصلہ سمجھتا ہوں، لہذا پھر لوٹ کر نہ گیا (نسائی ۱/۸۷)۔

تخفیف ۵۔۵۔ کی ہوئی! نسائی شریف کی اس روایت میں دس دس کی تخفیف کا ذکر ہے، دوسری بعض میں کچھ کچھ حصہ تدریجاً کم کر کے پانچ تک تخفیف آئی ہے، لیکن ثابت کی روایت میں شروع سے آخر تک ۵۔۵۔ کی تخفیف مروی ہے۔ اور اسی کو حافظ ابن حجرؒ نے سب سے زیادہ راجح اور معتمد قرار دیا ہے، اور لکھا کہ جمع میں بین الروایات کے اصول پر باقی روایات کو اسی پر محمول کرنا متعین ہے۔

نکتہ لطیفہ! حافظ نے لکھا:۔ محدث ابن المنیر نے ایک لطیف نکتہ نکالا ہے کہ حضور علیہ السلام نے آخر میں پانچ رہ جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھر لوٹ کر نہ جانے کی جو وجہ ظاہر کی ہے کہ اب مجھے اپنے رب سے درخواست کرتے شرم آ رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نے پانچ پانچ کی تخفیف سے اپنی فراستِ نبویہ کے ذریعہ سمجھ لیا تھا کہ اگر پانچ رہ جانے کے بعد بھی درخواست کریں گے تو گویا یہ درخواست حکمِ صلوٰۃ بالکل ہی اُٹھا دینے کی ہو جائیگی اور اس کو آپ نے پسند نہ کیا۔

نکتہ عجیبہ! اس کے بعد حافظؒ نے لکھا:۔ حضور علیہ السلام کی بار بار مراجعت اور طلبِ تخفیف سے معلوم ہوا کہ آپ کو یقین ہو گیا تھا کہ ہر بار میں جو باقی کا حکم رہ گیا ہے، وہ حتمی و آخری فیصلہ فیصلہ نہیں ہے، بخلاف آخری بار کے کہ اس میں حق تعالیٰ نے آخر میں یہ بھی فرمایا:۔ لایبدل القول لدیّ (میرے یہاں قول وفیصلہ کی اُلٹ پلٹ نہیں ہوتی) اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اب آخری و حتمی فیصلہ ہو چکا ہے

رؤیت باری تعالیٰ کا ثبوت

بعض شیوخ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بار بار حضور علیہ السلام کو درخواستِ تخفیف لے کر دربارِ ایزدی میں حاضر ہونے کی ہدایت کرنے میں یہ حکمت ظاہر کی ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے (اپنی دورِ نبوت میں) دیدارِ الٰہی سے مشرف ہونے کی درخواست کی تھی، جو نامنظور ہو گئی تھی، اور ان کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ نعمتِ عظیمہ وجلیلہ حضور اکرم ﷺ کو اب ملنے والی ہے، اس لئے قصد کیا کہ حضور بار

بار لوٹ کر بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوں اور بار بار ان کو دیدارِ الٰہی حاصل ہو، تا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام آپ کو بار بار دیکھ کر اپنے قلب کو تسکین دیں، اور بار بار آپ کے چہرۂ انور پر انوار و برکاتِ قدسیہ الٰہیہ کا مشاہدہ کریں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:۔

لعلی اراهم اوارىٰ من راهم (میری تمنا ہے کہ محبوب اور اُس کے قبیلہ کے لوگوں کو دیکھوں، ایسا نہ ہو سکے تو کم از کم ان ہی لوگوں کو دیکھ کر اپنے دل کی تسکین کرلوں، جنھوں نے میرے محبوب اور اس کے متعلقین کو دیکھا ہے)

اپنے شیوخ سے یہ عجیب و غریب توجیہ لطیف نقل کر کے حافظؒ نے اتنا ریمارک بھی دیا کہ اس کے لئے بار بار اور ہر مرتبہ رؤیتِ الٰہیہ کے ثبوت کے واسطے دلیل کی ضرورت ہے (فتح الباری ۱/۳۱۶) مقصد یہ ہے کہ ایک بار دیدارِ الٰہی کے قائلین اور ان کے دلائل تو موجود ہیں اسی لئے حافظ نے نفسِ رؤیت کے ثبوت کی دلیل طلب نہیں کی۔ بلکہ تجدیدِ رؤیت یعنی ہر مرتبہ کے لئے دلیل چاہی ہے تا کہ اپنے شیوخ کی توجیہ مذکور اور زیادہ موجہ و مدلل ہو سکے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہ امر کچھ مستبعد نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دیدارِ الٰہی کی نعمت حاصل ہونے کا علم ہو گیا ہو جیسا کہ ہم پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بھی ذکر کر چکے ہیں کہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے شبِ معراج میں ملاقات کے وقت فرمایا تھا کہ آج کی رات تم اپنے رب سے ملنے والے ہو، تمہاری امت بہت ضعیف ہے اس کی فلاح و بہبودی کے لئے جتنی بھی زیادہ سے زیادہ مراعاتِ خسروانہ اس مبارک ترین موقع سے فائدہ اُٹھا کر حاصل کر سکو بہتر ہوگا۔

ناظرین اس قسم کی تصریحات و اشارات کو ذہن میں رکھیں تا کہ آخر بحث میں جب ہم شب معراج میں رؤیتِ باری کے بارے میں تحقیق پیش کریں تو کار آمد ہو، کیونکہ ہمارے اکابر اساتذہ و شیوخ حضرت علامہ کشمیریؒ وغیرہ کا رجحان بھی اس کے ثبوت ہی کی طرف ہے۔

کلامِ باری تعالیٰ بلا واسطہ کا ثبوت

قوله علیه السلام فلما جاوزت نادانی منادٍ امضیت فریضتی وخففت عن عبادی (حق تعالیٰ کے آخری وحتمی فیصلہ پر راضی برضا ہو کر جب میں لوٹنے لگا تو میرے کانوں نے یہ ندا سُنی:۔ میں نے اپنا فریضہ جاری کر دیا اور اپنے بندوں کا بوجھ بھی ہلکا کر دیا۔) حافظ ابن حجرؒ نے اس پر لکھا کہ یہ اس امر کے اقوی دلائل میں سے ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ نے اپنے نبی اکرم ﷺ سے شبِ معراج میں بلا واسطہ کلام فرمایا ہے۔ (فتح الباری ۷/۱۵۳)

حضرت اقدس مولانا تھانویؒ نے نشر الطیب میں لکھا:۔ ترمذی شریف میں جو کعب کا قول مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رؤیت و کلام کو حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں تقسیم کر دیا، اس سے حضور علیہ السلام کے لئے کلام کی نفی لازم نہیں آتی، کیونکہ اس سے کلام کی عادت مراد ہے۔ جو مرۃً بعد اُخریٰ ہو، اور حضورِ اقدس ﷺ کے لئے کلام کی صورت صرف ایک ہی بار واقع ہوئی ہے (یعنی شبِ معراج میں)۔

فائدہ مہمہ نادرہ! شبِ معراج میں فرضیتِ نماز کے موقع پر جو حضور علیہ السلام کو حق تعالیٰ جل ذکرہٗ کے ساتھ شرفِ ہم کلامی میسر ہوا، اس کو بھی نفیِ رؤیت کے دلائل میں شمار کیا گیا ہے، کیونکہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ کی ہم کلامی سے مشرف ہونے کو تین صورتوں میں منحصر کر دیا گیا ہے اور اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ حالتِ تکلیم میں رؤیت نہیں ہو سکتی حافظ ابن حجرؒ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہ حضرتِ عائشہ کی دوسری دلیل نفیِ رؤیت کی ہے، لیکن حافظ نے اس کا جواب بھی ذکر کیا ہے کہ ان آیات سے نفیِ رؤیت مطلقاً پر استدلال کرنا صحیح نہیں، قرطبی نے یہی جواب دیا ہے اور کہا:۔ بہت سے بہت اس کا اقتضاء یہ ہو سکتا ہے کہ ان حالاتِ ثلاثہ مذکورہ فی الآیۃ کے علاوہ کسی اور حالت میں تکلیم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ تکلیم حالتِ رؤیت میں واقع نہ ہوئی ہو۔ (اور اس طرح رؤیت بلا تکلیم ماننے میں آیتِ مذکورہ کا خلاف نہیں ہوتا) (فتح الباری ۴۳۱)

ہمارے حضرۃ الاستاد المعظم علامہ کشمیریؒ بھی یہی فرمایا کرتے تھے کہ تکلیم کے وقت رؤیت نہیں ہوئی ہوگی، اور رؤیت کا شرف خاص بلا تکلیم ہوا ہے مزید تفصیل آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ردِ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ

حافظؒ نے اس موقع پر حافظ ابن قیمؒ کے بھی بہت سے مزعومات کا محققانہ رد کیا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب سیرت زاد المعاد فی ہدی خیر العباد میں بہ سلسلہ معراجِ نبوی بیان کئے ہیں، فلیرجع الیہ۔

شب معراج میں فرضیت صلوٰۃ کی حکمت

حافظ ابن حجرؒ نے محدث ابن ابی جمرہؒ سے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام کو جب معراج کرائی گئی تو آپ نے اس رات میں فرشتوں کی عبادتیں دیکھیں، ان میں سے جو حالتِ قیام میں تھے، وہ بیٹھے نہ تھے اور جو رکوع میں تھے وہ سجدے میں نہ تھے، بہت سے ایسے دیکھے جو سجدہ ہی میں تھے اور کبھی سر نہ اُٹھاتے تھے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے آپ کے لئے اور آپکی امت کے واسطے فرشتوں کی تمام اقسام عبادات کو نماز کی ہر اس ایک رکعت میں جمع کر دیا، جس کو بندہ رعایتِ شرائطِ طمانینت و اخلاص کے ساتھ پڑھے گا، موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ فرضیتِ نماز کو شب اِسراء کے ساتھ مخصوص کرنے میں، اس کے بیان و اظہار کی عظمت کی طرف بھی اشارہ ہے اور اسی لئے اس کی فرضیت میں یہ بھی خصوصیت رکھی گئی کہ وہ بلا واسطہ ہوئی، بلکہ مراجعاتِ متعددہ کے ساتھ ہوئی، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے (فتح الباری ۱۵۳/۷)

نسخ قبل العمل کی بحث

یہاں ایک بحث یہ ہوئی ہے کہ جب امت کو پچاس نمازوں کا حکم پہنچا ہی نہیں اور نہ اس پر عمل کرنے کی صورت پیش آئی، تو اس حکم کا نسخ کیونکر ہوا کہ پچاس سے پانچ رہ گئیں، عمل سے پہلے نسخ ہو جانا معقول نہیں، اسکا جواب محقق عینی نے دیا کہ اگر وہ حکم ہی تھا تو اولاً حضور علیہ السلام کے لئے تھا اور آپ کے واسطہ سے امت کو، جب آپ کو حکم ملا تو آپ نے واجب جان کر اس کی تعمیل کا عزم کر لیا اور امت کو پہنچانے کا بھی عزم مستحکم فرما لیا تھا، اس کے بعد جو حق تعالیٰ سے عروض معروض ہو کر اس حکم میں آپ کے لئے اور امت کے واسطے بھی تخفیف ہوئی تو یہ نسخ حقیقی اور صحیح ہی ہے، غرض حکم مل جانے کے بعد تخفیف کے لئے آپ کی شفاعت سبب نسخ تو ضرور بنی، مگر وہ حقیقت حکم کو باطل کرنے والی نہیں تھی، اور آپ کی شفاعت منظور ہو کر حکم تبلیغ اور خاص آپ کے حق میں پچاس نمازوں کا حکم منسوخ ہو گیا، رہا امت کے حق میں تو ان کو جب حکم پہنچا ہی نہیں تو اس کے بارے میں نسخ قبل العمل کا اعتراض بھی نہیں ہوسکتا، دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ پچاس نمازوں کا حکم تعبدی نہیں تھا، بلکہ یہ بات حضور علیہ السلام کو بطورِ خبر بتلائی گئی تھی یعنی حضور علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے خبر دی تھی، کہ آپ اور آپ کی امت کیلئے لوحِ محفوظ میں پچاس نمازیں مقرر ہوئی تھیں اس کا مطلب حضور علیہ السلام نے بالفعل پچاس نمازیں پڑھنے کا اخذ کیا، پھر جب اس بارے میں مراجعت ہوئی تو حق تعالیٰ نے واضح کیا کہ وہ پچاس کی تعداد باعتبار ثواب کے تھی، عمل کے لحاظ سے نہیں۔ (عمدہ ۲۰۶/۲ طبع استنبول)

سوالات و جوابات! اس عنوان کے تحت بھی علامہ عینی نے نہایت مفید علمی و تحقیقی اشارات کئے ہیں، جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:۔

(۱) تمام انبیاء علیہم السلام میں سے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی نے کیوں امتِ محمدیہ کے ساتھ ایسی ہمدردی کا معاملہ کیا؟

جواب یہ کہ روایت میں ہے، انہوں نے اس امت کی خصوصی فضیلت و کرامت عند اللہ معلوم ہو جانے پر حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ مجھے بھی امتِ محمدیہ میں شامل فرما لے، اس لئے ان کے اندر اس امت کے معاملہ میں خصوصی اعتناء شفقت کا داعیہ ایسا ہی پیدا ہو گیا تھا

جیسا کسی کو اپنی قوم کے ساتھ ہوا کرتا ہے، داودی نے یہ وجہ بتلائی کہ جب حضور علیہ السلام فرضیت وصلوٰۃ کا حکم لے کر بارگاہِ خداوندی سے لوٹے تو سب سے پہلے آپ کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہی ہوئی تھی، اس لئے حق تعالیٰ نے اُن کے دل میں ایسی بات ڈال دی تا کہ جو بات خدا کے علمِ ازلی میں مقدر ہو چکی تھی، وہ اس طرح پوری ہو جائیگی (لیکن یہ توجیہ اُس روایت کے خلاف ہوگی کہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے حکمِ نماز کے بارے میں نہ کچھ پوچھا نہ بتلایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

(۲) دس دس نمازوں کی تخفیف ہونے میں کیا حکمت ہے؟ (شاید محقق عینی کے نزدیک دس دس والی روایت زیادہ راجح ہے اور ہم نے اوپر لکھا ہے کہ حافظ حجرؒ نے ۵۔۵۔ والی روایت کو راجح قرار دیا ہے، لیکن جو جواب آگے آرہا ہے وہ دونوں کے لئے بن سکتا ہے) جواب یہ کہ حدیث میں ہے نماز کا ثواب اتنا ہی لکھا جاتا ہے جتنے حصہ میں قلب خدا کی طرف متوجہ رہا ہو، لہذا کسی نماز کا ثواب آدھا لکھا جاتا ہے، کسی کا چوتھائی، یہاں تک کہ دسویں حصہ تک کا ثواب بھی لکھا جاتا ہے، اس سے آگے حدیث میں کچھ نہیں بتایا گیا، لہذا ایک دن رات کی مقررشدہ سابق پچاس نمازوں کے لحاظ سے اگر کم سے کم دسواں حصہ بھی پانچ پڑھی ہوئی نمازوں میں حضورِ قلب خشوع وخضوع کا، ہجود رکوع وغیرہ ارکانِ نماز میں تعدیل وکمال کے ساتھ موجود ہوا تو پانچ نمازوں کا ثواب تو ہی مل جائے گا، اگر زیادہ حضورِ قلب ہوگا تو دس نمازوں یا زیادہ کا ثواب ملے گا، پھر کامل پچاس کا ثواب اس کو ملے گا، جن کی نماز پوری طرح ہر حیثیت سے کامل ومکمل ہوگی۔

(۳) حضور علیہ السلام نے شب معراج میں انبیاء علیہم السلام سے آسمانوں پر کیسے ملاقات کی جبکہ ان کے اجسامِ مبارکہ کا مستقر زمین میں ہے؟ ابن عقیل وابن التین نے جواب دیا کہ ان کی ارواح بشکل اجساد متشکل ہوگئی تھیں، ورنہ ارواح کا اجساد کی طرف لوٹنا تو بجز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صرف قیامت کے دن ہی ہوگا، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ابھی تک زندہ ہیں اور زمین پر بھی اتریں گے، میں کہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام تو سب ہی زندہ ہیں، اور ان کو حضور علیہ السلام نے حقیقتاً دیکھا ہے، اور آپ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے بھی گزرے ہیں، جبکہ وہ کھڑے ہوئے اپنی قبر مبارک ومنور میں نماز پڑھ رہے تھے اور ان کو آپ نے چھٹے آسمان پر بھی دیکھا ہے۔

(۴) آسمانوں پر صرف آٹھ انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کا ذکر کیوں آیا ہے؟ اس کے وجوہ ومناسبات ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں جو خاص باتیں حضرت آدم علیہ السلام سے متعلق محقق عینی نے ذکر کی ہیں وہ لکھی جاتی ہیں:۔ حضرت آدم علیہ السلام کو احادیث میں ابو البشر کہا گیا ہے، اسی کے ساتھ آپ کی کنیت ابومحمد بھی ہے، اور ابن عساکر نے حضرت علیؓ سے مرفوعاً روایت کی کہ اہل جنت کی کوئی کنیت نہ ہوگی، بجز حضرت آدم علیہ السلام کے کہ آپ کو ابومحمد سے یاد کیا جائے گا، حضرت کعب احبارؒ کی حدیث میں ہے کہ اہل جنت میں سے کسی کی داڑھی نہ ہوگی بجز حضرت آدم علیہ السلام کے کہ ان کی داڑھی سیاہ ہوگی ناف تک، یہ اس لئے کہ دنیا میں ان کے داڑھی نہ تھی، اور ان کے بعد ذریتِ آدم کی ہوئی ہے (شاید اس لئے کہ آخرت میں بہت سی باتیں برعکس ہو جائیں گی) حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اور اُن کا قد ساٹھ ہاتھ کا تھا، اسی لئے ہر جنتی کی شکل ولمبائی قد بھی ان ہی جیسی ہوگی، بیس بطن سے ان کی چالیس اولاد ہوئی، اور عمر ایک ہزار سال ہوئی، جنت سے نکلے تو ہندوستان میں سراندیپ کے پہاڑ نوذ پر اترے فرشتوں نے آکر غسل اور تجہیز وتکفین کے فرائض انجام دیئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نماز جنازہ پڑھائی، ان کے پیچھے فرشتوں کی صف تھی، اور ان کے پیچھے آپ کی اولاد کی، فرشتوں ہی نے جبل ابی قبیس کے غار الکنز میں آپ کو دفن کیا اور اولاد سے کہا کہ یہی طریقہ تمہیں اپنی میتوں کے بارے میں اختیار کرنا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے طوفانِ اعظم کے موقع پر آپ کے جسمِ مبارک کو قبر سے نکال کر تابوت میں رکھا اور اپنے ساتھ کشتی میں لیا، جب طوفان کا پانی اُتر گیا تو پھر آپ کو سابق مرقدِ مبارک ومنور کی طرف واپس لوٹا دیا۔ (عمدہ ۲۰۸/۲)

(۵) قولہ تعالیٰ لا یبدل القول لدیّ، سوال ہوسکتا ہے کہ کیا ارشادِ باری میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی جبکہ پچاس سے پانچ

کردی گئیں؟ جواب یہ ہے کہ اس سے مراد اخبارات ہیں، وہ نہیں بدلتے جیسے ثواب پانچ کا پچاس ہونا، تکلیفات یعنی احکامِ تکلیفیہ مراد نہیں، کہ ان میں تبدیلی ہوتی رہی ہے، یا مراد قضاءِ مبرم، وہ بھی نہیں بدلتی، البتہ قضاءِ معلق بدلتی رہتی ہے، اس میں سے جس چیز کو چاہیں حق تعالیٰ باقی رکھتے ہیں اور جس کو نہ چاہیں ہٹا دیتے ہیں، یا مقصد یہ ہے کہ اِس (آخری فیصلہ) کے بعد ہمارے ارشاد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ (عمدہ ۱۰۹/۲) (۷) محقق عینیؒ نے ۲/۲۰۹ پر معراج کے وقتِ شب واقع ہونے کی بھی دس حکمتیں ذکر کیں، جو قابلِ مطالعہ ہیں۔

ماءِ زمزم و ثلج سے غسل قلب کی حکمت

صدرِ مبارک کو زمزم سے اور قلبِ منور کو ثلج سے دھونے کی حکمت یہ ہے کہ بارگاہِ قدس میں داخل ہونے کے لئے دل ثلجِ یقین سے معمور ہو جائے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ بحالتِ صغرسنی یہ عمل (شقِ صدر وغیرہ) اس لئے ہوا تھا کہ آپ کا قلبِ مبارک قلوبِ انبیاء علیہم السلام کی طرح منشرح ہو جائے، اور دوسری بار اس لئے کہ آپ کا حال مثل حالِ ملائکہ ہو جائے۔

حکمت اسراء و معراج

مناجات تھی (یعنی راز و نیاز کی باتیں کرنا) اور اسی لئے اس کا وقوع اچانک اور بغیر کسی سابق وعدہ و معیاد کے ہوا، یہ صورت نہایت وقیع و باعظمت ہوتی ہے، دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہم کلامی ہے کہ وہ بطورِ وعدہ وایفائے وعدہ پیش آئی ہے ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے، اور دونوں کے مقامِ مناجات وکلام میں بھی بہت زیادہ تفاوت ہے، جس طرح اُس ذات میں جس سے طور پر کلام ہوا اور اس ذات میں جس کو اعالیِ بیتِ معمور کی طرف بُلایا گیا بیّن فرق مراتب ہے۔ ایسے ہی جس کے لئے مسافتِ شہریہ کے فاصلہ تک ہوا کو مسخر کر دیا گیا تھا، اور اُس شخصِ معظم ومقدس کے درمیان فرق عظیم ہے جو فرشِ خاک سے عرشِ معلّٰی کی بلندیوں تک آن کی آن میں پہنچ گیا۔

(۸) جسم انسانی کے لئے باوجود کثافتِ مادّی کیوں کر ممکن ہوا کہ وہ آسمانوں اور ان کے اوپر ملاء اعلیٰ تک پہنچ سکا؟ جواب یہ کہ ارواح چار قسم کی ہیں:

(۱) ارواحِ عوام! جو صفاتِ بشریہ کے اثرات سے متاثر ہو کر مکدر ہو چکی ہیں اور ان پر قوائے حیوانیہ غالب ہو جاتی ہیں اسی لئے قبولِ عروج وترقی کی صلاحیت ان میں قطعاً باقی نہیں رہتی۔

(۲) ارواحِ علماءِ! جو اکتسابِ علوم کی وجہ سے بدن کی قوتِ نظریہ میں کمال حاصل کر لیتی ہیں۔

(۳) ارواحِ مرتاضین! جو اکتسابِ اخلاق حمیدہ کے ذریعہ بدن کی قوتِ مدبرہ کو کامل کر لیتی ہیں، یہ مرتاضین کی ارواح اس لئے کہی جاتی ہیں کہ وہ لوگ ریاضت ومجاہدہ کے سبب اپنے قوی بدنیہ کو کمزور کر دیتے ہیں۔

(۴) ارواحِ انبیاء وصدیقین! ان کو مذکورہ دونوں قوتوں کا کمال حاصل ہوتا ہے، اور یہی ارواحِ بشریہ کے درجہ کمال کی غایت ہے پس جتنی بھی ان کی ارواح کی قوت زیادہ ہوگی، اُن کے ابدان بھی اسی قدر زمین سے بلند ہو جائیں گے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کے اندر چونکہ یہ ارواح قوت یافتہ ہوتی ہیں، اُن کو معراج سماوی حاصل ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام میں سے بھی چونکہ سب سے زیادہ کمالِ قوتِ روحانیہ حضور اکرم علیہ کو حاصل تھا، اس لئے آپ کو قاب قوسین او ادنی تک عروج نصیب ہوا۔ (عمدہ ۲/۲۱۰)

حقیقت وعظمتِ نماز

معراجِ نبوی جسکا عظیم مقصد مناجات اور سیرِ ملکوت تھی، ظاہر ہے کہ نماز کی فرضیت اس موقع پر اس کی حقیقت واہمیت کو پوری طرح

ظاہر کرتی ہے، تاہم یہاں چند اکابرِ ملّت کے اقوال بھی ذکر کئے جاتے ہیں، تاکہ مزید فائدہ وبصیرت حاصل ہو۔

علامہ محدث سہیلیؒ نے لکھا:۔ معراج کے موقع پر نماز کی فرضیت سے اس کا فضل وتفوق ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی فرضیت حضرۃ قدسیہ (یعنی بارگاہِ الٰہیہ) ہی میں حاضری کے وقت مقدر ہوئی، اور اسی لئے طہارت وپاکیزگی اس کے لئے موزوں بلکہ شرائط ادا میں سے ہوئی، اور اس سے یہ بھی بتلایا گیا کہ نماز (بندہ کی طرف سے) ربِّ اکبر کی مناجات ہے، اور یہ کہ حق تعالیٰ کی ذات اقدس بھی نماز پڑھنے والے کی طرف متوجہ ہوتی ہے، جب وہ نماز میں الحمدللہ رب العالمین الخ کہتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوکر حمدنی عبدی، اور اثنی علی عبدی وغیرہ فرماتے ہیں، بالکل اُسی طرح ہوتا ہے، جس طرح معراج میں ساتویں آسمان پر حضور علیہ السلام کی مناجات حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ہوئی تھی، وہاں حضور علیہ السلام نے اپنے رب کا کلام سُنا اور مناجات بھی ہوئی اور وہاں حاضری ومعراج سے قبل آپ کے ظاہر وباطن کو آب زمزم وغیرہ کے ذریعہ پاک بھی کردیا گیا تھا، اسی طرح نمازی بھی نماز سے پہلے پاکی حاصل کرتا ہے، اور جس طرح حضور اکرم ﷺ شبِ معراج میں اپنے جسمِ مبارک کے ساتھ دنیا کی حدود سے نکل گئے تھے، اسی طرح ایک نمازی بھی اپنے قلب کے ساتھ دنیا سے نکل جاتا ہے، اس موقع پر اس پر دنیا کے سارے کام ممنوع وحرام ہوجاتے ہیں، اس وقت اس کو صرف اپنے رب سے مناجات کرنی اور اس کے قبلہ (تجلّی گاہ) کی طرف ہی توجہ کرنی ہوتی ہے، جس طرح حضور اکرم ﷺ نے شب معراج میں اس وقت کے قبلہ بیت المقدس کی طرف توجہ کی تھی، پھر آپ کو آسمان کی طرف معراج کرائی گئی، اور ایسے ہی نمازی بھی آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اُٹھاتا ہے تاکہ قبلہ ارضی (کعبہ معظّمہ) کے ساتھ قبلہ علیا بیتِ معمور کی طرف بھی اشارہ ہوسکے، اور ساتھ ہی جس کی نماز پڑھ رہا ہے اور اس سے مناجات کرنے والا ہے اس کے عرشِ اعظم کی جہت کی طرف بھی توجہ واشارہ ہوجائے (الروض الانف ۱/۲۵۱)

حضرتِ مجدد سرہندی قدس سرہٗ نے فرمایا:۔ مرتبہ عُلیا تو صرف کہ اس کو فقیر نے حقیقت کعبہ ربّانی پایا ہے، اس سے بہت زیادہ بلند وبالا حقیقت قرآن مجید سبحانی ہے' اور اس سے بھی بہت اوپر ایک مرتبہ مقدسہ ہے جو حقیقت نماز ہے کہ اس کی ظاہری صورت عالم شہادت وظہور میں مصلیانِ اربابِ نہایت کے ساتھ قائم ہے، ہوسکتا ہے کہ اس حقیقتِ نماز کی طرف اس چیز سے اشارہ ہوا ہو جو قصہ معراج میں منقول ہوئی یعنی قف[1] یا محمد فان الله یصلی بیشک وہی عبادت شایانِ مرتبہ تجرد وتنزہ ہوسکتی ہے جو مراتب وجوب سے صادر ہوا ور اطوار قدم سے ظہور میں آئے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کی بارگاہِ اقدس کے لئے موزون ولائق وہی عبادت ہے جو صرف مراتب وجوب[2] سے صادر ہو، اس کے سوا نہیں، پس (اس نقطہ نظر سے) وہی عابد بھی ہے اور وہی معبود بھی، اور حقیقتِ نماز کے اس مرتبہ مقدسہ میں جو اعلیٰ درجہ کمال وسعت وامتیازِ بیچوں کا ہے، اس کے لحاظ سے حقیقتِ کعبہ اس کی صرف ایک جزو ہوگی، اور حقیقتِ قرآن مجید بھی اس کا محض ایک حصّہ۔ کیونکہ نماز تمام کمالاتِ مراتبِ عبادات کی جامع ہے، اور درحقیقت وہ اصل الاصل کے مرتبہ ومقام میں ہے، جس میں معبودیتِ صرف متحقق ہے۔۔ کاملین یعنی انبیاء واکابر اولیاء کے منتہائے اقدام، نہایتِ مقام، حقیقتِ صلوٰۃ تک ہی پہنچ سکتے ہیں، وہی سب عبادت کرنے والوں کی عبادت کا انتہائی مرتبہ ہے، جس کے اوپر معبودیتِ صرف کا مقام ہے، کہ وہاں نہ کسی کی شرکت ہے نہ وہاں کوئی پہنچ سکتا ہے، جہاں تک عبادت وعابدیت کی ملی جلی سرحدیں ہیں، وہاں تک کم از کم نظری اعتبار سے قدم رکھنے کی گنجائش ضرور ہے لیکن جہاں معبودیتِ صرف کی حد

---

[1] معربِ مکتوبات علامہ محمد مرادکی نے حاشیہ میں حوالہ محدث قسطلانیؒ کی مواہب لدنیہ کا دیا ہے، یہ روایت شرح المواہب ۶/۹۳ میں موجود ہے مگر محدث قسطلانیؒ نے اس کو اور اس کے ساتھ دوسری ایک روایت کو ذکر کرکے ساری ذمہ داری شفاء الصدور پر ڈالدی ہے، جس سے ان کو نقل کیا ہے، مؤلف

[2] حاشیہ مکتوبات میں اس طرح ہے:۔ یعنی عبادت شایانِ جنابِ قدسِ وتعالیٰ وہی ہے جو مرتبہ وجواب سے صادر ہو دوسری نہیں، لہٰذا درحقیقت وہی عابد بھی ٹھہرا اور وہی معبود بھی، اور حدیث میں وارد ہے لا احصی ثناء علیك انت كما اثنیت علی نفسك فافهم یعنی جس طرح ممکن وحادث کی ثنا واجب بالذات کی ثنا کے برابر نہیں، اسی طرح ممکن وحادث کی تحمید وتمجید بھی واجب کی تحمید وتمجید وتنزیہ وغیرہ کے برابر نہیں ہوسکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم! مؤلف

آ گئی، وہاں قدم جانے کی کسی صورت گنجائش نہیں ،۔۔۔۔۔امر قف یا محمد! میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آ گے قدم (کسی ممکن وحادث کا) جا ہی نہیں سکتا، کہ مرتبہ نماز سے اوپر جو مرتبہ وجوب سے صادر ہو،صرف حضرتِ ذات باری تعالیٰ وتقدس کے تجرد وتنزہ کا مرتبہ ہے، حقیقتِ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ اسی مقام میں متحقق وثابت ہے،اور الٰہیہ غیر مستحقہ للعبادت کی نفی بھی اُسی جگہ رونما ہوتی ہے۔۔۔۔۔توحید کے اس اعلیٰ مقام میں ترقی کا دارومدار صرف عباداتِ نماز کے ساتھ وابستہ ہے، کہ وہی انتہاء کمال تک پہنچنے والوں کا مآلِ کار ہے، دوسری سب عبادتیں صرف تکمیلِ نماز میں مدد دیتی ہیں اور اس کے نقص کا تدارک کرتی ہیں، اسی وجہ سے نماز کو ایمان کی طرح حسن لذاتہ کہا گیا ہے،اور دوسری عبادتوں کا حسن لذواتہا نہیں مانا گیا۔(مکتوبات ۷۷-ص ۷ ج ۹)۔

نطق انور! ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔میرے نزدیک ہر وہ فعل جو خالقِ حقیقی جل مجدہ کے خوف وخشیہ اور تعظیم واجلال کے تحت کیا جائے وہ نماز ہے،اور نماز اس معنی سے تمامی مخلوق کے اندر مشترک وموجود ہے، اگرچہ صورتیں مختلف ہوں،لہذا ہر مخلوق کی نماز اس کے مناسبِ حال ہے۔اسی کی طرف حق تعالیٰ نے کل قد علم صلوته وتسبيحه سے ہر جنسِ مخلوق کو حق تعالیٰ کی نماز وتسبیح کا طریقہ معلوم ہے) اشارہ کیا ہے، اس آیت میں تمامی مخلوقات کے وظیفہ نماز میں شریک ہونے کا حال بیان کیا گیا ہے، مثلاً سجدہ کہ ساری دنیا کی چیزیں اپنے رب کے لئے سربسجود ہیں، تو ہر ایک کا سجدہ اس کے حسبِ حال ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔ولله يسجد من في السموات والارض (اللہ کے لئے زمین وآسمانوں کی سب ہی چیزیں سجدہ کر رہی ہیں) پس سایوں کا زمین پر گرنا ان کا سجدہ ہے، غرض حقیقتِ نماز تمام خلائق میں مشترک ہے، حتی کی میں نے قصہ معراج کی ایک حدیث میں دیکھا:۔ قف يا محمد فان ربك يصلى جس سے معلوم ہوا کہ حقیقتِ نماز کا ایک وجود جناب باری تعالیٰ میں بھی ہے لیکن ظاہر ہے کہ صلوٰۃِ خالق اس کی شان کے مناسب ہوگی، اور صلوٰۃِ مخلوق اس کے حسبِ حال۔اسکی تفصیل پھر اپنے موقع پر ہوگی۔[1]

صلوٰۃِ خالق کے معنی بعض حضرات نے مخلوق کے حق میں رحمت وشفقت کے بھی کئے ہیں، لیکن ہم نے اوپر حضرت مجدد صاحبؒ کی تحقیق سے دوسرے معنی درج کئے ہیں، جو نہایت اعلیٰ غامض علمی تحقیق وتدقیق ہے، امید ہے کہ اہلِ علم ودانش اس کی قدر کریں گے۔

معراج ارواح مومنین

رسولِ اکرم ﷺ کی معراجِ اعظم واکمل کے صدقہ میں امتِ محمدیہ کے لئے بھی نماز ترقی مدارجِ اخروی کیلئے ان کی معراج ہی ہے، اسی لئے نماز کو معراج المومنین قرار دیا گیا ہے، اور یہ ہماری نماز صورۃً بھی حضور علیہ السلام کی معراجِ اعظم کی یادگار ہے، جس کی طرف اشارہ علامہ سہیلی وغیرہ نے کیا ہے، اور نماز کا آخری جز والتحیات بھی معراجِ اعظم ہی سے ماخوذ ہے، جس کو ہم آخر میں ذکر کریں گے۔

اس کے علاوہ حدیثِ طحاوی شریف مامن امرء مسلم يبيت طاهر اعلى ذكر الله الخ (جو مسلمان ذکر اللہ کے بعد طہارت کے ساتھ سوئے گا اور شب کے کسی حصہ میں بیدار ہوتے ہی اس کے منہ سے کوئی سوال دنیا وآخرت کے بارے میں نکلے گا تو حق تعالیٰ اس کا

---

[1] شرح المواہب ۹۴/۶ میں بھی ہے کہ جب حضور علیہ السلام کو قف يامحمد فان ربك يصلى کی صدا آئی تو آپ نے کہا کہ میرا رب تو اس سے مستغنی ہے کہ وہ نماز پڑھے، اس پر ندا آئی کہ بیشک میں غنی ومستغنی ہوں اس سے کہ کسی کے لئے نماز پڑھوں، جس سے کمال یا کوئی غرض حاصل کروں بلکہ میری صلوٰۃ کا مطلب دوسروں پر رحمت وفضل کرنا ہے بغیر اس کے کہ اس کے لئے کوئی مجھ پر جبر کرے، کیونکہ میں غنی مطلق ہوں اور میرے سوا کوئی الہ ومعبود نہیں، میں خود بھی اپنے بارے میں سبحانی سبحانی کہتا ہوں اور غیر لائق اِلوہیت چیزوں سے اپنی تنزیہ کرتا ہوں، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حضرت مجدد صاحبؒ والی توجیہ بھی اقوال سبحانی سبحانی سے نکل سکتی ہے، کہ حق سبحانہ کی اپنے بارے میں تسبیح وتحمید اور تنزیہ چونکہ بمرتبہ وجوب ہے، اس لئے وہ تسبیح وتحمید حادث وممکن سے ظاہر ہے کہ بدرجہا فائق ولائقِ ذاتِ واجب ہے۔اور حدیث اللهم لا احصى ثناء عليك الخ سے بھی اس کی تائید ہوچکی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔مؤلف

وہ سوال ضرور پورا کردیں گے اس پر علامہ محدث مناوی نے کہا کہ اس میں طہارت پر سونے کی شرط اس لئے لگائی گئی کہ اس طرح سونے کے باعث مومن کی روح کو معراج حاصل ہوتی ہے اور وہ عرشِ الٰہی کے نیچے جا کر سجدہ کرتی ہے، جو حق تعالیٰ کے مواہب وعطیات کا مصدر ومنبع ہے، پس جو شخص طہارت پر نہیں سوئے گا۔ وہ اس مقام خاص تک نہ پہنچ سکے گا، جس سے فیض وانعام حاصل ہوتا ہے، چنانچہ بیہقی کی حدیث ہے کہ ارواح کو سونے کی حالت میں عروج کرایا جاتا ہے اور ان کو حکم ہوتا ہے کہ عرش کے قریب جا کر سجدہ کریں، اور جو طاہر نہ ہوگا وہ عرش سے دور رہ کر سجدہ کرے گا) اِس حدیث سے وضو کا سونے کے وقت مستحب ہونا معلوم ہوا۔ (امانی الاحبار ۳۴/۲)

تیمّم وقت نوم! پہلے ہم یہ تحقیق فقہاء سے نقل کر چکے ہیں کہ جن امور کے لئے وضو وطہارت واجب وضروری نہیں ہے، ان کے لئے بجائے وضو کے تیمّم بھی کافی ہے، اس لئے امید ہے کہ سونے کے وقت بھی وضو نہ ہوسکے تو تیمّم ہی کرلیا جایا کرے، اس سے بھی فضیلتِ مذکورہ حاصل ہو جائے گی۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

التحیات یادگارِ معراج

حضرت العلامۃ المحدث ملا علی قاریؒ نے لکھا:۔ ابن الملک نے کہا کہ روایت ہے۔ حضور علیہ السلام کو جب عروج کرایا گیا تو آپ نے ان کلمات کے ساتھ حق تعالیٰ کی ثناء وصفت بیان کی:۔ التحیات للہ والصلوات والطیبات (تمام قولی عبادات، تمام بدنی طاعات اور سب مالی خیرات ومبرات صرف خدائے تعالیٰ ہی کے لئے ہیں، (کسی دوسرے کے واسطے ہرگز نہیں) اس پر حق تعالیٰ جل ذکرہٗ نے ارشاد فرمایا:۔ السلام علیك ایها النبی ورحمة الله وبرکاته (آپ پر سلامتی ہو اے نبی! اور خدا کی رحمتیں و برکاتِ عالیہ بھی) حضور علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا:۔ السلام علینا وعلیٰ عباداللہ الصالحین (ہم پر بھی سلامتی ہو اور خدا کے نیک بندوں پر بھی) اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ کلمات ادا کئے: اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمد اعبدہٗ ورسولہ اسی سے السلام علیک ایھا النّبی! کی وجہِ خطاب بھی سمجھ میں آجاتی ہے، کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے واقعہ معراج کی نقل وحکایت کے طور پر ہے، جس کو آخرِ نماز میں رکھدیا گیا جو معراج المومنین ہے (مرقاۃ شرح المشکوۃ ۳۳۱/۲ طبع ملتان)۔

چار نہروں اور کوثر کا ذکر

سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کے بعد چار نہریں دیکھنے کا ذکر بھی احادیثِ معراج میں ملتا ہے، حافظؒ نے لکھا: بدءالخلق کی حدیث میں اصلِ سدرہ میں چار نہروں کے ہونے کا ذکر ہے، اور حدیث میں اسکی اصل (جڑ) سے نکلنے کا ذکر ہے،

اور مسلم کی حدیث ابی ہریرہؓ میں چار نہروں کے جنت سے نکلنے کا مذکور ہوا ہے، نیل، فرات، سیحان وجیحان، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ سدرہ کا تعلق جنت سے ہو، اور یہ چاروں نہریں اس کے نیچے سے نکلی ہوں، اس لئے ان کو جنت سے کہا گیا، آگے حدیثِ معراج میں یہ تفصیل ہے کہ باطنی دونہریں جنت میں چلتی ہیں، اور ظاہری دونوں (دنیا کے اندر چلنے والی) نیل وفرات ہیں۔ محدث ابن ابی جمرہؒ نے کہا باطن کی عظمت واہمیت معلوم ہوئی کہ اس کو دارالبقاء سے متعلق کیا گیا اور ظاہر کو دارالفناء سے، اور اسی لئے اعتماد بھی باطن پر ہی ہوا کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔ حق تعالیٰ تمہاری صورتوں اور ظاہر کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے قلوب اور باطن کو دیکھتا ہے حافظؒ نے لکھا کہ روایتِ شریک (کتاب التوحید) میں آئیگا کہ حضور علیہ السلام نے شبِ معراج میں دونہریں آسمانِ دنیا پر دیکھیں، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بتلایا کہ وہ نیل وفرات ہیں۔

اِن دونوں روایات میں جمع کی صورت یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے سدرہ کے پاس تو ان دونوں کو جنت کی دونہروں کے ساتھ دیکھا اور آسمانِ دنیا پر ان دونوں کو الگ سے دیکھا ہے، یہی ابن دحیہ کی رائے بھی ہے، نیز حدیثِ شریک میں یہ بات بھی آئے گی کہ آپ نے

آسمانوں پر چڑھتے ہوئے ایک نہر اور بھی دیکھی جس پر موتیوں اور زبرجد کا محل بنا ہوا تھا، اسکو ہاتھ لگایا تو اس سے مشک کی خوشبو مہکنے لگی، حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا تو بتلایا کہ یہی وہ کوثر ہے جو حق تعالیٰ نے آپ کے لئے تیار کر کے چھپا دی ہے، ابن ابی حاتم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کر کے آگے بڑھے تو ایک نہر پر پہنچے جس پر موتی، یاقوت وزبرجد کے خیمے لگے تھے اور نہایت خوبصورت سبز رنگ کے پرندے اس پر جمع تھے اور اس پر سونے چاندی کے پیالے، گلاس رکھے تھے، یہ نہر یاقوت وزمرد کے سنگریزوں پر بہتی ہے اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید تھا۔ میں نے ایک گلاس میں اسکا پانی لے کر پیا تو شہد سے زیادہ شیریں اور مشک سے زیادہ خوشبودار پایا۔

حدیث ابی سعید میں اس طرح ہے کہ وہاں ایک چشمہ دیکھا جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ جس سے دو نہریں نکلتی ہیں، ایک کوثر اور دوسری جسکو نہرِ رحمت کہا جاتا ہے الخ (فتح الباری ۱۵۱/۷) مزید تفصیل شرح المواہب ۸/۷ و ۹/۶ میں دیکھی جائے۔

ایک شبہ کا ازالہ! حضرتِ اقدس مولانا تھانویؒ نے لکھا کہ دوسری احادیث سے حوضِ کوثر کا جنت میں ہونا ثابت ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی اصل جنت میں ہے، لہذا یہاں حضور علیہ السلام نے اس کی شاخ دیکھی ہوگی، جیسا کہ اس کی ایک شاخ میدانِ قیامت میں بھی ہوگی۔

عطیہ اواخر آیات سورۂ بقرہ پر ایک نظر

حضور اکرم ﷺ کو شبِ معراج میں سیر ملکوت وآیاتِ کبریٰ کے ساتھ جو خصوصی عطیات وانعامات حاصل ہوئے، ان میں سے نماز کی عظمت واہمیت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے امتِ محمدیہ کے لئے خاص طور سے مغفرتِ کبائر ذنوب کا جو وعدہ وبشارتِ عظمیٰ ملی وہ بھی ظاہر سے بہت بڑی نعمت ہے، تیسری نعمت سورۂ بقرہ کی آخری آیات کا مضمون ہے، جس میں پہلے یہ بتلایا گیا کہ رسول اکرم ﷺ اور اُن کے ماننے والوں کا طریقہ اپنے رب کی طرف سے نازل شدہ ساری ہدایات کو بے چوں وچرا تسلیم کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے ساتھ اس کے فرشتوں، ساری کتبِ منزلہ اور تمام رسولوں پر بلاتفریق ایمان ویقین رکھنا بھی ہے، اور نہ صرف دل سے یقین کافی ہے بلکہ زبان سے بھی تسلیم واطاعت کا اقرار، مصیر الی اللہ کا یقین واقرار، اور اپنے گناہوں کے بارے میں مغفرت مانگتے رہنا بھی ضروری ہے، جیسا کہ پہلے بھی سب مقبول ونیک بندے ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ اِس کے بعد **ربنا لاتوء اخذنا!** سے آخر تک ایک خاص دعا تلقین کی گئی، جو زمانہ معراج کے لحاظ سے عجیب معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ دعا ہجرت سے تقریباً ایک سال قبل شبِ معراج میں عطا ہوئی، جبکہ مکہ معظمہ میں کفر واسلام کی آویزش اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکی تھی، مسلمانوں پر جو یک طرفہ مظالم کفارِ مکہ کی طرف سے ابتداءِ عہد نبوت سے لے کر اس وقت تک برابر کئے جا رہے تھے، ان میں روز بروز زیادتی ہو رہی تھی، بلکہ اب اُن مظالم ومصائب کا دائرہ حدودِ مکہ معظمہ سے بڑھ کر اطرافِ مکہ اور سرزمینِ عرب کے دوسرے خطوں تک بھی وسیع ہو چکا تھا، جس نے بھی کہیں پر اسلام قبول کیا، اس پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا، ایسی عام اور ہمہ گیر مصائب ومشکلات کے دور میں معراجِ اعظم کا واقعہ مبارکہ پیش آتا ہے، پھر بھی حق تعالیٰ کی طرف سے اِن حالات ومصائب کو ادنیٰ اہمیت نہیں دی گئی، بلکہ ساری توجہ ان مظلوم وبے کس مسلمانوں کی اس طرف مبذول کر دی گئی کہ اپنی خطاؤں لغزشوں، بھول اور غلطیوں کو حق تعالیٰ سے معاف کرائیں، اور اس امر سے پناہ مانگیں کہ کہیں اِن مصائب ومظالم سے بھی زیادہ کے ذریعہ ان کی مزید آزمائش نہ ہو جائے، جیسی اُن سے پہلی اُمتوں کے مسلمانوں کی ہو چکی ہے، بلکہ اس کا بھی خطرہ ہے کہ خیر الامم کے صبر ویقین کا امتحان کہیں ناقابلِ تحمل اور مافوقِ طاقتِ بشریہ مصائب وآلامِ دنیوی کے ذریعہ نہ ہو جائے، چنانچہ دعا میں التجا کی گئی کہ ایسی صورت پیش نہ آئے، پھر گناہوں اور لغزشوں کی مغفرت ومعافی اور مراحمِ خسروانہ کی درخواست پیش کرنے کی تلقین بھی ہو چکنے کے بعد آخر میں کفار کے مقابلہ میں نصرتِ الٰہیہ طلب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ مسلمانوں کو مصائب ومشکلات اور کفار ومشرکین کے بڑے سے بڑے مظالم ڈھانے کے وقت بھی جذباتی رنگ میں کوئی اقدام کرنے کی اجازت ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس قسم کی چیزوں کو صرف تقدیرِ خداوندی اور اس کی طرف سے امتحان وآزمائش سمجھ کر اپنے اصلاحِ ظاہر وباطن اور توجہ وانابت الی اللہ کی فکر کرنی چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یا تو معاصی وسیأت کی مغفرت مقصود ہے یا آزمائشِ ایمان وصبر کے ساتھ درجاتِ اخروی کی ترقی منظور ہے، اِس لئے اس کنج وکاؤ کی فکر میں نہ پڑنا چاہیے کہ وہ مصائب وآلام کیوں اور کس وجہ سے آرہے ہیں، بلکہ اہل ایمان کو اس وقت بھی اپنے بلند تر اخلاقی وروحانی کردار کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے مکی زندگی میں عمل کر کے دکھایا تھا۔

دیارِ حرب والے مسلمانوں کے لئے ہدایت

حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ میں اُن مسلمانوں سے بری ہوں۔ جو مشرکوں میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں، ان سے مراد وہ مشرکین وکفار ہیں، جو اہلِ اسلام سے بغض وعناد رکھتے ہیں، اور اُن کی جان ومال، عزت وآبرو اور دین وملت سے دشمنی رکھتے ہیں، ان کو اپنے ملک ووطن سے نکالنے کے درپے ہوتے ہیں، اسی لئے قرآن مجید میں ایسے کفار ومشرکین سے موالات اور دوستی، تعلق ویگانگت کا رشتہ رکھنے سے روکا گیا ہے، اور ایسے لوگوں سے ترکِ موالات کرنے میں کسی مداہنت کو بھی جائز نہیں رکھا گیا، اس لئے جو مسلمان ایسے کفار ومشرکین سے بھی موالات رکھیں، اور ان پر اعتماد کریں، اور اُن کے دست وبازو بنیں وہ عتابِ دنیوی وعذابِ اخروی کے مستحق ہوتے ہیں، ان کو اپنی اس بے اعتدالی اور خطا پر نادم ہو کر حق تعالیٰ سے معافی طلب کرنی چاہیے اور **ربنالاتؤاخذنا ان نسبنا او اخطانا** (اے ہمارے رب! ہماری بھول چوک اور خطاء و بے اعتدالی پر مواخذہ نہ فرما) اس دعا کا اچھی طرح سمجھ کر وِرد کرنا چاہیے، اس طرح عجب نہیں کہ حق تعالیٰ کی نظرِ کرم نہ صرف خطا کار مسلمانوں کے حال پر مبذول ہوجائے بلکہ ممکن ہے کہ وہ ظالم وجابر دشمنانِ اسلام ومسلمین (کفار ومشرکین) بھی رحمتِ حق سے نواز دیئے جائیں، جس طرح کفارِ مکہ نعمتِ اسلام سے سرفراز کردیئے گئے تھے،

حضرت علامہ عثمانیؒ نے آیت **عسی اللہ ان یجعل بینکم وبین الذین عادیتم منھم مودۃ (ممتحنہ)** کی تفسیر میں لکھا:۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت ورحمت سے کچھ بعید نہیں کہ جو آج بدترین دشمن ہیں، کل انھیں مسلمان کردے، اور اس طرح تمہارے اور اُن کے درمیان دوستانہ وبرادرانہ تعلقات قائم ہوجائیں، چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر ایسا ہی ہوا، تقریباً سب مکہ والے مسلمان ہوگئے اور جو لوگ ایک دوسرے پر تلوار اُٹھارہے تھے، ایک دوسرے پر جان قربان کرنے لگے اس آیت میں مسلمانوں کی تسلی کردی کہ مکہ والوں کے مقابلہ میں یہ ترکِ موالات کا جہاد صرف چند روز کے لئے ہے، پھر اس کی ضرورت نہیں رہے گی، چاہیے کہ بحالت موجودہ تم مضبوطی سے ترکِ موالات پر قائم رہو، اور جس کسی سے کوئی بے اعتدالی ہوگئی ہو (کہ کفار ومشرکین معاندین کے ساتھ کوئی موالات کی ہو یا ان پر اعتماد وبھروسہ کیا ہو) تو اس غلطی کو خدا سے معاف کرائے، وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (فوائد ۷۱۳)

آگے ارشاد ہے:۔ **لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم الآیہ** (اللہ تعالیٰ ان کفار کے ساتھ بہتر سلوک وانصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے لڑائی جھگڑا پسند نہیں کیا۔ اور نہ تم کو تمہارے گھروں اور شہروں سے اُجاڑنے کی کوشش کی، اللہ تو انصاف پسند لوگوں کو چاہتا ہے، ہاں! اللہ تعالیٰ ایسے کفار ومشرکین اور دشمنانِ دین وایمان سے موالات ودوستی کا تعلق رکھنے سے منع کرتا ہے جو تمہارے دین کی وجہ سے تم سے لڑے اور تمہیں گھروں سے نکالا اور اس کے لئے مظاہرے کئے جو مسلمان ایسے لوگوں سے بھی دوستی کریں، وہ بڑے ظالم وگنہگار ہیں۔

جب تک کسی دارالحرب کے بسنے والے مسلمانوں کے حالات بہتر وسازگار نہ ہوں، ان کو دینی ودنیوی اعتبار سے بہت ہی محتاط اورنہایت صبر وسکون کی زندگی گزارانی پڑتی ہے، ایک طرف اگروہ معاندین کے دل آزار اور دین دشمن رویہ کے باعث ترکِ موالات پر مجبور ہوتے ہیں، تو دوسری طرف وہ قومی وملکی بہی خواہی وخیر سگالی کے فرض سے بھی غافل نہیں رہ سکتے، کیونکہ اپنے وطن اور ہم وطنوں سے غداری ان کے لئے کسی طرح جائز نہیں ہے، دارالاسلام میں چونکہ اعلیٰ درجہ کی اجتماعی زندگی موجود ہوتی ہے، اس لئے وہاں بڑی ذمہ داری سربراہوں کے ذمہ پر عائد رہتی ہے لیکن دارالحرب میں اجتماعی زندگی بہت مضمحل اور کمزور درجہ کی ہوتی ہے اس لئے ذمہ داریوں کا بوجھ ہر ہر فرد اسلام کو اُٹھانا پڑتا ہے، اور اٹھانا چاہیے، ورنہ وہ بڑی تیزی سے زوال وفنا کے گھاٹ پر اُتر سکتے ہیں۔ **ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا۔**

تحقیق اعطاء ونزولِ خواتیم بقرہ

علامہ محدث ملا علی قاریؒ نے لکھا:۔ مراد عطاءِ خواتیم سے اِن دعاؤں کی قبولیت ہے، اگر کہا جائے کہ یہ تو بظاہر حدیثِ صحیح مسلم وغیرہ کے خلاف ہے، جس میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک روز حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی حالت میں اوپر سے کسی چیز کے اُترنے کی آواز سُنی، سر اٹھا کر دیکھا اور بتلایا کہ یہ فرشتہ آسمان سے اُترا ہے، جو آج کے سوا کبھی زمین پر نہیں اُترا پھر اُس فرشتے نے سامنے آکر حضور علیہ السلام کو سلام کیا اور کہا:۔ آپ کو دونوروں کی بشارت ہو جو صرف آپ کو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے گئے اور آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے، ایک سورۂ فاتحہ، دوسرے سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں، آپ اُن میں سے کوئی حرف نہیں پڑھیں گے کہ اس کی مراد آپ کو عطا نہ ہوگی۔ میں کہتا ہوں، کوئی منافات وخلاف نہیں ہے، کیونکہ شبِ معراج میں یہ عطیہ مذکورہ آسمان پر منجملہ **فاوحی الی عبدہ ما اوحی** حاصل ہوا ہے، جس کا قرینہ یہ ہے کہ پانچ نمازوں کا عطیہ بھی آسمانوں پر ہی مقام اعلیٰ میں عطا ہوتا تھا، اور ایک خاص معظم فرشتے کا بشارتِ مذکورہ کو لے کر اُترنا بھی اس کی عظمتِ شان اور حضور علیہ السلام کی خصوصی فضیلت وجلالتِ قدر کی دلیل ہے، (غرض وہ واقعہ آسمان اور وحیِ خصوصی کا اور یہ زمین اور وحیِ عمومی کے طریقہ کا تھا) البتہ یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ سورۂ بقرہ تو مدنیہ ہے اور معراج کا واقعہ بالاتفاق مکہ معظمہ کے زمانہ قیام کا ہے، اسکا ایک جواب تو یہ ہے کہ خواتیم بقرہ کو پوری سورت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ لہذا اس سورت کو اکثر اجزاء کے لحاظ سے مدنیہ کہا گیا۔ ابن الملک نے حسن اور ابن سیرین ومجاہد سے نقل کیا ہے کہ شبِ معراج میں ان آیات اواخر سورۂ بقرہ کی وحی بلا واسطہ جبرئیل علیہ السلام کی ہے، لہذا یہ آیات اُن حضرات کے نزدیک مکیہ ہیں، دوسرا جواب جمہور کے اِس قول کی بنا پر کہ سورۂ بقرہ پوری مدنیہ ہے، علامہ محقق ومحدث تورپشتی[1] حنفیؒ (شارحِ مشکوٰۃ) نے دیا کہ شبِ معراج میں ان آیات کی عطاء سے ان کا نزول ثابت نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ کہ آخری دوآیتوں میں جو طلبِ مغفرت سے آخر تک کا مضمون ہے اس کی تلقین کے ذریعہ آپ کے لئے اور آپ کی امت کے لئے سوالیوں کے واسطے جو اس کا حق ادا کریں گے، قبولیتِ دعا کا یقین دلایا گیا ہے۔

---

[1] علامہ تورپشتی کو طبقاتِ شافعیہ میں بھی ذکر کیا ہے، جس کی وجہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بطور مزاح فرمایا کرتے تھے کہ شافعیہ نے خیال کیا ہوگا کہ کوئی بڑا محقق محدث تو حنفی ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے لامحالہ تورپشتی جیسا محدث اکبر شافعی ہی ہوسکتا ہے اور بلاتحقیق مزید ان کو طبقاتِ شافعیہ میں شامل کر دیا، اور یہ بھی نہ سوچا کہ علامہ کی شرح مشکوٰۃ کا جو مطالعہ کرے گا، وہ ان کے حنفی ہونے کا فیصلہ کرے گا یا شافعی ہونے کا، بہر حال یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ علامہ تورپشتی بہت بڑے محدث محقق اور حنفی المسلک ہیں، (م ۶۶۱ھ) رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

[2] مقدمہ انوار الباری ۱۲۰/۲ میں آپ کا ذکر ہے، لیکن تعجب ہے کہ تذکرۃ الحفاظ ذہبی، الرسالۃ المستطرفہ اور الفوائد البہیہ وغیرہ میں ایسی جلیل القدر محدث کا ذکر نہیں ہے ورنہ شروح وحواشیِ مشکوٰۃ شریف کی ابتداء میں آپ کا تذکرہ ہے حالانکہ ان میں آپ کی تحقیقات بہ کثرت نقل ہوئی ہیں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظِ حدیث تورپشتی فقہ میں بھی پورے ضابطہ ہیں۔ اور علمِ عقائد میں بھی بہت عمدہ کتاب لکھی ہے۔ میرے پاس موجود ہے اور کشمیر میں پڑھائی جاتی ہے۔ مؤلف

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے کہا:۔کہ اس کلام سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اعطاء نزول کے بعد ہوا ہے کیونکہ مراد اس سے استجابتہ لی گئی، جو طلب کے بعد ہوا کرتی ہے، حالانکہ سورت مدنی ہے اور معراج اس سے پہلے مکہ معظمہ میں ہوئی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو از قبیل **فاوحی الی عبده ما اوحی** کہا جائے، اور نزول بالمدینہ کو از قبیل **وما ینطق عن الهوی ان هو الا وحی یوحیٰ علمه شدید القویٰ** قرار دیا جائے۔ ملا علیٰ قاری نے لکھا:۔اس کا حال یہ ہے کہ اس میں تعظیم واہتمام شان کیلئے وحی کا تکرار واقع ہوا ہے، یعنی شب معراج میں تو بلا واسطہ ان آیاتِ اواخر بقرہ کی وحی آپ پر کی گئی، پھر مدینہ طیبہ میں بواسطہ جبرئیل علیہ السلام وحی کی گئی اور اس سے یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح رہے گی کہ تمام قرآن مجید کا نزول بواسطہ جبرئیل علیہ السلام ہوا ہے، جسکی طرف حق تعالیٰ کا اشارہ اس آیت سے ہوا۔ **نزل به الروح الامین علیٰ قلبك لتکون من المنذرین** اور ممکن ہے کہ کلام شیخ (تور بشتی) کا مطلب یہ لیں کہ اعطاء سے مراد دونوں آیتوں کے مضمون کی استجابت ہے۔ اور یہ نزولِ آیات بعد الاسراء کے منافی نہ ہوگا۔

اس سے علامہ ملا علی قاریؒ نے علامہ طیبیؒ کو اس نقد کا جواب دیا ہے، جو انہوں نے شیخ تور بشتی پر کیا تھا، اور ہمارے نزدیک بھی شیخ کی عبارت کا مطلب یہی زیادہ صحیح ہے جو محقق قاریؒ نے سمجھا اور بیان کیا۔

یہاں علامہ طیبیؒ نے لفظ اعطاء اختیار کرنے کی وجہ بھی لکھی کہ خواتیم سورۂ بقرہ کو حدیث میں کنز تحت العرش سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ امام احمدؒ کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔مجھ کو عرشِ الٰہی کے نیچے کے خزانہ میں سے آیات خواتیم سورۂ بقرہ کی عطاء کی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کی گئیں، اور یہ بھی ماثور ہے کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ کو حق تعالیٰ جل ذکرہ کی طرف سے دو مقام ایسے حاصل ہوئے ہیں، جن پر اوّلین و آخرین رشک و غبطہ کریں گے، ایک دنیا میں دیا گیا، شبِ معراج میں، دوسرا آخرت میں ملے گا، یعنی مقام محمود اور دونوں جگہ آپ نے بجز امتِ محمدیہ مرحومہ کے اور کسی امر کا فکر و اہتمام نہیں فرمایا۔ (مرقاۃ ۴۳۷/۵)

سیرِ **جنت!** حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سدرۃ المنتہیٰ کے بعد میں جنت میں داخل کیا گیا، میں نے دیکھا کہ (اس کے محلات کے دروازوں اور کھڑکیوں پر) موتیوں کی لڑیاں آویزاں تھیں (حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔جس طرح سورت و بمبئی کے علاقوں میں مالدار لوگ گھروں کے دروازوں پر زینت کے لئے رنگارنگ موتیوں کی لڑیوں سے بنے ہوئے پردے ڈالتے ہیں، اسی طرح محلاتِ جنت کے دروازے اور دریچے مزیّن ہوں گے، اور وہاں کی مٹی مشک کی تھی، (بخاری و مسلم)

محقق عینی و حافظؒ نے لکھا کہ جن حضرات نے اس روایتِ حبائل کو صحیح قرار دیا ہے، انہوں نے اس سے مراد موتیوں کے ہار اور قلائد مراد لئے ہیں، یا حبال الرمل سے ماخوذ بتلایا، جمع حبل کی بمعنی ریت کا لمبا سلسلہ، یعنی جنت میں (صحراؤں کے) حبال الرمل کی طرح (بہ کثرت) موتیوں کے حسین و خوشنما تختے تھے، ابن الاثیر نے کہا کہ اگر حبائل کی روایت صحیح مان لی جائے تو یہ مراد ہوگی کی حبال الرمل کی طرح اونچے اونچے ٹیلے موتیوں کے تھے، یا حبلہ سے لیا جائے جو ایک قسم کا زیور ہوتا تھا لیکن صاحبِ تلویح اور دوسرے بہت سے ائمہ حدیث کی رائے ہے کہ یہ سب تخیلِ ضعیف ہے بلکہ کاتب کی تصحیف ہے، کیونکہ صحیح طور سے حبائل صرف حبالہ یا حبلہ کی جمع بن سکتا ہے۔

دوسری روایت زیادہ صحیح و قوی بجائے حبائل کے جنابلہ ہے، جیسا کہ آگے احادیث کتاب الانبیاء (بخاری ۴۷۱) میں آئے گا۔ **فاذا فیها جنابذ اللؤلؤ** (روایت عبداللہ بن مبارک وغیرہ باب ذکر ادریس) محقق عینیؒ نے لکھا کہ روایت اصیلی میں زہری سے **دخلت الجنة فراء یت جنابذ من اللؤلؤ** مروی ہے، جنابذ جُنبذ کی جمع ہے، قبہ کی طرح ہر مرتفع و بلند چیز کو کہتے ہیں، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ فارسی سے معرب ہے، اور عجمی زبان میں گنبد مراقبہ کو کہتے ہیں (عمدہ ۲۰۳/۲ و فتح ۳۱۶/۱)۔

یعنی محلاتِ جنت کے گنبد مروارید کے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک موتی کا ایک گنبد سالم تھا۔ ملا علی قاری نے لکھا:۔جنت کی

مٹی مشک کی ہوگی، جوسب سے بہتر خوشبودار چیز مانی جاتی ہے، اور حدیث میں ہے کہ خوشبوئے جنت کی مہک پانچ سوسال کی مسافت تک پہنچے گی۔

جنت کا وجود! امام بخاریؒ نے کتاب بدء الخلق (۴۵۹) میں مستقبل باب صفة الجنة اوراس کے مخلوق وموجود ہونے کے بارے میں قائم کیا، اوراسی طرح مستقل باب (۶۱ء میں) صفتِ ابوابِ جنت کالائے، پھر ۶۱ ہی میں باب **صفة النار وانها مخلوقة** لائے (دوزخ کا حال اور یہ کہ وہ بھی موجود مخلوق ہے) اسکے بعد کتاب الرقاق میں بھی **باب صفة الجنة والنار** (۹۱۹ میں) ذکر کیا۔

محقق عینیؒ وحافظ نے لکھا کہ جنت ونار کے مخلوق وموجود ہونے کوامام بخاریؒ نے اس لئے ثابت کیا ہے کہ فرقہ معتزلہ نے اس سے انکار کیا ہے، انہوں نے کہا کہ جنت کا وجود روزِ قیامت سے پہلے نہ ہوگا، اور ایسے ہی دوزخ کے بارے میں اُن کا عقیدہ ہے کہ وہ قیامت کے دن پیدا کی جائے گی، حافظؒ نے یہ بھی لکھا کہ امام بخاریؒ نے جواحادیث اُن کے مخلوق وموجود ہونے کے ثبوت میں پیش کی ہیں، اُن میں سے بھی زیادہ صراحت اس بارے میں امام ابوداؤد[۱] وامام احمدؒ کی روایت کردہ حدیث میں ہے۔ جوقوی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے (فتح ۱۹۹/۶، عمدہ ۱۴۶/۱۵) آگے حافظؒ نے **واتوابه متشابها يشبه بعضه بعضا ويختلف فى الطعمه** کے تحت لکھا کہ اس کا مطلب حضرت ابن عباسؓ کے قول کی طرح ہے کہ جنت کے پھلوں میں دنیا کے پھلوں کے لحاظ سے صرف نام کی شرکت ہے، یعنی نام اور ظاہری صورت توایک ہوگی لیکن مزہ الگ ہوگا حسن نے متشابہا کے معنی یہ کئے کہ وہ سب بہتر قسم کے ہوں گے، جن میں کوئی خرابی نہ ہوگی۔ (فتح ۲۰۰/۶)

سیرت کی بعض اردو کتابوں حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر مذکور، اور حدیث قدسی **اعددت بعبادى الصالحين مالا عين ارت** الخ اور آیتِ قرآنی **فلا تعلم نفس ما اخفى لهم من قرة اعين** سے بظاہر یہ سمجھا گیا کہ جنت کی چیزوں کی حقیقت ہی یہاں کی چیزوں سے الگ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کوایک مخفی حقیقت فرمایا ہے، یا یہ کہ آخرت میں اہل جنت کے لئے جن باغوں اور نہروں کی بشارت دی گئی ہے وہ حقیقت میں ان کے ایمان واعمالِ صالحہ کی تمثیلی شکلیں ہوں گی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی بہشت کی صفت قرآن مجید میں **ان لك الا تجوع فيها ولا تعرى الايه** سے بیان ہوئی ہے تو وہ اس سے مندرجہ ذیل تحقیق اخذ کی گئی:۔ یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جوپھیل کرایک دنیا ہوگئی ہیں، جب آدم کی اولاد کواپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت نجات ملے گی تو پھران کے لئے وہی بہشت ہے جس میں نہ بھوکا ہونا ہے نہ پیاسا ہونا، نہ ننگا ہونا نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر دوطرح سے کی جاسکتی ہے، یا تو بہشت میں اہل بہشت تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک وبے نیاز ہوجاتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہاں کے الوانِ نعمت کھا کرانسان پھر بھوکا نہ ہوگا، اور شراب وشربت پی کر پھر پیاسا نہ ہوگا۔ الخ

---

[۱] حافظؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، ہم اس کو پورانقل کرتے ہیں، امام ابوداؤد نے باب فى خلق الجنة والنار قائم کرکے صرف یہی ایک حدیث روایت کی ہے:۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ اللہ تعالیٰ نے جب جنت کوپیدا کیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا، جاؤ! جنت کودیکھ کرآؤ! وہ گئے، اس کودیکھا اورلوٹ کرعرض کیا اے رب! قسم آپ کی عزت وجلال کی، اس کے حالات جوبھی سُنے گا وہ ضروراس میں داخل ہوگا (یعنی نیک اعمال کرکے) اس پر حق تعالیٰ نے جنت کے اردگرد تکالیف ومصائب کی باڑلگادی (کہ بظاہر مصائب وآلام اور تکالیف شاقہ ہیں اوراُن کے پسِ پردہ جنت کی نعمتیں اور ہمیشہ کی راحت وتنعم کی زندگی ہے) پھر حضرت جبرئیل سے فرمایا کہ اب پھر جا کر جنت کودیکھو! وہ گئے اس کوباہر اندر سے پھر دیکھا، اورلوٹ کرعرض کیا، اے رب قسم آپ کے عزت وجلال کی، مجھے ڈر ہے کہ اس میں کوئی ایک شخص بھی نہ جاسکے گا، (کیونکہ بظاہر اور باہر سے دیکھنے میں اس کے اندر داخل ہونے کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی جاذبیت نہیں ہے، بلکہ تکالیف ومصائب کی زندگی اختیار کرنے کودنیا میں کوئی بھی تیار نہ ہوگا) پھر جب دوزخ کوپیدا فرمایا تو اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ جاؤ! دوزخ کودیکھ کر آؤ! انہوں نے جا کر وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا اورلوٹ کرعرض کیا اے رب! آپ کی عزت وجلال کی قسم اس کے احوال سُننے کے بعد کوئی بھی اس میں داخل نہ ہوگا، اس کے بعد حق تعالیٰ نے اسکے چاروں طرف شہوات کی باڑلگادی (کہ بظاہر خواہشاتِ نفسانی کے مطابق چندروزہ لطف ومسرت اور آرام وراحت کی چیزیں ہیں اوراس کے اندر ہمیشہ کیلئے سخت تکالیف وآرام کی زندگی ہے) حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ پھر جا کر دیکھو! انہوں نے جا کر دیکھا اور لوٹ کرعرض کیا اے رب! آپ کے جلال وعزت کی قسم مجھے ڈر ہے کہ اس میں داخل ہونے کا استحقاق ہر شخص حاصل کرکے رہے گا اور کوئی بھی نہ بچے گا جو اس میں داخل نہ ہو۔ (ابوداؤد ۲۹۲/۲)

ہماری انسانی فطرت چونکہ دنیاوی عیش و تنعم کے ساز و سامان ہی سے لطف و مسرت حاصل کرنے کی عادی ہو چکی ہے اس لئے جنت میں جو چیزیں ملیں گی وہ بھی ان ہی عادی و مانوس اسبابِ مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔ بحوالہ مشکوٰۃ شریف (صفة الجنة) حدیثِ ابی ہریرہؓ پیش کی گئی کہ جنت میں کم سے کم رتبہ والے جنتی سے بھی حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر، وہ کرے گا تو خدا فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب دیا گیا جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اس کے برابر اور یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ وہاں کمی کس چیز کی ہوگی، بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی۔ (الا الصور من الرجال)

جنت میں اہل جنت کے مختلف رتبے ہوں گے، اس لئے اعلیٰ کے سامان و لباس کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا خیال ہوگا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دیا جائے گا کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے (حتی یتخیل الیہ) (بحوالہ ترمذی شریف)۔

جنت کے ارتقائے روحانی ہونے کو اس طرح ثابت کیا گیا کہ مادّی و جسمانی خلقت و فطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا۔ قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں:۔ الذین یرثون الفردوس هم فیها خالدون، ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طین ثم جعلناه نطفة الآیہ (سورۂ مومنون) جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیت پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کی معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی صدہا ہزار ہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع ملکوتی کا ظہور ہوگا، اسی کے ساتھ مسئلہ ارتقاء کے دوسرے اصول بقائے اصلح کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔

نقد و نظر! اوپر کی چیزیں اہل علم و تحقیق کے غور و فکر کے لئے مختصراً پیش کر دی گئیں، اور چونکہ اپنے ناقص مطالعہ و تحقیق کے تحت بعض اجزاء ہماری نظر میں کھٹکے، اس لئے ان کا ذکر بغرض بحث و تمحیص موزوں نظر آیا، ہمارے نزدیک جنت مع اپنے لوازم و نعم کے پہلے سے مخلوق و موجود ہے۔ اسی طرح دوزخ بھی اپنے لوازم محن و مصائب و سامان عذاب کے ساتھ پہلے سے مخلوق و موجود ہے اور ہمارے اچھے و برے عقائد و اعمال کے ذریعہ جو تمثیلی طور پر ان دونوں مقاموں میں سامانِ راحت و عذاب ظہور پذیر ہوتا ہے، وہ سامانِ سابق پر اضافہ ہے، اس لئے آخرت کے ان دونوں مقامات کی ساری نعمتوں و نقمتوں کو صرف ہمارے عقائد و اعمال کی تمثیلی اشکال قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے اس تحقیق کو زیادہ معقول سمجھ کر اختیار کیا گیا ہو، مگر ہمارے نزدیک یہ منقول کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ جس حدیثِ ابی داؤد و مسند احمد کا ذکر ہم نے اوپر حافظ ابن حجرؒ کے حوالہ سے کیا ہے، اور جس کو حافظ صاحب موصوف نے جنت و جہنم کے پہلے سے مخلوق و موجود ہونے کے ثبوت میں امام بخاریؒ کی حدیث سے بھی زیادہ صریح قرار دیا ہے، اسکی تخریج کا حوالہ حافظ نے دوسری جگہ ابوداؤد کے علاوہ نسائی، ابن حبان وحاکم کا بھی دیا ہے (کمافی تحفۃ الاحوذی ۳۳۷) اور یہ حدیثِ ترمذی شریف باب ماجاء حفت الجنة بالمکارہ میں بھی ہے، جس کا حوالہ حافظؒ نے نہیں دیا، اور یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس میں یہ زیادتی بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے جنت و دوزخ کو پیدا کر کے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو جنت کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ اسکو جا کر دیکھو، اور ان نعمتوں کا بھی مشاہدہ کرو جو میں نے اہل جنت کے لئے اس میں تیار کی ہیں اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جنت کو بھی دیکھا اور ان چیزوں کو بھی جو حق تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے اس میں تیار کی تھیں، پھر جب دوزخ کی طرف بھیجا تو اس وقت بھی فرمایا کہ اس کو جا کر دیکھو، اور ان چیزوں کو بھی جو میں نے اہلِ جہنم کے لئے بطور سامانِ عذاب تیار کی ہیں الخ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا۔

ایک شبہ کا ازالہ! اس سے واضح طور سے معلوم ہوا کہ جنت و دوزخ اپنے سامان واسبابِ راحت وتکلیف کے ساتھ پہلے سے موجود ہیں اس پر شبہ ہوسکتا ہے کہ امام ترمذیؒ نے باب **ماجاء فی فضل التسبیح والتکبیر والتھلیل والتحمید** کے تحت حدیثِ ابن مسعودؓ روایت کی ہے کہ شبِ معراج میں حضور اکرم علیہ السلام کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی تو انہوں نے آپ سے یہ بھی فرمایا:۔ میری طرف سے اپنی امت کو سلام پہنچا کر ان کو یہ خبر دیں کہ جنت کی مٹی بہت پاکیزہ اور خوشبودار ہے (کہ وہ مشک وزعفران کی ہی اور اس کا پانی شیریں ہے اور وہ جنت چٹیل میدان ہے، اس کے پودے اور درخت (کلماتِ طیبات) سبحان اللہ، الحمد اللہ، اور لا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہیں ، یعنی یہ اور ان جیسے دوسرے کلمات دخولِ جنت اور وہاں کے محلات میں کثرتِ اشجار کا سبب ہیں، جتنی کثرت ان کی ہوگی، وہاں کے باغ باغیچوں کی رونق بڑھے گی، اس سے معلوم ہوا کہ جنت کا رقبہ چٹیل میدان ہے، وہاں باغات ومحلات نہیں ہیں، علامہ طیبیؒ نے بھی یہ اشکال ذکر کیا ہے اور لکھا کہ یہ قولِ باری تعالیٰ **جنات تجری من تحتھا الانھار** کے خلاف ہے، جس سے معلوم ہوا کہ وہ اشجار وقصور سے خالی نہیں ہیں، کیونکہ جنت ان کا نام ہی اس لئے رکھا گیا کہ ان میں گھنے سایہ دار درخت ہیں جن کی ٹہنیاں اور شاخیں بہت قریب قریب اور ملی ہوئی ہیں صاحبِ تحفۃ الاحوذی نے ۴/۲۴۹ میں حدیث مذکورہ بالا کے تحت علامہ طیبیؒ کے حوالہ سے یہ اشکال اور اس کا جواب نقل کیا ہے، پھر قال القاری الخ سے ملا علی قاری کی ناقص عبارت ذکر کی ہے، جس سے وہم ہوتا ہے کہ ذکر کردہ جواب کو انہوں نے پسند کر کے بحث ختم کر دی ہے، حالانکہ اپنا جواب انہوں نے بعد کو ذکر کیا ہے، اس لئے تکمیلِ فائدہ کے لئے ہم پوری بات مرقاۃ شرح مشکوٰۃ سے نقل کرتے ہیں:۔ علامہ طیبیؒ نے اشکال مذکور کا یہ جواب دیا ہے کہ ابتدا میں تو جنت چٹیل میدان ہی تھا، پھر حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے اعمالِ عاملین کے مطابق اس میں اشجار وقصور پیدا کر دیئے، یعنی ہر عمل کرنے والے کے لئے اس کے خصوصی اعمال کے مناسب، پھر جب حق تعالیٰ نے ہر شخص کے لئے وہی اعمال آسان کر دیئے جن کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، تاکہ اُن اعمال سے وہ اپنا ثواب حاصل کرے، تو ان اعمال کو ہی مجازاً اُن اشجار کا لگانے والا قرار دیا گیا، گویا سبب کا اطلاق مسبب پر کیا گیا، دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ حدیثِ مذکور سے جنت کے اشجار وقصور سے بالکلیہ خالی ہونے کا ثبوت نہیں ہوتا، کیونکہ چٹیل میدانوں کے وجود کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ گو عظیم جنت کے اکثر حصوں میں اشجار وقصور ہیں مگر پھر بھی بہت سے حصے ان سے خالی ہیں، جن میں ان کلمات طیبہ کے ذریعہ باغ وبہار کی رونق آئے گی حافظ ابن حجرؒ نے کہا:۔ حاصل یہ ہے کہ جنت کے اکثر حصے تو ان کلمات کے علاوہ دوسرے اعمالِ صالحہ کے سبب سے اشجار وقصور کے ذریعہ آباد تھے ہی باقی حصوں کا ان کلمات کے سبب آباد ہونا بتایا گیا تاکہ ان کلمات کا ثواب ان کی عظیم فضیلت کے تحت دوسرے اعمال کے ثواب سے الگ اور ممتاز معلوم ہوا۔ اسکو نقل کر کے محدث ملا علی قاریؒ نے ریمارک کیا کہ اس کو ایک یا دونوں جوابوں کا حاصل قرار دینے میں نظر ظاہر ہے، اس پر تامل کرنا چاہیے۔ اور میرے دل میں جواب یہ آتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم کہ سب سے کم مرتبہ والے اہل جنت کو دو دو جنت ملیں گی، چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا **ولمن خاف مقام ربه جنتان** لہٰذا کہا جائے گا کہ ایک جنت تو وہ ہوگی جس میں اشجار وانہار، حور وقصور وغیرہ بطریقِ فضلِ خداوندی پیدا شدہ ہوں گے، دوسری جنت وہ ہوگی، جس میں یہ سب چیزیں اعمال واذکار کی وجہ سے بطورِ عدل پائی جائیں گی۔ (مرقاۃ ۳/۵۶ مطبوعہ بناء سورتی بمبئی)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جنت کے اشجار وقصور وغیرہ سے معمور وآباد ہونے اور بالکلیہ خالی نہ ہونے کی دلیل حدیثِ طبرانی سے بھی ملتی ہے، جو حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسولِ اکرم علیہ السلام سے سُنا، فرماتے تھے کہ جنت میں چٹیل میدان بھی ہیں، لہٰذا ان میں کثرت سے پودے لگاؤ، صحابہ نے عرض کیا کہ اس کے پودے کیا ہیں؟ تو فرمایا، سبحان اللہ والحمد اللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر (تحفہ ۴/۲۴۹)۔ اس حدیث میں بجائے **واتھا قیعان** کے **فیھا قیعان** ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ساری جنت قیعان نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ حصے قیعان ہیں۔ **کما لا یخفی، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمه اتم واحکم!**

نعمائے جنت کا مادی وجود

اوپر کی وضاحت وتصریحات سے یہ بات بھی ضمناً معلوم ہوگئی کہ جنت میں جو نعمتیں ہیں ان کا مادی وحقیقی وجود ہے اور وہ صرف تمثیلی اشکال وصور نہیں ہیں، اوپر کی احادیث میں ہے کہ محلات جنت کے گنبد مروارید کے ہیں، اور ان کے کمروں کے دروازوں پر موتیوں کی چکیں آویزاں ہیں، مشکوٰۃ شریف باب صفۃ الجنۃ میں متفق علیہ وحدیث ہے کہ جنتِ مومن کا پورا خیمہ صرف ایک جوف دار موتی کا ہوگا، اور دو جنت ہونگی جن میں سب سامانِ آرائش واستعمال چاندی کا ہوگا، اور ایسی ہی دو جنت سونے کی ہوں گی، اور جنت عدن میں جگہ پانے والوں کے لئے یہ نعمتِ عظمیٰ بھی حاصل ہوگی کہ ان کے اور دیدارِ خداوندی کے درمیان صرف رداءِ کبریا کا پردہ باقی رہے گا، حدیثِ مسلم میں ہے کہ اہل جنت کھائیں گے، پئیں گے۔ لیکن بول وبراز نہ ہوگا، صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ کھانے کا کیا ہوگا؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا، وہاں صرف ڈکار اور پسینہ مشک کی خوشبو والا ہاضمہ کی علامت ہوگی، اور وہاں سانس کے ساتھ بلا تکلّف تسبیح وتحمید جاری ہوگی، دوسری حدیثِ مسلم میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔ جنت میں منادی اعلان کر کے سب اہل جنت کو بتلا دے گا کہ یہاں تمہارے لئے ہمیشہ کے واسطے صحت وتندرستی ہے کبھی بیمار نہ ہوگے، ہمیشہ جوان رہو گے، بڑھاپا نہ آئے گا، راحت وعیش میں رہو گے کبھی تکلیف ومصیبت نہ آئے گی دائمی زندگی ہے، موت نہ آئے گی۔

یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ جنتی کے کپڑے پُرانے نہ ہوں گے، مطلب یہ ہے کہ جب تک کسی کپڑے کو بدن پر رکھے گا اس کی زینت کم نہ ہوگی، یعنی دنیا کی طرح اس میں ذرا سا بھی پُرانا پن یا میلا پن ظاہر نہ ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ صرف ایک لباس پہنے رہے گا جو کبھی پُرانا نہ ہوگا، کیونکہ جنت میں نہ کسی امر کی پابندی ہوگی نہ کسی چیز کی کمی ہوگی، اسی طرح جنت میں بھوک پیاس کی تکلیف نہ ہوگی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں بھوک پیاس نہ لگے گی، اگر ایسا ہوتو پھر کھانے پینے کا لطف ہی کیا ہوگا؟ جن لوگوں نے خیال کیا کہ جنت میں مادّی چیزیں نہ ہوں گی اور صرف تمثیلی اشکال وصور سے روحانی لذت اندوزی ہوگی، انہوں نے ان احادیث کا یہی مطلب سمجھا کہ جنت میں نہ بھوک ہوگی نہ پیاس نہ کپڑے پُرانے ہونگے اس لئے ایسی چیزوں کا دنیا کی طرح مادّی وجود بھی نہ ہوگا، حالانکہ یہ خیال قطعاً غلط ہے، اور جنت میں دنیا کی طرح ہر قسم کے لذائذ مادّی وروحانی حاصل ہوں گے، ترمذی کی حدیث میں ہے کہ جنت میں ایک مومن کو ایک سو مردوں کی قوتِ رجولیت حاصل ہوگی، اور امام نسائی واحمد کی روایت میں ہے کہ اہل کتاب میں سے ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور کہا:۔ کیا آپ فرماتے ہیں کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں! بخدا ایک جنتی کو کھانے پینے اور جماع کی قوت ایک سو آدمیوں کے برابر ملے گی، اس نے کہا کہ جو کھاتا پیتا ہے اس کو بول وبراز کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اور جنت میں گندگی نہ ہوگی؟! اس پر حضور علیہ السلام نے جواب دیا کہ وہاں یہ ضرورت صرف پسینہ نکلنے سے پوری ہوگی، جس سے پیٹ خالی ہوجایا کرے گا اور ان کے جسموں سے نکلنے والا وہ پسینہ مشک کی طرح خوشبودار ہوگا، منذری نے کہا کہ اس حدیث کے سب راوی ایسے ہیں جن سے صحیح میں احتجاج کیا گیا اور اس کی روایت طبرانی نے بھی اسنادِ صحیح سے کی ہے۔ نیز اسکی روایت ابن حبان وحاکم نے بھی کی ہے (تحفہ ۳/۳۲۷)

اقسامِ نعمائے جنت

جنت جس کا مستحق ہر مومن محض فضلِ خداوندی سے حسب اخبار ووعدہ خداوندی **ان الله اشترىٰ من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة** الایہ کے ذریعہ بن چکا ہے، اس میں جتنی اقسام کی نعمتیں آخرت میں حاصل ہونے والی ہیں، ان کا کچھ اجمالی خاکہ حسبِ ترتیب قرآن مجید ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

آیاتِ قرآنی اور نعمتوں کی اقسام

(۱) **وبشرالذین آمنوا وعملواالصالحات تا وھم فیھا خالدون** (بقرہ۔رکوع ۳)
باغات وانہار پھل اور میوے دنیا جیسے، خوبصورت ونیک سیرت بیویاں، ابدی زندگی۔

(۲) **ورضوان من اللہ** (آل عمران ۲۰) **رضی اللہ عنھم ورضواعنہ** (آخرِ مائدہ)
رضائے خداوندی۔ اہل جنت کا بھی اپنے آقا ومولیٰ سے خوش ہونا۔

(۳) **لھم دارالسلام عند ربھم** (انعام۔۱۵) مکمل سلامتی کا محل ومقام، قربِ خداوندی۔

(۴) **ونزعنا مافی صدورھم من غل** (اعراف۔۵) جنتیوں کا باہم سلیم الصدر وصاف سینہ ہونا۔

(۵) **یبشرھم ربھم برحمتہ تانعیم مقیم** (توبہ۔۳) رحمتِ خداوندی، پائدار ودائمی نعمت۔

(۶) **ومساکن طیبۃ فی جنات عدن** (توبہ۔۹) ہمیشگی کے باغوں میں پاک مسکن اور ستھری قیام گاہیں۔

(۷) **والملائکۃ ید خلون علیھم من کل باب** (رعد۔۳) فرشتوں کا بحکم خداوندی مجاہدین اہل جنت کی خدمت میں ہر طرف سے حاضر ہو کر سلام کرنا، اور ہدایا وتحائف پیش کرنا۔

(۸) **اکلھا دائم وظلھا** (رعد۔۵) جنت کے پھل دائمی کبھی ختم نہ ہونے والے سایہ لازوال اور کبھی نہ بدلنے والا۔

(۹) **اخوانا علی سرر متقابلین** (حجر۔۴) سب اہل جنت کا بھائی بھائی ہو کر انتہائی محبت والفت سے رہنا عزت وکرامت کے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنا۔

(۱۰) **لایمسھم فیھا نصب** (حجر۔۴) کسی قسم کی زحمت وتکلیف جنت میں نہ ہونا۔

(۱۱) **لھم فیھا مایشاء ون** (نحل۔۴) اہل جنت جو کچھ بھی وہاں چاہیں گے، اس کا فوراً مہیا ہونا۔

(۱۲) **لا یسمعون فیھا لغوا الاسلاماً ولھم رزقھم فیھا بکرۃ وعشیا** (مریم۔۴)
جنت میں کوئی بے ہودہ، جھوٹ، فحش وفتنہ فساد کی بات نہ سُننا، صبح وشام کا رزق برابر مہیا ہونا۔

(۱۳) **یحلون فیھا من اساور من ذھب ولولو ا ولباسھم فیھا حریر** (حج۔۳)
سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جانا، جنت کا عام لباس ریشمی ہونا۔

(۱۴) **خالدین** (فرقان۔۲) **یجزون الغرفۃ** (فرقان۔۶) جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا، بالا خانوں اور اونچی منزلوں میں قیام پذیر ہونا۔

(۱۵) **فلاتعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین** (سجدہ۔۲) ایسی ایسی عجیب وغریب ان دیکھی[۱] اور نہایت اعلیٰ قسم کی نعمتیں جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

(۱۶) **اذھب عنا الحزن الآیہ احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب** (فاطر۔۴) دُنیا کے غم اور انجام آخرت کی فکر ختم ہونا، رہنے کے اصلی وابدی گھر کا ملنا، رنج وتعب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ۔

---

[۱] حضرتِ علامہ عثمانیؒ نے لکھا:۔ حدیث میں ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کیلئے جنت میں وہ چیز چھپا رکھی ہے، جو نہ آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سُنی نہ کسی بشر کے دل میں گزری۔ (تنبیہ) سرسید وغیرہ نے اس حدیث کو لے کر جنت کی جسمانی نعمتوں کا انکار کیا ہے، میں نے ہدیہ سنیہ میں نے اس کا جواب دیا ہے (فوائد ۵۴۰) ہم نے بھی اس بارے میں اوپر کچھ لکھا ہے، اور آگے سورۂ زخرف کی آخری آیات پیش ہوں گی، جن میں غلمان کا سونے کے تھالوں اور ساغروں میں کھانے پینے کی چیزیں پیش کرنا اور اہل جنت کا پھلوں میں سے چُن چُن کر حسبِ رغبت کھانے کا ذکر صراحت کے ساتھ ہوا ہے۔ کیا یہ سب روحانی غذاؤں کا بیان ہے؟

(۱۷) غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین (یٰسین۔۲)فی شغل فاکھون ،ھم وازواجھم فی ظلا ل علی الا رائك متکؤن (یٰسین ۔۴)
گناہوں کی مغفرت اور باعزت لوگوں میں داخل ہونا،نعمائے جنت اور باہمی گفتگوؤں سے لطف اندوز ہونا،اپنی بیگمات کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے خوشگوار سایوں میں مسہریوں پرآرام کرنا۔

(۱۸)جنات عدن مفتحۃلھم الابواب ،متکین فیھا یدعون فیھا بفا کھۃ کثیرۃ وشراب وعند ھم قاصرات الطرف اتراب (ص۔۴) ان کی ہمیشہ رہنے والی جنتوں کے دروازوں کا ہروقت کھلا رہنا،مندوں پرتکیہ لگائے بیٹھنا،اور بہ کثرت وافرفواکہ ومشروبات طلب کرنا،انکے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہونا۔

(۱۹) لھم غرف من فوقھا غرف مبنیۃ (زمر۔۲) بلندعمارتیں منزل پرمنزل بنی ہوئی،جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔

(۲۰)اورثنا الا رض نتبوا من الجنۃ حیث نشاء(زمر۔۱۸)
اپنی جنت کے پوری طرح مالک ووارث ہونااوردوسروں کی جنتوں میں سیر وملاقات کے لئے بے روک ٹوک آجاسکنا۔

(۲۱)نزلا من غفور رحیم(حم السجدہ۔۴)
ہرچیز کا خواہش ورغبت کے مطابق ملنااورحضرتِ رب العزت جل مجدہ کی ضیافت کا شرفِ اعظم حاصل ہونا۔

(۲۲)ادخلوا الجنۃ تا فاکھۃ کثیرۃ منھا تاکلون (زخرف۔۷)
اہل جنت مردوں کومع بیویوں کےخوش کیا جانااورعزت دیناغلمانِ جنت کا کھانے پینے کی اشیاءکوسونے کےتھالوں اورساغروں میں سروکرنا،دل آرام اور جنت گاہ چیزوں میں ہمیشہ کی زندگی گزارنا،کثیر ووافرپھلوں میں سے حسبِ رغبت انتخاب کرکے کھانا۔

(۲۳)ان المتقین فی مقام امین تاالفوز العظیم (دخان۔۳)امن چین کےگھر میں ہونا،باغوں اورچشموں سے لُطف اندوز ہونا،باریک اوردبیز دونوں قسم کے ریشمی لباس پہننا،بے تکلف عزیزوں دوستوں کی طرح آمنے سامنے بیٹھنا،حورانِ بہشت سے ازدواجی تعلق کرادینا،دل جمعی واطمینان کے ساتھ جنت کے پھل اورلذیذ چیزیں جتنی چاہیں طلب کرسکنا،موت کے ذائقہ سے کبھی آشنانہ ہونا۔

(۲۴)ذلك یوم الخلود لھم مایشاء ون فیھا ولدینا مزید(ق۔۳) وہاں کی ساری نعمتیں ہمیشہ کے لئے ہونا،وہاں جوبھی چاہیں گے وہ ملنااوراس کے علاوہ بہت زیادہ بھی جس کا تصوروخیال بھی نہیں کرسکتے مثلاً دیدارِالٰہی ورضوانِ ابدی وقربِ خداوندی وغیرہا۔

(۲۵)فی مقعد صدق عندملیك مقتدر(قمر۔۳) پسندیدہ مقام میں بارباب ہونا،جہاں شہنشاہِ مطلق کا قرب حاصل ہوگا۔

(۲۶)ولمن خاف مقام ربہ جنتان تا آخرسورت(رحمٰن)خواص اہل جنت کے لئے دوعالی شان باغ ہونگے جن کے درختوں کی شاخیں نہایت پرمیوہ وسایہ دارہوں گی،اُن میں دوچشمے ہمہ وقت رواں دواں ہوں گے،ان میں ہرپھل کی دودوقسمیں ہوں گی،بیش قیمت ریشمی فرشوں پربیٹھے ہوں گے،دونوں باغوں کے پھل زمین کی طرف جھکے ہوئے بہت قریب ہوں گے۔محلاتِ جنت میں نیچی نگاہ والی نیک نہاد بیویاں ہوں گی لعل ومرجان ایسی خوش رنگ ودل کش،عوام اہل جنت کے لئے دوباغ ان سے کم درجہ کے ہونگے مگروہ بھی خوب سرسبزوشاداب،جن میں دوچشمے دوڑتے ہوں گے،ان میں میوے،کھجوریں اورانارہوں گےان کے محلات میں بھی خوبصورت ونیک سیرت عورتیں ہوں گی،اورحوریں بھی خیموں کے اندر پردہ نشین،کہ اُن تک کسی جن وانس کی دسترس نہ ہوسکی ہوگی،وہ جنت والے بھی سبزمسندوں اورقیمتی گدوں پرتکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔

(۲۷)علےٰ سررموضونۃ تالا صحاب الیمین (الواقعہ۔۱) مقربین اہل جنت کا جڑاؤتختوں پربیٹھنا جوسونے کے تاروں سے بُنے گئے ہیں،اُن کی خدمت کے لئےلڑکے ہوں گے سدا ایک حالت میں رہنے والے جو بےنشہ والی شراب کے گلاس وپیالے

پیش کیا کریں گے اور پسندیدہ پھل ولحمِ طیور، ان کے لئے عورتیں ہوں گی، گوری بڑی آنکھوں والی مثالی عمدہ موتی کی جو چھپا کر حفاظت سے رکھا گیا ہو۔ وہاں لغو وواہیات باتیں کوئی نہ سُنے گا، بلکہ ہر طرف سے سلام سلام ہی کی آوازیں سُنی جائیں گی، اصحاب الیمین اہل جنت بے خار بیریوں اور کیلوں کے باغوں میں ہوں گے، جہاں لمبے سائے ہوں گے اور پانی بہتے ہوئے، بہ کثرت میوے، جو کبھی ختم نہ ہوں گے اور نہ کسی وقت ان کے کھانے کی ممانعت ہوگی، گدے اور بچھونے بہت اونچے اونچے ہوں گے، حوریں اور دنیا کی عورتیں جوان کو ملیں گی، ان کا اُٹھان ایسا ہوگا کہ ان میں جوانی، خوبصورتی دلربائی ودل کشی کی شان ہمیشہ باقی رہے گی اور وہ سب آپس میں ہم عمر ہوں گے۔

(۲۸) **وجنة عرضها کعرض السماء والارض** (الحدید۔۳)

آسمان وزمین دونوں کو ملا کر رکھا جائے تو اس کی برابر جنت کا عرض[1] ہوگا، طول کتنا ہوگا یہ اللہ ہی جانے۔

(۲۹) **وجوه یومئذ ناضرة الی ربھاناظرة** (قیامہ۔۱) عرصاتِ محشر اور روضاتِ جنت میں مومنوں کے چہرے تروتازہ اور ہشاش بشاش ہوں گے اور ان کی آنکھیں محبوبِ حقیقی کے جمالِ جہاں آراء کی زیارتِ مبارکہ سے بہرہ اندوز ہوں گی (ابن کثیر ۴/۴۵۰)

(۳۰) **وجزاھم بما صبروا جنة وحریرا تا شرابا طھورا** (دہر۔۱۰) جنت کا موسم نہایت معتدل ہوگا نہ گرمی کی تکلیف نہ سردی کی، درختانِ جنت کی شاخیں مع پھول پھل وغیرہ جھکی ہوں گی جنت میں جو گلاس و پیالے وغیرہ ظروف مستعمل ہوں گے، وہ سب چاندی کے مگر شیشہ وبلور کی طرح صاف وشفاف ہوں گے، پینے کو چشمہ سلسبیل کے جام شراب ہوں گے۔ کھانے پینے کی چیزیں پیش کرنے والے خوبصورت تاب دار موتیوں جیسے غلمان ہوں گے وہاں کی سب نعمتیں بڑی اور بادشاہت عظیم الشان ہوں گی، اہل جنت کی پوشاک باریک وموٹے سبز رنگ کے ریشمی کپڑوں کی ہوگی، چاندی کے کنگن بھی جائز ہوں گے، اکل وشرب کے سلسلہ میں سب سے بڑا انعام یہ ہوگا کہ شرابِ طہور کا ایک جام حضرتِ حق جل مجدہ خود بھی عطا کریں گے، جو تشریفِ خاص وتکریمِ خصوصی ہوگی۔

اصحابِ صحاح میں سے امام ترمذیؒ نے سب سے زیادہ تفصیلات جنت وجہنم کے بارے میں پیش کی ہیں، ابواب صفة الجنة کے تحت ۲۴ باب قائم کئے ہیں اور ابواب صفة جہنم کے تحت دس باب ذکر کئے ہیں، وہ تفصیلات انوارالباری میں اپنے موقع پر آئیں گی، یہاں ہمیں صرف صفتِ درجاتِ جنت، اور خلودِ جنت وجہنم پر کچھ لکھنا ہے، والتوفیق من اللہ تعالیٰ۔

کثرت ووسعت درجاتِ جنت

حدیثِ ترمذی میں ہے کہ جنتوں کے ایک سو درجات ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان زمین سے آسمان تک برابر کا فاصلہ ہے، ان میں سے فردوس سب سے بہتر اور اعلیٰ جنت ہے اور ان سب کے اوپر عرشِ رحمان ہے دوسری حدیث میں ہے کہ ہر دو درجوں کے درمیان ایک سو سال کی مسافت کا بعد ہے، ایک روایت میں یہ فاصلہ پانچ سو سال کا بیان ہوا ہے، علامہ مناوی نے تطبیق دی کہ یہ اختلاف بہ لحاظ اختلاف سرعتِ سیر ہے (تحفہ ۳/۲۲۵)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک ساتوں آسمان وزمین جہنم کا علاقہ ہیں اور جنت کا علاقہ ساتویں آسمانوں کے اوپر کا ہے، جو سدرۃ المنتہیٰ سے شروع ہوتا ہے، اور میرے نزدیک اس کا نام سدرۃ المنتہیٰ بھی اس لئے ہے کہ وہ علاقہ جہنم کا منتہیٰ اور علاقہ جنت کا مبدا ہے، اور عرش جنتوں کے سارے علاقہ کو محیط ہے (یعنی جنتوں کا علاقہ جہنم کے علاقہ کو محیط اور اس کے اوپر ہے، اور عرش جنتوں کے سارے علاقہ کو محیط ہے) اس زمانہ کے بعض متنورین کو جو شبہات جنتوں کے بارے میں ہوتے ہیں، ان کے جواب میں حضرت شاہ صاحبؒ

---

[1] اس میں کوئی استبعاد نہیں، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اور حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد بھی نقل ہوا تھا کہ مکان غیر متناہی بالفعل ہے پھر اس غیر متناہی کا ادراک کئے بغیر استبعادِ عقلی کی بات محض جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ مؤلف

نے درسِ ترمذی شریف دارالعلوم دیوبند کے زمانہ میں فرمایا تھا کہ مکان (وفضاءِ کائنات) غیر متناہی بالفعل ہے اور ایسے ہی معلوماتِ خداوندی بھی غیر متناہی بالفعل ہیں، اور اس کا انکار بوجہ حماقت وغباوت ہوسکتا ہے (العرف الشذی ۵۲۴)

اب نئی تحقیقاتِ سائنس کے ذریعہ خود دنیائے ارضی وخلائی کا علاقہ ہی اس قدر عظیم ووسیع دریافت ہوا ہے کہ عقلیں دنگ اور حیران رہ گئی ہیں کچھ اشارات ہم نے نطق انور جلد اوّل اور اوپر کے مضمون میں کئے ہیں، اور عرصہ مکان کو غیر متناہی بالفعل مان لینے کے بعد تو کوئی استبعاد رہتا ہی نہیں، حیرت ہے کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور کتاب تکمیل الایمان میں عنوانِ جنت وجہنم کے تحت آیتِ قرآنی **جنة عرضها السموات والارض** میں اشکال کا ذکر کیا ہے کہ اتنا بڑا طویل وعریض علاقہ کسی ایک جنتی کے لئے ہوسکتا ہے؟ پھر کچھ اقناعی سا جواب بھی نقل کیا ہے، اس موقع پر کم از کم فاضل مترجم (عزیز مکرم مولانا محمد انظر شاہ صاحب سلمہ استادِ دارالعلوم دیوبند) ہی کو اپنے والد ماجد قدس سرہ کے ارشادات اور سائنس جدید کی تحقیقات کو ناظرین کی تفہیم وتقریب کیلئے پیش کردینا چاہیے تھا اور آئندہ ایڈیشن میں ایسے ضروری ومفید حواشی کا اضافہ کریں تو بہتر ہوگا۔

جنت دکھلانے کی غرض

اسکے علاوہ کہ جنت کی سیر کرانے میں حضور اکرم ﷺ کو اکرام خصوصی سے نوازا گیا، یہ مقصد بھی تھا کہ آپ اپنی امت کو جنت خریدنے کی ترغیب دیتے تھے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ **ان اللہ اشتری من المومنین انفسهم واموالهم بان لهم الجنه** اس لئے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضور جنت کا مشاہدہ بھی کرلیں تا کہ اپنی آنکھوں دیکھا حال امّت کو بتاسکیں اور وہاں کی وسعت وگنجائش بھی دیکھ لیں کہ ساری جنتی مخلوق اس میں سماسکتی ہے، بلکہ اس سے بھی وہ نہ بھرے گی، اور حق تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا کرکے اس کو پُر کریں گے جیسا کہ حدیث میں ہے اور یہ مقصد بھی تھا کہ جنت کے مقابلہ میں دنیا کا بے حیثیت وبے قیمت ہونا معلوم ہوجائے، تا کہ مومن بندے دنیا سے بے رغبت ہوں، اور مصائب وتکالیف دنیوی پر صبر کرنا آسان ہو۔ اور یہ بھی غرض تھی کہ کوئی ایسی کرامت وتفوق باقی نہ رہے جو کسی نبی کو دیا گیا ہو اور وہ حضور علیہ السلام کو حاصل نہ ہو، حضرت ادریس علیہ السلام کو یہ انعام خصوصی عطا ہوا تھا کہ قیامت سے پہلے جنت میں داخل ہوئے تھے، اس لئے حضور اکرم ﷺ کو بھی یہ فضل وشرف عطا کردیا گیا۔ یہ سب اغراض ابن دحیہ سے اخذ کرکے مختصراً یہاں درج کی گئیں (شرح المواہب ۶/۹۱) حدیث ترمذی واحمد میں یہ بھی آچکا ہے کہ حضور علیہ السلام اور حضرت جبرئیل کے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے اور حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے جنت ودوزخ اور وعدۂ خداوندی کے مطابق آخرت میں پیش آنے والی تمام چیزوں کو دیکھا الخ (شرح المواہب ۶/۹۰) ہم نے اوپر قرآن مجید کی تصریحات سے وعدۂ خداوندی کے مطابق جنت میں ملنے والی نعمتوں کی پوری تفصیل پیش کردی ہے، یقیناً حضور علیہ السلام نے ان سب نعمتوں کا عینی مشاہدہ فرمایا ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

دوزخ کا مشاہدہ

جنت کی سیر وسیاحت کے بعد رسول اکرم ﷺ کو شبِ معراج میں دوزخ بھی دکھلائی گئی بیہقی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ اپنے مقام پر رہی اور حضور علیہ السلام اپنی جگہ آسمانوں پر، اور درمیان سے حجابات اٹھا کر آپ کو اس کا مشاہدہ کرایا گیا، آپ نے فرمایا کی جنت کی سیر وسیاحت کے بعد دوزخ کو میرے سامنے کیا گیا، وہ حق تعالیٰ کے غضب اور عذاب کا مظہر ہے، اگر اس میں پتھر اور لوہا بھی ڈال دیا جائے تو اس کو بھی کھالے جب میں اس کو دیکھ چکا تو اس کو بند کردیا گیا۔

مالک خازن جہنم سے ملاقات

مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ آپ نے شبِ معراج میں مالک سے بھی ملاقات کی اور اُن کو سلام کیا، آپ نے بتلایا کہ وہ ایک ترش رو شخص ہیں جن کے چہرہ ہی سے غضب وغصہ کے آثار نظر آتے ہیں (شرح المواہب ۹۱/۶)

حدیثِ مسلم میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ شب معراج میں آسمانوں پر میں جس سے بھی ملا اس نے مجھے مرحبا کہا اور خندہ پیشانی سے پیش آیا بجز ایک شخص کے، اس کی وجہ کیا ہے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ وہ جہنم کے خازن و داروغہ مالک ہیں، وہ جب سے پیدا ہوئے کبھی نہیں ہنسے، اگر وہ کسی اور کے لئے ہنستے تو ضرور آپ کے لئے بھی ایسا کرتے (فتح الباری)

جنت وجہنم کے خلود و ہمیشگی کی بحث

امام ترمذیؒ نے اس عنوان کا مستقل باب قائم کیا ہے، اور ایک طویل حدیث روایت کی ہے جس کے آخر میں اس طرح ہے:۔ **ثم یقال یا اھل الجنة خلود لا موت ویا اھل النار خلود لاموت** (اہل جنت کے جنت میں اور اہلِ نار کے دوزخ میں داخل ہوجانے کے بعد موت کو مینڈھے کی شکل میں لایا جائیگا اور اس کو ذبح کرا کے اعلان کیا جائے گا کہ اے اہل جنت اسکے بعد ہمیشہ کی زندگی ہے، موت نہ آئے گی، اور اے اہلِ دوزخ! تمہارے لئے بھی ہمیشہ کی زندگی ہے موت نہ آئے گی) اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے حسن صحیح کہا اور اس کی روایت ابن ماجہ اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں کی ہے (تحفۃ الاحوذی ۳/۳۳۵)

اس کے بعد دوسری مختصر حدیث روایت کی ہے، اس میں ہے کہ قیامت کے دن موت کو چت کبرے مینڈھے کی شکل میں لاکر جنت و دوزخ کے درمیان کھڑا کیا جائے گا، اور اس کو وہاں ذبح کیا جائیگا، اس منظر کو اہل جنت و نار دونوں دیکھتے ہوں گے۔ اور اگر کوئی فرطِ خوشی کے مارے مرسکتا تو اہل جنت موت کے مرجانے کی خوشی میں مرجاتے، اسی طرح اگر کوئی فرطِ غم کی سہار نہ لاکر مرسکتا تو اہلِ دوزخ مرجاتے اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن کہا اور یہ حدیث بخاری، مسلم ونسائی میں بھی ہے (تحفہ ۳/۳۳۶)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ جماہیر اہلِ سنت والجماعت کی رائے ہے کہ اہل جنت واہل جہنم دونوں فریق کے لئے خلود و ہمیشگی ہوگی۔

شیخ اکبر کی رائے

وہ کہتے ہیں کہ اہل جہنم ایک طویل مدت تک آگ میں جلتے رہنے کے بعد ناری طبیعت بن جائیں گے، تب ان پر نار کی تکلیف وعذاب باقی نہ رہے گا، اس طرح گو جہنم اور اہل جہنم کے لئے فنا اور موت تو نہ ہوگی، مگر عذاب کا سلسلہ ختم ہوجائے گا، اور وہ ابدی نہ ہوگا، اہل جہنم، اس میں اسی طرح بے تکلیف وزحمت رہیں گے جس طرح پانی میں پیدا ہونے والے حیوانات، آبی طبیعت ہونے کی وجہ سے پانی میں زندگی گزارتے ہیں، حالانکہ باہر کے حیوانات پانی میں ایک ساعت بھی زندہ نہیں رہ سکتے، شیخ اکبر اپنے اس نظریہ پر آیت سورۂ ہود **خالدین فیھا مادامت السموات والارض الاماشاء ربك** کے استثناء سے اور حدیث **سبقت رحمتی علی غضبی** سے استدلال کرتے ہیں،

حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کی رائے

یہ ہے کہ جہنم کا داخلہ بطور کفارہ ہے، اور اہل جہنم ایک مدتِ مدیدہ طویلہ کے بعد فنا ہوجائیں گے، انہوں نے کہا کہ آیات واحادیث میں جو خلود و ہمیشگی کا ذکر ہے وہ اسی وقت تک کے لئے ہے جب تک جہنم باقی ہے، اور جب وہ فنا ہوجائے گی تو اس کے اندر کے لوگ بھی فنا ہوجائیں گے، ان دونوں حضرات کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ایسا ہی مذہب فاروقِ اعظم وابو ہریرہ وابنِ مسعودؓ کا بھی ہے، ممکن ہے ان حضرات کے

اقوال کی ان کو قوی اسانید ملی ہوں، ورنہ شاید جمہور سلف وخلف کی مخالفت نہ کرتے اور مجھے جو حضرتِ فاروق اعظمؓ کا اثر ملا ہے، اس میں کفار کی تصریح نہیں ہے اس لئے میرے نزدیک وہ عصاۃ مومنین پر محمول ہے، جیسا کہ مسندِ احمد کی روایت کردہ حضرت ابن عمرو بن العاصؓ کی مرفوع روایتِ مسند احمد کے بارے میں بھی میری یہی رائے ہے۔ پھر آگے عقلی نکتے ہیں (لعرف الشذی ۵۲۵)

استثناء کا جواب

حافظ ابن کثیرؒ کا رجحان متعدد مسائل مہمہ میں حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کی طرف ہو گیا ہے۔ حتی کہ بعض مسائل میں آپ نے ان کی وجہ سے اپنا شافعی مسلک بھی ترک کر دیا ہے، مگر اس خلود نار کے مسئلہ میں وہ جمہور ہی کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا:۔ امام ابوجعفر بن جریر طبریؒ نے اپنی کتاب میں مراد استثناء کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، لیکن خود انہوں نے وہ رائے اختیار کی ہے جو خالد بن معدان ،ضحاک، قتادہ وابن سنان سے نقل کی ہے، جسکی روایت ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس وحسن سے بھی کی ہے کہ استثناء کا تعلق صرف عصاۃ اہلِ توحید سے ہے، جن کو اللہ تعالیٰ بوجہ شفاعتِ شافعین ملائکہ نبیین ومومنین، جہنم کی آگ سے نجات دینگے پہلے اُن کی شفاعت اہل کبائر کے حق میں منظور ہوگی۔ پھر رحمتِ ارحم الراحمین متوجہ ہوگی تو جہنم سے وہ بھی نکال لئے جائیں گے جنھوں نے صرف کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھا تھا اور کوئی بھی نیک عمل نہیں کیا تھا، جیسا کہ احادیث صحیحہ مشہورہ کے ذریعہ یہ مضمون ثابت ہو چکا ہے، لہذا اس کے بعد صرف وہ لوگ جہنم میں رہ جائیں گے، جن پر وہاں کا خلود واجب وحتمی ہو چکا ہے اور جن کے لیے وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی، اور اسی تفسیر کو بہ کثرت علماء نے قدیماً وحدیثاً اختیار کیا ہے، اس آیت کی تفسیر میں اکابر صحابہ، تابعین وائمہ سے اقوال غریبہ نقل ہوئے ہیں اور ایک حدیثِ غریب طبرانی کبیر میں بھی وارد ہے، مگر اسکی سند ضعیف ہے۔ واللہ اعلم!

قتادہ نے کہا کہ اس آیت کے استثناء کا علم حق تعالیٰ ہی کو زیادہ ہے سدی نے کہا کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ **خالدین فیھا ابداً** کے ذریعہ منسوخ ہوگی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ۴۶۰/۲۱)

علامہ محدث ومفسر آلوسیؒ نے لکھا:۔ جہنم میں خلودِ کفار ان مسائل میں سے ہے جن پر اہل اسلام کا اجماع ہوا ہے، اور مخالف کا کوئی وزن واعتبار نہیں، قطعی دلائل (خلود کے) حدِ شمار سے زیادہ ہیں، اور مخالف کے پیش کردہ بہت سے آثار واخبار کسی ایک قطعی دلیل کے بھی برابر نہیں ہو سکتے اور آیت میں چونکہ بہت سی وجوہ کا احتمال ہے اس لئے مخالف کیلئے اس میں کوئی دلیل نہیں مل سکتی **(اذاجاء الاحتمال بطل الاستدلال)** اور آیت کے بارے میں نسخ کے دعوے کی بھی ضرورت نہیں، جو سدی نے کیا ہے بلکہ ایسے امور میں نسخ کا جاری کرنا درست بھی نہیں معلوم ہوتا۔ (روح المعانی ۱۴۶/۱۲)

خالدین فیھا مادامت السموات والارض پر حضرۃ العلامۃ المحدث المفسر الشیخ ثناءاللہ پانی پتیؒ نے لکھا:۔ ضحاک نے کہا کہ مراد یہ ہے جب تک جنت ونار کے آسمان وزمین رہیں گے تب تک ان میں رہیں گے، اہل معانی نے کہا عادۃً اہل عرب اس سے مراد تابید وہیشگی ہی لیتے ہیں، **الا ماشاء ربک** پر لکھا:۔ بظاہر اس سے انقطاع استقرار مفہوم ہوتا ہے جس کی تائید حضرت ابن مسعود وابی ہریرہؓ کے اقوال سے بھی ہوتی ہے کہ جہنم پر ایک زمانہ آئے گا جس میں کوئی نہ رہے گا صوفیہ میں سے شیخ محی الدین بن العربی بھی اس کے قائل ہوئے ہیں، لیکن یہ قول اجماع ونصوص کی وجہ سے مردود ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا **فی العذاب ھم خالدون** (وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے) اور طبرانی، ابونعیم وابن مردویہ نے ابن مسعودؓ سے روایت کی کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ اگر اہل جہنم سے کہا جاتا کہ تم اس میں بقدر تعداد ہر ذرہ وحصاۃ رہو گے، تب بھی وہ خوش ہوتے (کیونکہ ہمیشہ کے عذاب سے تو بہت کم ہی ہوتا) اور اگر اہل جنت سے کہا جاتا کہ تم بقدر

تعداد کل ذرات وحصات رہو گے تب بھی وہ غمگین ہوتے (کیونکہ ہمیشگی کے لحاظ سے وہ زمانہ بھی بہت کم ہوتا) لیکن ان کے لئے ابدیت وہمیشگی کا فیصلہ کر دیا گیا۔

طبرانی کبیر وحاکم نے حکم صحت کر کے حضرت معاذ بن جبل سے روایت کی کہ رسول اکرم ﷺ نے اُن کو یمن بھیجا تو وہاں جا کر انہوں نے لوگوں سے کہا:۔اے لوگو! میں تمہاری طرف رسول اکرم ﷺ کا قاصد ہو کر خبر دے رہا ہوں کہ اس زندگی کے بعد خدا کی طرف لوٹنا ہے پھر جنت ملے گی یا جہنم اور ہمیشہ کی زندگی ہوگی بلاموت ۔کے، اور اقامت ہوگی بلاکوچ کے، ایسے اجسام میں جن کو کبھی موت نہ آئے گی ،اور بخاری ومسلم میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ جب اہل جنت بہشت میں اور اہل النار دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو ان کے درمیان میں ایک اعلان کرنے والا کھڑا ہو کر پکار دے گا کہ اے اہل نار اب کبھی موت نہ آئے گی ،اور اے اہل جنت کبھی موت نہیں ، ہر شخص اپنے اپنے مقام میں ہمیشہ رہے گا بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی **یاأهل الجنة خلود ولا موت ویاأهل النار خلود ولا موت** وارد ہے، نیز حدیثِ ذبحِ موت اور نداء **یاأهل الجنة لاموت ویاأهل النار لاموت** والی حدیث حضرت ابنِ عمر، وابی سعید سے بخاری ومسلم میں ہے حاکم نے ابو ہریرہؓ سے بھی تخریج کر کے تصحیح کی ہے۔

علامہ بغوی نے کہا کہ حضرت ابن مسعودؓ کے قول مندرجہ بالا کا مطلب اہلِ سنت کے نزدیک یہ ہے کہ جہنم پر ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ اس میں کوئی شخص اہل ایمان میں سے باقی نہ رہے گا (یعنی وہ حصّے جہنم کے خالی ہو جائیں گے، جہاں اہل ایمان عصاۃ تھے) لیکن کفار جن حصّوں میں ہوں گے، وہ سب ہمیشہ بھرے رہیں گے اور میں نے **لابثین فیها احقابا** کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ وہ بھی اہل قبلہ میں سے اہل اہواء کے حق میں ہے۔

اس کے بعد محدث پانی پتیؒ نے لکھا:۔ چونکہ خلودِ کفار فی النار پر اجماع ہے، اس لئے آیتِ خالدین سے استثناء کے بارے میں اختلاف ہوا ہے کہ اسکا مطلب کیا ہے، میرے نزدیک اسکا مطلب یہ ہے کہ اہل النار کفار کو **جحیم** سے **حمیم** کی طرف نکالا جائے گا (یعنی آگ کے عذاب سے گرم کھولتے ہوئے پانی کے عذاب کی طرف) اور اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا، بغوی نے تفسیر **یطوفون بینها وبین حمیم آن** میں لکھا کہ وہ حمیم وجحیم کے درمیان دوڑتے رہیں گے جب آگ کے عذاب کی شدت کی تاب نہ لا کر فریاد کریں گے تو ان کو حمیم کے عذاب میں بھیج دیا جائے ،قال تعالیٰ **وان یستغیثو ایغاثوابماء کالمهل** یا آگ سے زمہریر کی طرف منتقل کر دیا جائیگا، بخاری ومسلم میں ہے کہ دوزخ کی شکایت پر اس کو دو سانس لینے کی اجازت دی گئی، سخت گرمیوں میں اس کے گرم سانس کا اور سخت سردی میں اس کے سرد سانس کا اثر آتا ہے(معلوم ہوا کہ دوزخ کے گرم وسرد دونوں عذاب نہایت شدید ہوں گے)

بعض محققین نے کہا کہ استثناء کا تعلق صرف بد بخت اہل ایمان سے ہے، جو اپنے معاصی کے سبب دوزخ میں داخل ہوں گے، پھر نکلیں گے، حضرت انسؓ کی روایت بخاری شریف میں ہے کہ کچھ گنہگار مسلمانوں کے عذاب جہنم کی وجہ سے رنگ بگڑ جائیں گے، اس لئے جب وہ وہاں سے حضور اکرم ﷺ کی شفاعت کے بعد نکل کر جنت میں آجائیں گے تب بھی جدا رنگ کے سبب سے ان کا لقب جہنمی ہوگا یہ بھی طبرانی کی روایت میں ہے کہ وہ دعا کریں گے یہ لقب اُن سے ہٹا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اُن کی دعا کو قبول کرلیں گے۔

یہ بھی ایک روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ میری امت کے کچھ لوگوں کو گناہوں کے سبب عذاب ہوگا اور وہ جب تک خدا چاہے گا، جہنم میں رہیں گے، پھر اہل شرک ان کو عار دلائیں گے، تمہارے ایمان وتصدیق نے تمہیں کیا نفع پہنچایا؟ (کہ تم بھی ہماری طرح اتنی مدت سے عذاب میں ہو) اس پر حق تعالیٰ فضلِ خاص فرمائیں گے، اور ہر موحد کو جہنم سے نکال لیں گے۔ پھر حضور علیہ السلام نے یہ آیت پڑھی **ربما یود الذین کفروالوکانو امسلمین** یعنی اس وقت کفار ومشرکین تمنا کریں گے کہ کاش! ہم مسلمان ہوتے۔ اس کے بعد محدث پانی پتیؒ نے لکھا کہ گناہ گار مومنوں کے دوزخ میں داخل ہونے اور پھر وہاں سے نکلنے کے بارے میں احادیث درجہ تواتر کو پہنچی ہیں

(اس لئے ان کے استثناء کا قول بھی کم اہم نہیں ہے)۔
اس کے بعد استثناء سے متعلق اور بھی اہم تحقیقی اشارات کئے ہیں۔ وللہ درہ رحمہ اللہ تعالیٰ (تفسیر مظہری ۵۵/۵)!

سبقیت کا جواب۔

حدیث میں سبقیت کو شیخ اکبر نے منتہیٰ پر محمول کیا ہے، کہ اس کے تحت عذاب کافر کے لئے بھی ہمیشہ نہ رہے گا، کیونکہ رحمت غضب پر سابق ہوگی، تو بالآخر کافر کا عذاب بھی ختم ہو جائے گا۔

نطقِ انور! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک سبقیت کا مدلول منتہیٰ میں نہیں بلکہ مبداء میں ہے یعنی حق تعالیٰ کے پاس رحمت وغضب میں مسابقت واقع ہوئی تو رحمت غضب سے پہلے آگے بڑھ گئی اور اُس جانب سے غضب پر متقدم ہوگئی، اسی لئے رحمت کا منشاء جود وعطاء ہے کہ وہ بغیر کسی سبب واستحقاق کے بھی آجاتی ہے، بخلاف غضب کے کہ وہ صرف معاصی پر اُترتا ہے اور ارتکابِ سیئات کا انتظار کرتا ہے، اور توبہ سے غفلت واعراض، نیز گمراہی وکج روی کے تسلسل وتمادی کے سبب سے وارد ہوتا ہے، پس غضب جب بھی آتا ہے مہلت کے ساتھ آتا ہے لہذا رحمت کا تقدم جانبِ مبدا میں ہی ظاہر ہوگا، جس کو شیخ اکبر نے دوسری جانب میں لیا اور مخالفتِ جمہور پر مجبور ہوئے۔

مراحمِ خسروانہ! دوسرے یہ کہ رحمت والا قاعدہ سارے قواعد وضوابط پر فوقیت رکھتا ہے، گویا وہ بادشاہی خصوصی اختیارات کی طرح ہے اسی لئے استواء علی العرش کی شان بتلاتے ہوئے، صفتِ رحمت کو نمایاں کیا گیا ہے اور فرمایا **الرحمن علی العرش استوی**، پس جس طرح حسی اعتبار سے عرش تمام جہانوں سے اوپر ہے، اسی طرح صفتِ رحمت بھی سب سے اوپر ہے، اور سب کچھ حق تعالیٰ کی رحمت کے سایہ میں آگیا اسکے برخلاف اگر قہار کا استواء علی العرش ہوتا (**والعیاذ باللہ من قھرہ وجلالہ**) تو ساری چیزیں صفتِ قہر کے تحت آجاتیں، اور روئے زمین پر کوئی مخلوق بھی اطمینان وسکون کا سانس نہ لے سکتی۔

ایک واقعہ! اس موقع پر حضرتؒ نے سنایا کہ شیخ عبداللہ تستریؒ سے ابلیس نے مناظرہ کیا، کہا کہ تم کہتے ہو مجھے جہنم میں عذاب دیا جائے گا، لیکن ایسا نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے **ورحمتی وسعت کل شیء**، کیا میں شیئ نہیں ہوں؟ اگر ہوں تو رحمتِ خداوندی کے تحت کیوں داخل نہ ہوں گا؟ علامہ تستری نے جواب دیا کہ رحمت تو ان لوگوں کے لئے ہے جو نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، خدا پر ایمان رکھتے ہیں، اور تم ان میں سے نہیں ہو، ابلیس اس جواب پر ہنسا اور کہنے لگا، خوب! میں تو تمہیں عالم وعارف سمجھتا تھا، مگر تم تو کچھ بھی نہیں جانتے، تم نے حق تعالیٰ کی صفاتِ مطلقہ کو مقید کر دیا، جس طرح اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، وخالق علی الاطلاق ہے ایسے ہی رحیم علی الاطلاق بھی ہے، اور تم اس کی صفاتِ رحمت مقید کر رہے ہو، اس پر شیخ خاموش ہو گئے، اور (اس وقت) جواب نہ ہو سکا لیکن میں کہتا ہوں کہ ابلیس لعین اس دلیل سے بھی مستحقِ رحمت نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس آیت میں صرف وسعتِ صفتِ رحمت کا بیان ہے، وسعتِ حکمِ رحمت کا نہیں (کہ رحمت کا حکم سب چیزوں کے لئے کر دیا گیا ہو) اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کہیں کہ اس مکان میں نو ہزار آدمی آسکتے ہیں، یعنی اتنے آدمیوں کی گنجائش ہے خواہ داخل ایک بھی نہ ہو، کیونکہ بتلانا تو گنجائش کا ہے یہ نہیں کہ بالفعل اتنی تعداد کے اس مکان میں داخل وموجود ہونے کا حکم کر دیا گیا، پس رحمتِ خداوندی میں بھی سارے جہانوں اور ان کی موجودات کی گنجائش ہے اور اس لعین کی بھی ہے، اسی لئے اگر وہ اس میں داخل نہ ہونا چاہتا تو اس میں کوئی تنگی ورکاوٹ نہ پاتا، لیکن اس بدبخت نے تو خود ہی اپنے آپ کو اس سے روک لیا اور داخل نہ ہوا، تو اس میں رحمت کا کیا قصور؟

قال تعالیٰ انلزمکموھا وانتم لھا کارھون؟ (سورۂ ہود آیت ۲۸)

(کیا ہم زبردستی کر کے تم سے اس نورِ ہدایت ورحمت کا اقرار کرا سکتے ہیں، جس سے تم بیزار ہو)

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ذبحِ موت خلوداور ہمیشہ کے لئے عدم فنائے فریقین (اہل جنت ونار) کا اعلان ہے، پھر بھی اہل جہنم کے بارے میں سات اقوال ہو گئے، ایک ان میں سے غیر مشہور یہ بھی ہے کہ وہ احقاب کی مدتِ طویلہ کے بعد (جس کو خدا ہی جانتا ہے) متعدم وفنا ہو جائیں گے، لیکن میں فنا یا عدم کی بات نہیں مانتا، البتہ استثناء کا قائل ہوں جو قرآن مجید میں ہے **الاماشاء ربک** پھر اسکا مصداق کیا ہے؟ اس کو بھی علمِ خداوندی پر محمول کرتا ہوں اور نہیں کہہ سکتا کہ وہ فناء ہے یا کچھ اور؟

پس میرا اعتقاد تو خلود ہی کا ہے جیسا کہ نصِ قرآنی سے ثابت ہے، اور استثناء کا بھی قائل ہوں، جس کی تصریح ہے، لیکن اسکی تفسیر و تفصیل نہیں کرتا، بلکہ اس کے ابہام کے باوجود اس پر ایمان رکھتا ہوں، جو کچھ مراد ہے وہ خدائے عزوجل کے پاس ہے اور اس بارے میں حضرت عمرؓ ابن مسعود ابو ہریرہؓ سے جو کچھ منقول ہوا ہے غالباً اسکی اصل گنہگاروں کے متعلق ہے، اور جن کلمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کفار کے حق میں ہیں وہ میرے نزدیک از قبیل خبطِ رواۃ ہے۔

نطقِ عثمانیؒ! حضرت علامہ محدث ومفسر مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے لکھا:۔ مطلب یہ ہوا کہ اشقیاء دوزخ میں اور سُعداء جنت میں اس وقت تک رہیں گے جب تک آخرت کے زمین وآسمان باقی رہیں، (یعنی ہمیشہ) مگر جو چاہے تیرا رب تو موقوف کر دے وہاں ہمیشہ نہ رہنے دے، کیونکہ جنتیوں اور دوزخیوں کا خلود بھی اسی کی مشیت واختیار سے ہے، لیکن وہ چاہ چکا کہ کفار ومشرکین کا عذاب اور اہل جنت کا ثواب کبھی موقوف نہ ہوگا چنانچہ فرمایا:۔ **وما هم بخارجين من النار** (بقرہ رکوع ۲۰) **يريدون ان يخرجوا من النار وماهم بخارجين منها** (مائدہ رکوع ۶) **لا يخفف عنهم العذاب ولا هم ينظرون** (بقرہ رکوع ۱۹)

ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر مادون ذلك لمن يشاء (نساء رکوع ۱۸) اسی پر تمام اہل اسلام کا اجماع رہا ہے، اور ہمارے زمانہ کے بعض نام نہاد مفسرین نے جو کچھ اس کے خلاف چیزیں پیش کی ہیں وہ یا روایات ضعیفہ وموضوعہ ہیں یا اقوالِ غریبہ ماؤلہ یا بعض آیات واحادیث ہیں جن کا مطلب کوتاہ نظری یا بدفہمی سے غلط سمجھ لیا گیا ہے الخ (فوائد عثمانی ۳۰۲)

سیرۃ النبی اور فنائے جہنم کی بحث!

شب معراج کی سیرِ جنت ومشاہدہ جہنم کا حال مختصر کر کے آگے بڑھنا تھا، کہ سیرۃ النبی جلد چہارم (تالیف حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ) میں جزاء وسزا کے تحت دوزخ کا بیان پڑھا، جو ۶۰۷ سے ۸۱۱ تک پھیلا ہوا ہے، اسکو پڑھ کر تکلیف اس لئے ہوئی کہ سیرۃ النبی ایسی معیاری وتحقیقی اہم اسلامی تالیف میں اس قسم کی غلط فہمی پیدا کرنے والا مواد موجود ہے اور اس کی اصلاح اب تک نہیں کی گئی ، اس عظیم الشان کتاب کی گرانقدر افادیت وجامعیت ہمارے نزدیک بھی مسلّم ہے اور اس کی مقبولیت نیز دوسری زبانوں میں اسکے تراجم واشاعت سے بڑی مسرت بھی ہے مگر اسی قدر اس امر سے تکلیف بھی کہ جن خیالات ونظریات سے خود حضرت سید صاحبؒ نے اپنی زندگی میں رجوع کر لیا تھا اور اس کو شائع بھی کر دیا تھا اس کی روشنی میں غلط مقامات کی اصلاح وتصحیح نہیں گئی ہے اور کتاب کے ایڈیشن پر ایڈیشن پہلے غلط نظریات رجوع شدہ ہی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ حضرت سید صاحبؒ کے علم وفضل، تقویٰ ودیانت، جذبہ احقاق حق وابطال باطل وغیرہ خصوصیات سے کون واقف نہ ہوگا، راقم الحروف کو بھی ہمیشہ اس کا اعتراف رہا، اور اسی لئے سیرۃ النبی پر (حسبِ خواہش سید صاحبؒ) مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمہ اللہ نے مفصل تبصرہ لکھا، تو احقر نے مولانا موصوف کو اس کی اہم اغلاط اور فروگذاشتوں کی طرف بھی توجہ دلائی تھی، تاکہ تبصرہ ونقد کا صحیح حق ادا ہو جائے، مگر موصوف کچھ اس قدر حضرت سید صاحبؒ کی شخصیت سے مرعوب ومتاثر تھے کہ کھل کر کچھ نہ لکھ سکے، اس کے بعد احقر نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دام ظلہم کو توجہ دلائی تو انہوں نے حضرت سید صاحبؒ کو اس

بارے میں اپنے طریقہ پر متوجہ کیا گیا ہوگا (جس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی تاہم) کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا موصوف نے مجھے اطلاع بلکہ خوش خبری دی کہ حضرت سید صاحبؒ نے بہت سی چیزوں سے رجوع کرلیا ہے، پھر رجوع کی ایک عبارت بھی معارف میں چھپ گئی، اور میں مطمئن ہوگیا کہ سیرۃ النبی کے جدید ایڈیشنوں میں اصلاح ہوگئی ہوگی۔

میرے پاس اُس وقت مجلس علمی کا نسخہ تھا، جس میں مخدوش مقامات پر نشانات بھی لگائے تھے، اس کے بعد کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور اب ۲۔۳ سال قبل تالیفِ انوارالباری کی ضرورت سے کتابیں خریدی گئیں تو مکمل سیرۃ النبی بھی منگائی گئی، اور اس وقت بظاہر یہ آخری ایڈیشن بارِ چہارم کا مطبوعہ ۱۹۵۹ء، (م ۱۳۷۸ھ) میرے پاس ہے، کیونکہ آخری ایڈیشن ہی لکھ کر طلب کیا گیا تھا۔ اب تک کئی جگہ مراجعت کی اور یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ رجوع شدہ اغلاط اب بھی موجود ہیں اور رفقائے دارالمصنفین نے اصلاح و ترمیم کا کوئی خیال نہیں کیا، اگرچہ میں اس کا ممنون ہوں کہ ادارہ نے میری دوسری بار کی درخواست پر سید صاحبؒ کے رجوع و اعتراف شائع شدہ معارف ماہ جنوری ۱۹۴۳ء کی نقل مجھے بھیج دی ہے۔

ضرورت ہے کہ اگر سیرۃ النبی پر نظر ثانی کرکے اس کی رجوع شدہ اور دوسری فروگذاشتوں کی اصلاح نہ ہوسکے تو کم از کم یہ شائع شدہ رجوع تو ضرور ہی اسکے ساتھ چھپ جایا کرے، اس موقع کی مناسبت سے اس کے چند جملے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

کتابوں اور مضمونوں کے ہزار ہا صفحات اتنے دنوں (چالیس سال کے عرصہ) میں سیاہ کئے گئے، کہا نہیں جاسکتا کہ کہاں کہاں حق کا ساتھ چھوٹا ہے، اور کس کس باطل کی تائید میں قلم نے لغزش کی ہے۔ خاکسار ہیچمدان علی الاعلان اپنی ان تمام غلطیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ حق کے خلاف ہوئی ہوں، صدق دل سے توبہ کرتا ہے، اور اپنے قصور کا اعتراف اور اپنی ہر اُس رائے سے جسکی سند کتاب و سنت میں نہ ہو ،اعلان براءت کرتا ہے، وما توفیقی الا باللہ تعالیٰ۔

مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیمؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے، ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہے تو بعد کے ایڈیشن میں اس کے مطابق تبدیلی کردی ہے، مثلاً معراج بحالت بیداری و بجسم ہونے پر قرآن مجید سے صحیح استدلال مجھے پہلے نہیں مل سکا اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی، تو دوسرے ایڈیشن میں اُس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کردی۔

اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی میں کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کرکے دونوں کے دلائل کی تشریح کردی، اور اب بحمد اللہ کہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آگیا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ چند اور مسائل میں اپنے رجوع کا ذکر کرکے آخر میں لکھا:۔

اگر مسلمانوں میں کوئی ایسا ہو جس نے میری وجہ سے ان مسئلوں میں میری رائے اختیار کی تو اس کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ اس میرے رجوع اور تصحیح کے بعد اپنی غلطی سے رجوع کرے اور صحیح امر اختیار کرے، علمائے سلف میں اپنی رائے سے رجوع اور ترجیح قول ثانی کا رواج عام رہا ہے، یہ ان ہی کا اتباع حق ہے۔ **والحق احق ان یتبع والسلام علی من اتبع الھدیٰ** (معارف ماہ جنوری ۱۹۴۳ء)۔

اوپر کی تفصیل سے واضح ہوگیا کہ حضرت سید صاحبؒ کی تحقیق آخر میں وہ نہ رہی تھی جو پہلے انہوں نے حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کے اتباع میں اختیار کی تھی، بلکہ وہ جمہور کی رائے کو اصح و اصوب مان چکے تھے، مگر موجودہ مطبوعہ و شائع شدہ سیرۃ النبی میں فنائے نار کی بحث پڑھ کر ہر شخص یہی سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ سید صاحب فنائے نار کے مسلک کو ترجیح دیتے تھے، اس لئے ہم اسکی غلطی واضح کردینا ضروری سمجھتے ہیں واللہ الموئید:۔

۶۰/۴ میں لکھا گیا کہ آیت **ولنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر لعلھم یرجعون** (سجدہ رکوع ۲) سے معلوم ہوا کہ عذابِ الٰہی کا مقصد انتقام اور نفسِ سزا و عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہِ راست پر لانا ہے، اس کی راجح تفسیر یہ ہے

کہ دنیا کے مصائب و پریشانیاں وغیرہ چھوٹا عذاب اس لئے انسانوں پر ڈالا جاتا ہے کہ وہ معاصی اور کفر و شرک سے باز آجائیں اور آخرت کے عذاب اکبر سے محفوظ ہوں، لہذا اس سے عذاب اخروی کو بھی نفس سزا اور عقوبت کی مد سے خارج کرنا درست نہ ہوگا۔

آگے ۶۰ ے ہی میں دوسرا عنوان عذابِ برزخ بھی کفارہ ہے اس کے تحت امتِ محمدیہ کے لئے برزخ کی تکالیف کا کفارہ ہونا ذکر کیا گیا ہے، جس سے مطلق عذاب کا خواہ وہ کفار پر ہو، کفارہ ہونا ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ آگے خود لکھا کہ حشر میں کفار کہیں گے کہ ہمیں بھی نیک بخت مومنوں کی طرح حشر و نشر اور بعد کے عذاب سے بچالیا جائے تو اس پر اُن کو جواب ملے گا:۔ **النار مثواکم خالدین فیھا الا ماشاء اللہ** (انعام) اس جواب کا مطلب یہ بتلایا کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی کامل نہیں ہوئی ہے، اس لئے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے، پھر جب خدا چاہے گا، تم کو اس سے نجات دے گا، اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے، اس کے علم و حکمت اور مصلحت کا جب تقاضہ ہوگا تم کو نجات ملے گی (سیرۃ النبی ۶۳ ے/۴)۔

آگے تیسرا عنوان ہے عذابِ دوزخ کفارۂ گناہ پھر وہ آیات پیش کی ہیں جن سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کیلئے بنایا ہے، عذاب کے لئے نہیں، پھر چوتھا عنوان لائے:۔ دوزخ قید خانہ نہیں، شفاخانہ ہے اور ۲ ے ے میں یہ عنوان بھی آگیا:۔ گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے جس کے ثبوت میں سورۂ رحمان کی آیات پیش کی گئیں، کہ آخرت کا عذاب بتلا کر نعمت جتائی گئی، حالانکہ مفسرین نے تصریح کردی ہے کہ بیانِ عذاب کے بعد فبای آلاء الآیہ کا مطلب یہ ہے کہ مجرموں کو سزا دینا بھی وفاداروں کے حق میں انعام ہے اور اس سزا کا بیان کرنا تاکہ لوگ سُن کر اُس جُرم سے باز رہیں یہ مستقل انعام ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:۔ ہر آیت میں نعمت جتائی، کوئی اب نعمت ہے اور کسی کی خبر دینا نعمت ہے کہ اُس سے بچیں (فوائد عثمانی ۶۹۱)

۳ ے ے/۴ میں آیاتِ سورۂ رحمٰن نقل کر کے لکھا گیا:۔ ان آیتوں کی تفسیر کسی پہلو سے بھی کیجئے، یہ بات بہر حال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال مجرموں کے حق میں نعمت ہیں، اس لئے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہِ راست پر آتے ہیں اور اس لئے بھی کہ آخرت میں وہ ان ہی کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشتِ ربانی کی رونق بن سکیں گے یہاں جن مجرموں کا عذاب بیان ہوا ہے، ان سے مراد گناہگار مومن بندے نہیں ہیں ایسا ہوتا تو صاحبِ سیرت کی بات درست بن سکتی، کیونکہ خود ان آیات ہی میں ہے **ھذہ جھنم التی یکذب بھا المجرمون** کیا تکذیبِ جہنم بھی مومن کا فعل ہو سکتا ہے؟ اس لئے بالکل ظاہر ہے کہ مراد مجرم کفار و مشرکین ہیں، پھر ان کے بہشتِ ربانی کے لائق بننے کا مطلب ہوگا؟ کفار کے بہشت میں جانے کے تو شیخ اکبر، ابن تیمیہ، وابن قیم بھی قائل نہیں ہیں۔

۴ ے ے/۴ میں عنوان ہے دوزخ میں رحمتِ الٰہی کا ظہور اور نجات اس کے تحت کلمہ گو گنہگار مومن بندوں کی نجات آیات و احادیث سے بیان کی ہے، مگر عنوان اس کے بجائے، بعض اہل جہنم کے لئے رحمتِ الٰہی کا ظہور و نجات ہو تو بہتر ہے، کیونکہ رحمت الٰہی کا ظہور دوزخ کے اندر نہ ہوگا لیکن مصنف کے ذہن میں چونکہ دوزخ کا مرتبہ مظہر قہر و غضب کا نہیں بلکہ شفاخانہ کا ہے، اس لئے ایسا عنوان لکھا ہوگا۔

۷۷۹ میں عنوان آیا:۔ کیا دوزخ کی انتہا ہے؟ اور لکھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے، گویا جمہور سلف و خلف کو مصنف نے اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں میں بھی شامل نہیں رکھا اس پر ایک بڑا حاشیہ بھی دیا ہے، جس میں اختلاف کی تفصیلات دی ہیں، اور آخر حاشیہ میں لکھا کہ میں نے اس باب کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس میں اجمال الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے، معلوم نہیں بہت ڈرتے ڈرتے نہ لکھتے تو اور کیا کچھ لکھ جاتے، آخر میں یہ بھی لکھا:۔ اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور توبہ کی توفیق بخشے اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھول دے

خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے حضرت سید صاحبؒ کی مذکورہ دعا قبول کی اور انہوں نے حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کے اختیار کردہ تفرد کو چھوڑ کر جمہور کے مسلک کو حق مان لیا اور رجوع بھی شائع کر دیا، یہ اور بات ہے کہ سیرۃ النبی شائع کرنے والوں نے اُن کے رجوع کو اہمیت نہ دی، اور افسوس ہے ایسی بڑی غلطی حضرت سید صاحبؒ کی طرف منسوب ہو کر برابر شائع ہو رہی ہے، جس کی اصل وتر جموں سے نہ معلوم کتنے لوگوں کو مسلکِ حق سے دوری ہو رہی ہوگی۔

بحث بہت لمبی ہوتی جا رہی ہے، ورنہ میں ان تمام دلائل کی بھی تردید کرتا جو فنائے نار کے لئے پیش کئے گئے ہیں مختصر گزارش ہے کہ جس جہنم کو شفاخانہ کی حیثیت دی جا رہی ہے کیا وہ واقع میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ اسکا فیصلہ خود اس کے خالق و مالک کے ارشادات کے ذریعہ کرایا جائے تو بہتر ہے۔

عذابِ جہنم اور قرآنی فیصلہ

(۱) جہنم کو قرآن مجید میں کئی جگہ **بئس المصير** (بُرا ٹھکانا) فرمایا گیا ہے۔

(۲) **اعتدنا لمن كذب بالساعة سعيرا** (فرقان) میں آگ کا جیل خانہ بتلایا ہے۔ (فوائد عثمانی ۴۶۷)

(۳) **ان الذين كفروا وما توا وهم كفار** آلایہ (بقرہ) جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی حالت کفر پر مر گئے، ان پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور انسانوں کی سب کی لعنت ہوگی، وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے، ان کا عذاب کبھی ہلکا نہ ہوگا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

(۴) **ولهم عذاب مقيم** (مائدہ) ان کے لئے ہمیشہ قائم رہنے والا عذاب ہوگا۔ **انه من يشرك بالله فقد حرم الله عليه الجنة وماواه النار** (مائدہ) شرک کرنے والے پر جنت حرام ہوگی، اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔

(۵) اہل جہنم کفار ومشرکین کی فریاد پر ارشاد ہوگا:۔ **اخسئوا فيها ولا تكلمون** (سورۂ مومنون) پڑے رہو پھٹکارتے ہوئے اور ہم سے بات مت کرو۔

(۶) **لاتدعوا اليوم ثبورا واحدًا وادعوا ثبورًا كثيرا** (فرقان) مت پکارو آج ایک مرنے کو اور پکارو بہت سے مرنے کو۔

(۷) **فذوقوا عذاب الخلد** (سجدہ) (چکھو عذاب سدا کا) **كلما ارادوا ان يخرجوا منها اعيدوا فيها** (سجدہ) جب بھی وہ جہنم سے نکلنا چاہیں گے اسی میں لوٹا دیئے جائیں گے۔

(۸) **والذين كفروا لهم نار جهنم** الآیہ (فاطر) کفار کے لئے جہنم کی آگ ہے، نہ تو ان کا بالکل قصہ ہی تمام کر دیا جائے گا کہ مر جائیں اور نہ سزا میں ہی کمی کی جائیگی۔

(۹) **فی سموم وحميم** الایہ (واقعہ) اصحابِ شمال کے لئے تیز بھاپ، جلتا پانی، اور دھوئیں کا سایہ ہوگا۔ **لآكلون** الآیہ سخت بھوک میں سینڈھ کے درخت سے پیٹ بھریں گے، اور اس پر گرم گرم جلتا ہوا پانی پئیں گے، انصاف کے دن ان کی مہمانی اسی شان سے مناسب وموزوں ہوگی، کیونکہ ہم نے ہی تو اُن کو پیدا کیا تھا، پھر بھی ہمارے قائل ہو کر نہ دیئے (بلکہ غیروں کا دم بھرتے رہے، اُن ہی کے لئے جئے اور ان ہی کے لئے مرے)۔

(۱۰) **فسحقا لاصحاب السعير** (ملک) اب دفع ہو جائیں دوزخ والے، ان کے لئے جوارِ رحمت میں کہیں ٹھکانہ نہیں۔

(۱۱) **كلا انها لظى نزاعة للشوى** (معارج) وہ تپتی ہوئی آگ ہے، جہنم کی کھینچ لینے والی کلیجہ کو۔

(۱۲) **وما ادراك ماسقر لا تبقى ولا تذر لواحة للبشر عليها تسعة عشر** الآیہ (مدثر) وہ آگ کیسی ہے؟ دوزخیوں کی کوئی چیز باقی نہ رہنے دے گی، بدن کی کھال جھلس کر حلیہ بگاڑ دے گی، جس پر انیس فرشتے مقرر ہیں (یہ انیس افسر ۱۹ قسم

کے عذاب پر مقرر ہوں گے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے تفسیر عزیزی میں ان کی تفصیل لکھی ہے)

(۱۳) **انها ترمی بشرر كالقصر** (مرسلات) وہ جہنم کی آگ محل جیسے اونچے شرارے پھینکتی ہے۔ **هذا يوم لا ينطقون** (مرسلات) اس دن تکذیب کرنے والے کفار کا بہت بُرا حال ہوگا نہ ان کو بولنے کی اجازت ہوگی نہ معذرت کرنے کی۔

(۱۴) **لا يذوقون فيها بردا الآيه** (نباء) جہنم میں نہ ٹھنڈک کی راحت پائیں گے نہ کوئی خوشگوار چیز پینے کو ملے گی، بلکہ گرم پانی ملے گا کھولتا ہوا جس کی سوزش سے منہ جھلس جائیں گے، اور آنتیں کٹ کر پیٹ کے باہر آجائیں گی، اور دوسری چیز پیپ ملے گی۔ جو دوزخیوں کے زخموں سے نکل کر بہے گی۔

غرض قرآن مجید میں جہاں بھی جہنم کا ذکر ہوا ہے، بطور مظہر غیظ وغضب وقہر وجلال خداوندی ہوا ہے اس کو شفاخانہ سے تعبیر کرنا بالکل قلبِ موضوع ہے، کیونکہ شفاخانہ تو رحمت وشفقت کی جگہ ہے اسی لئے وہاں کے خدام وتیمارداروں کا نہایت خوش خلق اور رحم دل ہونا ضروری ہوتا ہے کہ بیماری کی تکالیف کو بھی راحت وآرام سے بدل دیں، ہمارے نزدیک تو جہنم کو قید خانہ کہنا بھی اس کو کم درجہ دینا ہے کیونکہ اس میں قید وبند اور مشقتِ مقررہ کے علاوہ ہر قسم کے انسانی حقوق ومراعات دی جاتی ہیں۔

وجہ یہ کہ ایک انسانی حکومت اور اس کے قوانین کی بغاوت پر صرف اتنی ہی سزا دی جاسکتی ہے، لیکن **احكم الحاكمين رب العالمين جل وعلا** کی حکومتِ مطلقہ عالیہ سے بغاوت وہ جرم ہے جس کی سزا جہنم کا دائمی وابدی عذاب ہی ہوسکتا ہے اسکے وفادار واطاعت گزار بندے حزب اللہ بن کر خیر البریہ (بہترین خلائق ومخلوقات) کہلائے اور نعیم ابدی ورضوانِ دائمی سے بہرہ ور ہوئے، اور اس کے باغی وسرکش بندے حزب الشیطان بن کر شر البریہ (بدترین خلائق) کہلائے اور ابدی عذاب ولعنت کے سزاوار ہوئے، ان کے لئے رحم وکرم کا کیا موقع رہا۔

دونوں فریق کے حسبِ حال واستحقاق آخرت کی ابدی زندگی گزارنے کے واسطے جو جو مقامات، رقبے اور حدود تجویز کردی گئیں، ان میں تبدیلی کا سوال ہی نہیں **فريق في الجنة وفريق في السعير**

آخرت میں ملی جلی آبادی نہ ہوگی، وہاں کفار ومشرکین کی کالونی الگ اور ابرار واخیار مومنون کی کالونی جدا ہوگی **وامتازوا اليوم ايها المجرمون** (اس آخرت کی زندگی میں مجرموں کو غیر مجرموں سے الگ کردیا جائیگا) بلکہ دونوں قوموں کے طبقے بھی بہت دور دور اور الگ الگ ہوں گے **الا يترای نارا هما** کا صحیح مصداق اوپر کا طبقہ اہل جنت کا اور نیچے کا جہنم والوں کا ہوگا۔ دونوں طبقوں کے درمیان کروڑوں اربوں نوری سالوں کی مسافت حائل ہوگی، تاہم دونوں علاقوں کے رہنے والے ایک دوسرے کو دیکھیں گے، اور گفتگو بھی کرسکیں گے۔ آج ہم ٹیلی ویژن مشینوں کے ذریعہ امریکہ کی آوازیں سُنتے ہیں اور بولنے والوں کی صورتیں بھی دیکھتے ہیں، جنت میں مشینوں کی احتیاج نہ رہے گی۔ دنیا کی زندگی میں اگرچہ دونوں فریق اور قومیں ایک ساتھ اور ایک جگہ زمین پر رہتی تھیں، مگر ایک کے اعمال وارواح کے لئے ہر وقت اوپر کے اپنے طبقے اور وطن میں جانے کی اجازت تھی، دوسرے کے نہ اعمال اوپر جاسکتے تھے، نہ ارواح، **لا تفتح لهم ابواب السماء** احوال وقرائن دنیا کی زندگی ہی میں بتادیتے ہیں کہ آئندہ کی زندگی کہاں گزرنے والی ہے، بیشک اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا، نہ کسی پر سعادتوں کے دروازے بند کرتا ہے، بلکہ انسان خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں، اور جان بوجھ کر راہِ سعادت چھوڑ کر راہِ شقاوت وبدبختی پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔

فالهمها فجورها وتقواها، قد افلح من زكها وقد خاب من دسها۔ آدھی دنیا دوزخ میں ٹھکانہ بنائے گی اور آدھی جنت کی طرف چلی جائے گی، حدیثِ قدسی میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **هٰؤلاء الى الجنة ولا اُبالي وهٰؤلاء الى النار ولا ابالي** (یہ سب جنت

---

[۱] نطق انور جلد اوّل میں ہم نے حضرت شاہ صاحبؒ سے علاقہ جہنم وعلاقہ جنت کی تعیین نقل کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین کا علاقہ جہنم کا ہے اور آسمانوں کے اوپر سدرۃ المنتہٰی سے عرش اعظم تک جنت کا علاقہ اور اس کے سارے درجات ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم مؤلف

کے مستحق ہوکر ادھر چلے آئے، مجھے اس کی پروانہیں کہ میری ذات بے نیاز ہے، اور وہ سب جہنم سے تعلق کر کے اُدھر رہ گئے، اس کی بھی پروانہیں کہ میری ذات بے نیاز ہے دوسری حدیث میں ہے کہ ساری دنیا کے لوگ بھی اگر متقی پرہیزگار اور میرے عبادت گزار بن جائیں تو میری خدائی شان میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا، اور سارے ہی ایک طرف سے بدکار کفار اور فساق وفجار بن جائیں تو میری خدائی شان میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ **اللھم اجعلنا کلنا من حزبك ومن اھل الجنة ولا تجعلنا مع حزب الشیطان واھل النار ،انك سمیع مجیب الدعوات۔**

جنوں کا مقام جنت ودوزخ میں

اگر چہ امام بخاریؒ باب بدء الخلق ۶۵ ۴ میں مستقل طور سے باب **ذکر الجن وثوابھم وعقابھم** ،لائیں گے، تاہم یہاں بھی لکھا جاتا ہے، مطبوعہ حاشیہ بخاری ۶۵ ۴ میں کرمانی کا قول اور حضرت امام اعظم وامام مالکؒ کے مناظرہ کا ذکر ہے، حافظ ابن حجرؒ نے وجودِ جن، اقسام جن وغیرہ تفصیل دے کر ثواب وعقاب کے بارے میں بھی بیانِ مذاہب ودلائل کیا ہے، اس میں امام اعظمؒ وغیرہ کا قول ثواب جن کے متعلق لکھا کہ وہ مٹی کر دیئے جائیں گے، جمہور کا قول یہ نقل کیا کہ ان کو طاعات کا ثواب دیا جائے گا اس کے قائل ائمہ ثلاثہ (امام مالک، شافعی واحمد) اور اوزاعی، ابو یوسف، امام محمد بن الحسن وغیرہم ہیں، پھر یہ اختلاف ہوا کہ انسانوں ہی کی طرح جنت میں رہیں گے یا فرق ہوگا؟ ایک قول جو اکثر کا ہے یہ کہ ان ہی کی طرح ہوں گے، دوسرا یہ کہ جنت کے اردگرد اور نواحی میں رہیں گے، یہ امام مالک وغیرہ کا ہے، تیسرا یہ کہ وہ اصحابِ اعراف ہوں گے، چوتھا قول توقف کا ہے ابنِ ابی حاتم کی روایت میں بہ طریق ابی یوسف ابن ابی لیلی کا بھی یہ قول مروی ہے کہ جنوں کو جنت میں ثواب ملے **گالقوله تعالیٰ ولکل درجات مماعملوا** (سب ہی کو اپنے اعمال کے مطابق وہاں کے درجات ملیں گے) الخ (فتح الباری ۷/۲۱/۹)

محقق عینیؒ نے بھی جنوں کے بہت سے احوال کی تحقیق کی، پھر ثواب وعقاب کی بحث لائے، اور امام اعظمؒ کا قول **لاثواب لھم الا النجاة من النار ثم یقال لھم کونو اترا بامثل البھائم** نقل کیا، یعنی حساب وکتاب کے بعد صالح مومن جنوں کو ارشاد ہوگا کہ تمہارا تمہارا ثواب یہی ہے کہ جہنم سے نجات مل گئی، اور تم بہائم کی طرح مٹی ہو جاؤ، ابن حزم نے امام صاحب کے علاوہ بواسطہ سفیان ثوری لیث بن ابی سلیم سے بھی یہی قول نقل کیا ہے، دوسرا قول یہ کہ جنوں کو ثواب دیا جائے گا، الخ مثل نقلِ حافظؒ۔ پھر اس امر پر سب کا اتفاق نقل کیا کہ کافر جنوں کو عذاب ضرور ہوگا۔

امام ابو یوسف، امام محمد وامام مالک، شافعی واحمد وغیرہ سے یہ بھی منقول ہے کہ صالح مومن جن نواحی جنت میں مقیم ہوں گے، اور دنیا کے برعکس وہاں جنتی انسان ان کو دیکھیں گے اور وہ انسانوں کو نہ دیکھ سکیں گے، یہ بات حافظ ابن تیمیہ نے ابن حزم کے برخلاف نقل کی ہے۔

فرشتوں اور جنوں کو دیدارِ الٰہی نہ ہوگا؟

شیخ عبدالسلام کی قواعد صغری میں یہ بھی ہے کہ مومن جنوں کو جنت میں رؤیتِ باری تعالیٰ کا شرف حاصل نہ ہوگا کیونکہ یہ شرف صرف مومن انسانوں کو حاصل ہوگا، اور جبکہ ملائکہ[1] کو بھی حاصل نہ ہوگا، تو بدرجہ اولیٰ جنوں کو بھی حاصل نہ ہوگا۔ الخ (عمدہ ۱۸۴/۱۵) طبع منیریہ

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے بھی یہ تھی کہ مومن جن جنت میں رہیں گے مگر انسانوں کے تابع ہوکر، جس طرح دنیا میں رہتے ہیں کہ ہمارا پس خوردہ کھاتے ہیں اور جنگلوں اور پہاڑوں میں سکونت کرتے ہیں، ہماری طرح آباد علاقوں میں نہیں رہتے، ایسا ہی حال غالباً جنت میں بھی ہوگا، کہ ہمارے متروکہ مطعومات ومشروبات کھایا پیا کریں گے، اور انسانوں کے متروکہ غیر مسکونہ علاقوں (اطراف ونواحِ جنت) ہی میں سکونت بھی کریں گے۔ حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ میرے نزدیک امام اعظم ابوحنیفہؒ کی رائے بھی یہی ہوگی، جس کی نقل میں تحریف ہوکر ان کی طرف بالکلیہ انکار اور نفی منسوب ہوگی۔

---

[1] فرشتوں کے بارے میں شیخ کے اس قول کو علماء نے غریب کہا ہے۔ مؤلف

عروجِ مستوی! اوپر ہم معتبر حوالوں روح المعانی وغیرہ سے لکھ چکے ہیں کہ عروجِ مستوی کا درجہ نویں معراج کا تھا، اور عروجِ عرش کا درجہ دسویں اور آخری معراج کا، اس لئے بعض کتبِ سیرت میں جو منتہائے عروج کا عنوان قائم کر کے صرف سدرۃ المنتہیٰ تک عروج بتلایا گیا ہے وہ خلافِ تحقیق ہے، یہاں بھی مزید وضاحت کی جاتی ہے حافظ ابن حجرؒ نے **باب ماجاء فی قولہ عزوجل وکلم اللہ موسیٰ تکلیما** (بخاری ۱۱۲۰) میں **ثم علا بہ فوق ذلک بمالا یعلمہ الااللہ حتی جاء سدرۃ المنتہی** پر لکھا کہ یہاں سیاق وسباقِ عبارت میں تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے، کیونکہ سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر پہلے ہوتا پھر علا بہ الخ ذکر ہوتا (فتح الباری ۱۳/۳۷۱) معلوم ہوا کی عروجِ مستوہ کا مرحلہ سدرۃ المنتہیٰ کے بعد پیش آیا ہے۔

محقق عینی نے لکھا:۔ سدرۃ المنتہیٰ اس مقام کا نام اس لئے ہوا کہ ملائکہ کا علم اس تک منتہیٰ ہو جاتا ہے، اور اس لئے بھی کہ اس سے آگے بجز رسول اکرم ﷺ کے اور کوئی نہیں گیا۔

علامہ سیوطیؒ نے لکھا:۔ سدرہ کی اضافت منتہیٰ کی طرف اس لئے ہے کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں تک بندوں کے اعمال اور خلائق کے علوم کی انتہاء ہے، اور اس سے آگے فرشتوں اور رسولوں کو بھی تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ملی، بجز نبی اکرم ﷺ کے، اور وہ ساتویں آسمان میں ہے، اور اس کی جڑ چھٹے آسمان میں ہے (مرقاۃ ۵☆۳۲۹)

علامہ نوویؒ نے شرح مسلم شریف میں لکھا:۔ حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے مفسرین نے کہا کہ سدرۃ المنتہیٰ اس لئے نام رکھا گیا کہ علم ملائکہ وہاں تک منتہیٰ ہوتا ہے، اور اس سے آگے بجز رسول اکرم ﷺ کے کسی نے تجاوز نہیں کیا، اور حضرت ابن مسعودؓ سے نقل ہوا کہ جو اوامرِ خداوندی اوپر سے اُترتے ہیں اور جو امور نیچے سے اوپر چڑھتے ہیں وہاں پہنچ کر رُک جاتے ہیں (نووی ۱/۹۲)

علامہ نووی نے **حتی ظہرت لمستوی** (پھر مجھ کو اوپر چڑھایا گیا یہاں تک کہ میں مستویٰ تک پہنچ گیا) کی تحقیق کرتے ہوئے علامہ قاضی کا یہ قول نقل کیا:۔ حضور اکرم ﷺ کے علو درجہ وفضل وشرف خاص کی یہ بڑی دلیل ہے کہ آپ شبِ معراج میں تمام انبیاء علیہم السلام سے اوپر کے مرتبہ پر فائز ہوئے اور ملکوتِ سمٰوات کے مقامِ خاص تک پہنچے۔ (نووی ۱/۹۳)

حافظؒ نے باب المعراج (بخاری ۵۴۸) میں **قولہ فلما جاوزت نادانی مناد** الخ کے تحت تکملہ کے عنوان سے لکھا:۔ اس روایت کے علاوہ دوسری روایات میں کچھ اور امور کی زیادتی بھی ہے جو آپ نے سدرۃ المنتہیٰ کے بعد دیکھے ہیں (جن کا ذکر اس روایت میں نہیں ہے) ان میں سے یہ بھی ہے کہ میں نے مستویٰ پر چڑھ کر قلموں کے چلنے کی آواز سُنی، اس زیادتی کا ذکر اوّلِ صلوٰۃ میں بھی آچکا ہے (فتح الباری ۷/۱۵۳) یہاں حافظؒ نے اوّلِ صلوٰۃ والی حدیث کا حوالہ دیا، حالانکہ وہاں بھی عروجِ مستویٰ کا ذکر سدرہ سے پہلے کیا گیا ہے، اور غالباً حافظ نے اسی سے یہ صراحت کی ہے کہ مستویٰ کا عروج اور وہاں پہنچ کر جن چیزوں کا مشاہدہ ہوا وہ سب سدرۃ المنتہیٰ سے اوپر اور اس کے بعد ہوا ہے، گویا یہاں بھی ضمناً تنبیہ کردی کہ رواۃ کی ترتیب پر نہ جانا چاہیے واللہ تعالیٰ اعلم!

اوپر کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ مستویٰ کے مقام کے عروج سدرہ کے بعد ہوا ہے، اور سدرہ سے اوپر عروج بجز رسول اکرم ﷺ کے کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ آگے اس کی مزید تشریح پڑھئے! علامہ قسطلانیؒ نے لکھا کہ مستویٰ کے معنی مصعد کے ہیں یعنی اوپر چڑھنے کی جگہ، شارحِ علامہ محدث زرقانیؒ نے لکھا کہ دوسرے معنی مکان مستویٰ کے بھی ہیں یہ دونوں معنی روایت بمستوی کے مناسب ہیں اور روایت لام لمستویٰ کی صورت میں علامہ محدث تورپشتی حنفیؒ (شارح مشکوٰۃ شریف) نے کہا کہ لام علت کا ہے کہ میں بلند ہوا مستویٰ کی بلندی کی وجہ سے یا اس کے مشاہدہ ومطالعہ کے لئے، اور احتمال ہے کہ اس کو مصدر سے متعلق مانا جائے یعنی ظہرت ظہور المستوی اور ہوسکتا ہے کہ لام بمعنی الی ہو، جیسے اوحی لہا بمعنی اوحی الیہا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ایسے اونچے مقام پر چڑھ گیا جہاں سے ساری کائنات

وموجوداتِ عوالم کو دیکھا اور حق تعالیٰ کے اپنی مخلوقات کے بارے میں جو کچھ بھی اوامر و تدبیرات ہیں وہ بھی مجھ پر ظاہر ہوئے اور یہی وہ منتہیٰ ہے جس سے آگے کسی کو بڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا الخ (شرح المواہب ۸۸/۶)۔

صریف اقلام سُننا

حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ میں نے مستوی پر پہنچ کر قلموں کے چلنے کی آوازیں سُنی ملا علی قاریؒ نے لکھا یعنی لکھنے کے وقت قلموں کے چلنے کی جو آواز ہوتی ہے وہ آپ نے سُنی، اور یہ قلم تقدیر ہائے عالم کی کتابت کررہے تھے، یعنی میں ایسے بلند اور عظیم الشان مقام پر پہنچا جہاں سے تمام کائنات کا مشاہدہ کیا اور تمام اوامر و تدابیر الٰہیہ پر مطلع ہوا اور یہی وہ آخری مقام تھا جہاں سے آگے کوئی نہیں جاتا، یہی تحقیق ہمارے علماء میں سے بعض شارحین کی ہے الخ (مرقاۃ ۴۳۵/۵)

قاضی عیاضؒ نے بابِ معراج میں ایک فصل کلام و مناجاتِ باری جل ذکرہ کی بھی قائم کی ہے، جس میں ثابت کیا کہ حق تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کلام و تکلیم سے شرف عظیم بخشا تھا، اور چونکہ سید المرسلین علیہ السلام کا درجہ سارے انبیاء و مرسلین سے زیادہ بلند کیا (اور فرمایا **ورفع بعضهم درجات**) حتی کہ آپ مقامِ مستویٰ تک پہنچ گئے، اور وہاں ان قلموں کے چلنے کی آوازیں بھی سُنیں جو حق تعالیٰ کے فیصلے اور احکام لکھتے ہیں، ایسی حالت میں آپ کے لئے حق تعالیٰ کا کلام سُننے کو کیونکر مستبعد یا عجیب سمجھا جا سکتا ہے؟ پس پاک و مقدس ہے وہ ذاتِ اقدس و اعلیٰ جس نے جس کو چاہا اپنے خاص کرم و نوال سے نواز ا اور مقاماتِ عالیہ میں بعض کے درجات بعض سے زیادہ کردیئے۔

(شرح شفاء لملا علی قاری حنفیؒ ۴۳۳/۱ مطبوعہ استنبول ۱۳۱۶ھ)

شرح المواہب میں ہے۔ قاضی عیاض اور علامہ نوویؒ نے کہا کہ قلموں کی آواز فرشتوں کے لکھنے کی تھی جو وہ حق تعالیٰ جل ذکرہٗ کے فیصلہ شدہ امور لوحِ محفوظ سے نقل کرتے ہیں اور جو کچھ لوحِ محفوظ میں ہے وہ سب قدیم ہے صرف کتابت حادث ہے، اور ظاہر اخبار سے معلوم ہوا کہ لوحِ محفوظ کی کتابت سے فراغت ہو چکی ہے گویا قلم آسمان و زمین کی پیدائش سے بہت پہلے قدرت کے فیصلے لکھ کر خشک ہو چکے ہیں، اور فرشتوں کے اپنے مصاحف میں لکھنے کی جو آواز سُنی گئی، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی اصل کتاب سے نقلیں لی جاتی ہیں، اور اسی میں محو و اثبات ہوا کرتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے، یہ تحقیق ابن دحیہ کی ہے جس کا اتباع ابن المنیر نے کیا ہے اور ان دونوں نے مزید بتلایا کہ اصل لوحِ محفوظ کی جس سے اس کے علوم لکھے گئے ہیں وہ ازلِ قدم کا علمِ غیب قدیم ہے، جس میں نہ محو ہو سکتا ہے نہ اثبات، کہ اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم۔

صریف اقلام سُننے کی حکمت

اس میں حکمت بالغہ واللہ اعلم یہ تھی کہ حضور علیہ السلام کو مقدوراتِ الٰہیہ کے بارے میں جفافِ قلم کا علم ہو کر پوری طرح اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے اور صرف تقدیر الٰہی کی طرف ہی تفویض آسان ہو جائے، اسباب کی طرف سے صرفِ نظر ہو جائے، اور تا کہ اسباب کا استعمال بطورِ تعبّد (وتعمیل ارشادِ الٰہی) ہو جائے، بطور تعوّد کے اور (عام لوگوں کی طرح) عادی طریق پر نہ ہو، اسی سے توکل کا کمال حاصل ہوتا ہے اور اختلافِ اسباب کے وقت اضطراب کا خاتمہ ہوتا ہے۔

نویں معراج مذکور اور نویں سال ہجرت میں مناسبت

ان دونوں حضرات (ابن دحیہ وابن المنیر) نے وجہ مناسبت یہ لکھی کہ نویں سال ہجرت میں غزوہ تبوک پیش آیا ہے، جس میں حضور

---

[۱] یہاں سے اہل سنت کے اس عقیدہ کی صحت کی دلیل بھی معلوم ہوئی کہ وحی و مقادیر کی کتابت لوحِ محفوظ میں قلموں کے ذریعہ ہو چکی ہے جیسا کہ آیات و احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے لیکن ان اقلام کی کیفیت خدا ہی جانتا ہے، لہذا جتنی بات ثابت ہو چکی ہے اس کو اسی طرح ظاہر پر رکھیں گے، تاویل و انکار کے ذریعہ ہیر پھیر نہ کریں گے، اور اس کی کیفیت صورت و جنس کی تعیین کو خدا کے علم محیط پر محول کریں گے۔ (شرح المواہب ۸۸/۶)

علیہ السلام نے مکمل تیاری کے ساتھ تیس ہزار مجاہدین صحابہؓ کے ساتھ مدینہ طیبہ سے شام کا سفر فرمایا، لیکن چونکہ تقدیر الٰہی میں فتح شام کا وقت نہ آیا تھا، اس لئے ان سب کو بغیر جنگ و فتح واپس آنا پڑا، چونکہ صرف تقدیر الٰہی پر اعتماد تھا، اسباب پر نہیں، اس لئے پورے وقار و سکینت کے ساتھ بلا کسی اضطراب اور شکوہ و شکایت کے رضائے الٰہی پر صابر و شاکر ہوئے۔ (شرح المواہب ۸۹/۶)

عروجِ عرش! یہ دسویں معراج کا بیان ہے، پہلے روح المعانی وشرح المواہب کے حوالہ سے گزر چکا کہ شب معراج میں سید المرسلین علیہ افضل الصلوات والتسلیمات کو دس معراجوں کا شرف حاصل ہوا، سات آسمان کا عروج سات معراج تھیں، سدرہ کا عروج آٹھویں معراج تھی جس کی مناسبت آٹھویں سال ہجرت سے شرح المواہب ۸/۶ میں محدث ابن المنیر (شارحِ بخاری شریف) کے حوالہ سے مذکور ہے، نویں معراج مستویٰ کی تھی جس کی مناسبت نویں سال ہجرت سے اوپر درج ہو چکی ہے، یہ دسویں معراج جو عرشِ الٰہی کی طرف تھی، اس کی مناسبت بھی دسویں سال ہجرت سے ظاہر ہے کہ آپ کے تمام مراتبِ کمال کی تکمیل ہو کر مدارجِ قربِ خداوندی کی تکمیل اور رفیق اعلیٰ کی طرف سفر مقدر ہو چکا تھا، جیسا کہ حضور اکرم علیہ السلام نے وفات کے وقت فرمایا بھی:۔ **اللّٰھم الرفیق الا علی** (اے بارِ الٰہا! اب میں رفیقِ اعلیٰ کی طرف عروج چاہتا ہوں) اسی دسویں عروجِ اعلیٰ کے موقع پر دنیا ہی کی زندگی میں حضور علیہ السلام کو دیدارِ خداوندی کا شرفِ اعلیٰ واکمل بھی حاصل ہوا، جو اس دنیا کی زندگی میں اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہوا، اگرچہ اس میں اختلاف بھی ہے، مگر ہمارے نزدیک اکثر امت کا فیصلہ ثبوتِ رؤیت ہی کا ہے، اور ہمارے سرخیل محدثین ہند حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (شارحِ مشکوٰۃ شریف) نے تو یہاں تک فرمادیا[1] کہ ہم بغیر رؤیت کے راضی نہیں ورنہ صرف تکلم مع الحجاب میں کیا شرف ہے؟! پوری بحث آگے آئیگی، ان شاء اللہ تعالیٰ!

علامہ قسطلانیؒ (شارحِ بخاری شریف) نے مواہبِ لدنیہ میں لکھا:۔شب معراج میں حضور اکرم علیہ السلام کمالِ ادب مع اللہ کی پوری رعایت فرماتے ہوئے، اور مراتبِ عبودیت کی تکمیل سرانجام دیتے ہوئے، برابر آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ ساتوں آسمانوں کے حجابات سے گزر گئے، پھر سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے بڑھ گئے، اور مقام قرب کے نہایت بلند مرتبہ پر فائز ہوئے، جس کی وجہ سے اولین وآخرین پر سبقت لے گئے، کیونکہ کوئی نبی مرسل اور مقرب فرشتہ بھی وہاں تک نہ پہنچا تھا، پھر آگے بھی حجاب پر حجاب اُٹھتے چلے گئے اور حضور ایسے مقام سے سرفراز ہوں گے، جس پر سارے اولین وآخرین غبطہ کریں گے، وہاں بھی آپ کی استقامت صراطِ مستقیم پر ایسے ہی کمالِ ادب مع اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوگی جیسی یہاں (شبِ معراج میں) **مازاغ البصر وماطغی** سے بیان ہوئی ہے الخ (شرح المواہب ۱۰۱/۶)۔

۱۰۶ میں قولِ قسطلانیؒ **ولما انتھی الی العرش تمسك العرش باذیاله** کے تحت علامہ زرقانیؒ نے صاحب سبیل الرشاد کا اختلاف نقل کیا ہے۔جس میں انہوں نے قولِ ابن المنیر در بارۂ عروج الی العرش کو نامناسب کہا اور قزوینی سے روایتِ **وطء النبی العرش بنعله** اور **وصول الی ذروۃ العرش** کا بے اصل ہونا نقل کیا، نیز ماوراءِ سدرہ کے اصول کو اخبارِ ضعیفہ ومنکرہ سے بتلایا، اور بعض محدثین نے قزوینی کے جواب مذکور کو صواب بتلا کر کہا کہ اسراء ومعراج کی روایات مختصر ومفصل تقریباً چالیس صحابہ سے مروی ہیں، لیکن کسی نے عرش کا ذکر نہیں کیا اور کسی حدیث سے یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ حضور علیہ السلام نے عرش کو دیکھا ہے، بجز روایت ابن ابی الدنیا کے ابوالخارق سے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔میں شبِ اسراء میں ایک شخص کے پاس سے گزرا جو نورِ عرش میں چھپا ہوا تھا، میں نے کہا یہ فرشتہ ہے؟ کہا گیا نہیں میں نے کہا کیا نبی ہے؟ کہا گیا نہیں، میں نے کہا پھر کون ہے؟ کہا گیا ایک شخص ہے جس کی زبان ہر وقت ذکرِ الٰہی سے تر رہتی ہے، اور کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے لوگ اس کے ماں باپ کو بُرا کہیں۔لیکن یہ حدیثِ مرسل ہے، جس سے اس باب میں استدلال

---

[1] حضرت الشیخ المحدث مولانا شیخ محمد تھانویؒ نے حاشیہ نسائی شریف ۶/۳۷ میں نقل کیا:۔**والبعض من اکابر المتاخرین کا شیخ عبدالحق المحدث الدھلوی یقول انالا نرضی بدون الرئویة فیه والا فای شرف فی التکام مع الحجاب فقط؟!**

نہیں ہوتا، علامہ زرقانیؒ نے یہ سب نقل کر کے لکھا کہ اوپر کا یہ دعویٰ محلِ نظر ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے تجاوز کرنا کسی حدیث ضعیف یا حسن یا صحیح سے ثابت نہیں ہے، کیونکہ ابن ابی حاتم کی روایت حضرت انسؓ سے ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جب آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو آپ کو ایک بدلی نے ڈھانپ لیا جس میں سب رنگ تھے، وہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام پیچھے ہٹ گئے، اور خود قزوینی نے بھی اعتراف کرلیا ہے کہ ماوراء السدرہ تک جانے کا ثبوت اخبارِ ضعیفہ ومنکرہ سے ہے (شرح المواہب ۱۰۶/۶)

نطقِ انور! ہمارے حضرت علامہ کشمیریؒ نے بھی درسِ بخاری شریف میں الی سدرۃ المنتہیٰ پر فرمایا تھا کہ اسکے اوپر کسی مقرب کا وصول نہیں ہوا لیکن نسائی کی روایت میں ہے کہ آں حضرت ﷺ کو اس سے اوپر بھی کیا گیا ہے، اور جب اوپر ہوئے تو ایک بادل سا سامنے آیا، یہ تجلیِ الٰہی تھی، حضرت سمجھ گئے کہ یہ آخری مرحلہ ہے، سجدہ میں گر پڑے۔

تجلی الٰہی کی حقیقت! فرمایا:۔ اس کو صوفیہ کے کلام میں دیکھو، شیخ اکبر نے فتوحات میں، عارف جامی نے نقد النصوص میں، قاضی القضاۃ ہمدانی نے اپنی کتاب میں اور شیخ عبدالرزاق خاقانی شارح خصوص الحکم نے بھی تشریح کی ہے۔ حضرت مجدد صاحبؒ کلام میں بھی لفظِ تجلی آیا ہے مگر اس کی شرح نہیں کی، شیخ محب اللہ الہ آبادی چشتی کے کلام میں بھی کچھ دستیاب ہو جائے گی، یہ بادل وہی ہے جس کو قرآن مجید میں فرمایا:۔ **هل ينظرون الا ان ياتيهم الله فى ظلل من الغمام**

قاضی عیاضؒ نے لکھا کہ سدرہ کے بعد حضور علیہ السلام کو اتنا بلند کیا گیا، جس کو بجز اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا، اُس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:۔ مجھے گمان نہیں تھا کہ مجھ سے بھی اوپر کیا جائے گا، یہ بھی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے امام ہو کر بیت المقدس میں انبیاء علیہم السّلام کو نماز پڑھائی۔

محدث ملا علیٰ قاریؒ (شارحِ شفاء) نے لکھا:۔ یہ روایت دوسری اُس کے منافی نہیں جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے انبیاء علیہم السلام کی امامت آسمان پر کی ہے، یا جس میں ہے کہ آپ نے ملائکہ کی بھی امامت کی ہے مسجد اقصیٰ میں۔ (شرح الشفاء ملا علی قاریؒ ۳۹۷/۱) پہلے روایت آچکی ہے کہ حضور علیہ السلام نے آسمانوں پر بھی فرشتوں کی امامتِ صلوٰۃ فرمائی ہے، یہاں سے معلوم ہوا کہ آسمانوں پر انبیاء کی بھی امامت ہوئی ہے، ان سب روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مسجد اقصیٰ میں انبیاء وملائکہ دونوں کی امامت ایک ساتھ ہوئی ہے، اسی طرح آسمانوں پر بھی ہوئی ہوگی، جنوں اور دوسرے انسانوں (علاوہ انبیاء) کا ذکر ابھی تک کسی روایت میں نظر سے نہیں گزرا واللہ تعالیٰ اعلم۔

علامہ قسطلانیؒ نے شرح المواہب ۱۰۶/۶ میں حضور علیہ السلام کے عرش تک پہنچنے کا ذکر کر کے آگے یہ بھی نقل کیا کہ عرش نے اس وقت زبان حال سے ندا کی:۔ آپ بہترین وقت میں ہیں کہ حق تعالیٰ کی ناراضی اور جملہ مشوشات سے مامون ہیں، میں (ایسے مخصوص ومبارک وقت میں) آپ کو حق تعالیٰ جل ذکرہ کے جمالِ احدیث اور جلالِ صمدیت پر شاہد بناتا ہوں، میں خود اس کی بارگاہِ عالی کی طرف ظمآن ومشتاق، لہفان ومتحسر اور اس کی ذاتِ قدس کے بارے میں حیران ومتحیر ہوں کہ کسی طرح اس کی بارگاہِ متعالی میں باریابی حاصل کروں، مجھ کو اُس نے اپنی ساری مخلوق سے بڑا پیدا کیا، لیکن اتنی ہی زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ میری ہیبت بھی اس کے لئے ہے اور ان سب سے زیادہ ہی میری حیرت بھی ہے، میرے خوف ودہشت کا بدءِ پیدائش ہی سے یہ عالم تھا کہ میں برابر لرزاں ومضطرب ہی رہا اس پر حق تعالیٰ نے

لـه محدث زرقانیؒ شارح المواہب وشارح الموطاء لمالکؒ نے اس کی تشریح میں ابن مردویہ وابی شیبہ سے مرفوع حدیث ابی ذرؓ پیش کی کہ ساتویں آسمان وزمین کرسی کے مقابلہ میں اتنے چھوٹے ہیں جیسے ایک گھیرا بڑے لق ودق صحراء میں ڈال دیا گیا ہو، اور عرش کی بڑائی کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے جیسے اس صحرا کی مذکورہ حلقہ وگھیرے کے مقابلہ میں، اور ابن جریر نے حضرت ابوذرؓ سے مرفوعاً یہ روایت کی کہ ساتوں آسمان، کرسی کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے دراہم کو ڈھال کے اندر رکھ دیا جائے، اور کرسی کی حیثیت عرش کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے لوہے کا ایک گھیرا بڑے صحراء میں ڈال دیا جائے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کرسی وعرش الگ الگ مخلوق ہیں، اور حسن بصریؒ سے جو نقل ہوا کہ دونوں ایک ہیں، وہ صحیح نہیں، اوران سے نیز دوسرے تابعین اور صحابہ سے بھی صحیح طور سے یہی نقل ہے کہ کرسی عرش سے الگ ہے (شرح المواہب ۱۰۷/۶)

میرے[1] قائمہ پر لا الہ الا اللہ لکھدیا، تو اس کے اسمِ مبارک کی وجہ سے میرے ارتعاد وارتعاش میں اور بھی زیادتی ہوگئی، پھر محمد رسول اللہ لکھا تو اس کے بعد میرا قلق واضطراب ختم ہوا اور مجھے سکون میسر ہوا، آپ کا اسمِ مبارک میرے سکون کا موجب ہوا تھا، آپ کی رحمۃ للعالمینی کے صدقہ میں میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ان تمام الزامات سے بری قرار دے دیں جو مجھ پر حق تعالیٰ جل ذکرہ کی شان میں لگائے گئے ہیں، کہا کہ مجھ میں اس ذاتِ بے ہمتا کی سمائی ہے جس کی کوئی مثیل وشبیہ نہیں، اور میں اس ذاتِ لامحدودہ کو احاطہ کئے ہوں، جس کی ذات وصفات حد وشمار سے خارج ہیں، بھلا وہ میری محتاج کیسے ہوسکتی ہے۔

اس کا اسمِ مبارک ضرور رحمٰن ہے اور استواء اس کی صفت بھی، مگر اس کی ہر صفت اس کی ذات کے ساتھ متصل واحد ہے، پھر وہ مجھ غیر سے کیونکر متصل ہوسکتی ہے، اگر وہ مجھے نیست ونابود کردے، تب بھی اس کو ہر طرح کا حق واختیار ہے، میں خود اس کی قدرتِ کاملہ کے تحت ہوں، تو میں اس کو کیسے اٹھا سکتا ہوں؟ حضور علیہ السلام نے عرش کے اس معروضہ زبانِ حال کا جواب بھی بزبانِ حال ہی دیا کہ اے عرش! اس وقت اپنی داستان رہنے دے اور میری صفت وخلوت کو مکدر نہ کر الخ اس کے بعد علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے **ونو دتدلی** اور حضرت حق جل مجدہ کی رؤیت کا بیان کیا ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

حدیثی روایاتِ معراج واسراء میں اگرچہ عرش کا ذکر صراحۃً نہیں ہے، مگر ایسے کلمات ملتے ہیں جن سے عرش کی طرف عروج ثابت ہوتا ہے اور غالباً اسی لئے محدث ابن المنیر اور صاحبِ روح المعانی وغیرہ نے عروج الی العرش کا ذکر کیا ہے، بخاری شریف کی روایتِ شریک میں ہے:۔ **ثم علا به فوق ذلك بمالا يعلمه الا الله حتى جاء سدرة المنتهىٰ ودنا الجبار رب العزة فتدلىٰ حتى كان قاب قوسين اوادنى**، اس پر حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ اس روایت میں جمہور کے خلاف یہ بات ہے کہ سدرہ جمہور کے نزدیک ساتویں آسمان میں ہے، اور بعض کے نزدیک چھٹے میں، اور غالباً عبارت میں تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے، یعنی سدرہ کا ذکر مقدم تھا، پھر علوِ فوق کا ذکر ہوتا، اور حدیث ابی ذر میں عروجِ مستوی کا بھی ذکر ہے (وہ بھی ظاہر ہے کہ آسمانوں سے اوپر ہی ہے) اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس روایتِ شریک میں جس علو وعروج کا ذکر ہے وہ سدرہ کے اعلیٰ حصوں کے لئے ہو، اور جو گزرا وہ اس کے نچلے حصہ اور جڑ کا ذکر تھا (فتح الباری ۱۳/۳۷۱)۔

سدرہ طوبیٰ کی تحقیق

حافظ ابن حجرؒ نے جو دوسرا احتمال لکھا ہے اس کی بھی تائید ملتی ہے، تفسیر مظہری میں ہے، علامہ بغوی نے ذکر کیا کہ:۔ ہلال بن یسار نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ نے میری موجودگی میں کعب سے سدرۃ المنتہیٰ کے بارے میں سوال کیا، انہوں نے جواب دیا کہ، وہ بیری کا درخت ہے، عرش کی جڑ میں، اس تک مخلوقات کا علم منتہیٰ ہوجاتا ہے اور اس کے پیچھے سب غیب ہے، جس کو بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

بغوی نے حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت کی کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر کرتے ہوئے سُنا کہ اس کی ایک شاخ اتنی وسیع ہے جسکے نیچے سوار ایک سو برس تک چلتا رہے، اور ایک شاخ کے سایہ میں ایک لاکھ سوار آرام کرسکتے ہیں، اس میں سونے کے پروانے بسیرا لیتے ہیں، اور اسکے پھل مٹکوں جیسے ہیں، مقاتل نے کہا:۔ وہ ایسا عجیب درخت ہے جس پر انواع واقسام کے پھلوں کے علاوہ حلّے اور زیورات بھی لدے ہوں گے، اسکا اگر صرف ایک پتہ زمین پر آگرے تو تمام زمین والوں کو روشنی مل جائے اور وہی طوبیٰ ہے جس کا ذکر حق تعالیٰ نے سورۂ رعد میں کیا ہے (تفسیر مظہری ۹/۱۱۳)۔

---

[1] حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ میں نے عرش کو پانی پر پیدا کیا، اس میں اضطراب ہوا تو میں نے اس پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھدیا، جس سے اسکو سکون ہوگیا، یہ روایت اگرچہ موقوف ہے مگر بحکم مرفوع ہے کیونکہ ایسی خبر رائے سے نہیں دی جاتی۔

صاحبِ تفسیر موصوفؒ نے **الّذین آمنوا و عملوا الصالحات طوبیٰ لھم** (سورہ رعد) کے تحت لکھا:۔علامہ بغوی نے کہا کہ حضرت ابوامامہ، ابوہریرہ اور ابوالدرداءؓ نے فرمایا، طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے، جو ساری جنتوں پر سایہ فگن ہے۔حضرت عبید بن عمیر نے کہا کہ وہ جنت عدن کا درخت ہے جسکی جڑ دار النبی ﷺ میں ہے، اور ہر جنتی کے گھر و بالا خانہ میں اس کی ایک ایک شاخ پہنچتی ہے، خدا نے کوئی رنگ اور کلی پھول پیدا نہیں کی جو اس میں نہ بجز سیاہی کے، اور کوئی پھل اور میوہ پیدا نہیں کیا جو اس پر نہ ہو۔اس کی جڑ سے دو چشمے نکلتے ہیں، کافور و سلسبیل۔مقاتل نے کہا، اس کا ہر ایک پتہ ایک امت پر سایہ کرے گا، جس پر ایک فرشتہ خدا کی تسبیح انواع واقسام کی کرتا ہوگا۔

امام احمد، ابن حبان، طبرانی، ابن مردویہ اور بیہقی میں روایت ہے کہ ایک اعرابی نے سوال کیا، یارسول اللہ! جنت میں میوے بھی ہیں،؟ آپ نے فرمایا، ہاں! اس میں ایک درخت طوبیٰ ہے فردوس کے برابر، (طول و وسعت میں) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے طوبیٰ کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے فرمایا وہ درخت ہے جنت میں ایک سو سال کی مسافت کا، اہل جنت کے کپڑے اس کی کلیوں سے نکلیں گے (رواہ ابن حبان) معاویہ بن قرہ نے اپنے باپ سے مرفوعاً روایت کیا کہ طوبیٰ ایک درخت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے لگایا، اور اس میں اپنی روح پھونکی، حُلّے اور زیور اس پراُ گیں گے اور اس کی شاخیں اتنی بلند ہوں گی کہ جنت کی شہر پناہ کے باہر سے نظر آئیں گی، اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کے سایہ میں سوار ایک سو سال تک چل کر بھی اس کو قطع نہ کر سکے گا، چاہو تو قرآن مجید میں پڑھ لو **وظل ممدود** (بخاری و مسلم) الخ (تفسیر مظہری ۲۷/۱۱)

جس طرح کے طول و وسعت وغیرہ کے حالات طوبیٰ کے بارے میں وارد ہوئے ہیں، سدرہ کے متعلق بھی مروی ہیں، اور مقاتل نے سدرہ اور طوبیٰ کو ایک ہی قرار دیا ہے فتح الباری ۳۳۷/۱۱ میں بھی شجرۂ جنت کی تعیین حدیث ترمذی کے ذریعہ سدرہ ہی سے کی ہے، اور طوبیٰ کی روایت بھی ذکر کی ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ طوبیٰ وسدرہ کا سلسلہ ساری جنتوں کے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے اور سب سے اوپر کی جنت فردوس تک بھی گیا ہے، جو عرشِ اعظم سے بہت قریب ہے، یوں عرش کا احاطہ تو ساری جنتوں کو ہے کہ وہ ان سب کی چھت ہے، لہذا کچھ بعید نہیں کہ شبِ معراج میں مستویٰ[1] سے اوپر جا کر دنو وتدلی اور رؤیتِ مبارکہ کا واقعہ سدرہ وطوبیٰ کے سب سے اوپر کے آخری حصوں میں پیش آیا ہو جو جنت الفردوس کا علاقہ ہے اور عرشِ الٰہی کے قریب ہے، غالباً اسی کو محدث ابن المنیر وصاحبِ روح المعانی نے عرش کی طرف عروج کہا ہے واللہ تعالیٰ اعلم!

رؤیتِ باری جل ذکرہ

واقعہ معراجِ اعظم نبوی میں سب سے زیادہ اہمیت رؤیتِ عینی نبی اکرم ﷺ کو حاصل ہے اس لئے اس بحث کو بہت ہی احتیاط وتیقظ کے ساتھ لکھنا ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں **باب الاسراء برسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الی السموات وفرض الصلوات** کے بعد **باب معنی قول اللہ عزوجل ولقد رائہ نزلۃ اخری وھل را ی النبی صلے اللہ علیہ وسلم ربہ لیلتہ الاسراء** کے تحت احادیث رؤیتِ جبرئیل علیہ السلام ذکر کر کے حدیث مسروقؒ ذکر کی ہے، جس میں ان کا وہ مکالمہ درج ہوا ہے، جو حضرتِ عائشہؓ کے ساتھ ہوا ہے، اس حدیث پر علامہ نوویؒ نے نہایت عمدہ ترتیب سے کلام کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ اس رؤیت کے مسئلہ میں مختصر مگر بہت جامع تحقیق ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ فتح الملہم ۳۳۸/۱ میں بھی پوری نقل نہ ہوئی، البتہ اس پر حافظ ابن حجرؒ کا نقد اور علامہ زرقانیؒ کی جوابدہی نقل ہوگئی ہے، وہ بھی اہم ومفید ہے۔

---

[1] مستوی کے مقام میں آپ نے صریف اقلام سُنیں، جو فرشتوں کے لوحِ محفوظ سے اپنے دفتروں میں نقل کرنے کی آوازیں تھیں اور یہ بھی روایت سے ثابت ہے کہ لوحِ محفوظ عرش پر ہے، جیسا کہ فتح الباری ۴۰۵/۱۳ میں ہے۔لہذا مستوی پر پہنچنے کا ثبوت ہے عرش کے قریب پہنچنے کا ثبوت ہوا، پھر دنو وتدلی کا مقام عروج الی العرش ہوا، واللہ اعلم۔حضرت شاہ صاحبؒ نے نزلۃ اخری کے تحت یہ لکھا:۔**فلا رقی ھناك اذا اوصل وراء الوراء وانما ھناك نزول الی ماتحتاہ کنزول الملك عن رتبتہ لرعیتہ وعن مکانتہ** (مشکلات القرآن ۲۵۰)

بڑوں کے مسامحات

اصل مسئلہ پر سیرت حاصل بحث تو آگے آرہی ہے، ان شاء الله وبیده لتوفیق للصواب ،لیکن یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ بعض مرتبہ بڑے لوگوں کے ذہن بھی کسی ایک طرف کوڈھل جاتے ہیں اور وہ دوسری طرف سے بالکل ہی صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ

حافظ الدنیا حافظ ابن حجرؒ کی جلالتِ قدر مسلّم ہے اور ہم اب تک یہی سمجھتے رہے کہ ان سے صرف شافعیت کے تعصب وغیرہ کے تحت کچھ اونچ نیچ ہو گیا ہے، جو دوسروں سے تو زیادہ مستبعد نہیں، مگر حافظ کی جلالتِ شان کے لئے زیادہ موزوں نہ تھا،لیکن مسئلہ رؤیت میں ان کے طرزِ تحقیق کو بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوئی کہ علاوہ حنفیت وشافعیت کے دوسرے مسائل میں بھی جوشق وہ اختیار کر لیتے ہیں اس کے خلاف کو کرانے میں انصاف نہیں کرتے ،شبِ معراج میں چونکہ وہ صرف رؤیتِ قلبی کے قائل ہیں اس لیے انہوں نے حضرت ابن عباس وحضرت عائشہ کے متخالف اقوال میں بھی تطبیق کی سعی کی ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے جو رؤیتِ عینی کی رؤیت ہے، اس کا ذکر بالکل حذف کر کے لکھدیا کہ اُن سے یا تو مطلق رؤیت کی رؤیت ہے یا مقید یعنی رؤیتِ قلبی کی ،لہذا مطلق کو بھی مقید پر محمول کرلیں گے،اور حضرتِ عائشہؓ کی روایت کو نفیِ رؤیت عینی پر محمول کر کے دونوں کے مسلک کو ایک کر دیا دوسرے علامہ نوویؒ پر بھی بے ضرورت نقد کر دیا ،جس کا جواب علامہ زرقانیؒ وغیرہ نے دیا ہے۔اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حافظؒ نے فتح الباری ۴۳۰/ ۸ میں تو مطلق ومقید والی تحقیق ذکر کی ہے ،مگر ساتویں جلد کے ۱۵۵ میں حضرت ابن عباسؓ کا قول طبرانی اوسط سے بہ اسنادِ قوی نقل کیا کہ حضور علیہ السلام نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ،اور دوسرے طریق سے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام نے اپنے رب کی طرف نظر کی ،کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ،خُلّت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واسطے اور نظر حضرت سیّد المرسلین سیدنا محمد ﷺ کے لئے (مقدر) کی گئی ،اس سے معلوم ہوا کہ یہاں روایتِ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی مراد رؤیت عین سے تمام وہ چیزیں ہیں ،جن کا ذکر حضور علیہ السلام نے اِس رات (شبِ معراج) سے متعلق کیا ہے اور جن کا ذکر مذکورہ طویل حدیثِ معراج میں یہاں ہو چکا ہے۔

پھر لکھا کہ آیت **وما جعلنا الرؤيا التي ارينٰك الا فتنة للناس** کو واقعہ حدیبیہ سے متعلق کرنا درست نہیں (بلکہ شبِ معراج سے ہی اس کا تعلق ہے) آگے یہ بھی لکھا کہ اگر چہ احتمال امرِ مذکور کا ضرور ہے،لیکن اس آیت کی تفسیر میں ترجمان القرآن (حضرت ابن عباسؓ) ہی پر اعتماد کرنا زیادہ بہتر ہے پھر لکھا کہ سلف کا اس بارے میں اختلاف ہوا ہے کہ حضور علیہ السلام شبِ معراج میں حق تعالیٰ کے دیدار کی نعمت عظیمہ سے بھی مشرف ہوئے یا نہیں؟ اس میں دو قول مشہور ہیں ،حضرت عائشہؓ نے تو اس سے انکار کیا ہے اور حضرت ابن عباسؓ اور ایک طائفہ (جماعت) نے اس کو ثابت کیا ہے، بخاری تفسیر سورۂ نجم میں جب حضرتِ عائشہؓ کی پوری حدیث آئے گی تو ہم وہاں بحث کریں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ (فتح الباری ۱۵۵/ ۷)۔

حضرت الاستاذ العلام شاہ صاحبؒ نے مشکلات القرآن ۲۴۴ میں جو حوالہ فتح الباری ۱۷۱/ ۷ کا دیا ہے، وہ یہی ہے جو ہم نے اوپر نقل کر دیا ،صفحہ کا فرق مطبع کی وجہ سے ہوا ہے ،دوسرے حوالوں میں بھی آگے پیچھے تلاش کر کے حوالہ دیکھ لینا چاہیے ،حضرتؒ حوالوں میں غلطی نہیں کرتے تھے ، بلکہ ان کا ایک بڑا کمال بے نظیر وسعتِ مطالعہ کے علاوہ یہ بھی تھا کہ تیرہ سو سال کے اکابر امّت کے اقوال وافاداتِ ماثورہ منضبط حوالوں کے ساتھ ان کے غیر معمولی حافظہ ودماغ میں محفوظ تھے ،اور وہ پورے وثوق کے ساتھ حوالوں کی صحیح نشان دہی فرمایا کرتے تھے۔

یہاں مشکلات القرآن میں حضرت ابن عباسؓ کا اوسطِ طبرانی والا اثر مع توثیق رجالِ رواۃ ذکر کر کے آپ نے یہ معنی خیز مختصر جملہ تحریر فرمادیا

وھوفی الفتح ۱۷۱/ ۷ مختصراً اس مختصراً کے لفظ سے اشارہ کردیا کہ حافظ نے طبرانی کے اثر میں سے مرتین کے بعد کا جملہ **مرة ببصره ومرة بفؤاده** کم کر کے مختصراً نقل کردیا ہے، اور اسی مسامحت کی طرف ہم یہاں مسامحاتِ اکابر کے تحت اشارہ کررہے ہیں، بات بظاہر معمولی ہے، مگر تحقیق وریسرچ والوں سے پوچھئے کہ کتنی بڑی ہے، تاہم ایسے بڑوں سے بھی اگر تسامحات ہوئے ہیں تو ان سے دل برداشتہ ہونا یا اپنا حوصلہ پست کرنا ہرگز نہ چاہیے، بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے حوصلہ بلند سے سبق لیکر ہر مسئلہ کے مالہ وماعلیہ کی پوری تحقیق کر کے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا چاہیے، ایسا ہرگز نہ ہو کہ ہم کسی بڑے کی تحقیق کو محض اس کے بڑا ہونے کی وجہ سے ہی حق واحق سمجھ لیں، جیسا کہ ہم نے اوپر مثال پیش کی کہ حضرت سید صاحبؒ نے رجوع واعتراف میں اقرار کرلیا کہ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے، اور فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی کرلی تھی اور پھر اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آ گیا۔

بات لمبی ہورہی ہے، یہاں حافظ ابن حجرؒ کے ذکر میں اتنی حقیقت پھر دہرانے کی ضرورت ہے کہ وہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ حافظ الدنیا ہیں علم حدیث میں ان کا درجہ نہایت بلند ہے۔ جس کا تصور ہم جیسے کم علم نہیں کرسکتے، ان کی گرانقدر خدمات اس قدر ہیں کہ حق تعالیٰ کے یہاں مراتبِ علیہ عالیہ پر فائز ہوئے ہوں گے، مگر حنفیت وشافعیت کے تعصب میں ان سے کچھ مسامحات ضرور ہوئے ہیں، اور اسکے سوا بھی انہوں نے اگر کوئی رائے الگ سی قائم کرلی ہے تو اکابرِ شافعیہ کا بھی ساتھ نہیں دیا، مثلاً اسی زیر بحث رؤیت کے مسئلہ میں علامہ نووی شافعیؒ وغیرہ نے ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ کی رائے کو برملا ترجیح دی، جیسا کہ ہم آگے نقل کریں گے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے آٹھویں جلد میں مطلق ومفید کی شاخ نکال کر حضرت ابن عباسؓ کی رؤیتِ عینی کی روایات ہی کو درمیان سے ہٹا دیا، حالانکہ ساتویں جلد میں طبرانی کی روایت کا حوالہ بھی دیا ہے، مگر اسکو مختصر کردیا، پھر دوسری روایت ذکر کی جس میں نظر الی الرب کی صراحت ہے، کیا یہ دل کی رؤیت ہوسکتی ہے؟!

آٹھویں جلد میں جہاں یہ بحث کی ہے، حافظ نے امام احمدؒ کے مسلک کا اختلاف بھی نقل کیا ہے، اور دونوں طرف کے دلائل بھی نقل کئے ہیں، لیکن آگے حافظ ابن قیمؒ کا امام احمد سے رؤیت عینی کا انکار نقل کر کے اس پر کوئی نقد نہیں کیا۔

پھر آگے دوسری دو باتیں ان کی نقل کر کے ان کا رد بھی کیا ہے، ایک[۱] یہ کہ قول اسراء منامی وقول اسراء روحی دونوں میں بہت فرق ہے،

---

[۱] حافظ نے جو بات حافظ ابن قیمؒ کی طرف کی ہے، وہ مکمل نہیں ہے، اور درحقیقت یہ ان کی اپنی رائے بھی نہیں ہے، انہوں نے یہاں دو قول نقل کر کے صرف ایک کو تو ترجیح دے دی ہے باقی ان کی اصل رائے وہ ہے جو انہوں نے زادالمعاد کے ابتداء میں **فصل فی ذکر الهجرتين** میں لکھی ہے آپ نے لکھا:۔ حضور علیہ السلام کو روح وجسم دونوں کے ساتھ مسجدِ اقصی لیجایا گیا، پھر آسمانوں کے اوپر حق تعالیٰ تک عروج بھی جسم وروح دونوں کے ساتھ ہوا، اور وہاں پہنچ کر حق تعالیٰ کے خطاب وکلام سے بھی مشرف ہوئے اور نمازیں بھی فرض ہوئیں، اور ایسا ایک ہی مرتبہ ہوا ہے اور یہی قول سب اقوال میں سے اصح ہے، اس کے بعد سات اقوال دوسرے نقل کئے ہیں۔ (زادالمعاد ۸۲/ ۱ مطبوعہ برحاشیہ شرح المواہب)

یہ پوری رائے چونکہ غیر محل میں درج ہوئی ہے اس لئے ممکن ہے حافظ نے یہ نہ دیکھی ہو، پھر زادالمعاد باب بحث المعراج ۲۹۸/ ۳ مطبوعہ بالا میں اس طرح لکھا:۔ حضور علیہ السلام کو صحیح قول پر اسراء بالجسد ہوئی بیت المقدس تک، پھر آسمانوں تک، پھر سدرہ وبیتِ معمور تک، پھر آپ کو بارگاہ جبار جل جلالہ تک بھی عروج ہوا، اور قاب قوسین او ادنی کے قرب سے بھی مشرف ہوئے، اس وقت پچاس نمازوں کا حکم ملا، اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے فرمانے پر آپ تخفیف کرانے کے واسطے پھر اسی اپنے مقام سابق پر حضرت جبار تبارک وتعالیٰ میں پہنچے، یہ لفظ بخاری کے ہیں بعض طرق ہیں، اسکے بعد حافظ ابن قیم نے رؤیت کے بارے میں حضرتِ صحابہؓ کا اختلاف نقل کیا۔ اور دارمی کی عدم رؤیت پر اتفاقِ صحابہ کی حکایت بھی بلا تنقید نقل کی، اور یہ بھی ذکر کیا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ قولِ رؤیت ابن عباسؓ کا تعلق واقعہ اسراء سے نہیں مانتے تھے، بلکہ اسکا محمل زمانہ قیام مدینہ طیبہ کے ایک منامی واقعہ کو قرار دیتے تھے، اور کہتے تھے کہ اسی پر امام احمدؒ کا قول بھی مبنی ہے (زادالمعاد) اس دوسری بات پر بھی حافظ ابن قیم نے کوئی نقد وتبصرہ نہیں کیا، حالانکہ عدم رؤیت پر اتفاق صحابہ والی بات اور حضرت ابن عباسؓ کے قول رؤیت کا واقعہ اسراء سے بے تعلق ہونا اور واقعہ خواب سے متعلق ہونا ظاہر ہے دونوں امر خلافِ تحقیق ہیں مگر بڑوں کی مسامحت کون بتلائے؟ حافظ ابن حجرؒ نے بھی اس مقام کا مطالعہ کیا ہے، مگر خاموشی سے گزر گئے۔
ہمارے اکابر ومشائخ میں سے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ بھی حافظ ابن تیمیہؒ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں، دوسرے اکابر نہیں، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور دوسرے قول کو ترجیح ہے، حافظ نے لکھا کہ ظاہر اثار واحادیث اِس (دوسرے قول) کے بھی خلاف ہیں، بلکہ اسراء جسد وروح دونوں کے ساتھ حقیقۃً اور بیداری کے اندر ہوا ہے، منام واستغراق کی حالت میں نہیں ہوا، واللہ اعلم!

دوسری بات یہ لکھی کہ حافظ ابن قیم نے تعددِ اسراء کے نظریہ پر بھی اعتراض کیا ہے حالانکہ یہ بات قابلِ اعتراض نہیں کیونکہ تعددِ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ فرضیتِ صلوٰۃ کا حکم بھی بیداری کے اندر مکرر ہوا ہو، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ یہ منام میں اور پھر یقظہ میں ہوا ہو، جیسا کہ قصہ بعثت میں بھی ایسا ہوا ہے، اوراس کا بیان گزر چکا ہے اور بار بار رؤیت کا ہونا بھی جائز ہے، عادۃً اس کا متعدد بار واقع ہونا مستبعد نہیں ہے جیسا کہ آسمان کے دروازے کھلنے کا واقعہ اور ہر نبی کی طرف منسوب شدہ قول کا تعددِ ہے، بلکہ تکرّر وتعددِ کے خیال کو قوت پہنچانے والی بعض روایات بھی ملتی ہیں، مثلاً حدیث انسؓ مرفوع کہ ایک روز میں بیٹھا ہوا تھا، حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے، میرے کاندھوں کے درمیان ہاتھ مارا، میں کھڑا ہو گیا دیکھا کہ ایک درخت ہے، جس میں پرندے کے دو گھونسلے جیسے ہیں، ایک میں میں بیٹھ گیا، دوسرے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام بیٹھے، ہم دونوں اس میں بلند ہوکر آسمان تک پہنچ گئے، انہوں نے ایک دروازہ آسمان کا کھلوایا تو میں نے اوپر جا کر نورِ اعظم کا مشاہدہ کیا، اس سے وراء حجاب تھا اور اوپر کی سمت میں در ویاقوت کی جگمگاہٹ، پھر اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی، اس حدیث کی تخریج بزار نے کی ہے، اور کہا کہ حارث بن عمیر اس کے راوی منفرد ہیں، وہ مشہور بصری ہیں، (حافظ نے اس پر لکھا) میں کہتا ہوں کہ وہ رجالِ بخاریؒ میں سے ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ

حافظؒ کی طرح حافظ ابن کثیرؒ نے بھی مطلق ومقید کی تحقیق بنا کر رؤیتِ عینی کا انکار فرما دیا، جس کے رد میں علامہ محدث زرقانی نے لکھا کہ حضرت ابن عباسؓ سے رؤیتِ عینی کی روایت بھی ثابت ہے، اور یہ بھی لکھا کہ حضرت عائشہ وابن عباسؓ کے اقوال میں جمع وتوفیق ممکن نہیں، پھر ابن کثیر نے آگے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کر دیا ہے کہ ابن عباسؓ سے رؤیت عینی کی روایت ہی غیر صحیح ہے، اس کے رد میں علامہ زرقانیؒ نے شامی سے نقل کیا کہ طبرانی کی روایت رؤیت عینی کے بارے میں صحیح ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ

ایسا معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم کہ نفی رؤیت عینی کے بارے میں مطلق ومقید والی تحقیق کی ابتداء حافظ ابن قیمؒ سے شروع ہوئی، انہوں نے امام احمدؒ کے بارے میں دعویٰ کیا کہ امام احمدؒ سے مطلق رؤیت یا مقید یعنی رؤیتِ قلبی کا ثبوت ہوا ہے، لہٰذا ان کی طرف رؤیت عینی کی نسبت غلط ہے، حافظ ابن قیم کی اس بات کا رد بھی علامہ محدث زرقانیؒ نے کر دیا ہے، اور ثابت کیا کہ امام احمدؒ سے رؤیت عینی کی روایت صحت کو پہنچی ہے (شرح المواہب ۱۲۰)

اب بات یوں منقح ہوئی کہ رؤیتِ عینی کا انکار حافظ ابن تیمیہ وابن قیمؒ نے تو اس لئے کیا کہ وہ امام احمدؒ کی طرف اس کی نسبت کو غلط سمجھتے تھے، یا خود اپنا نظریہ ایسا تھا تو امام احمدؒ کی طرف بھی اس نسبت کو غلط قرار دیا۔

پھر چونکہ اِن دونوں کے اتباع میں حافظ ابن کثیر وابن حجرؒ کا رجحان بھی اُدھر ہی ہو گیا، اس لئے انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی نسبتِ مذکورہ کو مبحث سے خارج کرنے کی سعی کی، واللہ تعالیٰ اعلم!

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مگر کھل کر تنقید بھی کسی سے نقل نہ ہوئی، اس لئے ہمارے علم میں حضرت علامہ کشمیریؒ ہی کی وہ اعلیٰ شخصیت ہے، جس نے اپنے درسِ حدیث میں تمام اکابر محققین ومحدثین کے علوم وافادات سے روشناس کرانے کے ساتھ ان کے تفردات پر بھی مدلل ومکمل تحقیقی تبصرے کئے اور اس بارے میں آپ نے نہ کسی کے ساتھ رعایت برتی نہ مداہنت سے کام لیا، آپ ہی کے طرزِ تحقیق کی پیروی کرتے ہوئے انوار الباری میں بھی کچھ لکھا جاتا ہے اگرچہ یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے، اور چہ نسبت خاک را با عالم پاک وما توفیقنا الا باللہ العلیٰ العلیم!

۱؎ تہذیب ۲/۱۵۳ میں خت ع۔ کی علامت ہے لکھا کہ ابن معین، ابوحاتم ونسائی نے ثقہ کہا، ابوزرعہ نے ثقہ ورجل صالح کہا، ازدی وغیرہ نے ضعیف کہا مؤلف

سیرۃ النبی کا اتباع

سیرۃ النبی میں بھی حافظ ابن کثیر کی تحقیق کو نمایاں کیا گیا، اور یہ بھی لکھا گیا کہ بقول ابن حجرؒ حضرت ابن عباسؓ کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے، حالانکہ حافظ نے ایسا نہیں لکھا بلکہ مطلق ومقید والی بات کہی ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا، یہ بھی لکھا گیا کہ اکثر صحابہ رؤیت کے خلاف ہیں، اور بعض موافق ہیں، حالانکہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے، بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم اگر کسی کو بڑا سمجھتے ہیں تو اس کی ہر تحقیق پر اعتماد کر لیتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں دوسروں کی بات کو گرا دیتے ہیں، حالانکہ ہر بڑے شخص سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، بلکہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ بعض اوقات بڑوں سے پہاڑ جیسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے، حافظ ابن تیمیہ وابن قیمؒ وغیرہ کے بعض تفردات بھی اسی قبیل کے ہیں!

دو بڑوں میں فرق

ان دونوں اکابر کے بارے میں ایک اور فرق بھی ملحوظ رہے تو بہتر ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ کے اگرچہ دوسرے تفردات ہیں مگر امام اعظمؒ کے فقہی مسائل میں وہ اکثر تائیدی پہلو اختیار کرتے ہیں، اور امام صاحبؒ کی جلالتِ قدر کے قائل ہیں جیسا کہ ان کے فتاویٰ سے ثابت ہوتا ہے، برخلاف اس کے حافظ ابن قیمؒ فقہی مسائل میں حنفیہ کے سخت مخالف ہیں، جیسا کہ اعلام الموقعین کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے اور اسی لئے غیر مقلدین نے اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کر کے تقلید وحنفیت کے خلاف نہایت مضر زہریلا اثر پھیلایا ہے، حافظ ابن کثیر بڑے جلیل القدر محدث ومفسر ہیں، مگر شافعیت کے ساتھ ان کا میلان بھی بہت سے تفردات میں حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کی طرف ہے۔ لہذا! **خذ ماصفا، دع ماکدر** کا اصول نظر انداز نہ ہونا چاہیے، اور ہر اہم مسئلہ کی تحقیق نہایت تیقظ اور حزم واحتیاط سے ہونی چاہیے!

اہم گذارش! چونکہ عام ناظرین صرف مؤلف کی جلالتِ قدر سے متاثر ہوتے ہیں اس لئے پہلے اس امر کا بھی اہتمام ہوتا تھا کہ صرف ایسی تالیفات کے اردو تراجم شائع ہوں، جن سے غلط فہمی کا امکان نہ ہو مگر، اب یہ التزام نہیں رہا، کچھ لوگ صرف تجارت کے نقطہ نظر سے سوچتے ہیں اور مضر اثرات پر نظر نہیں کرتے، ہماری رائے یہ ہے کہ ایسی کتابیں شائع کرنے والے حضرات اس امر کا ضرور اہتمام کریں کہ اختلافی اہم مباحث پر وسیع النظر اور واسع الاطلاع علماءِ محققین سے حواشی ونوٹس لکھوا کر ساتھ شائع کریں۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حافظ ابن تیمیہؒ ایسے جلیل القدر سے بھی مسامحت ہو سکتی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کے مسلک رؤیت عینی کا بھی انکار کیا اور اس امر سے بھی کہ وہ رؤیت کی بات واقعہ اسراء سے متعلق مانتے تھے، حالانکہ سارے محدثین وشارحینِ حدیث ومفسرین نے یہی نقل کیا کہ حضرت ابن عباسؓ اور ایک جماعتِ صحابہؓ کی معراج میں رؤیتِ عینی کی قائل ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی اُن کی طرف رؤیتِ مقیدہ (بالفواد کی) نسبت لیلۃ المعراج ہی کے اندر مانی ہے، پھر حافظ ابن تیمیہ کا یہ دعویٰ کہ امام احمدؒ بھی اُسی رؤیت کے قائل تھے، جس کے حضرت ابن عباسؓ تھے، گویا اس طرح امام احمدؒ بھی رؤیتِ معراج کے قائل نہ تھے، حالانکہ سارا اختلاف لیلۃ المعراج ہی کی رؤیت کا ہے، اور اسی کے اندر امام احمدؒ رؤیت عینی مانتے تھے، جس کی تفصیل آگے آئے گی، یہاں اتنا عرض کرنا ہے کہ ہر معاملہ میں حافظ ابن تیمیہ کی تحقیق پر اعتماد کرنے والے ایسی مثالیں سامنے رکھ کر علی وجہ البصیرت فیصلوں کی اہمیت کو سمجھیں تو زیادہ بہتر ہے۔

من ذاالذی ماساء قط ومن له الحسنى فقط

خطا وغلطی سے بجز انبیاء علیہم السلام کے کون معصوم ہے؟ یہاں ان اکابر امت کی جلالتِ قدر اور علمی وتحقیقی بے نظیر خدمات کو کسی درجہ میں بھی نظر انداز کرنا ہرگز ہرگز مقصود نہیں ہے۔

علامہ نووی شافعیؒ کی تحقیق

آپ نے لکھا:۔ قاضی عیاضؒ نے فرمایا:۔ سلف وخلف اس بارے میں مختلف ہیں کہ حضور علیہ کو شبِ معراج میں رؤیتِ باری ہوئی یا نہیں؟ حضرت عائشہؓ نے اس سے انکار کیا، اور ایسا ہی حضرت ابو ہریرہؓ اور ایک جماعت سے منقول ہے، حضرت ابن مسعودؓ سے بھی یہی مشہور ہے، اور ایک جماعت محدثین و متکلمین کا بھی یہی قول ہے، حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ رؤیت سے مشرف ہوئے، اور ایسا ہی حضرت ابوذرؓ و کعبؓ و حسنؒ سے مروی ہے، حضرت حسنؒ تو اس پر حلف بھی اُٹھاتے تھے، اور ایسا حضرت ابن مسعودؓ و ابو ہریرہؓ و امام احمدؒ سے بھی منقول ہوا ہے، اصحابِ مقالات نے ابوالحسن اشعری اور ان کے اصحاب کی ایک جماعت سے بھی رؤیت کا قول نقل کیا ہے، ہمارے بعض مشائخ نے دلیل واضح نہ ہونے کا عذر کر کے اس بارے میں توقف کیا ہے، تاہم انہوں نے رؤیتِ باری کو دنیا میں جائز و ممکن کہا۔

صاحبِ تحریر نے ثبوتِ رؤیت ہی کا قول اختیار کرتے ہوئے کہا:۔ اس بارے میں اگر چہ دلائل بہ کثرت ہیں لیکن ہم سب سے زیادہ قوی دلائل سے استدلال کرتے ہیں، حدیث ابن عباسؓ کیا تم اس بات کو عجیب خیال کرتے ہو کہ خلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ہو، کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطے، اور رؤیت نبی مرسل محمد علیہ کے لئے ہو۔

حضرتِ عکرمہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا، کیا سیدنا محمد علیہ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ آپ نے جواب دیا جی ہاں دیکھا ہے، حضرت انسؓ کا قول بھی رؤیت کا اچھی سند سے مروی ہوا ہے، اور حضرت حسن بصریؒ تو حلف کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ حضور علیہ نے اپنے رب کو دیکھا ہے اور اصل اس باب میں حضرت ابن عباسؓ ہی کی حدیث ہے، جو حبرِ امت ہیں اور مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، اور اس مسئلہ میں بھی حضرت ابن عمرؓ نے اُن سے مراجعت و مراسلت کی ہے کہ آیا حضور علیہ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو آپ نے اُن کو خبر دی کہ ہاں دیکھا ہے، اور اس بارے میں حضرت عائشہؓ کی حدیث معارض نہیں ہو سکتی، کیونکہ انہوں نے یہ خبر نہیں دی کہ میں نے رسول اکرم علیہ کو سُنا کہ وہ فرماتے تھے میں نے اپنے رب کو نہیں دیکھا، بلکہ جو کچھ اس مسئلہ میں انہوں نے ذکر کیا وہ اُن کے نزدیک قولِ باری تعالیٰ **ماکان لبشر الآیہ** اور **لاتدرکہ الابصار** کی تاویل و تفسیر تھی، اور صحابی جب کوئی ایسی بات کہے، جس میں کوئی دوسرا صحابہ میں سے اس کا مخالف ہو تو اس کا قول حجت و دلیل نہیں ہوا کرتا، پھر جبکہ حضرت ابن عباسؓ سے اثباتِ رؤیت کی روایات پایہ ثبوت وصحت کو پہنچ گئیں تو اسی شق کو اختیار کرنا ضروری بھی ہے کیونکہ وہ بات عقل کے ذریعہ تو معلوم کی جا نہیں سکتی، صرف نقل و سماع ہی سے اخذ کی جا سکتی ہے، اور کوئی شخص حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں یہ بھی تصور نہیں کر سکتا کہ انہوں نے یہ بات اپنے ظن و تخمین سے کہہ دی ہو، معمر بن راشد کے سامنے جب حضرت ابن عباس و حضرت عائشہؓ کے اختلاف کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا:۔ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ سے زیادہ عالم نہیں ہیں، پھر یہ کہ حضرت ابن عباسؓ نے ایک امر کا اثبات کیا ہے، جس کی دوسرے نے نفی کی، اور قاعدہ ہے کہ مثبت نافی پر مقدم و راجح ہوا کرتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ راجح اکثر علماءِ کے نزدیک یہی ہے کہ حضور علیہ نے اپنے رب کو اپنے سر کی آنکھوں سے شبِ معراج میں دیکھا ہے، بوجہ حدیث ابن عباسؓ وغیرہ کے کہ اس کا اثبات وہ حضرات بغیر حضور علیہ سے سنے ہوئے نہ کر سکتے تھے، یہ ایسی بات ہے، جس میں شک و شبہ کرنا مناسب نہیں۔

اس کے علاوہ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رویت کی نفی کسی حدیث کی بنیاد پر نہیں کی، جس کو انہوں نے سُنا ہو، اور اگر کوئی حدیث نفی رؤیت کے لئے ہوتی تو وہ ضرور اُس کو بیان کرتیں، اور صرف آیات سے استنباط پر بھروسہ نہ کرتیں، اور اسکا بھی جواب یہ ہے کہ آیت **لاتدرکہ الابصار** میں تو ادراک سے مراد احاطہ ہے، ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ذاتِ بے چون و بے چگوں کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا، لیکن نفی احاطہ نفی رؤیت کو مستلزم نہیں ہے، اور آیت **ماکان لبشر** سے استنباطِ مذکور کو بھی بہت سے جوابات کے ذریعہ رد کیا گیا ہے، الخ (نووی ۱/۹۷)

علامہ نوویؒ کی تحقیق مذکور کے ضمن میں جو دلائل ذکر ہوئے ہیں، اُن پر حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے نقد کیا ہے، اور علامہ محدث زرقانی وغیرہ نے اس کی جوابدہی کی ہے، اس لئے اس کے بعد ہم علامہ موصوف ہی کی تحقیق یہاں درج کرتے ہیں:۔

تحقیق محدث قسطلانی رحمہ اللہ شافعی و زرقانی مالکی

شرح المواہب ۶/۱۰۹ میں ہے:۔علماء کا زمانہ قدیم ہی سے اختلاف چلا آرہا ہے کہ حضور علیہ السلام کو شبِ معراج میں دیدارِ الٰہی ہوا یا نہیں؟ اور ہوا تو آنکھوں سے ہوا یا قلب سے، یا ایک مرتبہ آنکھوں سے، دوسری مرتبہ قلب سے، تیسرا قول توقف کا ہے، امام بخاریؒ نے تفسیر میں حدیثِ مسروق پوری اور توحید میں اس کا ٹکڑا ذکر کیا، امام مسلم نے ایمان میں، ترمذی و نسائی نے تفسیر میں یہ حدیث روایت کی۔

اس حدیث میں مسروق و حضرت عائشہؓ کا مکالمہ ہے، جس میں حضرتِ عائشہؓ نے آیاتِ قرآنی سے عدمِ رؤیت کا استنباط کیا ہے علامہ زرقانیؒ نے بھی اس کے جوابات دیئے ہیں، پھر لکھا کہ علامہ نوویؒ نے بھی دوسروں کے اتباع میں کہا کہ حضرت عائشہؓ نے عدم وقوع رویت پر کوئی حدیثِ مرفوع نہیں پیش کی، جو بمقابلہ استنباطِ مذکور کے نص ہونے کی وجہ سے زیادہ قوی ہوتی، انہوں نے ظاہرِ آیت سے استنباط پر بھروسہ کیا، اور دوسرے صحابہ نے ان کی مخالفت کی ہے اور ان آیات کو ظاہر پر محمول نہیں کیا، جیسے حضرت ابن عباسؓ نے، اور جب کسی صحابی کے قول کی دوسرے صحابی سے مخالفت ثابت ہو تو بالاتفاق وہ قول حجت و دلیل نہیں ہوتا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے نقد کا جواب

حافظ نے لکھا کہ شیخ نوویؒ نے حضرت عائشہ کے عدمِ رؤیت کا فیصلہ بغیر کسی حدیث مرفوع کرنے کا یقین و ادعاء محدث ابن خزیمہ (امام محمد بن اسحٰق م ۳۱۱ھ) کے اتباع[1] میں کیا ہے، اور یہ یقین و ادعاء عجیب ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کی عدمِ رؤیت کی مرفوع روایت تو صحیح مسلم ہی میں موجود ہے، جسکی شیخ نووی نے شرح لکھی ہے اس کے بعد حافظ نے حدیث مسلم نقل کی، جس میں عدم رؤیت الرب کا کچھ ذکر نہیں مگر ساتھ ہی دوسرے طریق سے روایت کردہ حدیث بہ تخریج ابن مردویہ[2] پیش کی۔

جس میں امر مذکور کا ذکر ہے، پھر حافظ نے آگے یہ بھی لکھا کہ تاہم حضرت عائشہؓ کے آیت والے استدلال کی مخالفت حضرت ابن عباسؓ سے ضرور مروی ہے، آپ نے فرمایا کہ **لاتدرکہ الابصار** کا مطلب یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نورِ خاص کی تجلی فرمائیں، تب اس کو دیکھنے کی کوئی نظر تاب نہیں لاسکتی۔ (اس کے علاوہ دیکھ سکتی ہے چنانچہ) حضور علیہ السلام نے اپنے رب کا دیدار دو مرتبہ کیا ہے۔ حاصلِ جواب حضرت ابن عباسؓ یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں مراد نفی احاطہ بوقت رؤیت ہے، اصل رؤیت کی نفی مقصود نہیں ہے۔ اور اگر ثبوتِ رؤیت کی اخبار موجود نہ ہوتیں تو آیت کے ظاہر سے عدول کرنا درست بھی نہ ہوتا، اسی درمیان میں حافظ نے علامہ قرطبی کے دو جواب آیتِ مذکورہ کے متعلق نقل کئے اور پہلے پر نقد کر کے دوسرے کو استدلال جید قرار دیا، اور دوسرے دلائل رؤیت کی توثیق کر کے مطلق و مقید والی شق نکال

---

[1] اس موقع پر علامہ زرقانیؒ نے لکھا کہ صرف محدث نووی نے نہیں بلکہ ایک جماعت نے امام ابن خزیمہؒ کا اتباع اس بارے میں کیا ہے (شرح المواہب ۶/۱۱۰)

فتح الملہم ۱/۳۳۸ میں محدث ابن خزیمہؒ کا اصل فیصلہ بھی صحیح ابن خزیمہ کی کتاب التوحید سے نقل کردیا ہے، جس کا اتباع نووی اور دوسرے محدثین کی ایک جماعت نے کیا ہے:۔ اول تو نفی شیٔ سے کسی امر کا علمی وجود حاصل نہیں ہوتا (اس لئے حضرت عائشہؓ کے انکار رؤیت سے کوئی ایسی بات ثابت نہ ہوئی، جس کو دوسری وجودی چیز کے مقابلہ میں رکھ سکیں) دوسرے یہ کہ حضرت عائشہؓ نے یہ بھی نقل نہیں کیا کہ ان کو حضور علیہ السلام نے عدم رؤیت الرب کی خبر دی تھی اور انہوں نے صرف آیتِ قرآنی کی تاویل بیان کی۔ مؤلف

[2] روح المعانی ۵۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ سے رؤیت عینی کی روایت بھی ذکر کی ہے چند سطور بعد پھر لکھا کہ طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ سے دوبار کی رؤیت نقل کی، ایک مرتبہ دل سے، دوسری مرتبہ آنکھوں سے، اور لکھا کہ رؤیت عینی کی روایت حضرت ابن مسعود، حضرت ابوہریرہ وامام احمدؒ سے بھی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

کرصرف رؤیتِ قلبی کے قائل ہو گئے (فتح الباری ۴۳۰/۸)۔

اس جگہ المواہب کی عبارت میں درمیانی جملے غلطی سے ساقط ہو کر صحیح مسلم کی طرف روایتِ ابن مردویہ منسوب ہو گئی ہے جس پر علامہ زرقانی ؒ نے شرح المواہب میں متنبہ کر دیا ہے، اور حافظ کے نقد کا جواب بھی دیا کہ شیخ نووی پر ان کا نقد و تعجب کرنا بے محل ہے، کیونکہ روایت مسلم میں تو عدم رؤیت الرب کا کچھ بھی ذکر نہیں ہے، پھر شارحِ مسلم نووی پر مسلم کی روایت سے بے خبری کا الزام اور نقد و تعجب کیونکر صحیح ہوگا؟ رہی ابن مردویہ والی رؤیت اس میں ضرور اس کا ذکر ہے مگر وہ صحیح کے برابر نہیں ہو سکتی، دوسرے اس کا تعلق صرف آیت **ولقد رأٰہ نزلة اخری** کے بارے میں سوال سے ہے، اور جواب نبوی سے صرف اتنی بات ثابت ہوگی کہ اس موقع پر رؤیت الرب نہیں ہوئی بلکہ رؤیت جبرئیل علیہ السلام ہوئی ہے، لہذا یہاں مطلق رؤیت الرب کی بحث میں اس کو پیش کرنا بے محل ہے، اور اگر سوال حضرت عائشہؓ کو دونوں آیتوں سے متعلق مانا جائے تو بقول علامہ تقی سبکیؒ اس کی صراحت الفاظ میں نہیں ہے، اور غالباً اسی لئے ان ائمہ کا یہ دعویٰ استمرار کے ساتھ نقل ہوتا رہا کہ حضرت عائشہؓ نے عدم رؤیت کے لئے کوئی نص پیش نہیں کی، اور یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ آیت کی تفسیر میں راجح رؤیت بصری ہی ہے اور وہ رؤیت حق تعالیٰ ہی کی ہے، علامہ سبکی کی اس تحقیق پر محدث زرقانی ؒ نے کچھ تامل بھی ظاہر کیا، دیکھ لیا جائے (شرح المواہب ۱۱۰/۶)

مطلق و مقید والی دلیل کا جواب

علامہ زرقانی ؒ نے حافظ ابن کثیر و حافظ ابن حجرؒ وغیرہ کی اس دلیل کے جواب میں کہ مطلق کو مقید پر محمول کرنا چاہیے، لکھا:۔ اس قاعدہ کو یہاں پیش کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ گویا حضرت ابن عباسؓ سے رؤیت عینی والی اخبارِ مقیدہ ثابت نہیں ہیں، حالانکہ ایسا خیال عجیب ہے، کیونکہ شفاء میں حضرت ابن عباسؓ سے رؤیت عینی و قلبی دونوں قسم کی مختلف روایات نقل کر کے لکھا کہ زیادہ مشہور ان سے یہی ہے کہ حضور علیہ السلام نے حق تعالیٰ کا دیدار اپنی آنکھوں سے کیا ہے اور یہ بات ان سے بہ طرق متعددہ مروی ہے، لہذا جمع بین الروایات کی صورت یہی ہے کہ دیدار[1] دو مرتبہ ہوا ہے ایک مرتبہ قلب سے، دوسری مرتبہ آنکھوں سے، جیسا کہ محدث ابن خزیمہ نے کہا ہے اور اسی کی تصریح حضرت ابن عباسؓ سے روایتِ طبرانی میں ہے جس کی سند صحیح ہے۔

دوسرے یہ کہ قاعدہ مذکورہ کا محل و موقع وہ ہے کہ جبکہ مطلق کے مقابلہ میں صرف ایک مقید ہو، لیکن جب دو مقید معارض ہوں تو کسی ایک مقید کے ساتھ اس کا اطلاق ختم نہیں کیا جا سکتا، ورنہ یہ تحکم ہوگا، لہذا اگر دونوں کو جمع کرنا ممکن ہو تو جمع کرنا ضروری ہوگا جیسے یہاں ہم نے اوپر لکھا کہ تعدد پر محمول کر سکتے ہیں، اگر جمع ممکن نہ ہو تو مطلق کو ترجیح دی جائے گی۔

اس کے بعد علامہ قسطلانی ؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل شدہ روایات ذکر کیں اور علامہ زرقانی ؒ نے ان کی تشریح کی، آخر میں طبرانی والی روایت ذکر کی جس میں ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے رب کو دوبار دیکھا، ایک مرتبہ آنکھوں سے اور دوسری مرتبہ دل سے، اس حدیث کے سب راوی صحیح کے رجال ہیں، بجز جمہور کے اس کو بھی ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے لہذا اس کے ثقہ رجال کی وجہ سے اسنادِ حدیث صحیح ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح ردِ مطلق علی المقید والی دلیل یہاں نہیں چل سکتی، اسی طرح حضرت عائشہؓ و حضرت ابن عباسؓ کی نفی و اثبات کے اقوال کو جمع بھی نہیں کر سکتے کیونکہ اس آخری روایت میں رؤیت بصری کی تصریح موجود ہے۔

رہا حافظ ابن کثیر کا یہ قول کہ جس نے حضرت ابن عباسؓ سے رؤیت بصری کی روایت کی، اس نے اغراب کیا (یعنی غریب و نامانوس

---

[1] یہاں بھی حافظؒ نے مرتین کے آگے کا جملہ نقل نہیں کیا، لیکن علامہ محدث زرقانی ؒ نے اس کو پورا نقل کر دیا مرتین مرة ببصرہ و مرة بفوادہ رواہ الطبرانی باسناد صحیح عن ابن عباسؓ ملاحظہ ہو شرح المواہب ۱۱۱/۶۔ مؤلف

بات کہی) کیونکہ اس بارے میں صحابہ سے کوئی چیز صحت کو نہیں پہنچی، علامہ شامی[۱] نے اس قول کو غیر جید و ناموزوں قرار دیا، اس لئے کہ طبرانی کی یہ اسناد صحیح ہے (شرح المواہب ۱۱۷/۶)

یہ نہایت عجیب بات ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے کئی جگہ طبرانی کی مذکورہ بالا روایت ذکر کی، مگر مختصراً کہ مرتین کے بعد کا پورا جملہ نقل نہ کیا، اور حافظ ابن کثیر نے دوسروں پر اغراب کا الزام لگا دیا، پھر ان دونوں حضرات اور حافظ ابن قیمؒ نے مطلق و مقید والا قاعدہ یہاں جاری کیا ہے، اور حضرت ابن عباس و امام احمد سے ثابت شدہ رؤیتِ عینی والی روایت کو نظر انداز کر دیا، حافظ ابن تیمیہؒ نے شب معراج سے کسی قسم کی رؤیت کا بھی تعلق نہیں تسلیم کیا، اور ثابت شدہ رؤیت کو رؤیتِ خواب پر محمول کیا، حالانکہ رؤیتِ قلبی کے قائل تو حافظ ابن حجرؒ وغیرہ سارے ہی محدثین تھے، اور صحابہؓ میں سے کوئی بھی اس کا منکر نہ تھا، حتی کہ حضرتِ عائشہؓ وغیرہ بھی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ حضرت ابن عباسؓ کے اثباتِ رؤیت اور حضرت عائشہؓ کی نفی کو اس طرح جمع کر سکتے ہیں کہ ان کی نفی کو رؤیتِ بصر پر محمول کریں اور اُن کے اثبات کو رؤیتِ قلب پر محمول کریں، اور رؤیت الفواد سے مراد رؤیت قلب ہے، محض حصول علم نہیں ہے کیونکہ حضرت محمد ﷺ کو حق تعالیٰ کا علم تو ہمیشہ سے حاصل تھا، بلکہ مراد یہ کہ آپ نے اپنے دل سے اسکو دیکھا، یعنی جو رؤیت آپ کو حاصل ہوئی، وہ آپ کے دل میں پیدا کر دی گئی، جس طرح دوسروں کے لئے رؤیتِ بصری ہوئی ہے کہ آنکھوں میں وہ چیز پیدا کر دی جاتی ہے (فتح الباری ۱/۴۳۱/ ۸)۔ محدث ابن خزیمہ نے کتاب التوحید میں رؤیتِ بصری کے اثبات کو ہی ترجیح دی ہے، اور اس کیلئے پوری طرح استدلال کیا ہے، جو کچھ حضرت ابن عباسؓ سے رؤیت قلبی کے بارے میں وارد ہوا ہے، اس کو انہوں نے رؤیت کے دوبارہ واقع ہونے پر محمول کیا تا کہ روایات میں جمع ہو سکے، اور تصریح روایت طبرانی کے سبب سے بھی، جو مطلق کو مقید پر محمول کرنے سے مانع ہے اس کے بعد محدث قسطلانیؒ نے استاذ عبدالعزیز مہدوی کی طرف منسوب شدہ تحقیق نقل کی جو حسبِ ذیل ہے:۔

حضور اکرم ﷺ جب سفرِ معراج سے واپس تشریف لائے، تو آپ نے جو کچھ مشاہداتِ عوالم کئے تھے، اُن کی خبر لوگوں کو ان کے دینوی و اُخروی مقامات و مراتب کے لحاظ سے دی ہے، کفار چونکہ صرف اس سب سے نیچے کے جہاں اور عالم سے تعلق و مناسبت رکھتے ہیں (اور اوپر کے جہانوں سے ان کو کوئی تعلق و مناسبت نہیں) اس لئے آپ نے ان کو تو صرف مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک کے راستہ کی چیزوں سے خبر دی اور مسجد اقصیٰ کے حالات سے مطلع کیا، جن سے وہ واقف تھے، چنانچہ انہوں نے ان امور کی دل سے تصدیق بھی کی اگرچہ عناد کی وجہ سے کھل کر اقرار نہ کیا، پھر آپ نے اوپر کی معراج میں ایک آسمان سے ساتویں آسمان تک جو اور مشاہدے فرمائے، وہ صحابہ کرام سے بیان فرمائے، جو جو حالات جس جس کے لائق و مناسب تھے، اس کے بعد آپ نے اس سے اوپر کی معراج مقام جبرئیل اور افقِ مبین اعلیٰ کے احوال بھی بتلائے، اور اس افق سے اوپر دنو و تدلی اور مقام خاص وحی کے حالات و واردات بھی سُنائے، جو ان سب امور کو سمجھ سکتے تھے، انہوں نے اس کو بھی سمجھا، اسلئے بعض صحابہ کرام نے صرف اس امر پر دھیان دیا کہ حضور علیہ السلام نے جبرئیل امین کو افق مبین اعلیٰ پر دیکھا، اور اس کو بیان کیا، وہ اس میں صادق تھے کہ جتنا سمجھا وہ بیان کر دیا، بعض صحابہؓ نے قلب و بصیرت کے ذریعہ دیدارِ الٰہی خداوندی کی خبر کو سمجھا اور اس پر یقین کر کے آگے بیان کیا، وہ بھی صدق و صحت پر تھی، جیسے حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن مسعودؓ مشہور روایت کے مطابق وغیرہ، بعض وہ صحابہ بھی تھے جنھوں نے سر کی آنکھوں سے دیدارِ خداوندی کا ہونا بیان کیا، وہ بھی اپنے بیان میں صادق تھے، غرض ان سب نے جو کچھ حضور ﷺ کے ارشاداتِ مبارکہ کی روشنی میں سمجھا، اسکی خبر دی ہے، سب ہی کے اقوال صحیح اور حق ہیں، معراجِ اعظم کے سارے واقعاتِ صحیحہ واردہ کو پڑھ کر صحیح حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور رؤیتِ جبرئیل و رؤیتِ خداوندی کے مقامات اور قائلین کے احوال و مراتب کا

---

[۱] غالباً یہ محدث شیخ محمد الصالحی الشامی تلمیذ علامہ محدث سیوطی شافعیؒ (م ۹۱۱ھ) ہیں جن کی الآیات البینات کا حوالہ روح المعانی ۵۳ میں ہے، واللہ اعلم ۔ مؤلف

اختلاف وسبب اختلاف واضح ہو کر کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

علامہ زرقانیؒ نے اس کے بعد لکھا کہ جیسا شامیؒ نے کہا یہ کہنا غلط اور سوءِ ادب ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ سے اُن کی عقل کے مطابق خطاب فرمایا، اسی طرح رؤیت کے بارے میں حضرت عائشہؓ کے مسلک کی وجہ سے، ان کا تخطیہ کرنا بھی غلطی وسوءِ ادب کی بات ہے، اگرچہ اپنی جگہ یہ امر دیلمی سے مرفوعاً اور امام بخاریؒ سے موقوفاً ثابت ہے کہ لوگوں سے ان کی معرفت کے مطابق بات کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے؟! اسکے علاوہ حدیث **امرت ان اخاطب الناس علی قدر عقولهم** کے بارے میں حافظ نے کہا کہ اس کی سند گو موضوع نہیں مگر بہت زیادہ ضعیف ہے (شرح المواہب ۱۱۹/۶)

امام احمد رحمہ اللہ رؤیت بصری کے قائل تھے

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے لکھا:۔ رؤیت کو ثابت کرنے والوں میں امام احمدؒ بھی ہیں، حافظ حدیث صاحب تصانیف محدث خلّال (م ۴۳۹ھ) نے کتاب السنہ میں امام مروزی (م ۲۵۱ھ) سے نقل کیا (جنھوں نے امام احمدؒ کے مسائل مدون کئے ہیں) کہ میں نے امام احمد سے کہا، لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، جو کہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے رب کو دیکھا، تو اس نے خدا پر بڑا بہتان باندھا، تو اُن کے قول کا کس طرح جواب دیا جائے؟ امام احمدؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام ہی کے قول کو پیش کر دیا جائے، جس میں آپ نے خود فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو دیکھا ہے، نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد حضرت عائشہؓ کے قول سے بزرگ و برتر ہے (اسی کو مقدم کریں گے، کیونکہ آپ کی صراحت کے بعد کسی کی رائے معتبر نہیں ہوتی، محدث زرقانیؒ نے مزید لکھا اس سے ظاہر ہوا کہ امام احمدؒ اس بارے میں سوال وجواب کے قبل ہی سے رؤیت بصری کے قائل تھے، کیونکہ رؤیتِ قلبی کی قائل تو حضرت عائشہؓ بھی تھیں، جس کے مقابلہ میں امام احمدؒ نے حدیثِ رسول اللہ علیہ السلام کا حوالہ دیا، اور بتلایا کہ حدیث میں رؤیت سے مراد رؤیت قلبی نہیں بلکہ رؤیتِ بصری ہے جو اس کے ظاہر لفظوں سے سمجھی جارہی ہے۔ (شرح المواہب ۱۱۹/۶)

علامہ زرقانیؒ نے آگے لکھا کہ اس تفصیل کے بعد حافظ ابن قیمؒ کا یہ انکار بھی باطل و بے معنی ہو جاتا ہے کہ امام احمدؒ رؤیت بصری کے قائل نہ تھے اور صرف رؤیتِ قلبی کے قائل تھے، اور شفاء (۴۲۳) میں ہے کہ عبداللہ بن احمدؒ نے اپنے والد امام احمدؒ سے رؤیت کا قول نقل کیا، اور نقاش نے امام احمدؒ سے نقل کیا کہ میں حدیثِ ابن عباسؓ کی وجہ سے کہتا ہوں کہ حضور علیہ السلام نے اپنے رب کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے، دیکھا ہے، دیکھا ہے، اس لفظ کی تکرار یہاں تک کرتے تھے کہ سانس ختم ہوتا تھا، ابوعمر[1] نے بیان کیا کہ امام احمدؒ رؤیت قلبی کی بات کہتے تھے، اور رؤیتِ بصری دنیوی کی بات کہنے کی جرات نہ کرتے تھے۔ (شرح المواہب ۱۲۰/۶)

رؤیت قلبی سے کسی نے انکار نہیں کیا

شرح الشفاء ۴۱۸ میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس سوال بھیجا کہ کیا حضور علیہ السلام نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ یعنی بصر کی آنکھ سے، کیونکہ رؤیت بصیرت میں کوئی خلاف واختلاف نہیں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ ہاں! دیکھا ہے

---

[1] شرح الشفاء ۴۲۲ میں شارح علام حضرت ملا علی قاری حنفیؒ نے قال ابوعمر پر لکھا کہ بظاہر تو اس سے مراد مشہور معروف محدث ابوعمر بن عبدالبرؒ ہیں، مگر حلبی وغیرہ نے کہا کہ مراد ابوعمر طلمنکی (م ۴۲۹ھ) ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اور وہ مشہور ابوعمر بن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) نیز محدث ابن حزم وغیرہ کے استاذِ حدیث ہیں، قاضی عیاض مالکیؒ نے شفاء میں امام ابوالحسن اشعریؒ اور ان کے اصحاب کی ایک جماعت سے بھی نقل کیا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی بینائی اور سر کی آنکھوں سے جل ذکرہٗ کا دیدار کیا ہے اور امام اشعری کا یہ قول بھی نقل کیا کہ جو معجزہ بھی انبیاء سابقین کو عطا ہوا تھا، اس جیسا حضور علیہ السلام کو بھی ضرور دیا گیا ہے، اور ان سب سے زیادہ خصوصیت حضور علیہ السلام کو رؤیت کے ذریعہ دی گئی، یعنی رؤیت، لقاء اور درجہ علیا پر وصول شب معراج میں نصیب ہوا (شرح الشفاء ۴۲۳)۔

، پھر لکھا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مشہور تر قول یہی مروی ہے کہ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیدارِ رب کیا ہے، یہ روایت ان سے بہ طرق واسانید متعددہ مروی ہے، جو شہرت کے درجہ کو پہنچ گئی، اور بعض طرق روایت حاکم، نسائی وطبرانی میں رؤیت الرب بالعین کی صراحت ہے، اور اُن کی دلیل قولِ باری ماکذب الفواد ماراٰی ہے کیونکہ مراد یہی متعین ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا، اس کو دل نے نہیں جھٹلایا یہ نہیں کہا جاتا کہ جو کچھ دل نے دیکھا اس کو دل نے نہیں جھٹلایا، لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ قلب نبی اکرم ﷺ نے رؤیت بصری کے خلاف کا یقین واعتقاد نہیں کیا، خواہ مشاہدہ رب اس طرح مانیں کہ دل میں ہی دیکھنے کی قوت رکھدی گئی، یا آنکھوں سے دیکھا، اور دل کی قوت ان میں رکھدی گئی، کیونکہ اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ رؤیت کا وقوع خدا کے دکھلانے سے ہے، اپنی قدرت سے نہیں، اور راجح وہ ہے جو علامہ نووی نے کہا کہ اکثر علماء کے نزدیک حضور علیہ السلام نے اپنے رب کو شبِ معراج میں اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ الخ پھر رونہ علی ماری کے تحت ملا علی قاریؒ نے لکھا کہ جدال وشک جو کچھ بھی تھا وہ صرف رؤیۃ بصری کے بارے میں تھا، کیونکہ رؤیت بصیرت وقلب میں کوئی شک نہیں کرتا۔ (شرح الشفاء ۱۹/۱۴۱)

الفتح الربانی الترتیب مسند الامام احمدؒ میں شارحِ علّام نے **اختلاف العلماء فی رؤیۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم ربہ لیلۃ المعراج** کے تحت حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ کا اتباع کرتے ہوئے، حضرت ابن عباس وامام احمد کی طرف وہی مطلق رؤیت کی نسبت کردی ہے، جو بے تحقیق ہے، اور ہم اوپر اس کی مکمل تردید کر چکے ہیں، پھر بعض کا ابہام کر کے رؤیتِ عینی کا مسلک بھی ذکر کیا ہے اور لکھا کہ اس مسلک کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے اور اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے، پھر ان کا اتباع متاخرین نے بھی کیا ہے۔ الخ (الفتح الربانی ۲۶۱/۲۰)

افسوس ہے کہ محدث ومفسر ابن جریر کی پوری بحث کسی نے نقل نہیں کی، حالانکہ ابن کثیر کا بیشتر روایتی مواد اسی سے ہے مگر چونکہ اس بارے میں حافظ ابن کثیر حافظ ابن تیمیہ وابن قیمؒ سے متاثر ہو چکے تھے، اس لئے وہ چیزیں نقل نہ کی ہوں گی، ہمارے سامنے اس وقت تفسیر وتاریخ ابن جریر نہیں ہے، اس لئے کچھ نقل نہ کر سکے۔

حافظ نے فتح الباری میں ذکر کیا کہ محدث ابن خزیمہ نے کتاب التوحید میں اثباتِ رؤیت کو ترجیح دی ہے اور استدلال میں خوب تفصیل کی ہے، جس کا ذکر طویل ہوگا، بہتر ہوتا کہ حافظ ابن خزیمہ کی طویل بحث واستدلالات بھی سامنے آجاتے۔

منکرین رؤیت کو اگر محدث ابن جریر وابن خزیمہ کے طویل کلام کو ذکر کرنا پسند نہ تھا تو قائلین کو تو ان کے نقل وذکر کا اہتمام کرنا چاہیے تھا، اپنوں سے ایسی اہم فروگزاشتوں کا بڑا شکوہ ہے۔

رؤیت عینی کے قائل حافظ ابن حجر رحمہ اللہ

یہ ہمارا وجدان ہے، جو کسی نے نہیں ظاہر کیا کہ حافظ بھی رؤیت بصری کے قائل تھے، مگر شاید اس کو کھل کر نہ کہہ سکے، جس طرح امام احمدؒ کے متعلق ابو عمرؒ کا خیال گزرا کہ وہ رؤیتِ بصری کے قائل تھے مگر دنیا میں کسی کے لئے اس کا دعویٰ کرنے سے احتراز کرتے تھے۔

حافظؒ نے بعض شیوخ کی طرف نسبت کر کے جو حکمت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بار بار حضور علیہ السلام کو تخفیف کی درخواست کیلئے حق تعالیٰ کی جناب میں بھیجنے کی لکھی ہے وہ ہمارے نزدیک اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کی عینی رؤیت کی درخواست کی تھی قلبی کی نہیں کہ اس کا حصول دنیا میں بھی کسی کے نزدیک ممنوع نہیں ہے اور ہر برگزیدہ شخص کو ہوسکتا ہے، پھر لن ترانی میں بھی سب نے رؤیتِ بصری ہی مراد لی ہے، اگر رؤیتِ قلبی کی درخواست ہوتی تو جواب میں بھی وہی مراد ہوتی، اور جن حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو بھی رؤیت بصری[۱] حاصل ہوئی ہے وہ بھی ہمارے خیالِ مذکور کی مؤید ہے، حافظؒ نے لکھا کہ بعض شیوخ کی تحقیق

---

[۱] شرح الشفا میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رؤیت بواسطہ **نظر الی الجبل** تھی، جبکہ رب کی تجلی جبل پر ہوئی، اور حضور اکرم ﷺ کی رؤیت اس سے زیادہ

پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم تھا کہ حضور علیہ السلام کو اس موقع پر (شبِ معراج) میں رؤیت حاصل ہو رہی ہے۔ (جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا کہ تم آج رات اپنے رب سے ملنے والے ہو) اس لئے چاہا کہ بار بار لوٹا کر حضور کو دیدارِ الٰہی سے مشرف کرائیں، اور ان انوار و برکات سے محظوظ ہوں جو ایسی عظیم نعمت کے وقت حضور کو حاصل ہوں، ع **لعلی اراھم اواری من رآھم**۔ (فتح الباری ۳۱۶/۱)

حضرت ابن عباسؓ وکعب کا مکالمہ

ترمذی شریف (تفسیر سورۂ نجم) میں حدیث ہے کہ عرفہ میں حضرت ابن عباسؓ نے حضرت کعبؓ سے ملاقات کے وقت کوئی سوال کیا، جس پر حضرت کعبؓ نے اتنی بلند آواز میں تکبیر کہی کہ اس سے پہاڑ گونج گئے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہم بنو ہاشم ہیں، حضرت کعب نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنی رؤیت و کلام کو تقسیم کر دیا ہے حضرت محمد ﷺ و موسیٰ علیہ السلام میں، لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو بار خدائے تعالیٰ سے کلام کا شرف حاصل ہوا اور حضرت محمد ﷺ نے اُسکو دو بار دیکھا ہے الحدیث، صاحب تحفہ نے ۱۸۹ میں طیبی سے نقل کیا کہ حضرتِ کعب کی تکبیر بطورِ استعظام تھی کہ حضرتِ عائشہؓ کی طرح وہ بھی رؤیتِ باری کو بہت بڑی بات سمجھتے تھے جو کسی بشر کو دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن ملا علیٰ قاری نے طیبی کی اس تشریح پر نقد کیا ہے جو صاحبِ تحفہ نے ذکر نہیں کیا، آپ نے لکھا کہ آگے حضرت کعب خود رؤیت کو ثابت کر رہے ہیں پھر ان کی تکبیر کو حضرت عائشہؓ کی طرح کے استعظام و استعجاب پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے؟ لہٰذا تعظیم اس مقام کی اور اظہارِ شوق مقصود تھا، اس مقصد کے لئے، لیکن چونکہ حضرتِ کعب نے اصل سوال کا جواب نہ دیا تھا، اس لئے حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ ہم بنو ہاشم ہیں، علامہ طیبی کی دوسری بات نقل کر کے بھی ملا علیٰ قاری نے اس کی تردید کی ہے۔ (مرقاۃ ۳۰۹)

نطق انور! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ فکبر الخ سے لوگوں نے سمجھا کہ بلند آواز کی تکبیر تعجب و انکار کا اظہار تھا رؤیتِ باری پر، لیکن میرے پاس نقل صحیح ہے کہ حضرت کعبؓ نبی کریم ﷺ کے لئے رؤیتِ باری کے قائل تھے، اور غالباً ان کی تکبیر اظہارِ فرحت و مسرت کے لئے تھی، جیسے کوئی عجیب چیز اپنے خیال و منشا کے موافق پا جانے کے موقع پر ہوا کرتی ہے (العرف الشذی ۵۳۷)

محدث عینی رحمہ اللہ کی تحقیق

فرمایا:۔ حضرت عائشہؓ نے انکارِ رؤیت پر کوئی روایت پیش نہیں کی، بلکہ صرف آیات سے استنباط پر اعتماد کیا ہے اور مشہور قول ابن مسعود و ابو ہریرہ کا بھی ان کے مطابق ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے بہ طرقِ متعدد رؤیتِ عینی منقول ہے ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں بواسطہ ضحاک و عکرمہ حضرت ابن عباسؓ سے طویل حدیث نقل کی جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جب میرے رب نے اپنے دیدار کے ذریعہ میرا اکرام کیا کہ میرے دیکھنے کی قوت میرے دل میں ثبت کر دی جس سے میرے نورِ بصر کے لئے نورِ عرش کی روشنی ملنے لگی الخ، لالکائی نے حدیث حماد بن سلمہ عن قتادہ حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً روایت کی کہ میں نے اپنے رب عز و جل کو دیکھا ہے، اور حدیث ابی ہریرہؓ بھی کہ میں نے اپنے رب عز و جل کا دیدار کیا ہے، الحدیث، حضرت ابن عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس آدمی بھیج کر معلوم کیا، آیا حضرت

اکمل تھی، قاضی ابوبکر نے آیت لاتدرکه الابصار اور لن ترانی کی نفی سے متعلق جواب دیتے ہوئے ذکر کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو بواسطہ تجلی رب للجبل دیکھا، اسی لئے بے ہوش ہو کر گر گئے، اور پہاڑ نے بلا واسطہ رب کو دیکھا اس لئے وہ پارہ پارہ ہو گیا، امام رازی نے لکھا کہ حق تعالیٰ نے پہاڑ میں زندگی، عقل و فہم اور رؤیت کی استعداد پیدا کر دی تھی، جس سے دیکھا، حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تجلی للجبل کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ کی طرف نظر کرنے میں مشغول کر دیا تھا، ورنہ وہ بے ہوش ہو کر فوراً ہی مر بھی جاتے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت جعفر کے نزدیک بھی اُن کو رؤیت حاصل ہوئی ہے اگرچہ بالواسطہ اور حجاب کے ساتھ۔ الخ (شرح الشفاء ۴۲۷)

محمد علیہ السلام نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں دیکھا ہے، اور زیادہ مشہور اُن سے رؤیتِ عینی ہی ہے۔ الخ اور قاضی ابوبکر نے ذکر کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے رب کو دیکھا ہے، اور اسی لئے وہ بے ہوش ہو کر گرے تھے۔ (عمدہ ۲۴۷/۷)

حضرت شیخ اکبر رحمہ اللہ کے ارشادات

ان ھو الا وحی یوحی یعنی حضور علیہ السلام کے افقِ قلب (آسمان روح) پر پہنچنے کی ابتداء سے لے کر افقِ اعلیٰ کے منتہیٰ پر پہنچنے تک جو کہ روحِ مبین کے مقام کی انتہا ہے، جو کچھ بھی ہے وہ سب وحیِ الٰہی کا ہی سلسلہ ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کو پہنچتا رہا آپ کی تعلیم روح القدس نے کی جو شدید القوی ذومرہ ہے اور حضور کے لئے اپنی ذاتی و اصلی صورت میں ظاہر ہوا، پھر حضرت محمد علیہ السلام حق تعالیٰ کی طرف قرب و تدلی کے شرف سے مشرف ہوئے، اور مقام وحدت میں حق تعالیٰ نے بلا واسطہ جبرئیل علیہ السلام آپ کی طرف براہ راست اسرارِ الٰہیہ کی وحی فرمائی، مقام جمع میں جو کچھ دیکھا دل نے اس کی تصدیق کی، کیا تم ایسی چیز کے بارے میں جھگڑتے ہو جس کو تم نہیں سمجھ سکتے، نہ اس کا تصور کر سکتے ہو، حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اصل صورت پر آپ نے رجوع عن الحق اور مقام روح کی طرف نزول کے وقت بھی دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، جو مراتب جنت کا منتہیٰ تھا، یعنی حضور علیہ السلام جب فناءِ محض سے بقاءِ کی طرف لوٹے تو اُترتے ہوئے اسکے پاس حضرت جبرئیل سے ملے ہیں، اس وقت سدرہ کو بھی حق تعالیٰ کے جلال و عظمت اور اس کی تجلیوں نے ڈھانپ لیا تھا، آپ نے حق کا مشاہدہ بھی اس حالت میں کیا الخ (تفسیر الشیخ الاکبرؒ ۲/۱۷۷)!

محدث ملا علی قاری حنفی شارحِ مشکوٰۃ کی تحقیق

آپ نے شرح الشفاء میں مستقل فصل متعلق رؤیتِ باری جل ذکرہٗ کے آخر میں لکھا:۔ اس مسئلہ مشکلہ کے بارے میں جتنے دلائل مذکور ہوئے، ان کو اس طرح جمع کر سکتے ہیں کہ اثبات رؤیت کا تعلق تجلی صفات سے مانا جائے اور نفی کو تجلی ذات پر محمول کریں اس لئے کہ تجلی کا مطلب کشفِ حقیقت ہوتا ہے، جو ذاتِ حق تعالیٰ کے بارے میں محال ہے اس کا احاطہ ممکن نہیں، جس کی طرف **لاتدرکہ الابصار** اور **لایحیطون به علما** میں اشارہ کیا گیا ہے اور **فلما تجلی ربه للجبل جعله دکا** سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، پھر **وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرہ** اور حدیث **سترون ربکم کما ترون القمر لیلة البدر** سے مراد رؤیت باعتبار تجلیاتِ صفاتیہ ہی ہے، یعنی جو علمِ یقین ہمیں اس کی معرفت سے دنیا میں حاصل ہو چکے گا وہی آخرت میں عین الیقین بن جائے گا، اور چونکہ حقیقتِ ذاتیہ الٰہیہ کا کشف کرنے والی تجلیاتِ صفاتیہ مقاماتِ ابدیت و سرمدیت میں لانہایت ہوں گی، لہٰذا سالک منتہیٰ فی السیر الی اللہ جنت میں بھی سیر فی اللہ کے مدارج طے کرتا رہے گا، جس کو **وان الی ربك المنتھیٰ** میں بیان کیا گیا، پس اس کی آخریت کی بھی کوئی حد نہ ہوگی، جس طرح اولیت کی نہیں ہے۔ **فھوالاول والآخر والباطن والظاھر وھواعلم بالطوا ھرو الضمائر وما کشف للعار فین من الحقائق والسرائر**۔ (شرح الشفاء ۴۳۰)

حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد

فرمایا:۔ جنت میں مومنوں کو جو حق تعالیٰ سبحانہٗ کے دیدار کی دولت حاصل ہوگی وہ بعنوان بے چونی و بے چگونی ہوگی، کیونکہ اس کا تعلق اس ذات بے چوں و بے چگوں سے ہوگا، بلکہ دیکھنے والوں کو بھی بے چونی کی صف سے حظ وافر حاصل ہوگا تاکہ اس بیچوں کو دیکھ سکیں **لا یحمل عطایا الملك الا مطایاہ** اب یہ مُعمّا اخصِ خواص اولیاء اللہ کے لئے حل اور منکشف ہو گیا ہے، اور یہ دقیق و غامض مسئلہ ان

بزرگانِ دین کے واسطے تحقیقی اور دوسروں کے لئے تقلیدی ہوگیا ہے،، بجز اہل سنت کے کوئی بھی فرق مخالفین میں سے مسئلہ کا قائل نہیں ہے خواہ وہ (بظاہر) مومنون میں سے ہوں یا کافروں میں سے، بلکہ وہ سب ان بزرگانِ دین کے سواءِ دیدار خداوندی کو محال خیال کرتے ہیں ان مخالفوں کے استدلال کی بڑی بنیاد قیاسِ غائب پر شاہد ہے یعنی حق جل مجدہ کو مخلوق پر قیاس کرتے ہیں، جس کا بطلان وفساد ظاہر ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے باریک وغامض مسائل کے بارے میں ایمان ویقین حاصل ہونا بغیر نورِ متابعت سنتِ سنیہ نبویہ کے دشوار ومحال ہے۔ **علی صاحبها الصلوٰة والسلام والتحیه** حضرتِ حق تعالیٰ کی نسبت بہشت اور ماوراءِ بہشت سب کے ساتھ یکساں ہے وہ سب ہی اس کی مخلوق ہیں اور کسی میں بھی اس ذاتِ حق سبحانہ کا تمکن وحلول ممکن نہیں، لیکن بعض مخلوقات میں لیاقت وصلاحیت ظہورِ انوار واجبی کے لئے رکھدی گئی ہے، بعض میں نہیں، جس طرح آئینہ میں لیاقت ظہور صُور کی ہوتی ہے، اور پتھر وڈھیلے میں نہیں، لہذا وجہِ تفاوت اِدھر ہی سے ہے اُدھر سے نہیں، البتہ دنیا کے اندر دیدارِ الٰہی نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ محل ومقام اس دولتِ رؤیت کے ظہور کی لیاقت نہیں رکھتا، یہ دولت اگر اسی جہان میں میسر ہوتی تو حضرت کلیم اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰات والتسلیمات بہ نسبت دوسروں کے اس کے زیادہ مستحق تھے، اور ہمارے حضور علیہ السلام جو اس دولت سے مشرف ہوئے ہیں تو اس کا وقوع بھی اس دنیا کے علاقہ میں نہیں ہوا ہے، بلکہ بہشتِ بریں میں تشریف لے گئے اور دیدارِ حق کیا، جو عالمِ آخرت سے ہے، یعنی دنیا میں رؤیت نہیں ہوئی، بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے، دنیا سے باہر جا کر آخرت سے ملحق ہوکر دیدار کیا ہے الخ (مکتوبات امام ربانی حصہ ہشتم دفتر سوم ۳۱)

حضرتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کا ارشاد

فرمایا:۔ صحیح یہی ہے کہ معراج میں حضور علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ کو اپنی مبارک آنکھوں سے دیکھا ہے، اور جہاں تک دل کی آنکھوں سے دیکھنے کا تعلق ہے، تو اُن سے تو آپ دیکھتے ہی رہتے تھے، معراج کی رات ہی کی اس میں کیا تخصیص ہے؟ بہر حال مختار قول وہی ہے کہ آپ نے معراج کی رات میں حق تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ (ترجمہ اردو تکمیل الایمان وتقویۃ الایقان ۲۱۲)!

صاحب تفسیر مظہری کی تحقیق

حضرت العلامۃ المحدث قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے **والنجم اذا ھویٰ** کی تفسیر میں نجم کے بہت سے معانی ماثورہ بیان کئے اور لکھا کہ اگر اس سے مراد نجم قرآن اور اس کا نزول ہو، یا حضور اکرم علیہ السلام اور ان کا نزول مراد ہو آسمان سے شبِ معراج میں، تو بے شک نزولِ قرآن لوگوں کی ہدایت کے لئے اور حضور علیہ کا نزول بھی معراج کے بعد ہدایتِ خلق کے واسطے حق تعالیٰ کی طرف سے دونوں ہی بے نظیر نعمتِ عظیمہ وجلیلہ ہیں، اور اگر مسلم اور اس کا قبر میں دفن ہونا مراد ہو تو اس میں بھی شک نہیں کہ ایک مسلمان کا ایمان کی سلامتی اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونا، اسکے حق میں کمال کے حصول اور زوالِ ایمان کے خطرہ سے مامون ہونے کا وقت ہوتا ہے، ایسی ناقابلِ انکار حقائق کی قسم کے ساتھ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے صاحب محمد علیہ نے یہ حق کے راستہ کو چھوڑا، نہ باطل وگمراہی کے طریق کو اختیار کیا، اور جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ اپنی نفسانی خواہش سے بھی نہیں کہتے، بلکہ وہ سب خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہوتی ہے، ان کی تعلیم وتربیت (کسی اور نے نہیں بلکہ) نہایت زبردست قوتوں والے با اقتدار نے کی ہے، پھر ایسا ہوا کہ وہ شانِ استواء میں ہوا اور محمد علیہ افقِ اعلیٰ پر تھے، پھر وہ قریب ہوا اور نزدیک تر ہوکر صرف دو کمان یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا، اس وقت اس نے اپنے (مقرب) بندے کی طرف (بلا واسطہ) وحی کی جو کچھ وحی کرنی تھی، محمد علیہ نے اس وقت جو دیکھا، اس کی اُن کے دل نے بھی گواہی دی، کیا تم اس کی آنکھوں دیکھی چیزوں کے بارے میں جھگڑتے ہو یا شک وشبہ کرتے ہو، محمد علیہ نے تو اس کو دوسری مرتبہ بھی سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا ہے جس کے قریب جنت

الماوی ہے، اُس وقت سدرہ کو انوار و تجلیات ربانی نے ڈھانپ لیا تھا، دیکھنے والے محمد ﷺ کی نظر محبوب حقیقی کے جمالِ جہاں آراء پر مرکوز تھی، دائیں بائیں، اِدھر اُدھر ادنیٰ التفات نہیں کیا، (اس رات میں) اس نے اور بھی بڑی بڑی نشانیاں اپنے رب کی دیکھیں۔

حضرت العلامہ نے اوّل سے آخر تک سارا حال حق تعالیٰ جل ذکرہ' اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا اقرار دیا ہے اور اسی کو روایات سے ترجیح دی ہے اگرچہ ضمناً دوسرا قول بھی نقل کر دیا ہے، اور یہ بھی تصریح کی کہ اختلاف جو کچھ ہے وہ رؤیتِ بصری میں ہے کیونکہ رؤیت قلبیہ جس کی تعبیر مشاہدہ سے کرتے ہیں وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں، اس سے تو آپ کی امت کے اولیاءِ کرام بھی مشرف ہوئے ہیں، نیز لکھا کہ حضرت عائشہؓ وابن مسعودؓ کی شہادت نفی پر ہے جو شہادت اثبات کے مقابلہ میں مرجوح ہوتی ہے، اور جس دلیل سے حضرت عائشہؓ نے استدلال کیا ہے اسکا ضعف بھی ظاہر ہے اور لکھا کہ **اوحی جبرئیل الی عبدالله مااوحی الله الیه** والی تاویل چند وجوہ غیر معقول اور عربیت سے بھی بعید ہے، اول اس لئے کہ دعویٰ عام ہے **ان هوالا وحی یوحی** یعنی جو کچھ بھی حضور علیہ السلام کہتے رہے ہیں اور کہتے ہیں سب وحی الٰہی ہے اور واقعہ جبرئیل کا بیان ہونے سے صرف ایک خاص وقت کی وحی کا ثبوت بنتا ہے، جس سے سارے قرآن مجید اور آپ کے سارے ارشادات کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت نہیں ہوتا، لہٰذا یہاں کے قصہ معراج میں اگر خدا کی وحی مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ خدا ہی نے وحی کی ہے، اس قصہ میں بلاواسطہ اور دوسرے اوقات میں بالواسطہ۔

دوسرے اس لئے کہ اس صورت میں ضمیروں کا انتشار لازم آتا ہے، کہ حضرت جبرئیل نے اس کے بندے کی طرف وحی کی، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اوحی کی ضمیر بھی عبدہ' کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، یعنی خدا نے اپنے بندے کی طرف وحی کی، تیسرے اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ کیلئے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا دنو وتدلی یا قاب قوسین او ادنی کا قرب کوئی بڑا کمال نہیں، کہ حضرت محمد ﷺ تو خود ہی ان سے افضل ہیں، اور آپ نے فرمایا ہے آسمان پر میرے وزیر جبرئیل میکائیل ہیں۔

تاویل مذکور کی ایک وجہ اللہ تعالیٰ سے دنو وتدلی واستواء کا استبعاد ہوسکتا ہے، لیکن قرآن مجید میں تو خود ہی اس امر کی صراحت موجود ہے کہ اس کی بعض آیات محکم اور بعض متشابہات ہیں، لہٰذا اس تاویل بعید کی ضرورت نہیں، استواء دنو وتدلی اور قرب قاب قوسین او ادنی، سب کو بلا کیف اور اس کی شانِ منزہ کے لائق مان لینا کافی ہے، بابِ قلوب کے لئے یہ امور مشاہدۂ قمر لیلۃ البدر کی طرح واضح، روشن ومشہور ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم (تفسیر مظہری ۱۰۶) نزلة اخری کے تحت آپ نے یہ بھی لکھا:۔ اس سے معلوم ہوا کہ رؤیت متعدد بار واقع ہوئی ہے، اور صرف دو بار میں انحصار نہیں ہے، لہٰذا حضرت ابن عباسؓ وکعبؓ سے جو دو بار کی روایت ہے وہ تعدد کا ادنی درجہ بیان ہوا ہے، پھر لکھا کہ اس آیت (ولقد رأه نزلة اخری) میں شب معراج والی رؤیت کا بیان ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ جس عینی رؤیت کا بیان حضرت ابن عباس وکعبؓ نے کیا ہے وہ یہی رؤیت ہے (تفسیر مظہری ۱۰۹) آگے حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق میں آئیگا کہ اس سے پہلے شبِ معراج ہی کے اندر رؤیتِ قلبی ہوئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

صاحب روح المعانی کی تحقیق

آپ نے پہلے ابتدائی آیات سورۂ نجم کی تفسیر میں شدید القوی سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام کو لکھا اور ولقد رأه نزلة اخری تک تمام ضمیریں اُن ہی کی طرف لوٹائیں، برعکس تفسیر مظہری، پھر اس کے بعد ان آیات کی دوسری تفاسیر حسب ذیل ذکر کیں:۔

(۲) حضرت حسن بصریؒ سے نقل کیا کہ شدید القوی اللہ تعالیٰ ہیں، قوی کی جمع تعظیم کے لئے ہے اور ذومرہ سے مراد ذی حکمت ہے اور لکھا کہ مفسر ابوحیان نے فاستوی وهوبالافق الاعلیٰ کی ضمیریں بھی حق تعالیٰ کی طرف عائد کی ہیں، اور اسکو معنی عظمت

،قدرت وسلطان پر محمول کیا ہے

اور غالباً حسنؒ نے **ثم دنا فتدلی فکان قاب قوسین اوادنی ،فاوحی الی عبدہ ماا وحی** کی ضمیروں کو بھی حق تعالیٰ عزوجل کی طرف راجع کیا ہے، اور ایسے ہی **ولقد رائہ نزلۃ اخری** کی ضمیر منصوب کو بھی، اس لئے کہ وہ بحلف خداوند تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے، انہوں نے دنو باری تعالیٰ کی تفسیر حضور علیہ السلام کے عند اللہ رفع منزلت سے اور تدلی حق تعالیٰ کی تفسیر آپ کو پوری طرح جانب قدسی کی طرف جذب کرنے سے کی ہے سلف کا مذہب ان جیسے امور میں نفی تشبیہ کے ساتھ ان کے صحیح علم کو حق تعالیٰ کی طرف محمول کر دینا ہے۔

(۳) **قولہ تعالیٰ ثم دنا فتدلی فکان قاب قوسین اوادنی** کی ضمیریں، جیسا کہ حسنؒ سے مروی ہے نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہیں یعنی آپ اپنے رب سبحانہٗ سے قریب ہوئے اور بقدر **قاب قوسین** یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا اور قولہ تعالیٰ **فاوحی الخ** میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور الیہ کی جگہ **الی عبدہ تفخیم** شان کیلئے فرمایا گیا ہے اور متشابہ کی بات حسب سابق ہے۔

(۴) **علمہ شدید القوی** سے **وھو بالا فق الا علیٰ** تک تو وحی اور اس کو جبرئیل علیہ السلام سے لینے کا حال بیان ہوا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور **ثم دنا فتدلی** الخ میں جناب اقدس کی طرف عروج کا حال، حق تعالیٰ سبحانہ کا حضور علیہ السلام قرب اور آپ کی رؤیت باری کا ذکر ہوا ہے، پس دنا فتدلی اور کان واوحی کی سب ضمیریں نیز راہٗ کی ضمیر منصوب سب حق تعالیٰ جل ذکرہٗ کی طرف راجع ہیں، اور اس تفسیر کی تائید بخاری شریف کی حدیث حضرت انسؓ سے ہوتی ہے، جس میں ہے **ثم علا بہ فوق ذلک بمالا یعلمہ الا اللہ حتی جاء سدرۃ المنتھیٰ ،ودنا الجبار رب العزۃ فتدلی حتی کان قاب قوسین اوادنی فاوحی الیہ فیمااوحی خمسین صلوۃ الحدیث** ،اس سے بظاہر وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے، جو اوپر ذکر ہوئی۔

تفصیل مذاہب! پھر لکھا کہ قائلین رؤیت میں بھی اختلاف ہے، بعض کے نزدیک رؤیت عینی ہوئی ہے، اس کو ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے اور جو حضرت ابن مسعودؓ وابو ہریرہ وامام احمدؒ سے بھی منقول ہے، بعض کے نزدیک رویت قلبی ہوئی، یہ حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے، اور بعض نے کہا کہ ایک رؤیت عینی اور ایک قلبی ہوئی ہے، یہ بھی ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے، جیسا کہ طبرانیؒ ابن مردویہ نے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام نے اپنے رب کو دوبار دیکھا ہے ایک مرتبہ بصر سے اور ایک مرتبہ دل سے قاضی عیاض نے اپنی بعض مشائخ سے رؤیت عینی کے بارے میں توقف بھی نقل کیا ہے۔

اختلاف بابۃ اقتضاءِ ظاہر قرآن کریم

صاحب روح المعانی نے لکھا: ۔صاحب کشف کے نزدیک تو دنو وتدلی کا معاملہ حضور علیہ السلام اور جبرئیل علیہ السلام کے مابین ہے، اور رؤیت کا تعلق بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ہے، لیکن علامہ طیبی نے کہا کہ **وھو بالافق الا علیٰ** تک امر وحی **ونلقی وحی من الملک** کا بیان اور معاندین کے شبہات کا جواب ہے، پھر **ثم دنا** سے **من آیات ربہ الکبری** تک عروج بہ جناب قدس کا حال بیان کیا گیا ہے، پھر کہا کہ کسی صاحب عقل سے یہ بات مخفی نہیں ہو سکتی کہ مقام **فاوحیٰ** کو وحی جبرئیل پر محمول کرنا موزوں نہیں کیونکہ ارباب قلوب اس کو دو شخصوں کی راز ونیاز کے اندر مداخلت ودراندازی قرار دیتے ہیں، پھر یہ کہ کلمہ ثم بھی تراخی رتبی اور دونوں وحیوں کے فرق کو بتلا رہا ہے کہ ایک ان میں سے بالواسطہ اور تعلیم کے طور پر تھی، اور دوسری بغیر واسطہ کے اور تکریم کے طور پر ہوئی ہے، گویا اس سے ترقی بتلائی گئی مقام **وما منا الالہ مقام معلوم** سے (جو فرشتوں کا مقام تھا) بجانب بارگاہِ **قاب قوسین اوادنی** حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ جب

حبیب سے غایتِ قرب حاصل ہوااوراس کی وجہ سے حضور علیہ السلام پر غایتِ ہیبت طاری ہوگئی تو حق تعالیٰ نے غایتِ لطف کا معاملہ فرمایا ،اوروحیِ خاص ومکالمۂ خصوصی کے ذریعہ اس وحشت کوانس سے بدل دیا گیا،اکثر صوفیہ کی بھی یہی رائے ہے،وہ بھی آپ سے دنوحق سبحانہٗ کے جیسااس کی شان کے لائق ہے اورحق تعالیٰ سے آپ کے دنو وقرب کے قائل ہیں،اورایسے حضرات رؤیت کوبھی مانتے ہیں الخ!

آخر میں صاحبِ روح المعانی نے اپنی رائے لکھی کہ ظاہر نظم جلیل قرآنی کے اقتضاء کے بارے میں خواہ میری رائے صاحب کشف کے ساتھ ہو یا علامہ طیبی کے ساتھ ،بہرحال!میں حضور علیہ السلام کی رؤیت کا قائل ہوں اورحق سبحانہٗ سے آپ کے دنو وقرب کوبھی بوجہ لائق مانتاہوں،واللہ تعالیٰ الموفق (روح المعانی ۵۲/۲۷)!

حضرتِ اقدس مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کے رائے

آپ نے درسِ ترمذی شریف میں **قولها فقد اعظم الفرية** پرفرمایا:۔حضرت ابن عباسؓ وحضرت عائشہؓ دونوں کے مذہبوں میں جمع اس طرح کر سکتے ہیں کہ رؤیت کوقلب شریف کی قوت کے ذریعہ مانا جائے ،جواس وقت بصر میں بھی حلول کرگئی،لہذا جس نے قلب کی رؤیت بتلائی اس نے بھی صحیح کہا،اورجس نے بصری رؤیت بتلائی اس نے بھی ٹھیک کہا(الکوکب الدری ۲۱۹)!

ایک شبہ کا ازالہ

اس موقع پر حاشیہ میں حضرت عائشہ وابن مسعودؓ کا مذہب رؤیتِ جبرئیل لکھا گیا،اورحضرت ابن عباسؓ کا رؤیتِ باری تعالیٰ،اس طرح کہ بصر کی قوت دل میں کردی گئی،یعنی دیکھا دل ہی سے،اوررؤیتِ عینی حقیقۃً کا مذہب حضرت انس وحسن وعکرمہ کا درج ہوااس سے غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا مسلک رؤیتِ عینی حقیقۃً کا نہ تھا،اس لئے ہم مزید فائدہ کے لئے شرح الشفا ۴۱۸اسے صحیح پوزیشن لکھتے ہیں:۔محدثین ومتکلمین کی ایک جماعت نے حضرتِ عائشہؓ کا قول اختیار کیا اوروہی مشہور روایت حسبِ روایتِ شیخین حضرت ابن مسعودؓ سے بھی ہے،اورایسی ہی شہرت حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف بھی بروایتِ بخاری ہے کہ حضور علیہ السلام نے صرف حضرت جبرئیل علیہ السلام کودیکھا تھاان سے دوسری روایت اس کے خلاف بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے حق تعالیٰ کا دیدار آنکھوں سے کیا ہے،جیسے حضرت ابن مسعودؓ،ابوذر،حسن وامام احمد سے روایت ہے،حضرتِ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ رؤیتِ عینی کے قائل تھے اوریہی قول حضرت انس وعکرمہ وربیع کا بھی ہے،اورحضرت عطاء بن ابی رباح نے حضرت ابن عباسؓ سے رؤیتِ قلبی کی روایت کی ہے اورابوالعالیہ نے اُن سے دوباررؤیتِ قلبی ہونے کی روایت کی ہے،اورزیادہ مشہور حضرت ابن عباسؓ سے رؤیتِ عینی کی روایت ہے جو بہ طرق واسانیدِ متعددہ مروی ہے اوریہ روایت رؤیتِ قلبی والی روایت کے منافی نہیں ہے کیونکہ دونوں کوجمع کرنا ممکن ہے،یعنی رویتِ بصر وبصیرت دونوں کا ثبوت صحیح ہے جیسا کہ **ماكذب الفواد مارای** سے ظاہر ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا حاشیہ کوکب دری والا التباس دوسرے حضرات کوبھی پیش آچکا ہے،کیونکہ حافظ ابن حجرؒ وحافظ ابن کثیرؒ وغیرہ نے ہی غیرواضح ومبہم امورذکر کئے ہیں!اورحیرت ہے کہ بعض حضرات صاحبِ تحفہ وغیرہ نے اپنی شروح میں صرف حافظ کی عبارتیں نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے،اوردوسری کتابوں کا مطالعہ مکمل کرنے کے بعد کوئی تنقیح ضروری نہیں سمجھی غرض رؤیتِ عینی حقیقۃً کے بارے میں صرف دوہی مذہب ہیں اورپوری طرح دوٹوک انکار صرف حضرت عائشہؓ سے ثابت ہے،کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ وابو ہریرہؓ وغیرہ سے دوسری روایات بھی ہیں،اوراثباتِ رؤیت کے قائل حضرت ابن عباسؓ،حضرت انسؓ،عکرمہؒ،ربیعؒ،حسن بصریؒ وغیرہ ہیں،حضرت ابن عمرؓ نے بھی

حضرت ابن عباسؓ سے استفسار کیا تھا، اور بظاہر اُن کے جواب کے بعد سے وہ بھی پوری طرح رویت عینی ہی کے قائل ہو گئے ہوں گے۔

حضرت ابن عباسؓ و کعبؓ کا جو مکالمہ ترمذی شریف میں مروی ہے۔ اُس سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ حضرت کعبؓ بھی رؤیت عینی کے قائل تھے بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ ہی نہیں بلکہ بنو ہاشم سب ہی رؤیت عینی کے قائل تھے، کیونکہ ترمذی شریف میں روایت مختصر ہے، مفصل روایت جس کا ذکر حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۴۲۹/ ۸ میں اور علامہ سیوطی نے الدر میں کیا ہے، اس طرح ہے کہ ہم بنو ہاشم ہیں اور ہم اس امر کے قائل ہیں کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا یہ سُن کر حضرت کعبؓ نے نہایت بلند آواز سے تکبیر کہی الخ!

شارحین نے لکھا کہ حضرت ابن عباسؓ نے یہ جملہ اس لئے کہا کہ بنو ہاشم کا اصحاب علم و معرفت ہونا مسلم تھا، اور یہ بتلایا کہ اُن کا سوال رؤیت عینی کے بارے میں کسی مستبعد بات کے متعلق سوال نہیں (حاشیہ کوکب ۲/۲۷۳)!

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا یہ جملہ غالباً اس امر کو بھی جتلانے کے لئے تھا کہ ہم سب بنو ہاشم تو وقوع رؤیت عینی کے بارے میں پورا علم یقین رکھتے ہی ہیں، آپ نے اپنی رائے بلا تامل ہمیں بتلا دیں، اس پر حضرت کعبؓ نے فرط مسرت کے ساتھ نعرۂ تکبیر ند کیا، اور پھر اثبات رؤیت کی دلیل بھی پیش کی، خیال یہ ہے واللہ اعلم کہ حضرت کعبؓ کو غیر معمولی مسرت یہی معلوم کر کے ہوئی کہ نہ صرف برامت و ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ اس بارے میں اُن کے ہم خیال ہیں بلکہ سارے بنو ہاشم بھی یہی عقیدہ و رائے رکھتے ہیں، مذی میں چونکہ روایت مختصر آئی ہے اس لئے اس طرف توجہ نہیں کی گئی!

محدث سہیلی رحمہ اللہ کی تحقیق

آپ نے مستقل فصل میں مسئلہ رؤیت باری شب معراج پر بحث کی اور لکھا: علماء نے اس بارے میں کلام کیا ہے، حضرت مسروق نے حضرت عائشہؓ سے انکار رؤیت نقل کیا، اور ان کا استدلال **لا تدركه الابصار** ذکر کیا۔ اور مصنف ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ و کعب احبارؓ سے رؤیت کا وقوع نقل ہوا کعبؓ نے تقسیم رؤیت و کلام کا ذکر کیا، اور صحیح مسلم میں حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ، آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو فرمایا کہ میں نے نور کو دیکھا ہے، دوسری حدیث مسلم میں نورانی اراہ کا جواب ہے جس سے رؤیت کے بارے میں کافی و شافی وضاحت نہیں ملتی، شیخ ابوالحسن اشعری نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے اپنے سر کی آنکھوں سے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے، تفسیر نقاش میں امام احمدؒ کا رآہ رآہ سانس رکنے تک کہنا منقول ہے تفسیر عبدالرزاق میں نقل ہوا کہ امام زہری سے جب حضرت عائشہؓ کا انکار رؤیت ذکر کیا گیا تو کہا کہ ہمارے نزدیک حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ سے زیادہ اعلم نہیں ہیں، اور تفسیر ابن سلام میں حضرت عروہ سے منقول ہے کہ اُن کے سامنے اگر حضرت عائشہؓ کا انکار رؤیت نقل کیا جاتا تو ان کو بہت ناگوار ہوتا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا قول بھی اس بارے میں حضرت ابن عباسؓ کی طرح ہے کہ حضور علیہ السلام کو رؤیت ہوئی ہے، اور ایک مرتبہ مروان نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سوال کیا تھا کیا حضور علیہ السلام نے اپنے رب کو دیکھا تو فرمایا تھا ہاں! حضرت ابن عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہی سوال قاصد بھیج کر معلوم کرایا تھا تو انہوں نے بھی اثبات میں جواب دیا تھا، پھر انہوں نے رؤیت کی کیفیت دریافت کی تو حضرت ابن عباسؓ نے ایسی بات کہی، جس کا نقل کرنا مناسب نہیں کہ اس سے تشبیہ کا وہم ہوتا ہے اور اگر وہ بات صحیح ہو تو اس کی تاویل کی جائے گی، واللہ اعلم حاصل ان سب اقوال کا یہ ہے واللہ اعلم کہ حضور نے رؤیت باری کا شرف تو ضرور حاصل کیا، مگر اس درجہ کا اعلیٰ و اکمل نہیں جو آپ کو حظیرۃ القدس میں کرامت عظمیٰ و نعیم اکبر کے موقع پر حاصل ہوگا، یعنی اس کے لحاظ سے یہ کم ہی درجہ کا تھا، اور اس کی طرف آپ کو حظیرۃ القدس میں کرامت عظمیٰ و نعیم اکبر کے موقع پر حاصل ہوگا، یعنی اس کے لحاظ سے یہ کم ہی درجہ کا تھا، اور اس کی طرف آپ کا ارشاد رایت نوراً اور نورانی اراہ اشارہ کر رہا ہے واللہ اعلم۔

رہی دنو وتدلی کی بات تو اسکی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہونے میں بھی کوئی استحالہ نہیں ہے، جیسا کہ جامع صحیح بخاری کی ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے، اور اس روایت بخاری کی تقویت روایت ابن سنجر سے ہوجاتی ہے جو باسناد شریح بن عبیدہ مروی ہے الخ (الروض الانف ۲۴۹)

حضرت الاستاذ العلام شاہ صاحبؒ کی تحقیق! فرمایا:۔ شب معراج میں حضور علیہ السلام کو کچھ معاملات تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ پیش آئے ہیں اور کچھ حق تعالیٰ جل ذکرہ کے ساتھ، اور سورۂ نجم میں وہ دونوں قسم کے حالات جمع کر دیئے گئے ہیں، اس لئے بیان روات میں اختلاط ہوگیا ہے، پھر چونکہ رؤیت تجلیات کی تھی، اس لئے اس کے بارے میں بھی نفی واثبات دونوں آگئیں، کسی نے نورانی اراہ روایت کیا کسی نے نورانی اراہ، باقی یہ امر محقق ہے کہ رؤیت بصری حقیقۃً واقع ہوئی ہے، مگر مادی کا مجرد کو دیکھنا اتنا ہی ممکن ہے جتنا اسکے مناسب حال ہو اس لئے الفاظ سے پوری طرح تعبیر نہیں ہوسکتی، اور نفی واثبات میں کشاکش ہوگئی، پس ہم اس رؤیت کو اس شعر کا مصداق سمجھتے ہیں ۔

اشتاقه فاذا بدا اطرقت من اجلاله

غرض نبی کریم ﷺ کو معراج میں رؤیت تو ضرور ہوئی، مگر رؤیت دون رؤیت تھی، جو شان حق کے لئے موزوں تھی، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے **وما رميت اذ رميت ولكن الله رمى** میں ہے، وہاں بھی نفی واثبات جمع ہے، پس نفی واثبات رؤیت کے اقوال میں تنافی وتضاد کچھ نہیں ہے، دوسرے طریقہ پر سمجھو کہ وہ رؤیت تو حقیقۃً ہوئی مگر جیسی ایک نہایت باادب مرتبہ شناس کو حاصل ہوسکتی ہے، اور ممکن ہے بے حجاب بھی ہوئی ہو مگر ظاہر ہے کبریائے خداوندی کے غیر معمولی رعب وجلال نے ٹکٹکی لگا کر دیکھنے کا موقع نہیں دیا ہوگا، اور بظاہر اس کا نقشہ شاعر کے اس شعر سے سمجھ سکتے ہیں ۔

فبدا لينظر كيف لاح فلم يطق نظراً اليه ورده اشجانه

لہٰذا امام احمدؒ کی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ حضور علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اپنے خاص من وفضل سے نوازا اور دیدار سے مشرف کیا، آپ نے دیکھا، ضرور دیکھا، مگر ایسا ہی جیسے ایک حبیب اپنے حبیب کی طرف دیکھتا ہے یا عبد اپنے مولیٰ کی طرف دیکھتا ہے، کہ نہ تو نظر بھر کر ہی دیکھ سکتا ہے اور نہ اس پر قادر ہوتا ہے کہ اُدھر سے نگاہ ہٹا سکے، **ما زاغ البصر وما طغى** سے بھی اسی طرف اشارہ ہے، عدم زیغ سے اشارہ نگاہ نہ ہٹانے کی طرف ہے اور عدم طغیان سے حدود رؤیت وادب سے تجاوز نہ کرنا مراد ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا:۔ میں نے سورۂ نجم کی ایسی تفسیر کی ہے، جس سے ضمائر کا انتشار ختم ہوجاتا ہے، اور حدیث شریک بخاری پر جو دس اعتراضات کئے گئے ہیں، ان میں سے صرف دو اہم ہیں، باقی آٹھ غیر اہم و ناقابل التفات ہیں، ایک تو **دنا فتدلىٰ** والا اور میرے نزدیک یہ معاملہ حضرت جبرئیل کا ہے، جیسا کہ بغوی نے **قاب قوسين او ادنى** تک کہا ہے، اسکے بعد **فاوحى الى عبده ما اوحى** سے حق تعالیٰ اور حضور علیہ السلام کے مابین معاملات کا بیان ہے، یعنی شروع سے حضور کی صادق رسالت اور آپ پر وحی خداوندی لانے والے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے موثق ومکرم ہونے کا ذکر تھا، پھر شب معراج کی بلاواسطہ وحی کے اکرام خاص کا ذکر کیا گیا ہے،

فاوحیٰ کی ضمیر حق تعالیٰ کی طرف راجع ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف نہیں، اس لئے کہ طبری کی روایت میں **فاوحى الله الى ما اوحى** ہے اور مسلم کی روایت (عن انس، فتح الملہم ۳۲۰ج۱) میں **فاوحى الى ما اوحى** ہے، اور بخاری کی حدیث شریک میں **فاوحى الله فيما اوحى خمسين صلوة** ہے اور حضرت انسؓ سے مسند احمد ۱۴۹ج۳ میں بھی ایسا ہی ہے اور پہلے سے اگر حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ذکر تھا تو یہ ضروری نہیں کہ فاوحی میں بھی ضمیر حضرت جبرئیل ہی کی طرف راجع ہو، اور نہ اسکے قریب حق تعالیٰ کا ذکر ضروری ہے کیونکہ یہ وحی کا وصف تو اسی ذات کے ساتھ خاص ہے، پھر یہ کہ وحی تعلیم دو امر کا ذکر ہوا ہے، اور دونوں کے حالات الگ الگ بیان ہوئے ہیں لہٰذا آپ کی رسالت ثابت کرنے کے بعد اب مُرسِل نے اپنی وحی بلاواسطہ کا ذکر شروع کر دیا تو اس میں کیا اشکال ہے، جو مرسِل ہے وہی موحِی ہے، جس طرح **او يرسل رسولا فيوحى** میں دونوں ایک ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا:۔احادیثِ مرفوعہ اور آثارِ صحیحہ سے دونوں رؤیت ثابت ہیں، قلبی بھی اور بصری بھی، اور شبِ معراج میں پہلے قلبی ہوئی ہے، اس کے بعد رؤیت عینی کی طرف ترقی ہوئی، اور حضور علیہ السلام نے جو متعدد اوقات میں مختلف لوگوں کو حالاتِ معراج سُنائے ہیں اُن کے مطابق جو بات جسکے علم میں آئی، اسی کو اس نے بیان کر دیا ہے جیسا کہ مواہب میں مہدوی سے منقول ہے، اور حضرت عائشہؓ سے جو کچھ تفسیر آیات سورۂ نجم وغیرہ کی مروی ہے، وہ دوسروں کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ شبِ معراج میں رؤیت جبرئیل علیہ السلام اور رؤیتِ حق تعالیٰ جل ذکرہ دونوں واقع و ثابت ہوئی ہیں، اور جو محدثین نقل کرتے ہیں کہ حضرتِ عائشہؓ نے بعض آیات سورۂ نجم کے بارے میں رسول اکرم علیہ السلام سے استفسار کیا تھا اور حضور نے ان کا مصداق حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بتایا تھا تو اس سے کسی امر کا فیصلہ نہیں ہوسکتا کیونکہ آپ نے شبِ معراج میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی دیکھا ہے بعض محدثین کا طریقہ ہے کہ وہ بعض اوقات کسی ایک ہی بات پر ڈھل پڑتے ہیں اور دوسری بات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اگرچہ آیتِ قرآنی **ثم دنا فتدلیٰ** کو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے متعلق کیا اور حدیثِ شریکِ بخاری میں بھی دنا الجبار کو تقریباً وہم راوی قرار دیا ہے، لیکن رؤیتِ عینی حقیقۃً کا اثبات کیا ہے، جس کا اثبات **ماکذب الفواد ما رای** اور **مازاغ البصر وما طغی** وغیرہ سے کیا ہے اور رؤیت کے لئے دنو و قرب ضروری ہے اس لئے بھی اس کا ثبوت ضمناً تسلیم کیا ہے، چنانچہ آپ نے مشکلات القرآن ۲۴۵ میں تحریر فرمایا کہ رؤیتِ خداوندی کا تحقق بغیر دنو خداوندی نہیں ہوسکتا، اور یہ ایسا ہے جیسے ثلثِ لیل اخیر میں حق تعالیٰ کا نزول آسمان دنیا کی طرف ثابت ہے یا اہل جنت پر متوجہ ہو کر سوال کریں گے **ھل رضیتم**؟ کیا تم پوری طرح خوش ہو گئے؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ ترمذی میں فرمایا:۔ایک روایت حسنہ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اِن آیاتِ سورۂ انعام و نجم **وما جعلنا الرؤیا** الخ اور **ولقد راہ نزلۃ اخری** کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام سے نہیں، اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ان کا تعلق حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ہے لیکن مقتضی نظم قرآن عزیز کا وہی ہے جو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے (العرف الشذی ۵۳۴) حضرت شاہ صاحبؒ کے یہ اشعار بھی اہل علم کے لئے مشکلات القرآن ۲۶۰ سے پیش ہیں۔

رای ربه لما دنا بفواده	ومنه سری للعین ما زاغ لا یطغی
بحثنا فآل البحث اثبات رئویة	لحضرته صلے علیه کما یرضی
کما اختاره الحبرابن عم بنینا	واحمد من بین الا ئمة قد قوی
نعم رئویة الرب الجلیل حقیقة	یقال لها الرئویا بالسقة الدنیا!

حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری تحقیق بابت اسراء و معراج اور تفسیر آیات سورۂ نجم مشکلات القرآن میں اور مختصراً فتح الملہم ۳۳۵/ ۱ میں لائق مطالعہ ہے ہم نے اس کا خلاصہ پیش کر دیا ہے اور یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ حدیث شریک بخاری پر جو کچھ اعتراضات بلحاظِ روایت و درایت ہوئے، سب کے کافی و شافی جوابات حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے دیدیئے ہیں، وہ بھی قابل مطالعہ ہیں، اکثر محدثین نے حدیثِ شریک کی توثیق کی ہے، اور حافظ ابن قیمؒ نے تو یہاں تک اس پر اعتماد کیا کہ اس کی وجہ سے دنو و تدلی حق تعالیٰ کے قائل ہوئے، جبکہ وہ سورۂ نجم کے **ثم دنا فتدلی** کو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے متعلق مانتے ہیں، انہوں نے لکھا کہ سورۂ نجم میں جو **دنو دتدلی** ہے وہ اس **دنو دتدلی** سے مغایر ہے جو قصہ اسراء میں ہے، کیونکہ سورۂ نجم والے کا تعلق حسبِ قول حضرتِ عائشہؓ و ابن مسعودؓ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ہے لیکن جس دنو و تدلی کا ذکر حدیث اِسراء میں ہے، اس سے صراحت کے ساتھ ثابت ہوا کہ وہ دنو و تدلی رب تبارک و تعالیٰ ہی کی ہے اور اس کی طرف سورۂ نجم میں تعرض نہیں کیا گیا ہے الخ (زادلمعاد برحاشیہ شرح المواہب ۳۰۳)

معراج سے واپسی اور مسجد اقصیٰ میں امامت انبیاء علیہم السلام

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے معراج کو جاتے ہوئے بیت المقدس میں نماز پڑھی اور بعض سے یہ کہ واپسی میں پڑھی میں کہتا ہوں کہ دونوں روایتیں صحیح ہیں کیونکہ آپ نے جاتے ہوئے نفل ادا کئے ہیں اور واپسی میں صبح کی فرض نماز (العرف ۵۳۶) تفسیر ابن کثیر ۲۳ میں اس طرح ہے:۔معراج سے واپسی میں حضور علیہ السلام بیت المقدس میں اترے اور آپ کے ساتھ انبیاء علیہم السلام بھی اُترے، پھر آپ نے نماز کے وقت ان کی امامت کی، ممکن ہے وہ اس دن کی صبح کی نماز ہو، بعض کا خیال ہے کہ آپ نے ان کی امامت آسمان پر کی، مگر بہ کثرت روایات بیت المقدس ہی کے بارے میں ہیں، پھر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاتے وقت اول دخول بیت المقدس کے موقع پر پڑھائی، لیکن ظاہر یہ ہے کہ واپسی پر پڑھائی ہے، کیونکہ جانے کے وقت جب حضور علیہ السلام کا گذر انبیاء علیہم السلام منازلِ سماوی پر ہوا تو آپ نے ایک ایک کے بارے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے استفسار فرمایا ہے اور انہوں نے ہر ایک سے تعارف وملاقات کرائی ہے اور یہی صورت زیادہ مناسب وموزوں بھی تھی، کیونکہ آپ کو بارگاہِ رب العزت میں بُلایا گیا تھا تاکہ آپ کے لئے اور آپ کی امت کے واسطے خصوصی احکام وہدایات دیئے جائیں (اور ملکوتِ سماوات وآیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ بھی کریں) پھر اس مقصدِ عظیم سے فارغ ہوکر یہ مسرت وعزت بھی بخشی گئی کہ آپ اپنے بھائیوں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جمع ہوں، اور امامت کے ذریعہ ان سب پر آپ کا افضل وشرف وعلوِ مرتبت بھی ظاہر ہوجائے اس کے بعد بیت المقدس سے نکل کر براق پر سوار ہوئے اور صبح کے دھند لکے میں مکہ معظّمہ واپس پہنچ گئے، صلوات اللہ وتحیاتہ المبارکۃ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین!

حافظ ابن حجرؒ نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز وامامت کے قبل العروج ہونے کو ترجیح دی ہے (فتح الباری ۱۴۶/ ۷) مگر جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے اوپر اشارہ کیا ایسی صورت میں انبیاء علیہم السلام سے تعارف وملاقات عروج سے قبل ہی ہوجاتی، اور آسمانوں پر جاکر استفسار کی ضرورت نہ ہوتی، حدیثِ مسلم شریف میں ہے کہ میں نے اپنے کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں پایا ان میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے، اُن کا حلیہ ایسا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ایک طرف کھڑے نماز پڑھ رہے تھے ان کا حلیہ ایسا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی کھڑے نماز میں مشغول تھے، ان کا حلیہ مجھ سے زیادہ ملتا تھا، پھر نماز کا وقت آگیا تو میں نے ان سب کی امامت کی الخ اس موقع پر فتح الملہم ۳۲۴/ ۱ میں لکھا:۔ یہ رؤیت بالا تفاق سماوی رؤیت کے علاوہ ہے، اور مراد نماز تحیۃ المسجد یا خاص نمازِ معراج تھی کذا فی المرقاۃ۔ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں مسجد میں داخل ہوا اور سب انبیاء کو پہچانا، کوئی اس وقت قیام میں تھا، کوئی رکوع میں اور کوئی سجدہ میں، پھر نماز کی امامت ہوئی تو میں نے ان کی امامت کی، ایک روایت میں ہے کہ بہت ہی تھوڑی سی دیر میں بہت سے لوگ جمع ہوگئے، پھر اذان دی گئی اور اقامت ہوئی تو ہم سب نے صفیں باندھ لیں، اور انتظار میں تھے کہ کون امامت کرے گا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا، اور میں نے نماز پڑھائی، مسندِ احمد کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام مسجد اقصیٰ میں پہنچے اور کھڑے ہوکر نماز پڑھنے لگے، اتنے میں سارے انبیاء علیہم السلام آپ کے ساتھ نماز پڑھنے لگے، قاضی عیاض نے کہا:۔ ہوسکتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے سب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بیت المقدس میں نماز پڑھی ہو، پھر ان میں سے کچھ آسمانوں پر چلے گئے، جن سے آپ کی ملاقات ہوئی اور ہوسکتا ہے کہ آپ نے ان کے ساتھ نماز آسمان سے اُترنے کے بعد پڑھی ہو اور وہ سب آپ کے ساتھ اُترے ہوں۔

شرح المواہب ۱۲۴/ ۶ میں بحثِ رؤیت کے بعد نہایت عمدہ اشعار عربیہ ذکر کئے ہیں، قلتِ گنجائش کے سبب ان کا ترجمہ وتشریح ترک کرتا ہوں۔

مسجد اقصیٰ سے مکہ معظمہ کو واپسی

شرح المواہب ۱۲۶/۶ میں ہے کہ حضور اکرم علیہ السلام سفرِ اسراء و معراج کے بعد مسجد اقصیٰ سے مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے تو راستہ میں قریش کا ایک قافلہ مکہ معظمہ کی طرف آنے والا ملا، اونٹوں پر غلہ وغیرہ لدا ہوا تھا، ایک اونٹ پر دو بورے تھے، جن میں سے ایک بورا سیاہ رنگ کا، اور دوسرا سفید تھا، حضور کی سواری براق ان کے پاس سے گزری تو سارے اونٹ بدک کر راستہ سے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے، اور اس افراتفری میں وہ اونٹ جس پر دو بورے تھے، گر کر مر گیا، روایت حضرت انسؓ سے ابن ابی حاتم نے روایت کی ہے اور اسی کی دوسری روایت میں ہے کہ پھر آپ کو راستہ میں دوسرا قافلہ ملا، جس کی ایک اونٹنی گم ہو گئی تھی، پھر اس کو ایک شخص تلاش کر کے لایا، حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے ان قافلہ والوں کو سلام کیا تو بعض نے کہا کہ یہ آواز تو محمد علیہ السلام کی معلوم ہوتی ہے پھر حضور علیہ السلام صبح سے پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے اور اہل مکہ کو بتلایا کہ میں نے آج شب میں ایسا سفر کیا ہے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ فلاں مقام (روحاء) میں تمہارے ایک قافلہ پر گزرا ہوں، جہاں ان کی اونٹنی گم ہو گئی تھی، اور فلاں شخص اس کو تلاش کر کے لایا، وہ قافلہ فلاں فلاں جگہ ٹھہرتا ہوا فلاں دن یہاں پہنچے گا اور اُن کے آگے ایک کالے رنگ کا اونٹ ہوگا، جس پر کالا ٹاٹ اور دو بورے لدے ہوں گے، قریش نے سوال کیا کہ وہ کتنے اونٹوں کا قافلہ ہے اور کتنے ان کے ساربان ہیں؟ حضور علیہ السلام نے کچھ توقف کر کے ان کی تعداد بھی بتلادی اور وہ صحیح نکلی، اور جس دن آنے کی خبر حضور نے دی تھی، اسی دن وہ قافلہ دوپہر کے قریب پہنچا، اور اسی وصف کا اونٹ آگے تھا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب وہ سب لوگ گم شدہ اونٹنی کی تلاش میں گئے ہوئے تھے اور قافلہ میں کوئی آدمی نہ تھا تو میں نے ایک پانی کے برتن میں سے پانی پیا' اس کے بعد جب قافلہ والے مکہ معظمہ آئے تو سُرخ اونٹنی کے مرنے کی خبر بھی صحیح نکلی اور پانی پینے کی بھی، پانی والے نے کہا کہ واللہ میں نے پانی رکھا تھا، اس کو ہم میں سے کسی نے پیا بھی نہیں اور زمین پر بھی نہیں گرا، پھر بھی برتن میں سے غائب پایا۔

بخاری و مسلم کی احادیث میں یہ بھی ہے کہ جب میں نے اسراء و معراج کے حالات قریش کو سُنائے تو جن لوگوں نے مسجدِ اقصیٰ کو دیکھا تھا انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے سوالات کرنے شروع کر دیئے اور مسجدِ اقصیٰ کے ستونوں کی تعداد اور ہیئت وغیرہ پوچھی، پہلے تو مجھے سخت تشویش ہوئی کیونکہ وہاں میں نے ان چیزوں کا خیال نہیں کیا تھا، لیکن جلد ہی حق تعالیٰ نے میری مدد کی، اور مسجد اقصیٰ اور میرے درمیان کے حجابات اٹھا دیئے کہ میں نے اس کو دیکھ دیکھ کر تمام سوالات کے صحیح جوابات دیئے۔

مسند احمد و بزار کی حدیث ابن عباسؓ میں اس طرح ہے کہ مسجد اقصیٰ کو ہی اٹھا کر میرے سامنے لے آیا گیا، اور اس کو دارِ عقیل کے پاس رکھدیا گیا، کہ میں اس کو دیکھ کر جوابات دیتا رہا، حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔ اِس کا اقتضاء یہ ہے کہ مسجد کو اس کی جگہ سے زائل کر کے مکہ معظمہ لایا گیا اور یہ بھی خدائے تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں ہے، محدث علامہ قسطلانیؒ نے لکھا کہ بہ نسبت انکشاف کے اس صورت میں معجزے کی شان زیادہ ارفع ہے، اور اس میں کوئی استبعاد بھی نہیں کیونکہ بلقیس کا تخت تو پلک جھپکنے میں (ملکِ یمن سے ملک شام میں) حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آ گیا تھا محدث ابن ابی جمرہؒ نے فرمایا کہ مکہ معظمہ سے براہِ راست عروجِ سماوی نہ کرانے اور براہ بیت المقدس لیجانے کی حکمت یہ معلوم ہوئی ہے کہ اس کے بارے میں جب لوگوں پر سوالات و تحقیق کے بعد اتمامِ حجت ہو جائی گئی، تو باقی معاملات معراج میں بھی تصدیق ضروری ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ اس مومنوں کے ایمان میں اضافہ و ترقی ہوئی، اور معاندوں نے چونکہ اس کا بھی اطمینان نہ کیا تو ان کے کفر و عناد میں بھی مزید ترقی ہوئی، واللہ اعلم! (شرح المواہب ۱۲۱/۶)۔

عطایا معراج ایک نظر میں

حضورِ اکرم ﷺ کو شبِ معراج کے مختصر ترین وقت میں جو انعامات واکرامات وخصائص حاصل ہوئے ان کا اجمالی ذکر حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) شق صدر اور اس کو ایمان وحکمت سے معمور کرنا (۲) رکوبِ براق وسفرِ مسجد اقصیٰ مع حضرت جبرئیل علیہ السلام (۳) سیر ملکوت ارضی، (۴) عروج سماوی وسیر ملکوت السموات (۵) مشاہدۂ آیاتِ عظیمہ الٰہیہ ووعد الآخرۃ اجمع (۶) ملاقات انبیاء علیہم السلام (۷) امامت ملائکہ (۸) داخلہ بیتِ معمور (۹) سماعِ صریف الاقلام (۱۰) لقاء الرب جل ذکرہ (۱۱) کلام الرب عزا سمہ (۱۲) فرضیت صلوات (۱۳) عطیہ خواتیم بقرہ (۱۴) وعدۂ مغفرتِ خصوصی برائے امتِ محمدیہ (۱۵) رؤیتِ جنت ونار (۱۶) تقرب ودنو الرب الجبار تعالیٰ سبحانہ (۱۷) رؤیت الرب جل وعلا! (۱۸) امامتِ انبیاء وملائکہ علیہم السلام در مسجد اقصیٰ (۱۹) واپسی مکہ مکرمہ واتمامِ حجت بر کفار (۲۰) رؤیت مسجد اقصیٰ در مکہ معظّمہ زادہا اللہ شرفاً! **واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم!** (۷ ذی الحجہ ۸۷ھ)۔

(۳۴۰) حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن صالح بن کیسان عن عروۃ بن الزبیر عن عائشۃ ام المومنین قالت فرض اللہ الصلوٰۃ حین فرضھا رکعتین رکعتین فی الحضر والسفر فاقرت صلوٰۃ السفر و زید فی صلوٰۃ الحضر

ترجمہ! ام المومنین حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے جب نماز فرض کی تھی، تو دو رکعتیں فرض کی تھیں، حضر میں (بھی) اور سفر میں (بھی سفر کی نماز تو (اپنی اصلی حالت پر) قائم رکھی گئی، اور حضر کی نماز میں زیادتی کردی گئی!

تشریح! حضرت عائشہؓ کی مذکورہ حدیث الباب سے واضح ہوا کہ نماز کی ابتدائی فرضیت کی نوعیت سفر وحضر دونوں حالتوں میں تمام اوقات کے لئے دو دو رکعت ہی تھی، اسکے بعد سفر کی نماز تو دو دو رکعت ہی باقی رہی اور حضر واقامت کی چار رکعت ہوگئی، اور بخاری **باب یقصر اذا خرج من موضعہ** ۱۴۸ میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نماز اولاً تو دو رکعت ہی فرض ہوئی تھیں، پھر سفر کے لئے تو اسی طرح باقی رہی اور حضر کی نماز پوری کردی گئی، زہری نے راویِ حدیث حضرت عروہؓ سے سوال کیا کہ حضرت عائشہؓ کیوں سفر میں پوری پڑھتی تھیں؟ تو کہا کہ وہ بھی حضرت عثمانؓ کی طرح تاویل کرتی تھیں نیز حضرت عائشہؓ ہی سے بخاری شریف کتاب الہجرۃ ۵۶۰ میں حدیث آئیگی کہ نماز کی دو رکعت فرض ہوئی تھیں، پھر جب حضور علیہ السلام نے ہجرت کی تو چار رکعت فرض ہوگئیں، اور سفر کی نماز پہلی حالت پر چھوڑ دی گئی، وتابعہ عبدالرزاق عن معمر۔

بخاری **باب من لم یتطوع فی السفر وبر الصلوات وقبلھا** ۱۴۹ میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ رہا ہوں، آپ سفر میں دو رکعت پر زیادتی نہ کرتے تھے اور حضرت ابوبکر وعمر وعثمانؓ کو بھی ایسا ہی دیکھا، مسلم شریف میں اس حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:۔ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں رہا ہوں، آپ نے کبھی دو رکعت سے زیادہ نہیں پڑھیں تا آنکہ آپ کی وفات ہوئی، اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بھی رہا وہ بھی دو رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوئی، اور حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی رہا انہوں نے بھی کبھی دو رکعت سے زیادہ نہیں پڑھیں تا آنکہ ان کی بھی وفات ہوئی، پھر میں حضرت عثمانؓ کے ساتھ بھی رہا وہ بھی دو رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے حتی کہ وفات پائی، اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ** (تمہارے لئے رسول اکرم ﷺ کے عمل میں بہت اچھا نمونہ ہے) فتح الملہم ۲/۲۵۱ کتاب صلوۃ المسافرین وقصرہا۔

امام بخاری حدیثِ ابن عمرؓ مذکور کو عدم تطوع فی السفر کے لئے لائے ہیں، مگر حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ کی رائے تھی کہ اس کا تعلق فرض نماز قصر سے ہے، تطوع سفر سے نہیں، جو امام بخاری نے سمجھا ہے اس لئے یہ بھی حنفیہ کے مسلکِ قصر کی دلیل ہے، علامہ زیلعیؒ نے بھی لکھا

کہ بخاری ومسلم کی یہ حدیث اتمام صلوٰۃ فی السفر کے خلاف ہے (نصب الرایہ ۱۹۲/۲) اور علامہ نیموی بھی اس حدیث کو باب القصر فی الصلوۃ میں لائے ہیں، اور لکھا کہ اس حدیث کی روایت بخاری میں مختصراً اور مسلم میں مفصلاً آئی ہے (آثار السنن ۶۱/۲) حضرت شاہ صاحب نے آثار السنن کے قلمی حواشی میں اس موقع پر مسند طیالسی ۲۱۵ سے یہ روایت بھی حضرت عائشہؓ کی نقل کی کہ رسول اکرم علیہ السلام مکہ معظمہ میں دو رکعت پڑھا کرتے تھے، یعنی فرائض، پھر جب مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ پر چار اور تین رکعات فرض ہوگئیں، تو وہی پڑھنے لگے اور دو رکعت چھوڑ دیں جن کو آپ مکہ معظمہ میں پڑھا کرتے تھے، اور جو مسافر کے لئے پوری تھیں۔

راقم الحروف کے نزدیک حضرت شاہ صاحبؒ کی تنبیہ مذکور بہت اہم ہے خصوصاً جبکہ محقق عینی ایسے مستیقظ کو بھی اس پر تنبہ نہیں ہو سکا، اور انہوں نے بخاری باب من لم یتطوع کی دونوں حدیثوں کو ترجمۃ الباب سے مطابق قرار دے دیا ہے، عمدہ ۵۶۰/۳ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق پر دوسری حدیث (مذکورہ بالا) ترجمہ سے مطابق نہیں ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام بخاریؒ قصر صلوٰۃ کے مسئلہ میں حنفیہ، اور جمہور کے خلاف ہیں، بلکہ وہ اس کی موافقت میں ہیں، اسی لئے یہاں حدیثِ حضرت عائشہؓ کو لائے ہیں اور دوسرے مواضع میں بھی اور خصوصیت سے باب قصرِ صلوٰۃ میں اس کو لائے ہیں، جس پر محقق عینی نے لکھا کہ حضرت عائشہؓ کی اس حدیث میں وضاحت ہے کہ مسافر کے لئے دو رکعت ہی فرض ہیں اور فرض وواجب کے خلاف کرنا یا اس پر زیادتی کرنا جائز نہیں ہے۔

چنانچہ اگر حالتِ اقامت میں کوئی شخص پانچ نمازوں میں زیادتی کرے تو وہ بھی جائز نہیں ہوگی، اور نماز فاسد ہو جائیگی، اسی طرح اگر مسافر بجائے دو کے چار رکعت پڑھے گا تو نماز درست نہ ہوگی، یہی بات حضرت عمر بن عبدالعزیز سے منقول ہے کہ سفر کی حالت میں نماز دو رکعت ہیں، اس کے سوا صحیح نہ ہوگی، محدث ابن حزم نے اس کو بطور حجت کے پیش کیا ہے۔

حماد بن ابی سلیمان کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی قول امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب اور بعض اصحابِ امام مالک کا بھی ہے اور امام مالکؒ سے بھی بطریق شہرت یہ قول منقول ہے کہ جو سفر میں پوری نماز پڑھے وہ وقت کے اندر لوٹالے۔

ان حضرات نے حدیث عمرؓ سے بھی استدلال کیا ہے کہ سفر کی نماز دو رکعت پوری ہیں قصر یعنی کم نہیں ہیں، اس کا ثبوت تمہارے نبی کریم علیہ السلام کی زبان مبارک سے ہوا ہے، رواہ النسائی بسند صحیح، اور حضرت ابن عباسؓ سے مسلم شریف میں حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی حضرت محمد علیہ السلام پر حضر میں چار اور سفر میں دو رکعت فرض کی ہیں۔

تمہید ابن عبدالبر میں حدیثِ ابی قلابہؒ ہے کہ مسافر سے روزہ اور آدھی نماز کا بوجھ اٹھا دیا گیا، حضرت انس بن مالکؓ سے بھی ایسی ہی حدیث مروی ہے ابن حزم نے حضرت ابن عمرؓ سے صحیح حدیث نقل کی کہ سفر کی نماز دو رکعت ہے، جو ترک سنت کرے گا وہ کفر کرے گا، حضرت ابن عباسؓ سے نقل ہے کہ جو شخص سفر میں چار رکعت پڑھے گا، وہ اس جیسا ہے جو حضر میں دو رکعت پڑھے، اور یہی قول حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود[۱]، حضرت جابر، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر وثوریؒ کا ہے۔ امام اوزاعی نے کہا کہ مسافر اگر تیسری رکعت کی طرف کھڑا ہو جائے تو اس کو ترک کردے، اور سجدہ سہو کرے، حسن بن حی نے کہا اگر عمداً چار پڑھ کے تو نماز کا اعادہ کرے، حسن بصری نے کہا عمداً چار پڑھیں تو برا کیا اور اس کی قضا کرے، پھر کہا کیا اصحاب محمد علیہ السلام کے بارے میں تم خیال کر سکتے ہو کہ انہوں نے بھاری سمجھ کر دو رکعت چھوڑ دی

[۱] داؤدی نے حضرت ابن مسعودؓ کے متعلق نقل کیا کہ وہ قصر کو فرض سمجھتے تھے۔ (فتح الباری ۳۸۲/۲)

تھیں؟ اثر کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے پوچھا وہ شخص کیسا ہے جو سفر میں چار رکعت پڑھتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، مجھے وہ پسند نہیں ہے، علامہ محدث بغویؒ[1] (شافعی) نے کہا کہ یہی قول اکثر علماء کا ہے، علامہ محدث خطابیؒ[2] (شافعی شارحِ ابی دادی) نے کہا کہ قصر بہتر ہے تا کہ خلاف سے نکل جائے، امام ترمذیؒ[3] (شافعی) نے کہا کہ تعامل اسی پر ہے جو حضور اکرم ﷺ کے فعل مبارک سے ثابت ہے (عمدہ ۵۴۷/۳)

تفصیل مذاہب! بعض کتب شروحِ حدیث میں اس طرح لکھا گیا کہ جوازِ قصر میں سب متفق ہوتے ہوئے، قصر سے رخصت یا عزیمت ہونے میں مختلف ہو گئے ہیں اور دوسرے امر کے قائل امام ابوحنیفہ ہیں، اول کے دوسرے حضرات ہیں، ہمارے نزدیک یہ تعبیر درست نہیں اور صحیح یہ ہے کہ قصر کے وجوب و عزیمت کا قول امام صاحب اور جمہور کا ہے اور رخصت ہونے کا قول امام شافعی وغیرہ کا ہے، جبکہ شافعی مذہب کے بہت اکابر وجوبِ قصر کو ترجیح دیتے ہیں، جیسے علامہ خطابی، بغوی وغیرہ دوسری طرف علامہ شوکانی اور حافظ ابن حزم وغیرہ بھی شد ومد کے ساتھ وجوب کے قائل ومثبت ہیں۔

حافظ ابن قیمؒ و حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی وجوبِ قصر کو ترجیح دی ہے اور آپ نے اپنے فتاویٰ میں مذاہب کی حسب ذیل صحیح ترین صورت پیش کر کے محققانہ ومحدثانہ کلام بھی خوب تفصیل سے کیا ہے۔

علماء کا نمازِ مسافر کے بارے میں اختلاف ہوا کہ آیا اس پر صرف دو رکعت فرض ہیں اور قصر کرنے میں نیت کی بھی ضرورت نہیں، یا بغیر نیت کے قصر نہیں کر سکتا، پہلا قول اکثر علماء کا ہے جیسے امام ابوحنیفہ و امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا بھی ایک قول یہی ہے، جسکو ابوبکر وغیرہ نے اختیار کیا ہے، دوسرا قول امام شافعیؒ کا ہے اور مذہبِ احمدؒ میں بھی یہ دوسرا قول ہے جس کو خرقی وغیرہ نے اختیار کیا، لیکن اول قول ہی صحیح ہے، جس پر سنتِ نبویہ بھی دال ہے کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ قصر نماز پڑھاتے تھے اور نماز سے پہلے ان کو بتلاتے بھی نہ تھے کہ آپ قصر کریں گے، اور نہ خود ان کو نیتِ قصر کا حکم کرتے تھے، پھر علماء کا اس بارے میں اختلاف ہوا کہ سفر میں چار رکعت پڑھنا کیسا ہے، حرام ہے یا مکروہ یا ترکِ اولیٰ ہے یا وہی راجح ہے؟ امام ابوحنیفہ کا مذہب اور ایک قول مذہبِ مالک میں یہ ہے کہ قصر واجب ہے، اور مسافر کو چار رکعت پڑھنا جائز نہیں مذہبِ امام

---

[1] علامہ محدث ملا علیٰ قاری حنفیؒ نے لکھا:۔ حافظ ابن حجرؒ نے ارشادِ نبوی **صدقة تصدقها الله عليكم** سے استدلال کیا کہ قصر رخصت ہے واجب نہیں میں کہتا ہوں کہ صدقہ کا لفظ تو عام ہے صدقہ نافلہ وواجبہ کو قرآن مجید میں ہے **انما الصدقات للفقراء**، پھر یہ کہ آگے حضور علیہ السلام نے فاقبلوا صدقتہ بھی فرمادیا ، اور امر کا ظاہر وجوب کے لئے ہے، لہذا امام صاحبؒ کی موافقت ہوئی، قصر کی عزیمت اور اتمام کے اساءت ہونے میں، اور علامہ بغوی شافعی نے اعتراف کیا کہ اکثر علماءِ وجوبِ قصر کے قائل ہیں، اور حافظ ابن حجرؒ کا ان پر رد قابلِ رد ہے (مرقاۃ ۱۹۶/۲ طبع بمبئی)!

علامہ خطابی نے معالم میں لکھا:۔ اکثر علماءِ سلف وفقہاءِ امصار کا مذہب یہ ہے کہ سفر میں قصر واجب ہے اور یہی قول حضرت عمر ابن عمر و ابن عباسؓ کا ہے، نیز حضرت عمر بن عبدالعزیز، قتادہ وحسن سے بھی یہی مروی ہے، حضرت حماد بن ابی سلیمان نے کہا کہ جو شخص سفر میں چار رکعت پڑھے وہ نماز لوٹائے، امام مالک نے فرمایا کہ جب تک وقت رہے لوٹائے (تحفۃ الاحوذی ۳۸۲/۱)!

[2] علامہ شوکانی نے بھی قولِ وجوب کو راجح قرار دیا، اور دعوائے فضل اتمام کو حضور علیہ السلام کے تمام اسفار میں قصر کرنے اور اتمام نہ کرنے کی وجہ سے ساقط کیا اور کہا کہ یہ بہت مستبعد امر ہے کہ حضور علیہ السلام نے تمام عمر میں مفضول کو لازم کیا ہو اور افضل کو بالکل چھوڑ دیا ہو، اس کو نقل کر کے صاحبِ تحفہ نے لکھا کہ متبعینِ سنتِ نبویہ کی شان یہی ہونی چاہیے کہ وہ بھی قصر کو لازم پکڑیں اور تاویلات کا سہارا لے کر قصر کو ترک نہ کریں۔ (تحفہ ۳۸۳)!

[3] امام ترمذی نے لکھا:۔ نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمرؓ سے سفر میں قصر ثابت ہے، اور حضرت عثمانؓ سے بھی پہلے زمانہ خلافت میں، اور اسی پر اکثر اہل علم اصحابِ نبی محمد ﷺ وغیرہم کا عمل ہے، حضرت عائشہؓ سے سفر میں اتمام کی بھی روایت آئی ہے مگر تعامل اُسی پر ہے جو نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب سے مروی ہے۔ (ترمذی بابُ التقصیر فی السفر)

مالک کی دوسری روایت اور امام احمد کا ایک قول جو دونوں قولوں میں سے زیادہ صریح وواضح بھی ہے یہ کہ پوری نماز پڑھنا مکروہ ہے، ان کا دوسرا قول اور امام شافعیؒ کا اظہر القولین یہ ہے کہ قصر افضل ہے اور چار[۱] پڑھنا ترک اولیٰ ہے۔

دوسرا قول امام شافعیؒ کا یہ ہے کہ چار پڑھنا افضل ہے اور یہ سب اقوال میں سے ضعیف تر ہے الخ (فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۲۳/۱)!

حافظ ابن تیمیہؒ کا استدلال مذکور سب سے الگ اور ان کی دقیق النظری کا شاہد ہے کہ حضور علیہ السلام کا نماز قصر سے پہلے نیت قصر کرنے اور بتلانے کا اہتمام نہ کرنا بھی امر کا ثبوت ہوا کہ سفر والی نماز اپنی اصل حالت پر جیسی ابتدا میں تھی باقی ہے اور چار میں سے دو رکعت نہیں ہوئے ہیں کہ نیت کی احتیاج واقع ہوا اور **فلیس علیکم جناح** کا جواب بھی موصوف نے وہی دیا ہے جو حنفیہ دیتے ہیں کہ نفی جناح بیان حکم وازالہ شبہ کے لئے ہے اس لئے اس سے قصر کی سنیت واہمیت کم نہیں ہوتی جیسے **فلا جناح علیه ان یطوف بهما** میں ہے کہ وہاں طواف بالاتفاق مامور بہ ہے، اور آیت میں خوف وسفر کا ذکر اسلئے ہوا کہ خوف کی حالت میں قصر ارکان مراد ہے اور سفر کی صورت میں قصر عدد اور دونوں ہوں تو دونوں قصر درست ہوں گے (۱۲۲/۱)!

نطق انور! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ جبکہ اتمام صلوٰۃ فی السفر کا ثبوت بجز حضرت عثمانؓ وحضرت عائشہؓ کے کسی سے بھی نہیں ہوا اور ان کا اتمام بھی تاویل کے ساتھ تھا تو حنفیہ کا مذہب ہی قوی ہوا اور وہی جمہور کا بھی مذہب ہے۔

اور اسی لئے جب حضرات ابن مسعودؓ کو حضرت عثمانؓ کے اتمام کی خبر ملی تھی تو انہوں نے اناللہ پڑھا تھا، یہ بھی فرمایا کہ امام شافعیؒ کے پاس صرف دارقطنی کی حدیث حضرت عائشہؓ ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے سفر میں اتمام کیا اور حضور علیہ السلام نے قصر کیا تھا پھر انہوں نے حضور علیہ السلام سے اس کو بیان کیا تو آپ نے تصویب فرمائی، لیکن یہ حدیث ضعیف ومعلول ہے بلکہ حافظ ابن تیمیہؒ نے تو اسکو موضوع تک کہہ دیا ہے اور حضرت عائشہؓ کی طرف اسکی نسبت کو غلط ٹھیرایا ہے اور کہا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حضرت عائشہ حضور علیہ السلام اور سارے صحابہ کو قصر کرتے دیکھیں اور تنہا اتمام کریں، دوسری وہ خود ہی احادیث روایت کرتی تھیں کہ نماز دو ہی رکعت فرض ہوئی تھی، پھر سفر کی برقرار رہی، اور حضر کی زیادہ ہوگئی الخ (کمافی زادالمعاد ۲۸ برحاشیہ شرح المواہب)!

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں اسکو موضوع کہنے کی جرات تو نہیں کرسکتا کیونکہ اس کی سند قوی ہے اور سب رجال ثقہ ہیں، البتہ معلول کہنا صحیح ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی بلوغ المرام میں اس روایت کا اعلال کیا ہے اور وجہ اعلال کی طرف **التلخیص** الجبیر میں اشارہ کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے نزدیک یہ حدیث ہوتی تو انھیں اتمام کے لئے تاویل کی ضرورت ہی پیش نہ آتی جس کا ذکر حضرت عروہ سے بخاری ومسلم میں آتا ہے کہ وہ بھی حضرت عثمانؓ کی طرح تاویل کرتی تھیں حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ تقدیر صحت بھی اس حدیث کا جواب دیا اور دوسرے دلائل پیش کئے، جن کو ہم باب قصر صلوٰۃ میں ذکر کریں گے۔ ان شاءاللہ تعالیٰ!

موجودہ کتب حدیث وشروح میں سے قصر واتمام کی بحث کو سب سے بہتر تفصیل ودلائل کے ساتھ اعلاء السنن ۱۲۶/۷ تا ۱۸۰/۷ میں درج کیا گیا ہے، علم وتحقیق اسکا مطالعہ کریں۔

باب وجوب الصلوٰة فی الثیاب وقول الله عزوجل خذوا زینتکم عند کل مسجد ومن صلی ملتحفا فی ثوب واحد ویذکر عن سلمة بن الاکوع ان النبی صلی الله علیه وسلم قال تزره ولو لبشوکة وفی اسناده نظر ومن صلی فی الثوب الذی یجامع فیه مالم یرفیه اذی وامر النبی صلی الله علیه وسلم ان لا یطوف بالبیت عریان

(کپڑے پہن کر نماز پڑھنا (فرض) ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد تم ہر نماز کے وقت اپنی آرائش (یعنی لباس) کو پہن لیا کرو، (اس پر دلیل ہے) اور جو شخص ایک ہی کپڑے میں لپٹ کر نماز پڑھ لے (تو یہ درست ہے) اور سلمہ بن اکوعؓ سے مروی ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:۔ اپنی (قبا کو) ٹانک لے اگرچہ کانٹے سے سہی اور اس کی اسناد میں اعتراض ہے اور جو شخص اس لباس

---

[۱] امام شافعیؒ نے فرمایا:۔ میں ترک قصر کو مکروہ سمجھتا ہوں اور اس سے روکتا بھی ہوں جبکہ اعراض عن السنّت کی وجہ سے ہو (کتاب الام ۱۵۹/۱ طبع بمبئی)

میں نماز پڑھے، جس میں جماع کرتا ہے تاوقتیکہ اس میں نجاست نہ دیکھے (تو یہ بھی جائز ہے) اور نبی کریم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ کعبہ کا طواف کوئی برہنہ نہ کرے۔

(۳۴۱) حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل قال ثنا یزید بن ابراھیم عن محمد عن ام عطیة قالت امرنا ان نخرج الحیض یوم العیدین و ذوات الخدور فیشھدن جماعة المسلمین و دعوتھم و تعتزل الحیض عن مصلاھن قالت امراة یا رسول الله احدانا لیس لھا جلباب قال لتلبسھا صاحبتھا من جلبابھا

ترجمہ! حضرت ام عطیہؓ روایت کرتی ہیں:۔ہمیں آپ نے حکم دیا تھا کہ عید کے دن حائضہ اور پردہ نشین عورتیں باہر جائیں، تاکہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں اور ان کی دعا میں شریک ہوں، اور حائضہ عورتیں نماز سے علیحدہ رہیں، ایک عورت نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم میں سے کسی کے پاس ڈوپٹہ نہیں ہوتا (وہ کیا کرے؟) آپ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ والی کو چاہیے کہ اپنا ڈوپٹہ اسے اڑھاوے۔

تشریح! امام بخاریؒ یہاں سے نماز کی حالت میں کپڑوں کے استعمال کی ضرورت بتلانا چاہتے ہیں، اس باب میں اُس کی فرضیت و وجوب پر روشنی ڈالی ہے اور آیتِ قرآنی و حدیث سے اس کو ثابت کیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ یہ امام بخاریؒ کا ہم سب پر بڑا علمی احسان ہے کہ وہ تراجم ابواب میں حتی الامکان قرآن مجید کی آیات بھی پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں اس کے بعد ۱۵ باب اور ذکر کریں گے، جن میں مختلف احوال و ظروف کے لحاظ سے نماز کے اندر کپڑوں کا استعمال بتلائیں گے، کپڑے کم ہوں یا تنگ تو کس طرح کیا جائے، مرد و عورت کے الگ احکام کیا ہیں وغیرہ۔

امام بخاریؒ نے اس باب میں بدن چھپانے کو شرائط و فرائض نماز میں سے ثابت کر کے غالباً اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جو حضرات بدن چھپانے کو فی نفسہ تو فرض و ضروری قرار دیتے ہیں مگر نماز کے اندر اسکو صرف سنّیت کا درجہ دیتے ہیں، ان کی رائے صحیح نہیں اور ان سے مراد مالکیہ ہیں، علامہ ابن رشدؒ نے ہدایۃ المجتہد ۹۷/۱ میں لکھا: ظاہر مذہب امام مالکؒ کا یہ ہے کہ ستر عورت سنن صلوٰۃ میں سے ہے، اور امام ابوحنیفہ و امام شافعیؒ نے اس کو فرائض نماز میں شمار کیا ہے، ان حضرات کی دلیل آیت قرآنی **یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد** ہے کہ امر وجوب کے لئے ہے اور سبب نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عورتیں بحالت عریانی بیت اللہ شریف کا طواف کرتی تھیں، اس کو روکا گیا اور طواف کے وقت ستر عورت کو فرض کیا گیا، لیکن جو لوگ اس کو سننِ صلوٰۃ سے قرار دیتے ہیں وہ امرِ قرآنی مذکور کو استحباب پر محمول کرتے ہیں، دوسرے اس زینت کو ظاہری زینت چادر وغیرہ پر محمول کرتے ہیں اور اُس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں، جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ نمازِ جماعت پڑھنے والے کچھ لوگ اپنے تہد و چادر میں بچوں کی طرح گردنوں میں گرہ لگا کر باندھ لیا کرتے تھے اور عورتوں کو حکم تھا کہ وہ اس وقت تک سجدہ سے سر نہ اٹھائیں جب تک مرد سجدہ سے سر اٹھا کر بیٹھ نہ جائیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔اسکا یہ مطلب نہیں کہ سجدہ میں ان لوگوں کو ستر عورت حاصل نہ تھا، بلکہ یہ حکم احتیاطی تھا کہ مبادا کسی کا ستر کھل جائے اور اس پر نظر پڑ جائے، اور ہمارے فقہاء بھی ستر عورت کو اسی درجہ میں ضروری و معتبر قرار دیتے ہیں کہ کسی دوسرے کی نظر اس پر بلا کسی خاص قصد و اہتمام کے نہ پڑ سکے اور اتنی احتیاط پر بھی اگر اضطراراً کھل جائے، یا کسی نظر خاص قصد و تکلف کے ساتھ پر جائے تو وہ شرعاً معتبر نہیں۔ (یعنی نمازی کے لئے مضر نہیں)!

تفسیر آیتِ قرآنی و دیگر فوائد

حضرت شاہ صاحبؒ نے امام بخاریؒ کی پیش کردہ آیت **خذوا زینتکم عند کل مسجد** (اعراف) کی تفسیر میں فرمایا:۔اس

سے پہلے حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے اور جنت سے نکلنے پر لباس جنت سے محروم ہونے کا قصہ بیان فرمایا ہے، پھر اس کی مناسبت سے مسئلہ لباس وستر کی طرف بھی توجہ فرمائی، اور لباس کا حکم بجائے نماز کے مسجد میں آنے کیلئے اس لئے دیا کہ نظر شریعت وقرآن مجید میں فرض نماز کی ادائیگی مسجد ہی میں ہونی چاہیے، اسی لئے دوسری جگہ فرمایا **ولا یاتون الصلوة الا وهم کسالیٰ**، یعنی مسجدوں میں نماز کے لئے آنے میں سستی کرتے ہیں، غرض نماز کو اچھے لباس میں اور مسجد میں جماعت کے وقت پورے نشاط واہتمام کے ساتھ جا کر ادا کرنا چاہیے کیونکہ لفظ زینت سے معلوم ہوا کہ نماز کی حالت میں بہ نسبت دوسرے حالات کے بہتر لباس ہونا چاہیے (کہ سب سے بڑے دربار کی حاضری ہے) حدیث وفقہ میں بھی اسکی تاکید ہے، حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نماز کے وقت عمامہ کا بھی اہتمام فرماتے تھے، اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے نماز عید میں بارہ ہاتھ کا، جمعہ میں سات ہاتھ کا عمامہ باندھا ہے۔ فقہاء نے تین کپڑوں میں نماز کو مستحب لکھا ہے، چادر تہمد وعمامہ، لیکن ترکِ عمامہ پر کراہتِ نماز کی تصریح فقہ میں نہیں ہے، بجز ایک کتاب فتاویٰ دینیہ کے جو ایک سندی عالم کی تصنیف ہے اور میں ان کے فقہی مرتبہ سے واقف نہیں ہوں، اس لئے میرے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ جن بلاد میں عمامہ کو لباس کا خاص اور محترم جزو سمجھا جاتا ہے، وہاں نماز میں بھی اس کا التزام کرنا چاہیے، بغیر اس کے نماز مکروہ یا خلافِ اولیٰ ہوگی، اور جن بلاد میں وہ لباس کا خاص جزو نہیں ہے، وہاں بغیر اس کے نماز میں کوئی کراہت نہ آئے گی!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حضرت شاہ صاحبؒ نے آپ کا ارشاد نقل کیا کہ جن کپڑوں کے ساتھ ایک شخص لوگوں کی مجالس میں جانا پسند نہ کرتا ہو، ان کپڑوں کے ساتھ نماز بھی نہ پڑھے کہ دربارِ خداوندی کی حاضری ہے اور اچھے کپڑوں میں نماز ادا کرنے کا اہتمام کرے کیونکہ خدا کی مجلس مخلوق کی مجلس سے زیادہ رعایت واحترام کے مستحق ہے، مقصد یہ ہے کہ جب وسعت وفراخی ہو تو نماز وذکرِ خداوندی کے وقت تنگی نہ کرے، اچھا لباس اختیار کرے، ناقص ردی یا بقدرِ فرض پر اکتفا نہ کرے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ارشادِ باری تعالیٰ **ینزع عنهما لباسهما لیریهما سوآتهما** سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سترِ عورت خصائصِ جنت میں سے ہے، اور جب وہ خصوصیت نافرمانی کی سزا میں چھن گئی تو پتوں سے بدن ڈھانکنا پڑا اور جنت سے نکل کر دنیا کی طرف اترنا پڑا، اور یہاں ستر کو فرض کر دیا گیا تا کہ اسکا اہتمام کریں، جنت کی طرح نہیں کہ وہاں لباس وسترِ عورت بلا کسی اہتمام کے حاصل تھا اور آئندہ بھی حاصل ہوگا۔

قوله تعالیٰ انه یراکم هو وقبیله کی تفسیر میں فرمایا کہ محشر وآخرت میں اسکا برعکس ہو جائے گا کہ ہم شیاطین وجن کو دیکھیں گے، اور وہ ہم کو نہ دیکھ سکیں گے، واللہ تعالیٰ اعلم!

آگے لباس التقویٰ بھی آیا ہے، یعنی لباس کا بڑا مقصد اگر چہ جسم کی حفاظت وزینت ہے مگر بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے، جس سے مراد لباسِ مشروع ہے، کہ نہ زینت کے لحاظ سے حدودِ شرع سے متجاوز ہو، نہ اس سے فخر وغرور اور تکبر وریا کی بو آئے، نہ غیر صنف یا غیر قوموں کے ساتھ اشتباہ وتشبہ کی صورت پیدا ہو، پھر جتنے بھی انبیاء وصالحین اور صحابیات وصالحات سے ملتی جلتی پوشاک اور وضع قطع ہوگی، اتنی ہی زیادہ بہتر وافضل ہوگی، اس کے برعکس جو پوشاک یا وضع قطع خدائے تعالیٰ کے مستحقِ غضب وعذاب بندوں کی ہوگی، وہ تقویٰ ورضائے الٰہی سے دور کرنے والی ہوگی، **اللهم وفقنا لما تحب وترضیٰ!**

قوله ومن صلےٰ ملتحفا فی ثوب واحد الخ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام طحاویؒ نے اس کے لئے **الصلوة فی الثوب الواحد** کا باب قائم کیا ہے مقصد یہ ہے کہ جب

ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھنی ہو تو اگر وہ بڑا ہے تو اس کو بطور توشّح والتحاف واشتمال استعمال کرنا چاہیے، جس کو اردو میں گاتی مارنا کہتے ہیں ،یعنی چادر کا سرا گردن کے پیچھے گھما کر سامنے سینہ پر لا کر باندھ دے۔

اگر اتنی گنجائش نہیں ہے تو پیچھے لے جا کر گدّی پر گرہ لگا دے، اور اگر اس سے بھی کم ہے تو تہمد کی طرح بدن پر ناف سے اوپر باندھ لے ،غرض یہ ہے کہ جتنا بھی کپڑا ہو وہ سب استعمال میں آ جائے، اور زیادہ سے زیادہ بدن کو ڈھانک دے۔

امام احمدؒ کے نزدیک بھی اگر چہ بدن کا قابلِ ستر تو وہی ہے جو دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک ہے لیکن اس بارے میں جو حدیثی اوامر آئے ہیں، ان کے ظاہر سے متاثر ہو کر وہ اس امر کے قائل ہو گئے ہیں کہ کپڑے میں گنجائش ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص اگر کھلے مونڈھے کے ساتھ نماز پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی، شاید وہ قابلِ ستر جسم کے علاوہ کے لئے بھی تاکدِ ستر کے قائل ہوں، تاہم ان کا یہ مسئلہ فقہی نقطہ نظر سے بہت عجیب ہے۔ اس کے علاوہ ایک صورت اشتمالِ صماء کی ہے جس کو اشتمالِ یہود بھی کہتے ہیں کہ کپڑے کو بدن کے اردگرد اس طرح لپیٹ دے کہ وقتِ ضرورت اندر سے ہاتھ بھی بغیر کشفِ عورت کے نہ نکال سکے تو اسکو شریعت میں ناپسند کیا گیا ہے پھر بحر میں اسکی تصریح کر دی ہے کہ یہ کراہت جب ہی ہے کہ صرف ایک کپڑا ہو، اگر دو ہوں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ وقتِ ضرورت بلا کشفِ عورت بھی ہاتھوں کو باہر نکال سکے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: میرے نزدیک کپڑے کو اس طرح احتیاط واہتمام سے باندھ کر نماز کے لئے کھڑا ہونا ایسا ہی ہے جیسے امراء وملوک کے سامنے کمر پر پٹی باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں، اور دونوں ہاتھ ناف سے نیچے باندھنے کی صورت بھی ایسی ہی ہے، لہذا جب مقصود شہنشاہِ جبار کی پیشی میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا ہے تو ناف کے اوپر و نیچے والی تو دونوں صورتیں موزوں بن سکتی ہیں، لیکن سینہ کے اوپر والی بے معنی ہو جاتی ہے، اور وہ کتبِ شافعیہ میں سے بھی بجز حاوی کے کسی اور کتاب میں نہیں ہے اکثر میں سینہ کے نیچے ہی ہے، اس لئے میرا خیال ہے کہ تحت الصدر ہی کو مسامحت وغلطی سے فوق الصدر کر دیا گیا ہے۔

قولہ ولو بشوکۃ! حضرتؒ نے فرمایا کہ ایسا کرنا کہ چادر میں کانٹا وغیرہ لگا لیا جائے کہ وہ کھل نہ سکے مستحب ہے، ورنہ اپنی عورت (قابل ستر جسم) کی طرف نظر کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔[1]

محقق عینیؒ نے لکھا: محمد بن شجاعؒ کے نزدیک نظر الی العورۃ مفسدِ صلوٰۃ ہے۔ (عمدہ ۲/۲۱۴)!

قولہ لم یر فیہ اذی! فرمایا: اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک بھی منی نجس ہے اور وہ بھی اس بارے میں حنفیہ کے موافق ہیں، امام بخاریؒ نے یہاں تیسری جگہ اسکی طرف اشارہ کیا ہے۔

قولہ وامر النبی علیہ السلام ان لا یطوف الخ! فرمایا: بتلایا کہ بعض فرائض نماز وحج میں مشترک ہیں جیسے سترِ عورت!

قولہ فیشہدن جماعۃ المسلمین! فرمایا: مراد یہ ہے کہ عیدگاہ میں حاضر ہوں، جماعتِ نماز میں شرکت واقتداء مراد نہیں، اگر چہ شہود کا استعمال شرکتِ جماعت کے لئے بھی حدیث میں موجود ہے۔

افادۂ انور! فرمایا کہ باب ستر میں جو احادیث مروی ہیں وہ چونکہ امام بخاریؒ کی شرط پر نہیں ہیں اسلئے اس حدیث کو فقط استئناس کے لئے یہاں لائے ہیں۔

---

[1] محقق عینیؒ نے لکھا: محمد بن شجاعؒ کے نزدیک نظر الی العورۃ مفسد صلوٰۃ ہے۔ (عمدہ ص ۲۱۴ ج ۲)

باب عقد الازار علی القفا فی الصلوٰۃ وقال ابوحازم عن سهل بن سعد صلوا مع النبی صلی الله علیه وسلم عاقدی ازرهم علی عواتقهم

نماز میں تہبند کو پشت پر باندھنے کا بیان، اور ابوحازم نے سہل بن سعد سے روایت کیا ہے کہ صحابہؓ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ تہمدوں کو اپنے شانوں پر باندھ کر نماز پڑھی تھی!

(۳۴۲) حدثنا احمد بن یونس قال ثنا عاصم بن محمد قال حدثنی واقد بن محمد عن محمد بن المنکدر قال صلیٰ جابر فی ازار قد عقده من قبل قفاه و ثیابه موضوعة علی المشجب فقال له قائل تصلی فی ازار واحد فقال انما صنعت ذٰلک لیرانی احمق مثلک واینا کان له ثوبان علیٰ عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم.

(۳۴۳) حدثنا مطرف ابو مصعب قال ثنا عبدالرحمٰن بن ابی الموالی عن محمد بن المنکدر قال رایت جابراً یصلی فی ثوب واحد وقال رایت النبی صلی الله علیه وسلم یصلی فی ثوب.

ترجمہ! محمد بن منکدرؒ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت جابرؓ نے ایسے تہ بند میں جس کو انہوں نے اپنی پشت کی طرف باندھا تھا، نماز پڑھی باوجودیکہ ان کے کپڑے تپائی پر رکھے تھے، ان سے ایک کہنے والے نے کہا کہ آپ ایک ازار میں نماز پڑھتے ہیں، انہوں نے کہا میں نے یہ اس واسطے کیا کہ تیرے جیسا احمق مجھے دیکھے اور رسول ﷺ کے زمانہ میں ہم میں سے کس کے پاس دو کپڑے تھے؟

ترجمہ: محمد بن منکدرؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، اور انہوں نے کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا ہے!

تشریح: محقق عینیؒ نے لکھا:۔ اس باب کا مقصد یہ ہے کہ نماز شروع کرنے والا اپنی چادر کو بدن سے لپیٹ کر گدّی سے باندھ لے تو نماز درست ہو جائے گی، جس طرح صحابہ کرامؓ نے اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی امامت میں نماز ادا کی ہے، اور اس باب کی مناسبت سابق باب اور آئندہ آنے والے ۱۵ ابواب سے یہ ہے کہ ان سب ہی میں احکام ثیاب بتلائے گئے ہیں، اگرچہ آگے پانچ بظاہر غیر متعلقہ ابواب بھی درمیان میں آ گئے ہیں مثلاً **باب مایذکر فی الفخذ** آگے محقق نے ان پانچ ابواب کی وجہ مناسبت بھی لکھی ہے۔ (عمدہ ۲/۲۱۶)!

مشجب کا معنی حضرت شاہ صاحبؒ نے تپائی سے کیا تھا، اور حافظ و محقق عینی وغیرہ نے لکھا:۔ تین لکڑیاں کھڑی کر کے اوپر کے سرے جوڑ لئے جائیں اور نیچے کے سرے پھیلا لئے جائیں، وہ مشجب ہے اور اسی کو شہری لوگ سِپَہ بولتے تھے، لکڑی کے اس اسٹینڈ پر غسل وغیرہ کے وقت کپڑے ڈال لیا کرتے تھے اور پانی ٹھنڈا کرنے کے لئے اس پر مشکیزہ بھی لٹکایا کرتے تھے (عمدہ ۲/۲۱۸ و فتح ۱/۳۱۹ مجمع البحار ۲/۱۷۱)!

بحث و نظر! محقق عینیؒ نے لکھا:۔ حدیث الباب سے باوجود زائد کپڑوں کے بھی ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا جواز معلوم ہوا، اور یہی مذہب اکثر فقہاء کا ہے اور ایک جماعت صحابہ سے بھی اس کی صحت کے لئے احادیثِ صحیحہ مروی ہیں مثلاً حضرت جابر، ابی ہریرہ، عمرو بن ابی سلمہ و سلمۃ بن الاکوعؓ سے تاہم حضرت ابن عمر و ابن مسعود و مجاہدؒ سے اس کے خلاف نقل ہوا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام احمدؒ نے ظواہر احادیث پر نظر کر کے یہ فرمادیا کہ مونڈھے کھلے نماز درست نہ ہوگی، حالانکہ ان کے نزدیک بھی وہ واجب الستر اعضاء میں سے نہیں ہیں۔

باب الصلوة فی الثوب الواحد ملتحفا به وقال الذهدی فی حدیثه الملتحف المتوشح وهو المخالف بین طرفیه علی عالقیه وهو الاشتمال علی منکبیه وقالت ام هانی التحف النبی صلی الله علیه وسلم بثوب له وخالف بین طرفیه عَلٰی عاتقیه

(صرف ایک کپڑے کو لپیٹ کر نماز پڑھنے کا بیان، اورزہری نے اپنی حدیث میں بیان کیا ہے کہ ملتحف کے معنی متوشح کے ہیں اور متوشح وہ شخص ہے جو چادر کے دونوں سرے پلہ مارکر اپنے دونوں مونڈھوں پر ڈال لے، اور یہی اشتمال علی منکبیہ (کا مطلب ہے) اورام ہانی نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ایک کپڑے سے التحاف کیا جس کے دونوں سرے دونوں مونڈھوں پرڈال لئے)

(۳۴۴) حدثنا عبیدالله بن موسیٰ قال اناهشام بن عروة عن ابیه عن عمر بن ابی سلمة ان النبی صلی الله علیه وسلم صلی فی ثوب واحد قد خالف بین طرفیه.

ترجمہ! حضرت عمر بن ابی سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی، اسکے دونوں سروں کے درمیان میں تفریق پیدا کردی کہ ایک سرا ایک شانہ پر اور دوسرا سرا دوسرے شانہ پر ڈال لیا۔

(۳۴۵) حدثنا محمد بن المثنی قال حدثنا یحییٰ قال ثناهشام قال حدثنی ابی عن عمر بن ابی سلمة انه' رای النبی صلی الله علیه وسلم یصلی فی ثوب واحد فی بیت ام سلمة قد القیٰ طرفیه عاتقیه.

ترجمہ! حضرت عمر بن ابی سلمہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو ام ہانیؓ کے گھر میں ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا۔ آپ نے اس کے دونوں سرے دونوں شانوں پرڈال لئے تھے۔

(۳۴۶) حدثنا عبید بن اسمٰعیل قال ثنا ابو اسامة عن هشام عن ابیه ان عمر بن ابی سلمة اخبره قال رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی فی ثوب واحد مشتملاً به فی بیت ام سلمة و اضعاً طرفیه علیٰ عاتقیه

ترجمہ! حضرت عمر بن ابی سلمہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں رسول خدا ﷺ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ اس کا اشتمال کئے ہوئے تھے، یعنی اس کے دونوں سرے پلّہ مارکر اپنے دونوں شانوں پرڈالے ہوئے تھے۔

(۳۴۷) حدثنا اسمٰعیل بن ابی اویس قال حدثنی مالک بن انس عن ابی النضر مولیٰ عمر بن عبیدالله ان ابامرة مولیٰ ام هانی بنت ابی طالب اخبره انه' سمع ام هانی بنت ابی طالب تقول ذهبت الیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم عام الفتح فوجدته' یغتسل و فاطمة ابنته' تستره' قالت فسلمت علیه فقال من هٰذه فقلت انا ام هانی بنت ابی طالب فقال مرحباً بام هانیٔ فلما فرغ من غسله قام فصلی ثمان رکعات ملتحفاً فی ثوب واحد فلما انصرف قلت یارسول الله زعم ابن امی انه قاتل رجلاً قد اجرته' فلان بن هبیرة فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم قد اجرنا من اجرت یاام هانی قالت ام هانی و ذاک ضحیً

ترجمہ! حضرت امّ ہانی بنت ابی طالبؓ روایت کرتی ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے پاس فتح (مکہ) کے سال گئی، میں نے آپ کو غسل کرتے ہوئے پایا اور آپ کی بیٹی فاطمہؓ آپ پر پردہ کئے ہوئے تھیں، امّ ہانی کہتی ہیں میں نے آپ کو سلام کیا آپ نے فرمایا، کون ہے؟

میں نے عرض کیا میں امّ ہانی بنت ابی طالب ہوں، آپ نے فرمایا مرحبا ام ہانی پھر جب آپ اپنے غسل سے فارغ ہوئے تو کھڑے ہو گئے ،اور ایک کپڑے میں التحاف کر کے آٹھ رکعت نماز پڑھی، جب فارغ ہوئے، تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میری ماں کے بیٹے (علی مرتضیٰ) کہتے ہیں کہ میں ایک شخص کو مار ڈالوں گا حالانکہ میں نے اسے پناہ دی، ہبیرہ کے فلاں بیٹے کو، رسول خدا ﷺ نے فرمایا، امّ ہانی! جسے تم نے پناہ دی اسے ہم نے بھی پناہ دی، امّ ہانیؓ کہتی ہیں، یہ (نماز) چاشت کی تھی۔

(۳۴۸) حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شھاب عن سعید بن المسیب عن ابی ھریرۃ ان سآئلاً سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الصلوٰۃ فی ثوب واحد فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوبکلکم ثوبان

ترجمہ! حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ کسی نے رسول خدا ﷺ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا حکم پوچھا تو رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہیں؟ (یعنی جائز ہے)!

تشریح! محقق عینیؒ نے لکھا:۔ اس باب کا مقصد یہ ہے کہ جب ایک کپڑے میں نماز پڑھی جائے تو اس کو بدن پر لپیٹ لیا جائے، علامہ زہریؒ نے التحاف کی شرح توشح سے کی کہ چادر کے دونوں سرے ایک مونڈھے سے دوسرے پر ڈال لئے جائیں، اور یہی اشتمال کہلاتا ہے، ابن بطال نے فرمایا کہ اس طرح چادر اوڑھنے کا فائدہ یہ ہے کہ حالت نماز میں رکوع کے وقت بدن کے واجب الستر حصہ پر نظر نہ پڑے گی، عینیؒ نے فرمایا دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ چادر حالتِ رکوع وسجدہ میں بدن پر سے نہ گرے گی۔

دوسری صورت التحاف کی وہ ہے کہ یہود کی طرح چادر کو بدن پر اس طرح لپیٹ لیا جائے کہ ہاتھ باہر نہ نکل سکیں اس کو شارع علیہ السلام نے ناپسند کیا ہے۔ اور اگر چادر بڑی نہ ہو تو اس کو تہبند کے طریقہ پر استعمال کرنا بہتر ومسنون ہے، جمہور اہل علم صحابہ وتابعین وفقہاء کا مذہب یہی ہے کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے اگر چہ زائد کپڑے موجود ہوں، امام طحاویؒ نے اس کو احادیث کے تواتر سے ثابت بتلایا، اور گیارہ صحابہ سے نقل کیا، البتہ حضرت ابن مسعود، طاؤس وابراہیم نخعی اور امام احمد سے ایک روایت میں، نیز مالکیہ میں سے عبداللہ وہب سے اور محمد بن جریر طبری سے یہ منقول ہوا ہے کہ جب ایک سے زیادہ کپڑوں پر قادر ہو تو ایک میں نماز مکروہ ہوگی۔

جمہور کی طرف سے دو کپڑوں میں نماز پڑھنے کی تاکید کو افضلیت واستحباب پر محمول کیا گیا ہے، لہٰذا اس اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں ہے! (عمدہ ۲/۲۱۹)

بحث ونظر! **قولھا فصلی ثمان رکعات**، پر حضرت صاحبؒ نے فرمایا:۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ نماز بطور شکر فتح مکہ تھی یا چاشت کی تھی۔ بہر حال وقت چاشت ہی کا تھا، اس میں بھی اختلاف ہوا ہے کہ اشراق وچاشت کی نمازیں الگ الگ ہیں یا ایک ہی ہیں، محدثین وفقہاء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ ایک دن میں دو جداگانہ نمازیں نہیں ہیں، اگر اول وقت ادا کی تو اشراق ہے اور وہی آخر وقت میں چاشت ہے، حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ ابوداؤد باب صلوٰۃ الضحیٰ ۱۸۳ اور صحیح ابن خزیمہ میں صراحت ہے کہ حضور علیہ السلام نے ہر دو رکعت پر سلام پھیرا تھا۔

پھر فرمایا کہ نمازِ اشراق وچاشت کی ترغیب میں بہ کثرت قولی احادیث مروی ہیں، لیکن فعلی احادیث بہت کم ہیں اس کی وجہ میں نے نیل الفرقدین میں بیان کی ہے، اس کی مراجعت کی جائے۔

قولھا قد اجرتہ فلا ن بن ھبیرۃ پر حافظؒ نے لکھا:۔ میرے نزدیک روایت الباب میں حذف یا تبدیلی واقع ہوئی ہے کہ دراصل **فلان بن عم ھبیرۃ** تھا، عم کا لفظ حذف ہو گیا، یا قریب کی جگہ ابن ہو گیا، یعنی **فلا ن قریب ھبیرۃ** تھا، اس سے قبل حافظ نے کرمانی کا قول بھی ناتمام ذکر کر دیا، اس پر محقق عینیؒ نے کرمانی کا پورا قول نقل کیا کہ امّ ہانی نے ہبیرہ کا بیٹا مراد لیا ہے اپنے بطن سے، یا ربیب کا

ارادہ کیا (یعنی دوسرے کے بطن سے) اور یہ قول اقرب الی الصواب اور زیادہ معقول ہے اور حافظؒ نے جو توجیہ حذف ومجاز وتقدیر شیئ بعید سے کی ہے، وہ کسی طرح مناسب نہیں، یہ سب خلاف اصل اور بے جا تصرف کلام ہے، نیز محققین کے اقوال مذکورہ بالا کے بھی مخالف ہے (عمدہ ۲۲۳/۲)! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ حضرت ام ہانیؓ کا دیور تھا، جو اس وقت تک بحالت کفر تھا، فقہ حنفی کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ کسی کافر کو اگر کسی مسلمان نے امان دیدیا تو وہ شرعاً مامون ہو جاتا ہے خواہ اس کو کسی غلام نے امن دیا ہو یا عورت نے یا بچہ نے، اسکو قتل کرنے کا حق نہیں رہتا۔ اگر کسی وجہ سے اس کو قتل کرنا ہی ہو تو نقض امان کا اعلان کر کے قتل کرنا جائز، ہو سکے گا، حضور علیہ السلام کے ارشاد سے یہ شبہ نہ ہو کہ آپ نے امان دیا، پہلے سے امان نہ تھا بلکہ امان تو پہلے ہی مل چکا تھا، آپ نے ان کی تسکین خاطر ودفع تشویش کے لئے دستور ومحاورہ کے مطابق ایسا فرمایا ہے کہ ہم تمہارے امان کو نقض نہیں کرتے۔

باب اذا صلی فی الثوب الواحد فلیجعل علی عاتقیه

(جب ایک کپڑے میں نماز پڑھے تو چاہیے کہ اس کا کچھ حصہ اپنے شانہ پر ڈال لے)!

(۳۴۹) حدثنا ابو عاصم عن مالک عن ابی الزناد عن عبدالرحمٰن الاعرج عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لایصلی احدکم فی الثوب الواحد لیس علیٰ عاتقه شیٌ

(۳۵۰) حدثنا ابو نعیم قال ثنا شیبان عن یحیی بن ابی کثیر عن عکرمة قال سمعته' او کنت سالته' قال سمعت اباهریرة یقول اشهد انی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من صلی فی ثوب واحد فلیخالف بین طرفیه.

ترجمہ! حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایسے ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے جس میں اس کے شانے پر کچھ نہ ہو۔

ترجمہ! حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول خدا ﷺ کو میں نے یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جو شخص ایک کپڑے میں نماز پڑھے تو اس کے دونوں سروں کے درمیان میں تفریق کر لینا چاہیے (کہ دونوں سروں کو شانوں پر ڈال لے)!

تشریح! ایک چادر میں نماز پڑھی جائے تو اس کے سرے مونڈھوں پر ڈال کر پڑھی جائے، حافظؒ نے لکھا:۔ یہ تاکید جمہور کے نزدیک استحباب کے لئے ہے اور جن احادیث میں ممانعت ہے وہ کراہت تنزیہی پر محمول ہے، لیکن امام احمدؒ سے ایک قول یہ منقول ہے کہ بغیر مونڈھے پر پلّہ ڈالنے کے نماز درست ہی نہ ہوگی، گویا اس کو شرط صحت صلوٰۃ قرار دیا، دوسرا قول یہ ہے کہ نماز ہو جائے گی مگر گناہ گار ہوگا، گویا مونڈھا ڈھانکنے کو مستقل واجب قرار دیا، کرمانی نے لکھا کہ بظاہر ممانعت کا مقتضی تو تحریم ہی ہے، مگر اجماع جواز ترک پر منعقد ہو چکا ہے لیکن یہ اجماع کا دعوی درست نہیں جبکہ امام احمدؒ ومحمد بن علی سے عدم جواز منقول ہے اور امام ترمذی نے بھی خلاف کا ذکر کیا ہے، امام طحاویؒ نے شرح المغنی[1] میں اس سے متعلق مستقل باب قائم کیا اور حضرت ابن عمر، طاؤس ونخعی کا بھی خلاف نقل کیا، پھر سب احادیث کو اس طرح جمع کیا کہ اصل تو یہی ہے کہ نماز چادر کے پلّے مونڈھوں پر ڈال کر پڑھی جائے، اگر کپڑا چھوٹا ہو تو بطور تہمد باندھ لے شیخ تقی الدین سبکیؒ نے امام شافعیؒ سے بھی وجوب کا قول ذکر کیا ہے مگر معروف کتب شافعیہ میں اس کے خلاف ہی ہے علامہ خطابیؒ نے عدم وجوب پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے

---

[1] حافظ ابن حجرؒ کے پیش نظر امام طحاویؒ کی یہ کتاب اکثر رہی ہے اور اس کا ذکر انہوں نے بہت سی جگہ فتح الباری میں کیا ہے افسوس ہے کہ ایسے علمی نوادر اب تک شائع نہ ہو سکے، اور امت ان کے گرانقدر افادات سے محروم ہے ولعل الله یحدث بعد ذلک امراً انه! مؤلف

کہ حضور علیہ السلام نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی جس کا ایک سرا بعض ازواجِ مطہرات پر پڑا تھا، اور وہ سورہی تھیں، جس سے معلوم ہوا کہ نہ تو کپڑا اتنا بڑا تھا کہ مونڈھوں پر ڈال لیتے اور نہ اتنا چھوٹا تھا کہ بطور تہمد کے استعمال فرماتے، لیکن استدلال میں تامل ہے اور بظاہر امام بخاریؒ کے مذہب میں تفصیل ہے کہ کپڑا بڑا ہو تو مونڈھوں پر ڈال لینا واجب ہے، اور اگر تنگ ہو تو واجب نہیں، اور یہی ابن المنذر کا قول مختار ہے اور اسی تفصیل کی طرف اشارہ کرنے کیلئے امام بخاریؒ نے اگلا باب اذا کان الثوب ضیقاً کا باندھا ہے (فتح ۳۲۲/۱)!

معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ کا مذہب امام احمدؒ کے مذہب سے مختلف ہے، اور صرف امام احمدؒ مونڈھوں کے ڈھانکنے کو شرطِ صحت صلوٰۃ یا واجب ضروری قرار دیتے ہیں، امام بخاری و ابن المنذر صرف وجوب کے قائل ہیں اور اسکو بھی تنگی کے وقت اٹھا دیتے ہیں، محقق عینیؒ نے بھی امام احمدؒ کا وہی مذہب ذکر کیا جو اوپر نقل ہوا (عمدہ ۲/۲۲۸)

نطقِ انور! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام احمدؒ احادیث کے ظاہری الفاظِ امر و نہی والتحاف واشتمال وغیرہ سے متاثر ہو گئے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ مراتبِ امر و نہی کی تعیین اجتہادی ہے، اسی لئے مجتہدین کا اس میں اختلاف پیش آیا ہے، ایک وجوب و تحریم پر محمول کرتا ہے تو دوسرا استحباب و کراہت پر، سب ہی کو عامل بالحدیث سمجھا جاتا ہے اور کسی پر دوسرا معترض نہیں ہوتا، البتہ اگر کوئی کسی حدیث کے تمام ہی مراتب کو ترک کر دے تو اس پر اعتراض ہوتا ہے اور اسی کو ترکِ حدیث کا ملزم قرار دیا جاتا ہے۔

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ مراتب کو سب نے اجتہادی سمجھا ہے، البتہ جب حدیث میں کسی چیز کے ترک یا فعل پر وعید بھی وارد ہو تو اس وقت وجوب یا حرمت کا حکم لگانا ضروری و متعین ہو جاتا ہے، اور اس حالت میں استحباب و کراہت والی بات نہیں چل سکتی۔

باب اذا کان الثوب ضیقا

جب کپڑا تنگ ہو تو کس طرح نماز پڑھے؟

(۳۵۱) حدثنا یحیی بن صالح قال ثنا فلیح بن سلیمان عن سعید بن الحارث قال سالنا جابر بن عبداللہ عن الصلوٰۃ فی الثوب الواحد فقال خرجت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض اسفارہ فجئت لیلۃ لبعض امری فوجدتہ یصلی و علی ثوب واحد فاشتملت بہ وصلیت الیٰ جانبہ فلما انصرف قال ما السریٰ یا جابر! فاخبرتہ بحاجتی فلما فرغت قال ماھٰذا الاشتمال الذی رایت قلت کان ثوباً قال فان کان واسعاً فالتحف بہ و ان کان ضیقا فاتزر بہ.

(۳۵۲) حدثنا مسدد قال ثنا یحیٰ عن سفیٰن قال حدثنی ابو حازم عن سھل قال کان رجال یصلون مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم عاقدی ازرھم علیٰ اعناقھم کھیئۃ الصبیان ویقال للنسآء لاترفعن رؤوسکن حتی یستوی الرجال جلوساً

ترجمہ: سعید بن حارث کہتے ہیں کہ ہم نے جابر بن عبداللہؓ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا حکم پوچھا انہوں نے کہا، میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ آپ کے کسی سفر میں نکلا، ایک رات کو اپنی کسی ضرورت سے میں (آپ کے پاس) آیا میں نے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا، اور میرے جسم کے اوپر ایک کپڑا تھا، تو میں نے اس سے اشتمال کیا اور آپ کے پہلو میں کھڑے ہو کر میں نے بھی نماز پڑھی، جب آپ فارغ ہو گئے تو فرمایا کہ اے جابر رات کو آنا کیسے ہوا؟ میں نے آپ کو اپنی ضرورت بتائی، جب میں فارغ ہوا تو آپ نے فرمایا، یہ اشتمال جو میں نے دیکھا کیسا تھا؟ میں نے کہا ایک کپڑا تھا، آپ نے فرمایا، اگر کپڑا وسیع ہو تو اس سے التحاف کر لیا کرو، اور اگر تنگ ہو تو اس کی تہ بند بنالو!

ترجمہ: حضرت سہلؓ روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز اس طرح پڑھتے تھے جیسے لڑکے اپنے تہبندوں کو اپنے شانوں پر باندھ لیتے ہیں، عورتوں سے کہہ دیا جاتا تھا کہ جب تک مرد سیدھے بیٹھ نہ جائیں اپنے سروں کو نہ اٹھانا۔

تشریح: محقق عینیؒ نے لکھا:۔ پہلی حدیث الباب میں حضور علیہ السلام کے ماھذ الاشتمال؟ فرمانے کا مقصد یہ تھا کہ کپڑا چھوٹا ہونے کی حالت میں اس کو بدن کے اوپر تک لپیٹنا اور بدن کو سکیڑ کر نماز پڑھنا موزوں و معتدل نہیں، اس وقت کپڑے کو بطور تہ بند کے استعمال کرنا چاہیے۔ البتہ بڑی چادر ہو تو کاندھوں کے اوپر پلٹے ڈال کر اس کو استعمال کرنا چاہیے تا کہ اکثر حصہ جسم کو چھپانے کے زیادہ موزوں صورت حاصل ہو سکے، اور اسی کو دوسری حدیث میں بتلایا گیا کہ بہت سے لوگ حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے دہقانی لڑکوں کی طرح بجائے تہمد کی طرح استعمال کے اپنی چادریں گردنوں پر باندھ لیا کرتے تھے، اور اس میں چونکہ بحالت سجدہ بے جا نظر پڑنے کا احتمال تھا، اس لئے مردوں کے پیچھے نماز پڑھنے والی عورتوں کو حضور علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ وہ مردوں کے سجدہ سے اُٹھ جانے کے قبل، اپنے سر سجدے سے نہ اٹھائیں (عمدہ ۲۳۰/۲)!

افاداتِ انور! اس موقع پر ارشاد فرمایا:۔ حدیث الباب میں مسئلہ بتلایا گیا ہے کہ اگر کپڑا چھوٹا ہو جس کو لپیٹ نہ سکیں تو اس کو نماز میں کس طرح استعمال کریں، اور بہت سے مسائل احادیث میں ایسے ملیں گے جن کا ذکر فقہ میں نہیں ہے اسلئے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سارے مسائل فقہ میں آچکے ہیں، اسی طرح بخاری باب من لا یقطع الصلوٰۃ یشیئ (۷۳/۱) میں حدیث عمر بن حفص بن غیاث کی روایت سے آئے گی کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ شب کو رسول اکرم ﷺ (حجرۂ مبارکہ میں) نماز پڑھتے تھے، اور میں سامنے (دیوارِ قبلہ کی طرف) لیٹی رہتی تھی، اگر مجھے کسی ضرورت سے اُٹھ کر باہر جانا ہوتا تھا تو میں بیٹھ کر حضور علیہ السلام کے لئے تشویش کا باعث نہ بنتی تھی بلکہ پیروں کی طرف سے کھسک کر نکل جاتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ نمازی کے سامنے بیٹھا ہوا آدمی کھسک کر چلا جائے تو جائز ہے، جیسے حضرت عائشہؓ لحاف میں سے کھسک کر چلی جاتی تھیں لیکن یہ مسئلہ بھی فقہ میں نہیں ملے گا، فقہ والوں نے نمازی کے سامنے سے گزرنے کے مسائل تو لکھے، مگر سامنے بیٹھنے والا کیا کرے، اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

ائمہ حنفیہ اور امام بخاری رحمہ اللہ

فرمایا:۔ حدیث الباب کے راوی یحییٰ بن صالح امام بخاریؒ کے مشائخِ شام میں سے ہیں، یہ حنفی المذہب اور امام محمدؒ کے تلمیذِ حدیث وفقہ ہیں، سفر حج میں بھی مکہ معظمہ تک امام محمدؒ[1] کے ساتھ رہی ہیں آگے امام بخاریؒ باب من قال لا یقطع الصلوٰۃ شیء میں عمر بن حفص[2] بن غیاث سے روایت لائیں گے جو امام ابو یوسف کے تلمیذِ حدیث ہیں اور انہوں نے امام اعظمؒ کو بھی دیکھا ہے، ان کے والد محدثِ کبیر حفص بن غیاث تو امام اعظمؒ کے کبارِ تلامذہ میں سے ہیں، اور اس سندِ روایت میں عبدالواحد بن زیاد (م ۱۷۶ھ) بھی ہیں میرے نزدیک ان کو بھی امام اعظمؒ سے تعلق رہا ہے کیونکہ دار قطنی کے آخر میں ان سے منقول ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے مالِ خبیث صدقہ کر دینے کے بارے میں سوال کیا اور یہ بھی کہ اس مسئلہ کو انہوں نے کہاں سے اخذ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حدیث عاصم بن کلیب سے اخذ کیا ہے جس میں ہے

---

[1] اس امر کا ذکر حافظؒ نے بھی کیا ہے نیز امام محمد کو ان کے اساتذۂ حدیث میں لکھا اور ان کے اکابر تلامذہ حدیث امام بخاریؒ کے علاوہ ۲۸ ذکر کئے ہیں اور یہ کہ ان سے امام بخاری نے ۸ حدیث روایت کیں، ولادت ۱۳۷ھ میں یا ۱۴۷ھ میں اور وفات ۲۲۲ھ میں ہوئی (تہذیب ۲۲۹/۱۱)!

[2] عمر بن حفصؒ کی وفات ۲۲۲ھ میں ہوئی (تہذیب ۴۳۵/۷) فیض الباری ۸۷/۲ میں وفی اسنادہ حفص الخ چھپا ہے وہ بات عمر بن حفص ہی سے متعلق ہو سکتی ہے نہ کہ حفص سے کہ ان کی وفات ۱۹۴ھ میں ہوئی، اور انہوں نے نہ صرف امام صاحب کو دیکھا بلکہ ان کے ممتاز و کبار اصحاب و تلامذہ اور شرکاءِ تدوین فقہ میں سے تھے، اور امام صاحب سے مسانید امام میں بہ کثرت احادیث بھی روایت کی ہیں، مفصل تذکرہ مقدمہ انوار الباری ۲۰۶/۱ میں موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! مؤلف

کہ آپ کو بے اجازت مالک کے ذبح شدہ بکری کا گوشت کھانے کی دعوت دی گئی، تو آپ نے نہ کھایا اور اُسے مساکین کو کھلا دینے کا حکم دیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس طرح بکثرت اصحاب وتلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے ہیں جن سے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے، اور بہت سے امام اعظمؒ کے تلامذہ[1] بھی شیوخ بخاری میں ہیں۔ اس کے باوجود امام بخاریؒ نے کہیں کوئی منقبت اِن حضرات ائمہ ثلاثہ کی ذکر نہیں کی، یہ بڑے تعجب و حیرت کی بات ہے راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ تعجب و حیرت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اِن ائمہ ثلاثہ کے اکابر اصحاب وتلامذہ، جو شیوخ بخاری ورجالِ صحیح میں ہیں، ان کی بڑی اکثریت نے ان جلیل القدر حضرات کے بڑے بڑے مناقب ومحامد بیان کئے ہیں، اور نکتہ چینی کرنے والوں کی سخت مذمت کی ہے پھر بھی امام بخاریؒ مدح کرنے والوں سے متاثر نہ ہو سکے، اور متعصب قسم کے بے جا نکتہ چینوں کے جھوٹے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو گئے، اس سلسلہ میں ہم نے مقدمہ انوار الباری جلد اوّل اور امام بخاریؒ کے حالات جلد دوم میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی مطالعہ کر لیا جائے، تو پوری طرح صحیح حالات سامنے آسکتے ہیں۔

حضرتؒ نے حافظ ابن حجرؒ کے بارے میں بھی فرمایا کہ ان کا تو مستقل شیوہ ہے کہ حنفیہ کے عیوب نکالتے ہیں اور مناقب چھپاتے ہیں۔

حال ہی میں الجنۃ احیاء الادب السندی حیدر آباد (پاکستان) سے محدث شہیر شیخ الاسلام مسعود بن شیبہ سندیؒ کی مشہور تالیف مقدمۃ کتاب التعلیم شائع ہوگی ہے، جس کا اہل علم کو مدت سے انتظار تھا، اس میں حضرت امام اعظمؒ کے مستند مناقب کامل تحقیق سے درج ہوئے ہیں اور ناقدین کے اعتراضات نہایت قوی دلائل سے دفع کئے گے ہیں، اس پر علامہ محقق مولانا عبدالرشید نعمانی دام فیضہم کے حواشی وتعلیقات بھی اہل علم وتحقیق کے لئے گرانقدر تحفہ ہیں۔

قولہ فی بعض اسفارہ! مسلم شریف میں تعیین ہے کہ وہ غزوۂ بُواط تھا جو اوائلِ مغازی سے ہے یہ جگہ مدینہ طیبہ سے تین منزل دور ہے، ابن اسحٰق نے کہا کہ جن غزوات میں حضور اکرم ﷺ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی ان کی تعداد ستائیس ہے (عمدہ ۲/۲۲۹)!

قولہ لبعض امری! یعنی اپنی کسی ضرورت وکام سے حضور علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ لفظ امر ادر کا واحد ہے اوامر کا نہیں جو بمعنی حکم و مامور بہ ہوتا ہے (عمدہ ۲/۲۲۹)!

قولہ فاشتملت ! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ یہ تعبیر ناقص ہے کیونکہ انہوں نے کپڑوں کے دونوں کناروں کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے دبایا تھا جو اشتمال نہیں کہلاتا، ان کو مسئلہ معلوم نہ تھا، ورنہ ایسی حالت میں کپڑے کو کمر سے باندھنا چاہیے تھا۔

قولہ کان ثوبا! یہاں بھی نقصِ تعبیر ہے، کیونکہ وہاں صورت وحدتِ ثوب کی نہ تھی بلکہ کپڑا چھوٹا تھا۔

قولہ لاترفعن الخ! فرمایا:۔ اس حدیث سے شافعیہ کا مسئلہ نہ سمجھا جائے کہ امام ومقتدی کے افعال بھی بجائے معیت کے تعقیب ہونی چاہیے، کیونکہ یہ ممانعت دوسری وجہ سے تھی، اور اس سے حنفیہ کا یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کسی نے سترِ عورت کر لیا، مگر اس پر نظر خاص اہتمام وتکلف سے پڑ سکتی ہو تو اس سے نماز فاسد نہ ہوگی۔

---

[1] مثلاً ابو عاصم الضحاک النبیل، اسحٰق بن یوسف ازرق، اسرائیل بن یونس، ابونعیم فضل بن دکین، حماد بن زید، حفص بن غیاث، زہیر بن معاویہ، سفیان بن عیینہ، شعبہ صلت، علی بن مسہر، عبداللہ بن مبارک، عبدالرزاق بن الہمام، فضیل بن عیاض، لیث بن سعد، مکی بن ابراہیم، مسعر بن کدام، وکیع، یحییٰ القطان، یزید بن ہارون، اس وقت ہمارے سامنے ۱۴۴ اکابر ائمہ محدثین ایسے ہیں، جن سے امام بخاری وغیرہ نے روایت کی ہے اور وہ امام اعظمؒ کے اخص تلامذہ حدیث میں سے ہیں، ہم نے اس بارے میں بہت کچھ مقدمہ انوار الباری جلد اوّل میں بھی لکھا ہے۔ مؤلف

باب الصلوٰۃ فی الجبہ الشامیۃ وقال الحسن فی الثیاب ینسجھا المجوس لم یربھا باسا وقال معمر رایت الزھدی یلبس من ثیاب الیمن ما صبغ بالبول وصلی علی بن ابی طالب فی ثوب غیر مقصود

(جبہ شامیہ میں نماز پڑھنے کا بیان حسن بصری نے کہا کہ ان کپڑوں میں نماز پڑھنا، جن کو مجوس بنتے ہیں کچھ حرج نہیں ہے معمر نے کہا ہے کہ میں نے زہری کو یمن کے وہ کپڑے پہنے دیکھا، جو پیشاب سے رنگے جاتے تھے اور حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے بے دھوئے کپڑے میں نماز پڑھی)

(۳۵۳) حدثنا یحییٰ قال ثنا ابو معاویۃ عن الاعمش عن مسلم عن مسروق عن مغیرۃ بن شعبۃ قال کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر فقال یا مغیرۃ خذالاداوۃ فاخذتھا فانطلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ تواریٰ عنی فقضٰی حاجتہ، و علیہ جبۃ شامیۃ فذھب لیخرج یدہ من کمھا فضاقت فاخرج یدہ من اسفلھا فصببت علیہ فتوضا وضوءہ للصلوٰۃ و مسح علیٰ خفیہ ثم صلی

ترجمہ! حضرت مغیرہ بن شعبہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ایک سفر میں تھا، آپ نے فرمایا کہ اے مغیرہ پانی کا برتن اٹھالو! تو میں نے اٹھالیا پھر آپ چلے، یہاں تک کہ مجھ سے چھپ گئے، اور آپ نے اپنی ضرورت رفع کی (اس وقت) آپ (کے جسم) پر جبہ شامیہ تھا آپ اپنا ہاتھ اس کی آستین سے نکالنے لگے، تو وہ تنگ ہونے کی وجہ سے اوپر نہ چڑھی، لہذا آپ نے اپنے ہاتھ کو اس کے نیچے سے نکالا پھر میں نے آپکے اعضائے شریفہ پر پانی ڈالا، اور آپ نے نماز کے وضو کی طرح وضو فرمایا، اور آپ نے موزوں پر مسح کیا، پھر نماز پڑھی!

تشریح و تحقیق! ترجمۃ الباب اور حدیث الباب دونوں کا بظاہر اور اولیٰ مقصد یہ ہے کہ کفار کی وضع قطع کے کپڑے بھی نماز کے وقت استعمال کئے جا سکتے ہیں جیسے حضور اکرم ﷺ نے شامی جبہ کا استعمال فرمایا کیونکہ اس وقت شام رومیوں کے تحت اور کفار کے قبضہ میں تھا، اور وہاں رومیوں کے طرز ہی کے لباس استعمال ہوتے تھے، دوسرا ضمنی اور ثانوی مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کفار کے بنائے ہوئے یا استعمالی کپڑوں کا استعمال بغیر دھوئے ہوئے، نماز کے وقت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جس کی طرف امام بخاریؒ نے بعد الترجمہ آثار سے اشارہ کیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے سامنے پہلا مقصد وضع قطع ہی ہے جو حدیث الباب کے بھی منطوق و منصوص کے مطابق ہے، دوسری بات ضمنی و ثانوی درجہ کی ہے۔

اس کے برخلاف شارحین بخاریؒ نے لباسِ کفار کی صرف طہارت و نجاست کو مقصود قرار دیا ہے اور وضع قطع کی طرف کوئی تعرض نہیں کیا، حالانکہ حدیث الباب میں ساری بات اُسی سے متعلق معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے شامی جبہ پہنا تھا جس کی آستین تنگ تھیں، وضو کے وقت آپ ان کو اوپر نہ چڑھا سکے، تو اپنے ہاتھ آستینوں کے نیچے سے نکال لئے تب وضو فرمایا، لہذا حدیث الباب میں بظاہر طہارت و نجاستِ ثیابِ کفار سے کوئی تعرض نہیں ہے البتہ ضمناً وہ بات ضرور نکل سکتی ہے، اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے مستحق ترجیح ہے، آپ نے اس موقع پر لباس وغیرہ میں تشبہِ کفار کی بحث بھی کی ہے اور لباس کفار کی طہارت و نجاست کی بھی، ہم دونوں کو درج کرتے ہیں:۔

اسلامی شعار و تشبہ کفار

فرمایا: شعار کی بحث صرف ان امور میں چلے گی جن کے بارے میں صاحب شرع سے کوئی ممانعت کا حکم موجود نہ ہو، ورنہ ہر ممنوع شرعی سے احتراز کرنا ضروری ہوگا، خواہ وہ کسی غیر قوم کا شعار ہو یا نہ ہو، اس کے بعد جن چیزوں کی ممانعت موجود نہ ہو اگر وہ دوسروں کا شعار ہوں، تو ان سے بھی مسلمانوں کو اجتناب کرنا ضروری ہوگا، اگر وہ نہ رکیں اور ان کا تعامل بھی دوسروں کی طرح عام ہو جائے یہاں تک کہ اُس زمانہ کے مسلمان صلحاء بھی ان کو اختیار کرلیں تو پھر ممانعت کی سختی باقی نہ رہے گی۔

جس طرح کوٹ کا استعمال ابتداء میں صرف انگریزوں کے لباس کی نقل تھی، پھر وہ مسلمانوں میں رائج ہوا، یہاں تک کہ پنجاب میں صلحاء اور علماء تک نے اختیار کرلیا تو جو قباحت شروع میں اختیار کرنے والوں کے لئے تھی، وہ آخر میں باقی نہ رہی، اور حکم بدل گیا، لیکن جو امور کفار و مشرکین میں بطور مذہبی شعار کے رائج ہیں یا جن کی ممانعت صاحب شرع نے بہ صراحت کردی ہے، ان میں جواز یا نرمی کا حکم کبھی نہیں دے سکتے۔

ثیابِ کفار وغیرہ کے احکام

فرمایا:۔ جس طرح امام بخاریؒ نے حسن بصری کا قول نقل کیا کہ مجوس کے بنے ہوئے کپڑوں کو پاک سمجھا جاتا تھا، یا حضرت علیؓ کا اثر نقل ہوا کہ وہ غیر مقصور یعنی کورا کپڑا (نیا بغیر دُھلا) استعمال فرمالیتے تھے، اسی طرح مسئلہ حنفیہ کے یہاں بھی ہے کہ نئے کپڑے جو بلادِ کفر سے آتے ہیں، ان کو پاک سمجھتے ہیں، بجز اسکے کہ ان کی ناپاکی کی کوئی وجہ معلوم ہو، نیز فقہاء نے یہ بھی لکھا کہ کفار کی تیار کردہ کھانے پینے کی چیزیں اور پوشاک و دوائیں سب میں گمان غالب کا اعتبار ہوگا، کہ جب تک ظن غالب طہارت کا ہو اور نجاست کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو، ان سب چیزوں کو پاک ہی قرار دیا جائے گا، اور صرف وہم و شک نجاست کا خیال نہ کریں گے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ کتبِ فتاویٰ میں تو کچھ ایسا ہی لکھتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے احتمالات و شکوک بالکلیہ نظر انداز کردیئے جائیں، مگر میری رائے یہ ہے کہ اتنی زیادہ توسیع اور ڈھیل نہیں ہے، چنانچہ کتبِ متون میں مذکور ہے کہ آزاد پھرنے والی مرغی کا جھوٹا مکروہ ہے (ظاہر ہے یہ کراہت کا حکم صرف اس لئے ہوا کہ احتمال ہے اس نے کوئی نجس چیز کھائی ہو) اگرچہ فتح القدیر میں اس پر لکھا کہ یہ کراہت تنزیہی ہے، مگر شک و احتمال کا معتبر ہونا کسی درجہ تو ثابت ہوا، بحر میں مسئلہ ہے کہ جو پانی جنگل میں ہو اور اس کے آس پاس وحشی جانوروں کے نقشِ قدم ہوں، تو اس پانی کا استعمال مکروہ ہے حالانکہ فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایسے پانی میں جب تک نجاست کا مشاہدہ نہ کرلیا جائے یا کوئی صحیح خبر وقوع نجاست کی نہ ہو تو اس پانی کو نجس نہ کہیں گے، ایسے ہی ثیابِ کفار[1] کا بھی مسئلہ ہے کہ جب تک نجاست کا مشاہدہ یا خبر نہ ہو، ان پر حکم نجاست نہ لگائیں گے، لیکن جن کفار و مشرکین کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ طہارت کا خیال نہیں رکھتے، بعض نجس چیزوں کو بھی پاک سمجھتے ہیں، ان کی بنائی ہوئی مٹھائی وغیرہ دوسری چیزیں میرے نزدیک مکروہ و قابل احتراز ہی ہیں، خاص طور سے اہل تقویٰ کو ان سے بچنا چاہیے آج کل بعض لوگ ان چیزوں سے پرہیز نہیں کرتے اور بالکل بے پروائی سے برتاؤ کی اجازت دیتے ہیں یہ غلط ہے بلکہ روکنا مناسب ہے ہندوؤں کے یہاں مشاہدہ ہوا ہے کہ کتا برتن میں منہ ڈال دیتا ہے اور وہ اس کو ناپاک نہیں سمجھتے اور گائے کے گوبر اور پیشاب کو پاک سمجھتے ہیں، جو ہمارے مذہب میں نجس ہیں، لہذا جو لوگ ہماری پاکی کا خیال نہیں کرتے ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

امام زہری رحمہ اللہ کا مذہب

امام بخاریؒ نے یہاں معمر کا قول بھی نقل کیا کہ میں نے امام زہریؒ کو دیکھا وہ یمنی کپڑے پہنتے تھے، جن کے رنگ میں پیشاب کا استعمال ہوتا تھا، اس موقع پر حافظ اور عینی[2] وغیرہ شارحین بخاری نے لکھا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام زہریؒ ماکول اللحم جانوروں کے

---

[1] موفق نے لکھا:۔ کفار کے جن کپڑوں کے استعمال کی اجازت ہے وہ ہیں جو ان کے استعمالی نہ ہوں یا اوپر کے حصۂ جسم پر استعمال ہوتے ہوں جیسے جامہ، چادر، کرتہ وغیرہ کہ وہ طاہر سمجھے جائیں گے، اور جو نیچے کے حصوں پر استعمال ہوں جیسے تہمد، پاجامہ، جانگیہ وغیرہ، ان کے بارے میں امام احمدؒ نے فرمایا کہ ان میں اگر نماز پڑھ لی جائے تو اس کا لوٹانا مجھے پسندیدہ ہے اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ نماز کا لوٹانا واجب و ضروری ہو، جو قاضی کا قول ہے، اور امام ابوحنیفہ و شافعی نے بھی کفار کے ازار و پاجامہ کا استعمال مکروہ بتلایا ہے کیونکہ وہ لوگ نجاست سے احتراز نہیں کرتے لہذا ظاہر یہی کہ ان کے یہ کپڑے بول و براز سے ملوث ہوں گے دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اعادہ وجوب سے کم درجہ کا ہو، جو ابوالخطاب کا قول ہے اس لئے کہ اصل طہارت ہے جو شک سے زائل نہ ہوگی، (لامع ۱/۱۴۳) حافظؒ نے لکھا:۔ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ کفار کے کپڑوں میں بغیر دھوئے نماز مکروہ ہے۔ امام مالک سے مروی ہے کہ اگر ان کپڑوں میں نماز پڑھ لی جائے تو وقت کے اندر اعادہ کرلے (فتح ۱/۳۲۳)!

[2] علامہ عینی نے عمدہ ۹۱۹ میں امام زہری کی طرف طہارت کا قول منسوب کیا ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق مذکور کے بعد محتاج دلیل اور مستحق تصحیح ہے۔ مؤلف

پیشاب کو طاہر سمجھتے تھے، اس پر حضرتؒ نے فرمایا کہ امام زہریؒ کی طرف یہ نسبت غلط ہے کیونکہ میرے نزدیک ان کا مذہب سارے ابوال کی نجاست کا تھا، اور اس کے ثبوت میں میرے پاس مصنف عبدالرزاق وغیرہ کی نقول ہیں، پھر اس کے باوجود ان کے استعمال مذکور کی وجہ یہ تھی کہ ایسے کپڑوں کو پیشاب میں رنگنے کے بعد دھونے کا رواج بھی تھا، اس لئے وہ بھی ضرور دھونے کے بعد استعمال کرتے ہوں گے اور دھونے کے بعد استعمال کا ذکر یہاں اس لئے کیا گیا کہ جو طبائع ایسے کپڑوں کا استعمال دھونے کے بعد بھی پسند نہ کریں، ان کو اس نقل سے فائدہ ہوگا کہ طبعی کراہت نہ کریں گے پھر فرمایا:۔ مجھے جب سے یہ معلوم ہوا کہ حیدر آبادی رومال بھیڑ بکریوں کے پیشاب میں رنگے جاتے ہیں، تو میں بھی استعمال سے پہلے دھلوالیتا ہوں۔

نیز فرمایا:۔ کہ صرف اس قول معمر عن الزہری سے استدلال کرکے امام زہریؒ کا مذہب طہارت **ابوال ماکول اللحم** قرار دیدینا درست نہیں کیونکہ مصنف عبدالرزاق سے ان کا مذہب نجاست ابوال ثابت ہے، اور بخاری ۸۶۰ **باب البان الاتن** میں **هل تشرب ابوال الابل ؟** کے سوال سے بھی اشارہ نجاست کی طرف ہے (جس کے جواب میں ابوادریس نے کہا کہ دوائی ضرورت سے ان کا استعمال جائز سمجھا گیا ہے اگر وہ سائل و مجیب کی نظر میں طاہر ہوتے تو مذکور سوال و جواب کا کیا موقع تھا؟) فرمایا:۔ میں نے حضرت عمرؓ کا اثر بھی دیکھا ہے کہ انہوں نے یمنی کپڑوں کے استعمال کی ممانعت کا ارادہ کرلیا تھا جو پیشاب سے رنگے جاتے تھے، لیکن جب حضرت ابیؓ نے کہا کہ آپ ایسی چیز کی ممانعت کا حکم کیوں کر کر سکتے ہیں، جس کی ممانعت حضور اکرم ﷺ سے ثابت نہیں تو حضرت عمرؓ نے وہ ارادہ ترک کردیا۔

مطلب یہ کہ حضرت عمرؓ بھی مطلقاً سب ابوال کی نجاست کے قائل تھے، تب ہی تو یمنی کپڑوں کے استعمال کو روکنا چاہا تھا، مگر چونکہ ایسے کپڑوں کے دھونے کے بعد استعمال کی شرعاً گنجائش موجود تھی اور اسی لئے حضور اکرم ﷺ سے ممانعت ثابت نہ تھی، اس لئے حضرت ابیؓ کی بات حضرت عمرؓ نے قبول کرلیا تا کہ لوگ سختی و تنگی میں مبتلا نہ ہوں، پھر جب امام زہریؒ کا مذہب بھی تمام ابوال کی نجاست ہی تھا تو وہ کیوں کر بغیر دھلے یمنی کپڑے استعمال کر سکتے تھے، لہذا حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق مذکور نہایت قابل قدر ہے۔

حافظ ابن حزم کی تحقیق

ابوال ماکول اللحم کی نجاست کے بارے میں حافظ ابن حزمؒ نے محلی جلد اول میں ۱۶۸ سے ۱۸۲ تک مفصل بحث کی ہے جو اہل علم کے لئے قابل مطالعہ ہے، اور اس بارے میں اگرچہ ان کا مسلک امام ابوحنیفہ و شافعی کے موافق ہے، مگر حسب عادت امام اعظم کے مذہب کی تفصیل و تفریع نقل کرکے اختلاف و درازلسانی کی گنجائش نکال لی ہے، امام مالک اور داؤد ظاہری کے دلائل کا مکمل رد کیا ہے لیکن امام احمدؒ کا مذہب نقل نہیں کیا، نہ انکا نام لے کر تردید کی حالانکہ ان کا مذہب بھی **ابوال ماکول اللحم** کی طہارت ہی ہے بلکہ ازبال (گوبر) کو بھی پاک کہا ہے جیسا کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی فتاوی ۱/۸-۲۳ میں نقل کیا ہے یہ عجیب طرز تحریر ہے کہ موافقوں کو تو محض تعصب کی راہ سے مطعون کیا جاتا ہے اور مخالفوں سے صرف نظر کی جاتی ہے۔

طہارت و نجاست ابوال وازبال کی بحث

اس بارے میں پہلے امام طحاویؒ نے عقلی و نقلی عمدہ بحث کی، جو مزید تحقیق کے ساتھ امانی الاحبار ۲/۱۰۱ تا ۲/۱۱۶ میں قابل مطالعہ ہے پھر حافظ ابن حزمؒ نے محلی ۱/۱۶۸ تا ۱/۱۸۲ میں خوب داد تحقیق دی اور قائلین طہارت ابوال وزبال **ماکول اللحم** کا مکمل رد کیا، حالانکہ اُن قائلین میں بہ کثرت مسائل میں ان کے ہم مشرب داؤد ظاہری[1] وغیرہ بھی تھے، اور امام احمدؒ بھی تھے جن کی بظاہر عظمت و جلالت قدر کے پیش

---

[1] داود ظاہری سب سے الگ ہوکر سارے حیوانات کے ابوال وارواث کو طاہر مانتے ہیں بجز انسان کے، اور امام احمدؒ وغیرہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نظر وہ نام لے کر تردید پسند نہیں کرتے، جبکہ امام مالک وشافعی کی تردید نام لے کر اور سخت الفاظ میں کرتے ہیں اور امام اعظم، امام ابو یوسف وامام محمد وزفرؒ (ائمہ حنفیہ) سے تو اتنی کد ہے کہ ان کی موافقت کو بھی مخالفت میں بدلتے اور طعن وطنز کا پہلو نکال لیتے ہیں۔

ان کے بعد محقق عینی، حافظ ابن حجر وعلامہ نوویؒ وغیرہ نے بھی مسلک جمہور (نجاستِ ابوال وازبال) کی محدثانہ انداز میں تائید کی، مگر حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی فتاویٰ میں طہارت کا اثبات بڑی قوت سے کیا ہے، اور وہی نقلی وعقلی دلائل دہرائے ہیں، جن کی پوری تردید امام طحاوی، ابن حزم ،عینی وحافظ کر چکے تھے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اپنی درسی افادات اور قلمی حواشی آثار السنن میں جمہور کی پرزور تائید کی ہے۔

پوری بحث تو اپنے موقع پر آئے گی، یہاں ہم حافظ ابن تیمیہؒ کے اس مقام کے طرزِ استدلال کا کچھ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) ابوبکر ابن المنذر رنے، جن پر اکثر متاخرین نقل اجماع وخلاف کے بارے میں اعتماد کرتے ہیں، لکھا کہ عامۂ سلف سے طہارت ابوال ہی منقول ہے، پھر لکھا کہ امام شافعیؒ نے تمام ابوال کو نجس کہا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ امام شافعیؒ سے قبل کسی نے چوپاؤں کے ابوال وابعار کو نجس کہا ہو، اس کو نقل کر کے حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا:۔ حضرت ابن عمرؓ سے بولِ ناقہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ جہاں اس کا پیشاب لگ جائے اس کو دھولو شاید حضرت ابن عمرؓ کا یہ حکم ایسا ہی تھا جیسا کہ رینٹھ تھوک اور منی وغیرہ لگ جانے سے دھویا جاتا ہے، اور زہری سے بھی نقل ہے کہ چرواہے کو اونٹوں کے پیشاب لگ جائیں تو کیا کرے؟ فرمایا دھویا جائے۔

حماد بن ابی سلیمان نے بھی بول شاۃ وبعیر کے دھونے کو فرمایا اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب بھی نجاست ہی کا ہے، اس لئے ابن المنذر کے قول مذکور کا مطلب غالباً یہ ہے کہ سلف سے تھوڑے بہت بول وگوبر سے اجتناب واحتراز کے وجوب کا حکم منقول نہیں ہے یعنی وجوب کے درجہ کی بات ہمیں نہیں پہنچی۔

پھر حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا کہ میرے علم میں کسی صحابی کا قول نجاست کے بارے میں نہیں ہے بلکہ طہارت ہی کے اقوال ہیں بجز ابن عمرؓ کے بشرطیکہ انہوں نے نجاست کا ارادہ کیا ہو (فتاویٰ ۱۳۲/۲ طبع جدید قاہرہ فی خمس مجلدات)!

لفظ ابن حزمؒ نے اسکے برخلاف اس طرح لکھا:۔ ابوال وازبالِ **ماکول اللحم** کی نجاست کا قول ہی بہت سے سلف سے منقول ہے حضرت ابن عمرؓ نے بول ناقہ دھونے کا حکم دیا، امام احمدؒ نے جابر بن زید کا قول نقل کیا کہ سارے پیشاب نجس ہیں، حضرت حسن نے فرمایا کہ سارے پیشاب دھوئے جائیں، حضرت سعید بن المسیب نے سارے ابوال کے لئے رش وصب کا حکم دیا، امام زہری[۱] نے ابوال ابل دھونے کا حکم دیا، محمد بن سیرین پر چمگادڑ کا پیشاب گر گیا تو اس کو دھویا پھر فرمایا کہ میں اس دھونے کی کوئی اہمیت نہ سمجھتا تھا تا آنکہ مجھ کو سات صحابہؓ سے یہ بات پہنچی، اور حماد بن ابی سلیمان سے محدث شعبہ نے بول شاۃ وبول بعیر کے بارے میں سوال کیا تو دھونے کا حکم بتلایا (محلی ۱۸۰/۱)

طحاوی ومصنف ابن ابی شیبہ وبیہقی میں حضرت حسن بصری سے کراہتِ ابوال بقرہ غنم وحکم غسل مروی ہے اور نافع وعبدالرحمٰن بن القاسم سے ابوال بہائم دھونے کا امر منقول ہے میمون بن مہران نے بھی بولِ بہیمہ وبول انسان کو برابر درجہ کا قرار دیا (امانی ۱۱۶/۲)

یہ ان سب حضرات کا ابوال کو نجس بتلانا، دھونا، اور ابن سیرین کا سات صحابہ سے دھونے کا حکم نقل کرنا، اور حضرت عمرؓ کا حیرہ کے کپڑوں کے استعمال کو ممنوع کرنے کا ارادہ کرنا کہ وہ پیشاب سے رنگے جاتے تھے، جیسا کہ مجمع الزوائد ۲۸۵/۱ میں امام احمد سے روایت ہے شیخ ابن المنذر کے دعوے اور حافظ ابن تیمیہؒ کی تاویلات کے جواب میں کافی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) صرف **ماکول اللحم** حیوانات کے ابوال وارواث کو طاہر کہتے ہیں امام محمد صرف ابوال **ماکول اللحم** کو طاہر مانتے ہیں، ارواث کے بارے میں ان سے صرف ایک روایت شاذہ ہے۔ مؤلف

[۱] معلوم ہوا کہ امام زہری کو حافظ عینی نے جو قائلین طہارت میں لکھا ہے وہ صحیح نہیں، اور ابن سیرین نے بھی قول طہارت سے رجوع کر لیا تھا۔

(۲) عرنیین کیلئے حضور علیہ السلام نے بطور علاج شربِ ابوال کی تجویز کی تھی، اس سے بھی حافظ ابن تیمیہؒ نے خوب بڑھا چڑھا کر استدلال کیا ہے اور لکھا کہ دوا کرنا مستحب ہے واجب نہیں کہ اس کے لئے حرام کو حلال کیا جاتا ۱/۱۴۴ ۲/۱۳۴اس کا جواب دیا گیا کہ رمضان میں فطر بھی حرام ہے جو سفر کی وجہ سے حلال ہو گیا، حالانکہ سفر بھی واجب نہیں، صرف مباح ہے ایک مباح کی وجہ سے حرام کیسے حلال ہو گیا؟ پھر دواء حرام و نجس چیز کے استعمال کی اجازت ظاہر ہے کہ کسی حاذق طبیب کے فیصلہ سے ہو گی، جبکہ وہ یہ سمجھے گا کہ اس مرض کا ازالہ اسی دوا سے ممکن ہے ورنہ جان کا اندیشہ ہے تو کیا ایسی صورت میں جان کا بچانا بھی واجب وضروری نہ ہو گا، حافظ ابن تیمیہؒ نے یہ بھی لکھا کہ ایک مرض کی بہت سی دوائیں ہوتی ہیں حلال بھی حرام بھی، پھر حرام کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ طبیب موجودہ میسر ادویہ میں سے انتخاب کرتا ہے، اور مجبور ہو کر کسی دوا کو تجویز کرتا ہے، جب دوسری موجودہ میسر ادویہ سے شفا[1] نہیں دیکھتا، ایسی حالت میں اگر وہ کسی محرّم و نجس دواء کو تجویز کرتا ہے، تو اس کا تعلق دوسری حلال ادویہ کے وجود و فائدہ کا نہ انکار ہے، نہ اس دواء کے فی نفسہ غیر نجس و حلال ہونے کا ثبوت اس لئے حضور علیہ السلام کی تجویز بھی جیسا کہ جمہور امت نے سمجھا محض شرعی ضرورت علاج و تداوی کے تحت تھی، اس کے بارے میں دوسری تاویلات موزوں نہیں ہوں گی۔

(۳) گیارہویں دلیل پیش کی کہ اگر یہ سب چیزیں (ابوال وارواث) نجس ہوتے تو حضور علیہ ان کی نجاست ضرور بتلاتے اور آپ نے نہیں[2] بتلائی لہذا نجس نہیں، حالانکہ حدیث اکثر عذاب القبر من البول، حاکم نے علی شرط الشیخین روایت کی ہے، اتقوا البول فانه اوّل مایحاسب به العبد فی القبر (مجمع الزوائد من الطبرانی) استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه (صحیح ابن خزیمہ وغیرہ کذافی فتح الباری) حدیث بخاری و مسلم عذاب القبر بسبب عدم احترازمن البول، حدیث لا یصلی بحضرة طعام ولا وهوید افعه الا خبثان (ابوداؤد) حافظ ابن حزمؒ نے لکھا کہ شارع علیہ السلام نے بول و نجو کو اخبث بتلایا، اور خبیث محرم ہوتا ہے (محلی ۱/۱۷۸)!

حضرت سعد بن معاذ کا ضغطہ قبر سے نجات نہ پانا اور اثرِ بول کی وجہ سے ایسا دبایا جانا جس سے پسلیاں دوہری ہو گئیں شرح الصدور للسیوطی میں ہے، جس میں ذکرِ غنم تو نہیں جو دوسری روایات میں ہے مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنے پیشاب سے تو ضرور ہی بچتے ہوں گے کہ وہ بالاتفاق نجس ہے (الاستدراک الحسن ۱/۱۵۸) اب سب روایات کے باوجود یہ دعویٰ کہ حضور علیہ السلام نے ابوال وارواث کی نجاست بیان نہیں فرمائی کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

(۴) حدیث اکثر عذاب القبر من البول، پر حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا کہ مراد ہر انسان کا اپنا پیشاب ہے، کیونکہ دوسروں کا بول کسی انسان کو پہنچنا قلیل و نادر ہے دوسرے یہ کہ ہر بول سے اجتناب کرانا مقصود ہوتا تو من البول کی جگہ من النجاسات فرمایا جاتا، اس عجیب تحقیق و اصلاح کی کیا داد دی جائے؟

(۵) مدافعتِ اخبثین والی حدیث پر لکھا کہ اس سے استدلال نہایت ساقط درجہ کا ہے کیونکہ صرف مدافعت والے بول و براز کو اخبث کہا گیا ہے ہر بول و براز کو نہیں (فتاویٰ ۲/۱۲۸) گویا انسان کے بول و براز کو بھی اخبث۔ نجس و حرام لعینہ نہ قرار دینا چاہیے کیونکہ اس کی خباثت تو صرف مدافعت کی وجہ سے ہے والا فلا۔ کیا اس قسم کی بحث و تحقیق کی توقع حافظ ابن تیمیہؒ ایسے بلند پایہ محدث سے ہو سکتی تھی؟

---

[1] جس طرح پیاسے کے پاس کوئی چیز بجز شراب کے نہ ہو اور پیاس سے مرنے کا خطرہ ہو تو جس مقدار سے جان بچ سکے، پی سکتا ہے، یا گلے میں لقمہ اٹک جائے اور پانی موجود نہ ہو، جان کا خطرہ ہو تو شراب کا گھونٹ جائز ہے اس میں سارے مذاہب کا اتفاق ہے حنفیہ نے جواز تداوی بالمحرم کے تحت تداوی بالخمر کو بھی جائز قرار دیا ہے جبکہ اسی میں شفا متعین ہو یا حاذق طبیب اسی کو آخری علاج تجویز کر دے (امانی الاحبار ۲/۱۰۹)!

[2] حافظ ابن حزمؒ نے دعویٰ کیا کہ تحریم ابوال اور وجوب اجتناب ابوال کے بارے میں نصوص موجود ہیں، لہٰذا ان پر عمل واجب ہے پھر متعدد احادیث ذکر کیں۔

باب کراهیة التعری فی الصلوٰة وغیرها

(نماز میں اور غیرنماز میں ننگے ہونے کی کراہت کا بیان)

(۳۵۴)حدثنا مطربن الفضل قال ثنا روح قال ثنا زکریآء بن اسحاق قال ثنا عمرو بن دینار قال سمعت جابر بن عبدالله یحدث ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان ینقل معهم الحجارة للکعبة و علیه ازاره فقال له العباس عمه' یا ابن اخی لوحللت ازارک فجعلت علیٰ منکبیک دون الحجارة قال فحله فجعله علیٰ منکبیه فسقط مغشیاً علیه فمارأی بعد ذٰلک عریاناً

ترجمہ! حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ کعبہ (کی تعمیر) کے لئے قریش کے ہمراہ پتھر اٹھاتے تھے اورآپ کے جسم پرآپ کی آزار بندھی ہوئی تھی ،تو آپ سے آپ کے چچا عباس نے کہا کہ اے میرے بھتیجے! کاش تم اپنی آزاراتارڈالتے اوراسے اپنے شانوں پر پتھر کے نیچے رکھ لیتے ،جابر کہتے ہیں کہ آپ نے آزارکھول کراسے اپنے شانوں پر رکھ لیا تو بے ہوش ہوکر گر پڑے ،اس کے بعد آپ کبھی برہنہ نہیں دیکھے گئے۔

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔شروع اسلام میں تین چیزیں فرض تھیں۔ایمان،سترِعورت،اورنماز پھر بدن چھپانے کے احکام بہ لحاظِ عمر بھی مختلف ہیں،چھوٹی عمر میں زیادہ سختی نہیں ہے اورحضور علیہ السلام کی عمر بھی اس وقت کم تھی،بعض کتب سیر میں ۲۵ سال لکھی ہے اوربعض میں اس سے بھی کم،اوراس وقت تک آپ کی بعثت بھی نہ ہوئی تھی زمانہ جاہلیت میں سترِعورت کی پروا بھی نہ ہوتی تھی،اورنہ بدن کھُلنے کو معیوب سمجھتے تھے،تاہم اس چھوٹی سی بات پر بھی جوانی دوقتی تھی،حضور علیہ السلام پرغشی طاری ہوگئی اورتنبیہ کردی گئی تاکہ آئندہ اسکا اعادہ نہ ہو کیونکہ انبیاءعلیہم السلام کی تربیت شروع ہی سے حق تعالیٰ کی خاص نگرانی میں ہوتی ہے اوربعث ووحی سے قبل ایسے امور کی اصلاح دوسرے ہی طریقوں پر ہوسکتی تھی،جیسے بچپن میں شق صدر کا واقعہ ہوا کہ شیطان کا حصہ نکال دیا گیا،حالانکہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ابتداء ہی سے آپ کے قلب مبارک میں حظِ شیطان کی تخلیق نہ ہوتی،مگرحق تعالیٰ کواپنی خاص نگرانی وتربیتِ انبیاءعلیہم السلام کا مظاہرہ کرنا تھا اوریہ بھی بتلانا تھا کہ وہ اپنے انبیاءعلیہم السلام کے لئے نبوت کے قبل بھی ان باتوں کو پسند نہیں فرماتے،جونبوت کے بعدنا پسند فرماتے ہیں۔

لہذا ایسے لغزشوں کے دوسرے واقعات بھی جوانبیاءعلیہم السلام سے صادر ہوئے ہیں،اوّل توان کا صدورقبل نبوت وبعثت ہوااوران کا بڑا مقصدحق تعالیٰ کواپنی خصوصی تربیت وتادیب دکھلانی تھی،دوسری ان کا صدور بوجہ سہو ونسیان واضطرار یاکسی تاویل حسن کے تحت ہواہے،جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کہ وہ نسیان وغفلت کا نتیجہ تھی قال تعالیٰ:۔فنسی ولم نجد له عزما،اوراس کومحض تنبیہ وتادیب کے لئے عصیان وغوایت سے تعبیر کیا گیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بظاہر کذبات تاویل حسن کے تحت تھے،حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کے سامنے عریاں ہونا بھی محض ایک وقتی اضطراری صورت تھی،جس کا بڑا فائدہ قوم کے جھوٹے الزام سےان کو ہمیشہ کیلئے بری کرنا تھا،اسی طرح ایسے تمام صحیح واقعات کی عمدہ توجیہات حضرات علماءکرام نے پیش کردی ہیں اور جو باتیں غلط یاضعیف طریقوں سے چنا دی گئی ہیں جیسے شرک فی التسمیہ وغیرہ ان کے جواب وتوجیہ کی ضرورت نہیں،اس کو ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔

بحث ونظر

عصمتِ انبیاءعلیہم السلام

یہ بحث بہت اہم ہے،اورمختلف اقوال ومذاہب کا بیان بھی کتابوں میں منقح طور سے نہیں ہوا ہے نیز اس موقع پر فیض الباری

۱۱/۲ آخری سطر میں جوز واالصغائر کے بجائے جوز واالکبائر چھپ گیا ہے، اس لئے ہم یہاں مذاہب کی تفصیل بھی کرتے ہیں۔ واللہ الموفق!

(۱) **مسلک جمہور!** قبل النبوۃ صغائر وکبائر کا صدور ہوسکتا ہے بعد النبوۃ کبائر کا سہواً اور صغائر کا عمداً ہوسکتا ہے (جبائی اور ان کے اتباع اس کے خلاف ہیں) لیکن کبائر کا صدور بعد النبوۃ عمداً عند الجمہور بالکل ممنوع ہے۔ (مرقاۃ ۱۲۷/۱/ اوشرح شفاء ۲۰۰/۲ کلاہما للملاعلی قاری حنفیؒ)!

ملاعلی قاریؒ نے اسی موقع پر مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں یہ بھی لکھا کہ اگر چہ اکثر اس امر کے خلاف ہیں مگر حق عند المحققین یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبل نبوت و بعد نبوت بھی کبائر وصغائر عمداً وسہواً سب سے معصوم ہیں۔

صاحبِ روح المعانی نے شرح مواقف سے نقل کیا کہ اکثر حضرات نے بعد البعثت سہواً جوازِ صدور کبیرہ کو اختیار کیا ہے، بجز کفر وکذب کے، اور علامہ شریف سے مختار اس کے خلاف نقل کیا۔

پھر لکھا کہ صغائر کا صدور بعد البعثت عمداً بھی جمہور کے نزدیک علامہ تفتازانی نے شرح العقائد میں جائز نقل کیا، برخلاف جبائی واتباع کے، اور سہواً کو بالاتفاق جائز لکھا، لیکن محققین نے شرط کی کہ ایسے فعل پر نبی کو حق تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ضرور ہوتی ہے تاکہ وہ اس سے رُک جائے، البتہ شرح المقاصد میں عمداً صغائر کے صدور سے بھی انبیاء علیہم السلام کو معصوم قرار دیا ہے، الخ (روح المعانی ۲۷/۲۴ ۱۶/۲)!

شرح المواہب ۳۱۴/۵ میں لکھا:۔ مذہب اصح یہ ہے کہ حضور علیہ السلام اور ایسے ہی دوسرے سب انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہیں کبائر وصغائر سے، عمداً بھی اور سہواً بھی، علامہ سبکیؒ نے تبلیغی امور میں حارج کبائر اور دناءت والے صغائر، نیز مدات علی الصغائر سے انبیاء علیہم السلام کے معصوم ہونے پر اجماع نقل کیا ہے، غیر دناءت والے صغائر کے بارے میں اختلاف ہے معتزلہ اور دوسرے بہت سے لوگ ان کو جائز کہتے ہیں، مگر مختار ان کا ممنوع ہونا ہی ہے۔

اوپر کی تفصیل سے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ جمہور میں سے ماتریدیہ اور اشاعرہ کے مابین کیا اختلاف ہے ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درس میں فرمایا کہ جن چند مسائل میں ان دونوں کا واقعی اختلاف ہے، ان میں یہ مسئلہ بھی ہے ماتردیہ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام عمداً کبائر سے قبل النبوۃ و بعد النبوۃ معصوم ہوتے ہیں، اور اشاعرہ صدورِ کبیرہ کو قبل النبوۃ جائز کہتے ہیں، صرف بعد النبوۃ ممنوع مانتے ہیں اور غالباً ملاّ علی قاری وصاحب روح المعانی وشارح المواہب نے اسی مذہب ماتریدیہ کی طرف حق عند المحققین، علامہ شریف کے قول اور شرح المقاصد کی تحقیق سے اشارات کئے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علامہ تقی سبکی شافعیؒ اور علامہ قسطلانی شافعیؒ، اور علامہ زرقانی مالکیؒ نے بھی اس مسئلہ میں ماتریدیہ کا مسلک اختیار کیا ہے اشاعرہ کا نہیں، حالانکہ ماتریدیہ کے مسلک پر چلنے والوں میں شہرت حنفیہ ہی کی ہے اور حنابلہ تو ان کو اچھے القاب سے بھی نہیں نوازتے، حتی کہ حافظ ابن تیمیہؒ بھی اپنے کلام میں بلا مبالاۃ ان کو برا کہتے ہیں (کما نقلہ الشیخ الانورؒ) حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ حنفیہ اگر چہ شیخ ابوالحسن اشعری کو (مسائل کلام وعقائد میں) اپنا امام ومقتدا نہیں مانتے، لیکن بُرا بھی نہیں کہتے، یہ بھی فرمایا کہ متقدمین احناف اپنی نسبت شیخ ابومنصور ماتریدی کی طرف ہی کرتے تھے، لیکن متاخرین احناف دونوں کے اختلاف میں چنداں امتیاز نہیں کرتے، اور مختلط سے مسائل لکھ دیتے ہیں، (جس کی مثال اوپر موجود ہے کہ ملاّ علی قاری حنفی وعلامہ آلوسی حنفی ایسے محققین نے بھی اس امر کی ضرورت نہیں سمجھی کہ حنفیہ ماتریدیہ کی رائے الگ سے منقح کرکے بتلا دیتے، اور اسی لئے ہمیں یہاں تفصیلی کلام کرنا پڑا۔)

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا ارشاد

ہمارے اکابر اساتذۂ دیوبند میں سے حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا:۔ احقر کے نزدیک انبیاء علیہم السلام صغائر وکبائر ہر دو قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، نبوت سے قبل بھی اور بعد بھی اگر چہ میری یہ رائے اقوال اکابر کے خلاف

نظر آتی ہے لیکن بعد تقریر موافق نظر آئے گی الخ یہ مکتوب ترجمان السنہ ۳۵۵/۳ میں نقل کیا گیا ہے وہاں دیکھا جائے نہایت عمدہ تحقیق ہے لیکن اقوال اکابر کے خلاف ہونے کی بات محلِ تامل ہے کیونکہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ حنفیہ وماتریدیہ سب عصمتِ مطلقہ ہی کے قائل ہیں اسی لئے صاحبِ ترجمان نے لکھا:۔فقہائے حنفیہ تقریباً ایک زبان ہوکر مطلقاً عصمت کے قائل ہیں (ترجمان السنۃ ۳۲۸/۳) یہ فقہائے حنفیہ کی تخصیص بھی محلِ نظر ہے جبکہ ہمارے متکلمین حنفیہ بھی (جو سب ماتریدی ہیں) عصمتِ مطلقہ کے قائل ہے،اصل غلطی وہی ہے جس کی طرف حضرت شاہ صاحبؒ نے اشارہ فرمایا ہے کہ متاخرین احناف نے اشاعرہ وماتریدیہ کے نظریات کو مخلوط کردیا ہے حالانکہ ان دونوں کا متعدد مسائل مہمہ میں بہت بڑا فرق ہے مثلاً اسی عصمتِ انبیاء علیہم السلام کے مسئلہ میں اور آگے دوسری مثالیں بھی آئیں گی،ان شاءاللہ تعالیٰ!

(۲) مذہب معتزلہ! قبل نبوت وبعد نبوت بھی کبیرہ عمداً ممنوع ہیں اور صغیرہ (جو نبی کے مرتبہ عالیہ کے خلاف شان نہ ہوں) جائز ہیں جبکہ وہ بھی ماتریدیہ وسبکی وغیرہ کے نزدیک ممنوع ہیں (شرح المواہب ۳۱۴/۵)

(۳) مذہب شیعہ! قبل نبوت وبعدِ نبوت عمداً وسہواً کبیرہ وصغیرہ کا صدور ممنوع ہے (روح المعانی ۴۷/۱۶) جبکہ سہواً صغیرہ کے جوازِ وقوع میں اہل سنت متفق ہیں اور عمداً کو بھی جمہور نے جائز کہا ہے خلافاً للجبائی واتباعہ (شرح الشفاء ۲۰۰/۲)!

(۴) مذہب خوارج! یہ لوگ صدورِ کفر تک کو جائز کہتے ہیں،چہ جائیکہ اس سے کم درجہ کے کبائر معاصی وغیرہ (روح المعانی ۴۷/۱۶)

اشاعرہ وماتریدیہ کا اختلاف

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔شیخ ابومنصور ماتریدیؒ امام محمدؒ کے تین واسطوں سے شاگرد ہیں اور شیخ ابوالحسن اشعریؒ کے ہم عصر ہیں شاید عمر میں اشعری کچھ بڑے ہیں،ان دونوں کا بعض مسائل کلام وعقائد میں اختلاف بھی ہے،شیخ الاسلام محشی بیضاویؒ نے ۲۲ مسائل میں اختلاف گنوایا ہے،جن میں سے بہت سے مسائل میں تو اختلاف لفظی سا ہے مگر کچھ مسائل میں واقعی بھی ہے،جیسے عصمت کا مذکورہ مسئلہ ،دوسرے اہم اختلافی مسئلہ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے اواخر درس بخاری شریف میں **باب ما جاء فی خلق السموات والارض وغیرھا من الخلائق** کے تحت تقریر فرمائی تھی کہ امام بخاریؒ نے یہاں حق تعالیٰ کے لئے صفت تکوین کا اثبات کیا ہے،جس کے قائل ماتریدیہ ہیں،اور اشاعرہ نے اس کا انکار کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں حافظ ابن حجرؒ نے بھی حنفیہ کے مسلک کی تائید کی ہے،حالانکہ ان کے سخت رویہ سے کوئی بھی توقع نہیں کرسکتا کہ کسی مسئلہ میں بھی حنفیہ کی برتری کا اقرار کرسکیں۔

پھر فرمایا:۔اشاعرہ کے نزدیک صفاتِ خداوندی[۱] سات ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سات صفات کے ساتھ قدیم ہے وہ صفات حیاۃ،علم ،قدرت،ارادہ،سمع،بصر وکلام ہیں،ماتریدیہ ان سات کے علاوہ آٹھویں صفت تکوین بھی مانتے ہیں،جس کے تحت احیاء،امات،ترزیق وغیرہ ہیں،پہلی سات کو صفاتِ ذاتیہ کہتے ہیں،جن کی ضد خدا کے لئے ثابت نہیں،اور آٹھویں کے تحت امور کو صفاتِ فعلیہ کہتے ہیں،جن کی

---

[۱] صفاتِ باری سے متعلق لا عین ولا غیر ہونے کی بحث بھی نہایت اہم ہے حضرت الاستاذ العلام مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی سابق شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند،حال صدر مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور دامت فیوضہم نے اپنی گرانقدر تالیف علم الکلام (شائع کردہ مکتبہ کریمیہ ملتان) میں صفاتِ خداوندی سے متعلق نہایت مفصل ومفید بحث کی ہے،اور ۱۱۴ پر لکھا:۔صفاتِ خداوندی نہ عینِ ذاتِ باری ہیں نہ غیر ذات،بلکہ لازم ذات ہیں،جس طرح آفتاب کے نور کو نہ اس کا عین کہہ سکتے ہیں نہ غیر،البتہ وہ اس کو لازم ضرور ہے اسی طرح صفاتِ خداوندی ذاتِ باری کے لئے لازم ذات ہیں،کہ ان صفات وکمالات کا ذاتِ خداوندی سے جدا ہونا ممکن ومحال ہے یہی تمام اہل سنت والجماعت اور ماتریدیہ واشاعرہ کا متفقہ مسلک ہے اور اسی کو امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہ نے مکتوبات میں اختیار فرمایا ہے،اور حکماء وصوفیہ جو غیّیت کے قائل ہوئے ہیں،ان کا شدومد کے ساتھ رد کیا ہے۔

ضد بھی خدا کے لئے ثابت ہے لیکن دونوں قسم قدیم ہیں، البتہ دوسری قسم میں تعلق بالحادث حادث، اشاعرہ نے صفتِ تکوین سے انکار کیا ہے اوران سب امور کو جو اس کے تحت ہوتے ہیں خدا کی صفتِ قدرت وارادہ کے تحت قرار دیا ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ماتریدیہ نے قرآن مجید کی موافقت کی ہے کہ اس میں بھی مستقل طور سے محی وممیت فرمایا گیا ہے راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حافظؒ نے فتح الباری ۸ ۲۷/۱۳ میں صفاتِ ذات بہ تفصیل مذکورہ بالا سات ذکر کیں، اوراحیا اماتت، خلق ورزق، عفووعقوبت کو صفاتِ فعل قرار دیا ہے، اور لکھا کہ یہ سب قرآن مجید واحادیثِ صحیحہ سے ثابت ہیں پھر لکھا کہ بعض دوسرے امور جو نص کتاب وسنت سے ثابت ہیں ان میں سے وجہ، یدعین وغیرہ کا تعلق صفاتِ ذات سے ہے اورنزول، استواء، مجئی وغیرہ صفاتِ فعل سے ہیں، لہذا ان امور کا اثبات بھی ضروری ہے مگر ایسے طریقہ پر کہ حق تعالیٰ کو تشبیہ سے منزہ رکھا جائے۔

صفاتِ ذات ازل سے ابد تک موجود وثابت ہیں اورصفتِ فعل ثابت ہیں مگر بالفعل ان کا وجود ازل میں ضروری نہیں، اللہ تعالیٰ نے خودارشادفرمایا ہے:۔انما امرہ اذااراده شيئا ان يقول له كن فيكون۔

اس کے بعد حافظؒ نے ۳۴۰/۱۳ میں لکھا:۔امام بخاریؒ نے فعل اور مـاينـشـاء عن الفعل میں فرق کیا ہے اوراوّل صفت فاعل وباری کی ہے جو غیر مخلوق ہے، لہذا اسکی صفات بھی غیر مخلوق ہوں گی، لیکن اس کا مفعول جو اس کے فعل کا نتیجہ ہے وہ مخلوق ومکون ہے الخ!

پھر ۳۴۱/۱۳ میں لکھا:۔مسئلہ تکوین متکلمین کی بحث کا مشہور مسئلہ ہے اختلاف ہوا کہ صفتِ فعل کو قدیم کہیں گے یا حادث؟ سلف کی ایک جماعت نے جس میں امام ابوحنیفہ بھی ہیں اس کو قدیم کہا، دوسروں نے جن میں ابن کلاب واشعری ہیں حادث[1] بتلایا، پھر طرفین کے دلائل وجوابات نقل کرکے حافظ نے لکھا کہ امام بخاریؒ کے خاص طرز سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے قول کی موافقت کی ہے اوراس رائے والے نظریہ حوادث لااوّل لھا والی خرابی سے بھی محفوظ ہیں، وباللہ التوفیق!

مکمل بحث اپنے موقع پر آئے گی، یہاں ان دونوں اہم اختلافی مسائل کے مختصر تذکرہ سے یہ بات روشنی میں آ گئی کہ جلیل القدر متکلم اسلام امام ابومنصور ماتریدیؒ نے اکابر ائمہ حنفیہ کے تلمذ کی برکت سے جن مسائل کی تنقیح اشاعرہ کے خلاف کی ہے ان میں نہ صرف بعد کے علماءِ احناف نے ان کا اتباع کیا ہے، بلکہ ان کی تحقیق کو اکابر علمائے شافعیہ اورامام بخاریؒ نے بھی اختیار کیا ہے، اس کے باوجود حافظ ذہبی یا حافظ ابن تیمیہؒ وغیرہ حنابلہ کا ماتریدیہ کے خلاف سخت رویہ اورتشدد موزوں نہ تھا، اس کے بعد ہم دوسرے اہم اختلافی مسائل پر بھی اسی طرح روشنی ڈالیں گے ان شاءاللہ تعالیٰ!

---

[1] صفتِ فعل کو حادث کہنے سے ایک بڑی خرابی یہ لازم آتی ہے کہ حوادث کا قیام وحلول ذات خداوندی کے ساتھ لازم آتا ہے اس اعتراض کا ذکر حافظؒ نے بھی فتح ۳۴۱/۱۳ میں کیا ہے اورحافظ ابن تیمیہؒ کے معتقدات پر جو چند بڑے اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں بھی قیامِ حوادث باللہ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، غالباً اس مسئلہ کو انہوں نے اشاعرہ ہی سے لیا ہوگا، اورماتریدیہ سے کدکی وجہ سے ایک طرف کو ڈھل گئے ہوں گے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کی دوسری اہم لغزشیں یہ ہیں:۔عالم کا قدم نوعی، نفی خلود نار بحق کفار، اللہ تعالیٰ کے لئے حرکت وجہت کا اثبات تجویز استقراء معبود علی ظہر بعوضہ، رجال کے بارے میں غلطیاں (جس پر ایک حنبلی عالم ابوبکر صامتی نے ہی مستقل تالیف کی ہے) زیارۃ قبرانبیاء علیہم السلام کے لئے سفر کو معصیت قرار دینا وغیرہ۔

علامہ کوثریؒ نے مکتبہ ظاہریہ دمشق کی موجودہ بعض قلمی تالیفاتِ حافظ ابن تیمیہؒ سے وہ عبارات بھی نقل کی ہیں، جن سے صراحۃً ذاتِ باری کی تجسیم وتشبیہ لازم آتی ہے (دیکھو مقالات کوثری ۳۱۹ وغیرہ) اسی لئے وہ موصوف اوران کے خاص تلامذہ وتبعین کے بارے میں بہت سخت ہو گئے تھے، اور ہمارے حضرات اساتذہ واکابر میں سے حضرت اقدس مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ بھی درسِ حدیث کے دوران ایسے مسائل پر گزرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ پر سخت نکیر کرتے تھے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے سامنے غالباً وہ قلمی تحریرات نہیں آئیں تاہم وہ بھی انکی جلالتِ قدر کی غیر معمولی مدح کے ساتھ ان کے تفردات پر نکیر کرتے تھے، اور قوی دلائل نقلیہ وعقلیہ کے ذریعہ انکار کرتے تھے، عفا الله عن زلات العلماء كلها. ويوفقنا للسداد والصواب مؤلف

باب الصلوٰة فی القمیص والسراویل والتبان والقباء

(کرتے، پاجامے، اورلنگوٹ اورقبا میں نماز پڑھنے کا بیان)

(۳۵۵)حدثنا سلیمٰن بن حرب قال ثنا حماد بن زید عن ایوب عن محمد عن ابی ھریرة قال قام رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألہ عن الصلوٰة فی الثوب الواحد فقال او کلکم یجدثوبین ثم سال رجل عمر فقال اذاوسع اللہ فاوسعوا جمع رجل علیہ ثیابہ' صلی رجل فی ازارورداء فی ازار و قمیص فی ازارو قباء فی سراویل ورداء فی سراویل و قمیص فی سراویل و قباء فی تبان و قباء فی تبان و قمیص قال و احسبہ قال فی تبان ورداء

(۳۵۶)حدثنا عاصم بن علی قال حدثنا ابن ابی ذئب عن الزھری عن سالم عن ابن عمر قال سال رجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال مایلبس المحرم فقال لایلبس القمیص والاالسراویل ولاالبرنس ولاثوبامسہ زعفران ولاورس فمن لم یجدالنعلین فلیلبس الخفین فلیقطعھما حتی یکونآ اسفل من الکعبین و عن نافع عن ابی عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مثلہ'

ترجمہ! حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی طرف (متوجہ ہوکر) کھڑا ہوااوراس نے آپ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا حکم پوچھا، آپ نے فرمایا، کیاتم میں سے ہر شخص کو دو کپڑے مل جاتے ہیں، پھر ایک شخص نے (یہی مسئلہ) حضرت عمرؓ سے پوچھا توانہوں نے کہا، جب اللہ تعالیٰ وسعت کرے تو تم بھی وسعت کرو (اب) چاہیے، کہ ہر شخص اپنے کپڑے (دودو) پہنے، کوئی ازاراور چادر میں نماز پڑھے، کوئی ازار وقمیص میں، کوئی ازاراور قبا میں، کوئی سراویل اور چادر میں، کوئی سراویل اور قمیص میں، کوئی سراویل اور قبا میں، کوئی تبان اور قبا میں، اورکوئی تبان اورقمیص میں، حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت عمرؓ نے یہ بھی کہا کہ کوئی تبان اور چادر میں!

ترجمہ! حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول خدا ﷺ سے پوچھا کہ محُرم کیا پہنے؟ آپ نے فرمایا نہ قمیص پہنے اور نہ سراویل اور نہ بُرنس اور نہ ایسا کپڑا جس میں زعفران لگ گیا ہو، اور نہ (اس میں) ورس (لگا ہو) پھر جو کوئی نعلین نہ پائے تو موزے پہن لے اوران کو کاٹ دے تاکہ ٹخنوں سے نیچے ہوجائیں، نافع نے حضرت ابن عمرؓ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کے مثل روایت کی ہے۔

تشریح! ترجمۃ الباب اوراحادیث سے بتلایا کہ کرتے، پاجامے، قباء وغیرہ میں کس طرح نماز ہوسکتی ہے اورثابت ہوا کہ کسی خاص کپڑے کی قید صحتِ نماز کے لئے نہیں ہے، حتیٰ کہ سلا ہوا بھی ضروری نہیں، کیونکہ احرام کی حالت میں نہ صرف بغیر سلا ہوا کپڑا استعمال ہوتا ہے بلکہ مردوں کے لئے سلا ہوا کپڑا ممنوع ہے حضرت عمرؓ سے کسی نے سوال کیا کہ نماز میں کون سے کپڑے استعمال کئے جائیں تو فرمایا:۔ جب کسی میں مالی وسعت ہوتو نماز کے وقت بھی اس نعمت وسعت کا اظہار کرے، ورنہ عام طور سے جس طرح لوگ نماز پڑھتے ہیں وہ بھی درست ہے مثلاً تہمد وچادر میں، تہمد وکرتے میں، تہمد وقبا میں، پاجامے وچادر میں، پاجامے وکرتے میں، پاجامے وقبا میں، جانگئے وقبا میں، جانگئے وکرتے میں، جانگئے اور چادر میں۔

مطلب یہ کہ دو کپڑوں میں نماز پڑھے تو تہمد کے ساتھ اوپر کے جسم کے واسطے چادر یا کرتا یا قباء بھی ہو پاجامے کے ساتھ پڑھے تو اس کے ساتھ بھی چادر کرتہ یا قبا ہو، جانگیہ پہنے ہوئے ہو تو اس کے ساتھ قباء کرتہ یا چادر ہو تا کہ ستر پوشی اور بدن پوشی کی رعایت زیادہ سے زیادہ ممکن طریقہ پر ہوسکے۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔ حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ نماز کے وقت کپڑوں کا اہتمام ہونا چاہیے، اورایک کپڑے میں نماز پڑھنا صرف تنگی وافلاس کے وقت ہے اوردو کپڑوں میں بہ نسبت ایک کے افضل ہے۔

قاضی عیاضؒ نے اس بارے میں اختلاف کی نفی کی ہے مگر ابن المنذر کی عبارت سے اختلاف کا ثبوت ملتا ہے، انہوں نے ائمہ سے ایک کپڑے میں جوازِ صلوٰۃ کا ذکر کر کے لکھا کہ بعض حضرات نے دو کپڑوں میں نماز کو مستحب قرار دیا ہے مگر اشہب کی رائے ہے کہ باوجود قدرت و وسعت کے صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھے گا تو وقت کے اندر اعادہ کرے، البتہ وہ ایک کپڑا موٹا اور غف ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں، اور بعض حنفیہ نے بھی شخص مذکور کی نماز کو مکروہ کہا ہے (فتح ۳۲۴/۱)!

محقق عینیؒ نے اس موقع پر عمدہ تنقیح کی اور محدث عبدالرزاق کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مسلک نقل کیا کہ وہ ایک کپڑے میں نماز کو مکروہ کہتے تھے، اور اسکی اجازت کو تنگی کے ابتدائی دور اسلام سے متعلق کرتے تھے جب لوگوں کو زیادہ کپڑے میسر نہ تھے، حضرت ابی بن کعبؓ اسکے خلاف غیر مکروہ کہتے تھے، ان دونوں کے اختلاف کو سن کر حضرت عمرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ صواب وہی ہے جو اُبی نے بتلایا، نہ وہ جو ابن مسعودؓ نے کہا (عمدہ ۲۳۵/۲)!

تحقیق لغات! قمیص:۔ کرتہ، صاحبِ قاموس نے لکھا کہ سوتی کپڑے کی قمیص کہلائے گی اونی کی نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ قمیص کا گریبان نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ سامنے کے گریبان والی موجودہ قمیص اور کرتہ بعد کی چیز ہے۔

قباء:۔ فارسی معرب ہے بعض نے عربی قرار دیا (فتح ۳۲۴/۱) سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو پہنا ہے الخ (عمدہ ۲۳۵/۲) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ سامنے سے کھلا ہوا ہوتا ہے (کوٹ یا بش شرٹ کی طرح) عباء کا مختصر ہے، وہ بڑی ہوتی ہے جس کو چوغہ کر لیا ہے اور اسکو کپڑوں کے اوپر پہنتے ہیں۔

سراویل:۔ پاجامہ فارسی معرب ہے (فتح ۳۲۴/۱) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کا دستور عرب میں نہ تھا، نہ یہ کاٹ تراش وہاں تھی بلکہ ایران سے اس کو لایا گیا، حضور علیہ السلام نے اس کو خریدا ہے مگر پہننا ثابت نہیں ہے!

رداء:۔ چادر (اوپر کی) ازار چادر (نیچے کی) عرف و استعمال میں یہ فرق و امتیاز ہو گیا ہے (عمدہ ۲۳۵/۲)!

تُبان:۔ لنگوٹا، جو پہلوان باندھتے ہیں، اس میں شرمگاہ و سرین کا ستر ہوتا ہے، اور جانگیہ یا انڈرویر بھی تبان ہی ہے جو نیکر کی شکل میں نصف رانوں تک ساتر ہوتا ہے، نیکر گھٹنوں کے قریب تک ہوتا ہے، لنگوٹی، جو صرف شرم گاہ کی ساتر ہوتی ہے وہ سترِ عورت کے لئے جمہور کے نزدیک کافی نہیں کیونکہ بعض نے گھٹنوں کو مفروض السترِ حصہ سے خارج کیا ہے، جیسے مالکیہ اور بعض نے نہیں، تاہم ران و سرین کا ستر ان سب کے نزدیک ضروری ہے لیکن لنگوٹی کے ساتھ بھی اگر تہمد یا چادر ہو تو نماز درست ہو جائے گی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ یہاں عمامہ کا ذکر نہیں ہے، لیکن ہمارے فقہاء لباس صلوٰۃ میں عمامہ کا ذکر بھی کرتے ہیں، میرے نزدیک بلادِ بارِدہ (سرد ممالک) میں نماز بغیر صافہ کے مکروہ ہو گی، اور بلادِ حارہ میں بلا کراہت ہو گی مگر مستحب ہے۔

حضرت اکابر کا ادب! حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر فرمایا کہ حضرات سلف و اکابر سے مساجد و مجالسِ علم وغیرہ کے ادب سے متعلق بہت سے واقعات منقول ہیں، مساجد میں بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے تھے، اور حضرت امام مالکؒ سے جب کوئی علمی سوال کیا جاتا تو اگر فقہی مسئلہ ہوتا تو اسی وقت جواب دیتے، اور حدیث سے متعلق ہوتا تو گھر جا کر غسل کر کے عمدہ لباس پہنتے، خوشبو لگاتے، اور کچھ خوشبو ساتھ لاتے تب مجلس میں بیٹھ کر حدیث سُناتے تھے تا کہ مجلس حدیث کی عظمت ظاہر ہو، ایک مرتبہ کسی نے راستہ میں چلتے ہوئے کسی حدیث کے متعلق استفسار کیا تو نہایت غصہ ہوئے اور فرمایا تم نے بے جا سوال کیا، یہ کوئی حدیث بیان کرنے کی جگہ ہے؟ ایک دفعہ حدیث کا درس دے رہے تھے بچھو نے کئی بار کاٹا مگر اپنی مجلس میں فرق نہ آنے دیا، اور درس پورا کر کے ہی اُٹھے۔

مدینہ طیبہ کے اندر جوتہ پہن کر نہ چلتے تھے کہ کہیں ایسی جگہ جوتہ نہ رکھا جائے جو قدم مبارک رسول خدا ﷺ سے مشرف و معظم ہو چکی

ہو، نہ مدینہ طیبہ کے اندر گھوڑے پر سواری کرتے تھے، قضائے حاجت کے لئے مدینہ طیبہ سے بہت دور جنگل میں تشریف لیجایا کرتے تھے اور اتنا کم کھاتے تھے کہ کئی کئی روز کے بعد باہر جانے کی ضرورت ہوتی تھی، خود ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بھی درس حدیث کے لئے تشریف لے جاتے تو خاص اہتمام فرماتے تھے اور دورانِ درس پان کا استعمال نہ فرماتے تھے جبکہ درس مسلسل کئی کئی گھنٹہ کا بھی ہوتا تھا، حالانکہ پان تمباکو کے ساتھ کھانے کی عادت تھی، تمباکو کی عادت پر انتہائی افسوس بھی کیا کرتے تھے بلکہ ایک بار یہ بھی فرمایا کہ جس نے تمباکو کی عادت ڈلوائی ہے اس کے لئے بددعا کرنے کو جی چاہتا ہے درحقیقت پان میں تمباکو کھانے کی عادت ڈالنا خصوصاً علماء کے لئے نہایت غیر مستحسن فعل ہے، اس سے احتراز کرنے کی پوری سعی کرنی چاہیے، مجھ سے تو حضرت اقدس گنگوہیؒ کے ایک متوسل بزرگ نے یہ بھی نقل کیا کہ حضرتؒ نے فرمایا تھا کہ تمباکو کھانا پینے سے بھی بُرا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم!

قوله اسفل من الكعبين پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ہشام نے امام محمدؒ سے کعبین کے بارے میں سوال کیا تھا تو انہوں نے عظمِ نابت اور جوتہ کا تسمہ باندھنے کی جگہ بتلایا تھا، لیکن نہ تفسیر باب حج سے متعلق تھی، جسکو بابِ وضو میں بے محل نقل کر دیا گیا ہے، یہ ہشام وہی ہیں جن کے پاس امام محمدؒ نے رَیّ جا کر قیام فرمایا تھا، مطلب یہ ہے کہ باب وضو میں کعبین سے مراد پاؤں کے ٹخنے ہوتے ہیں اور ہر باب کی تفسیر الگ الگ ہے۔

بَابُ مَايُستَرُ من العَوْرَةِ

(سترِ عورت کا بیان)

(۳۵۷) حدثنا قتيبة بن سعيد قال ثنا الليث عن ابن شهاب عن عبيدالله ابن عبدالله بن عتبة عن ابى سعيد الخدرى انه قال نهىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الاشتمال الصمآء و ان يحتبى الرجل فى ثوب واحد ليس علىٰ فرجه من شئ

(۳۵۸) حدثنا قبيصة بن عقبة قال حدثنا سفيٰن عن ابى الزناد عن الاعرج عن ابى هريرة قال نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن بيعتين عن اللماس والنباذ وان يشتمل الصمآء و ان يحتبى الرجل فى ثوب واحد

(۳۵۹) حدثنا اسحاق قال ثنا يعقوب بن ابراهيم قال انا ابن اخى ابن شهاب عن عمه قال اخبرنى حميد بن عبدالرحمٰن بن عوف ان اباهريرة قال بعثنى ابوبكر فى تلك الحجة فى مؤذنين يوم النحر نؤذن بمنىً ان لايحج بعدالعام مشرک و لايطوف بالبيت عريان قال حميد بن عبدالرحمٰن ثم اردف رسول الله صلى الله عليه وسلم علياً فامره ان يؤذن ببرآءة قال ابوهريره فاذن معنا على فى اهل منى يوم النحر لايحج بعد العام مشرک و لايطوف بالبيت عريان.

ترجمہ! حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے اشتمالِ صماء سے اور اس طرح کپڑا اوڑھنے سے کہ شرم گاہ کھلی رہے منع فرمایا ہے۔

ترجمہ! حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (دو قسم) کی بیع سے منع فرمایا ہے، لماس اور نباذی اور اسی طرح اشتمالِ صماء سے اور احتباء سے (ان دونوں کے معنی گزر چکے ہیں)!

ترجمہ! حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے امیر حج ہونے کے دن بزمرۂ موذنین بھیجا، تاکہ ہم منٰی

میں یہ اعلان کریں کہ بعد اس سال کے کوئی مشرک حج نہ کرے، اور نہ کوئی برہنہ (ہوکر) کعبہ کا طواف کرے۔ حمید بن عبدالرحمٰن (جو ابو ہریرۃؓ سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں) کہتے ہیں، پھر رسول خدا ﷺ نے (حضرت ابوبکرؓ کے) پیچھے حضرت علیؓ کو بھیجا، اور ان کو حکم دیا، کہ وہ سورتِ براءۃ کا اعلان کریں، حضرت علیؓ نے قربانی کے دن ہمارے ساتھ منیٰ میں لوگوں میں اعلان کیا، کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے، اور نہ کوئی برہنہ (ہوکر) کعبہ کا طواف کرے۔

تشریح! اس باب میں امام بخاریؒ نے بتلایا کہ نماز کی حالت میں اور نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں کن اعضاء کا ستر شرعاً واجب وضروری ہے، حافظؒ کا رجحان یہ ہے کہ اس باب میں صرف خارجِ صلوٰۃ کا حکم بتلانا مقصود ہے مگر محقق عینیؒ نے حکم عام سمجھا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ بخاریؒ کتاب المناسک (۲۰۵) میں فرمایا کہ حنفیہ کے نزدیک حجاب جو داخلِ صلوٰۃ ہے، اسی قدر باہر بھی ہے، چنانچہ اجنبی مرد کے سامنے منہ اور کفین کھولنا درست ہے، رجلین میں اختلاف ہے لیکن شرط یہ ہے کہ فتنہ نہ ہو، پھر متاخرین نے دعویٰ کیا کہ فتنہ ہے لہذا سب کو حرام کر دیا لیکن اصل مذہب وہی تھا اور حضور علیہ السلام نے جو حضرت فضل بن عباسؓ کا منہ خثعمی عورت کی طرف سے پھیر دیا تھا، وہ بھی اس لئے نہیں تھا کہ ان کو دیکھنا ناجائز تھا۔

بیان مذاہب! اگرچہ حنفیہ کے نزدیک حُرہ عورت کے لئے حجاب کا مسئلہ داخل وخارج صلوٰۃ یکساں ہے، لیکن مرد وعورت کے لئے ہر مذہب میں کچھ تفصیلات ہیں، اور داخل وخارج کے احکام بھی الگ الگ درج ہوئے ہیں، اس لئے "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ" وغیرہ سے دونوں حالتوں کے احکام یہاں نقل کئے جاتے ہیں، تاکہ اس بارے میں زیادہ روشنی حاصل ہو۔

مذہبِ حنفیہ! مرد کے لئے واجب السترِ حصّہ نماز وغیر نماز میں ناف سے گھٹنے تک ہے (ناف خارج اور گھٹنہ داخل ستر ہے) حرہ عورت کے لئے تمام بدن اور بال نماز وغیر نماز میں ضروری الستر ہیں، صرف وجہ، کفین وقدمین مستثنیٰ ہیں علاوہ نماز کے محارم عورت کے لئے اس کے سر، سینہ، بازو اور پنڈلیوں کی طرف بھی نظر جائز ہے، پیٹ اور پیٹھ کی طرف نہیں (فتح القدیر کتاب الکراہیۃ ۱۰۳/۸)!

اجنبی مسلمان عورت دوسری مسلمان عورت کا صرف مابین السرہ والرکبہ دیکھ سکتی ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ کہ اتنا حصّہ دیکھ سکتی ہے جتنا ایک مرد اپنے محارم کا دیکھ سکتا ہے، سراج نے اوّل کو اصح کہا (درمختار مع شامی ۳۶۵/۵)!

اجنبی مرد اور کافر عورت، مسلمان عورت کا صرف وجہ وکفین وقدمین دیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ شائبہ اشتہا نہ ہو یا ضرورتِ شرعیہ موجود ہو، ورنہ وہ بھی نہیں، اجنبی عورت کا اجنبی مرد کو بلا ضرورت دیکھنا بھی ممنوع ہے، خصوصاً جبکہ اندیشہ فتنہ ہو۔

مذہبِ شافعیہؒ! داخلِ صلوٰۃ مرد کے لئے واجب السترِ حصّہ بدن ناف سے گھٹنے تک ہے مگر ناف وگھٹنہ خارجِ ستر ہے، نماز سے باہر کا حکم کرنے والے کے اعتبار سے مختلف ہے، محارم ورجال کے واسطے مرد کا مابین السرہ الی الرکبۃ اور اجنبیہ کے لئے اس کا تمام بدن مطلقاً عورت ہے یعنی اجنبی عورت کو کسی اجنبی مرد کا چہرہ وغیرہ بھی دیکھنا جائز نہیں (کہ فتنہ کا اندیشہ ہے)!

اجنبی مرد کے حق میں اجنبی عورت کا وجہ وکفین بھی عورت ہے (کافر عورت یا فاسد اخلاق والی کے لئے نہیں) البتہ گھر کی خادمہ کے وہ اعضاء جو کام کے وقت کھل جاتے ہیں جیسے گردن، باز و وہ عورت نہیں ہیں۔

مذہبِ مالکیہ! داخلِ صلوٰۃ مرد کے لئے مغلظہ عورت (یعنی وہ اعضاء جن کا ستر نہایت ضروری ہے) صرف دونوں شرمگاہ ہیں، باقی قابل ستر اعضاء کو وہ عورتِ مخففہ میں داخل کرتے ہیں، اور حرۃ عورت کے لئے مغلظ اطراف وصدر کے علاوہ اعضاءِ مستورہ کو کہتے ہیں، کہ اطراف وصدر مخففہ ہیں، خارجِ صلوٰۃ مرد کے لئے وہ بھی شافعیہ کی طرح ناظر کے لحاظ سے حکم کرتے ہیں مگر اجنبیہ کیلئے وجہ واطراف کو مستثنیٰ کرتے ہیں، یعنی سر ہاتھ اور پاؤں اجنبی مرد کے دیکھ سکتی ہے، بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، عورت کا قابل ستر حصّہ خلوت میں اور محارم ومسلم

نسواں کی موجودگی میں صرف ناف سے گھٹنوں تک ہے اور اجنبی مرد و غیر مسلمہ عورت کے لئے مسلم عورت کا تمام بدن بجز وجہ و کفین کے عورت ہے، ان دونوں کے لئے وجہ و کفینِ اجنبیہ کی طرف نظر جائز ہے بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

مذہب حنابلہ! داخل صلوٰۃ مرد کے احکام مثل مذہبِ شافعیہ ہیں، عورت کے احکام بھی وہی ہیں البتہ یہ صرف چہرہ کو مستثنیٰ کرتے ہیں، خارجِ صلوٰۃ بھی مرد کے احکام مثل شافعیہ ہیں، البتہ خارجِ صلوٰۃ عورتوں کے بارے میں ان کے نزدیک مسلمہ و کافرہ کا فرق نہیں ہے یعنی مسلمہ عورت کافرہ کے سامنے کشفِ اعضاء کرسکتی ہے، بجز مابین السترو الرکبۃ کے!

افاداتِ انور! مایستر من العورۃ پر فرمایا:۔ تراجم ابوابِ بخاری شریف میں سوسوا سو جگہ مِن آیا ہے، شارحین نے کہیں تبعیضیہ اور کہیں بیانیہ بتایا ہے، ان دونوں کا فرق رضی میں دیکھا جائے، بیانیہ کی صورت میں اطرادِ حکم کیلئے ہوتا ہے، میں نے ہر جگہ تبعیضیہ سمجھا ہے اور اسی لئے بعض جگہ تقریر کر کے سمجھاتا ہوں اور شارحین آرام میں ہیں، یہاں تبعیض کی صورت اس طرح ہوگی کہ عورۃ لغۃ ہر اس شئی کو کہتے ہیں جس سے حیا کی جائے، لہٰذا اس کے افراد میں سے مرد و عورت کے وہ اعضاء بھی ہیں جن کا ستر واجب ہے۔

حج نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ثم اردف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیا'' پر فرمایا فتح مکہ رمضان ۸ھ میں ہوا اور عمرۂ جعرانہ بھی اسی سال میں ہوا ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نویں سال ہجرت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیر الحج بنا کر بھیجا، ان کی روانگی کے بعد سورۂ براءۃ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ آیات بھی آپ حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیج دیتے تو وہ موسمِ حج میں لوگوں کو سنا دیتے، اس پر فرمایا کہ ان کو میرے اہل بیت میں سے ایک شخص لیجا کر سنائے گا، پھر حضرت علیؓ کو بلایا اور فرمایا یہ آیات لے جاؤ اور یوم النحر میں لوگوں کو سُنا دینا، جب وہ منٰی میں جمع ہوں گے حضرت علیؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی ''عضباء'' پر سوار ہو کر روانہ ہوئے، اور حضرت ابوبکرؓ سے ذوالحلیفہ یا عرج کے مقام پر جا ملے، حضرت صدیق اکبرؓ نے پہلے حضور علیہ السلام کی اونٹنی کی آواز پہچانی پھر حضرت علیؓ کو دیکھا تو پوچھا کیا آپ کو حج ادا کرانے کے لئے حضور علیہ السلام نے بھیجا ہے؟ انہوں نے فرمایا نہیں، بلکہ آیاتِ براءۃ پڑھ کر سنانے کو بھیجا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پھر پوچھا آپ امیر ہوں گے یا مامور؟ انہوں نے فرمایا مامور ہوں گا، ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ لوٹے اور حضور علیہ السلام سے دریافت کیا، آیا میرے بارے میں کوئی چیز اتری ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آیاتِ براءت لے کر اترے ہیں اور کہا کہ اس پیام کو آپ خود پہنچائیں گے یا آپ کے اہل بیت میں سے کوئی شخص، محقق عینیؒ نے عمدہ ۲/۲۴۱ میں یہ سب تفصیل سے نقل کر کے لکھا کہ حضرت[1] علیؓ کو الگ سے آیات براءۃ پڑھنے کے حکم میں یہ حکمت تھی کہ ان آیات میں نقضِ عہد کی بات تھی، اور عرب کا دستور یہ تھا کہ کسی

---

[1] یہاں بخاری کی حدیث الباب میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا:۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس (نویں سال ہجرت کے) حج میں دوسرے اعلان کرنے والوں کے ساتھ مجھے بھی حکم دیا کہ منٰی میں نحر کے دن اعلان کردوں اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ بیت اللہ کا طواف بحالت عریانی ہوگا، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو خاص طور سے اعلانِ براءت کے لئے روانہ فرمایا، تو حضرت علیؓ نے بھی ہمارے ساتھ اوپر کی دونوں باتوں کا اعلان فرمایا۔ یہ حدیث بخاری ۲۲۰، ۴۵۱، ۶۲۶، اور ۶۷۱ میں کئی جگہ آئیگی، لیکن ترمذی تفسیر سورۂ توبہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت اس طرح ہے کہ پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو ان امور کے اعلان کرنے کا حکم دیا تھا، پھر حضرت علیؓ کو حکم فرمایا، پھر جب دونوں حضرات نے حج کرلیا، تو حضرت علیؓ نے چار باتوں کا اعلان کیا، اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہر مشرک سے بریٔ الذمہ ہے، صرف چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے، اس سال کے بعد کوئی مشرک حج بیت اللہ کے لئے نہ آسکے گا، کوئی شخص عریانی کی حالت میں طواف نہ کرے گا، جنت میں صرف مومن ہی داخل ہوں گے، حضرت علیؓ اعلان کرتے تھے، اور جب وہ تھک جاتے تھے تو حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہو کر ان ہی باتوں کا اعلان کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت علیؓ الگ الگ باتوں کے اعلان پر مامور تھے مگر ان حضرات اور دوسرے صحابہ نے تبلیغ و اعلانِ احکام مذکورہ میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم مؤلف!

عہد کا نقض وہی کرسکتا تھا جس نے وہ عہد باندھا ہو، یا پھر کوئی شخص اس کے اہل بیت میں سے کرسکتا تھا، اس لئے حضور علیہ السلام نے چاہا کہ نقض عہد کی بات دوٹوک ہوجائے، اور کسی کوئی نکالنے کا موقع ہاتھ نہ آئے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ سورۂ براءۃ میں چونکہ حضرت صدیق اکبرؓ کا ذکر تھا، ثانی اثنین اذھما فی الغار اس لئے مناسب ہوا کہ اس کو دوسرا آدمی پڑھ کر سنائے۔

ادائیگی حج میں تاخیر

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ـ حج کی فرضیت چھٹے سال ہوئی یا نویں سال، دوقول ہیں تاہم حضور اکرم ﷺ نے نویں سال میں خود حج کیوں نہیں کیا، جبکہ حج فرض کا جلد ادا کرنا ہی مطلوب ومحبوب ہے اگرچہ وجوب فوری نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ لوندلگا کر مہینوں کو آگے پیچھے کردیا کرتے تھے، جسکو قرآن مجید میں نسئی سے تعبیر کیا گیا ہے، اس فعل شنیع کی وجہ سے ایام حج بھی ذوالحجہ سے نکل جاتے تھے، نویں سال میں ایسی ہی صورت تھی کہ حج اپنے خاص مہینوں میں ادا نہیں ہوا تھا، دسویں سال میں حج ٹھیک اپنے مہینوں میں آگیا تھا، اسی لئے آپ نے اسی سال کیا۔

ناممکن الاصلاح غلطیاں

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی غلطیاں جن کی اصلاح متعذر ودشوار ہو، ان کے بارے میں مسامحت ہوسکتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے نویں سال حج کیا ان کا حج بھی یقیناً معتبر ہوا ہے کیونکہ کسی کو بھی اسکی قضا کا حکم نہیں دیا گیا۔

زمانۂ حال کے بعض غلط اعتراضات

اس زمانہ میں بھی بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ سعودی عرب حکومت نے فلاں سال میں رؤیت ہلال ذی الحجہ کا فیصلہ فلاں فلاں وجوہ سے غلط کیا ہے اوّل تو اس قسم کی باریکیاں نکالنا اور ان کو اخبارات ورسائل میں شائع کرنا مناسب وموزوں نہیں کہ عوام پر اس کے بُرے اثرات ہوتے ہیں اور اوپر کی تحقیق سے تو معلوم ہوا کہ اگر واقع میں بھی کوئی غلطی کسی وجہ سے واقع ہوگئی ہو تو اس سے مسامحت ہونی چاہیے، خصوصاً حج جیسی معظم عبادت کو جو نہایت دشواریوں اور غیر معمولی مالی وجانی قربانیوں کے ساتھ عمر میں ایک بار ادا کرنے کی نوبت آتی ہے، مشکوک ومشتبہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کیونکر مستحسن ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ مفید وصالح خدمات کی توفیق عطا فرمائے اور لایعنی امور سے محفوظ رکھے، امین!

بَابُ الصَّلٰوۃ بِغَیْرِ رِدَآءٍ

(بغیر چادر کے نماز پڑھنے کا بیان)

(۳۶۰) حدثنا عبدالعزیز بن عبداللہ قال حدثنی ابن ابی الموال عن محمد بن المنکدر قال دخلت علیٰ جابر بن عبداللہ و ھو یصلی فی ثوب واحد ملتفابه و ردآء ہ موضوع فلما انصرف قلنا یآاباعبداللہ نصلی وردآءک موضوع قال نعم احببت ان یرانی الجھال مثلکم رایت النبی صلی اللہ علیه وسلم یصلی کذا.

ترجمہ! محمد بن منکدر روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت جابر بن عبداللہ کے پاس گیا، وہ ایک کپڑے میں التحاف کئے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور اُن کی چادر رکھی ہوئی تھی، جب وہ فارغ ہوئے تو ہم نے کہا، کہ اے ابوعبداللہ! آپ نماز پڑھ لیتے ہیں اور آپ کی چادر (علیحدہ) رکھی رہتی ہے، انہوں نے کہا ہاں! میں نے چاہا کہ تمہارے جیسے جاہل مجھے دیکھیں (سنو) میں نے نبی کریم ﷺ کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا تھا۔

تشریح! حضرت اقدس مولانا گنگوہی قدس سرہٗ نے فرمایا:۔ حضرت جابرؓ نے ایک کپڑے میں بغیر چادر کے نماز اس لئے پڑھی کہ تعلیم مقصود تھی، کیونکہ عام لوگ سنن و آداب اور مستحباب کے ساتھ بھی واجب و فرض جیسا معاملہ کرتے ہیں (حالانکہ ہر ایک کو اپنے اپنے مرتبہ میں رکھنا چاہیے) لہذا تعلیم ضروری تھی، اور بہ نسبت محض قول کے عملی تعلیم سے زیادہ فائدہ ہوا کرتا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے فرمایا کہ اس سے حضرتؒ نے یہ اعتراض دفع کیا ہے کہ ایک کپڑے میں نماز اگر جائز بھی تھی، تب بھی خلاف اولیٰ تو ضرور ہی تھی، خصوصاً جبکہ کئی کپڑے موجود ہوں جیسا کہ روایت میں ہے کہ حضرت جابرؓ کی چادر پاس ہی رکھی تھی، اس کا جواب دیا گیا کہ تعلیم کی غرض سے اولیٰ کا ترک اختیار کیا ہے (لامع ۱۴۵/۱)

باب ما یذکر فی الخذ قال ابو عبد الله ویرویٰ عن ابن عباس جرھد ومحمد بن حجش عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الفخذ عورۃ وقال انس جسر النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن فخذہ قال ابو عبد اللہ وحدث غطی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رکبتیہ حین دخل عثمان وقال زید بن ثابت انزل اللہ علی رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم وفخذہ علی فخذی فثقلت علی حتی خفت ان ترض فخذی

(ران کے بارے میں جو روایتیں آئی ہیں، ان کا بیان (یعنی اس کا چھپانا ضروری ہے یا نہیں) امام بخاریؒ کہتے ہیں، ابن عباس اور جرہد اور محمد بن جحش کی روایت نبی علیہ السلام سے یہ ہے کہ ران عورت ہے، انس کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی علیہ السلام نے اپنی ران کھول دی تھی ابوعبداللہ کہتا ہے انس کی حدیث قوی السند ہے اور جرہد کی حدیث میں احتیاط زیادہ ہے کہ علماء کے اختلاف سے باہر ہو جاتے ہیں، ابوموسیٰ کہتے ہیں، جب عثمان آئے تو نبی علیہ السلام نے اپنے گھٹنے چھپا لئے، اور زید بن ثابت کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) اللہ نے اپنے رسول علیہ السلام پر وحی نازل کی، اور آپ کی ران میری ران پر تھی پس وہ مجھ پر بھاری ہوگئی، یہاں تک کہ مجھے اپنی ران کی ہڈی ٹوٹ جانے کا خوف ہونے لگا۔)!

(۳۶۱) حدثنا یعقوب بن ابراھیم قال نا اسماعیل بن علیہ قال اخبرنا عبدالعزیز بن صھیب عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزا خیبر فصلینا عندھا صلوٰۃ الغداۃ بغلس فرکب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ورکب ابو طلحۃ و انا ردیف ابی طلحۃ فاجری نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی زقاق خیبروان رکبتی لتمس فخذنبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم حسر الازار عن فخدہ حتی انی انظر الیٰ بیاض فخذنبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما دخل القریۃ قال اللہ اکبر خربت خیبر انا اذانزلنآ بساحۃ قوم فسآء صباح المنذرین قالھاثلاثاً قال وخرج القوم الیٰ اعمالھم فقالوا محمدا قال عبدالعزیز وقال بعض اصحابنا والخمیس یعنی الجیش قال فاصبناھا عنوۃً فجمع السبی فجآء دحیۃ فقال یا نبی اللہ اعطنی جاریۃً من السبیء فقال اذھب فخذجاریۃً فاخذ صفیۃ بنت حی فجآء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا نبی اللہ اعطیت دحیۃ بنت حی سیدۃ قریظۃ والنضیر لاتصلح الا لک قال ادعوہ بھافجآء بھا فلما نظر الیھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال خذجاریۃً من السبی غیرھا قال فاعتقھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتزوجھا فقال لہ ثابت یآ باحمزۃ ماصدقھا قال نفسھا اعتقھا و تزوجھا حتی اذا کان بالطریق جھزتھالہٗ ام سلیم فاھدتھالہٗ من اللیل فاصبح النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وسلم بالطریق جھزتھالہٗ ام سلیم فاھدتھالہٗ من اللیل فاصبح النبی صلی اللہ علیہ وسلم **عروساً فقال**

من كان عنده شيئ فليجئ به و بسط نطعاً فجعل الرجل يجئ بالتمر و جعل الرجل يجئ بالسمن قال واحسبه' قدذكر السويق قال فحاسوا حيساً فكانت وليمة رسول الله صلى الله عليه وسلم

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ سے رایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے خیبر کی طرف جہاد کیا، تو ہم نے صبح کی نماز خیبر کے قریب اندھیرے میں پڑھی، پھر نبی کریم ﷺ سوار ہوئے، اور ابوطلحہ (بھی) سوار ہوئے، اور میں ابوطلحہ کا ردیف تھا، نبی کریم ﷺ خیبر کی گلیوں میں چلے جارہے تھے، اور میرا گھٹنا نبی کریم ﷺ کی ران سے مس کرتا جاتا تھا، آپ نے آزار اپنی ران سے ہٹادی، یہاں تک کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی ران کی سپیدی کو دیکھ لیا، پھر آپ بستی کے اندر داخل ہو گئے، تو آپ نے فرمایا اَللّٰہُ اَکْبَرُ خَرِبَتْ خَیْبَرُ اِنَّا اِذَا اَنْزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِیْنَ تین بار فرمایا، حضرت انسؓ کہتے ہیں (بستی کے) لوگ اپنے کاموں کیلئے نکلے تو انہوں نے کہا ﷺ (آگئے) [عبدالعزیزؒ کہتے ہیں، ہمارے بعض دوستوں نے کہا ہے (کہ ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ) اور خمیس یعنی لشکر (بھی آگیا)] چنانچہ ہم نے خیبر کو بزور (شمشیر) حاصل کیا، پھر قیدی جمع کئے گئے، تو دحیہ آئے اور انہوں نے کہا کہ یا نبی اللہ! آپ نے صفیہ بنت حیی (قبیلہ) قریظہ اور نظیر کی سردار خاتون، دحیہ کو دے دی، وہ آپ کے سوا کسی کے قابل نہیں ہیں، آپ نے فرمایا، ان کو مع صفیہ کے لے آؤ، جب نبی کریم ﷺ نے صفیہ کی طرف نظر کی تو فرمایا کہ ان کے علاوہ کوئی اور لونڈی قیدیوں میں سے لے لو، حضرت انسؓ کہتے ہیں، پھر نبی کریم ﷺ نے صفیہ کو آزاد کر دیا اور ان سے نکاح کر لیا، ثابت نے حضرت انسؓ سے کہا کہ اے ابوحمزہ رسول خدا ﷺ نے صفیہ کا مہر کیا باندھا تھا؟ انسؓ نے کہا کہ یہ آزاد کر دینا ہی ان کا (مہر قرار پایا) یہاں تک کہ اثنائے راہ ہی میں ام سلیمؓ نے صفیہ کو آپ کے لئے دلہن بنایا، اور شب کو آپ کے پاس بھیجا، صبح کو نبی کریم ﷺ دلہا تھے، پھر آپ نے فرمایا، جسکے پاس جو کچھ ہو، وہ اسے لے آئے، اور آپ نے ایک چمڑے (کے دسترخوان) کو بچھا دیا کوئی چھوہارے لایا، اور کوئی گھی لایا (عبدالعزیز) کہتے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت انسؓ نے ستو کا بھی ذکر کیا، الغرض ان لوگوں نے حیس بنایا اور یہی رسول خدا ﷺ کا ولیمہ تھا!

تشریح! حسب تصریح و تحقیق محقق عینیؒ امام بخاری نے ران کے واجب الستر ہونے نہ ہونے کا کوئی فیصلہ اپنی طرف سے نہیں کیا، اسی لئے انہوں نے باب الفخذ عورة یاباب الفخذ لیس بعورة نہیں کہا، بلکہ باب مایذ کر فی الفخذ کہا ہے، بعض کو مذہب فخذ کے عورت ہونے کا تھا جو حدیث جرہدؓ سے استدلال کرتے تھے، دوسرے اس کے خلاف تھے اور حدیث انسؓ سے استدلال کرتے تھے، اس پر ایک اصولی سوال کھڑا ہو گیا کہ اصل تو یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں دو حدیث مروی ہوں اور ان میں ایک اصح (صحیح تر) ہو بہ نسبت دوسری کے، تو عمل اصح کے مطابق ہونا چاہیے، اور اس بارے میں اختلاف نہ ہونا چاہیے، اس کا امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ سند کی رو سے تو حدیث انسؓ ہی اقوی واحسن ہے، مگر تعامل حدیث جرہد پر ہوا اسلئے کہ اس میں ایک امر دینی کے لئے تقویٰ واحتیاط کا پہلو زیادہ ہے اور اس میں اختلافی امر سے نکلنے کی بھی صورت ہے، اس کے بعد علامہ عینیؒ نے اختلاف کی تفصیل نقل کی۔

بیان مذاہب! آپ نے لکھا:۔ جو لوگ ران کو واجب الستر نہیں قرار دیتے وہ یہ ہیں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب، اسماعیل بن علیہ، محمد بن جریر طبری، داؤد ظاہری، امام احمد (ایک روایت میں) اصطخری (اصحاب شافعی میں سے) ابن حزم۔

دوسرے حضرات جو ران کو واجب الستر بتلاتے ہیں یہ ہیں:۔ جمہور علماء تابعین اور بعد کے حضرات مثلاً امام ابوحنیفہ امام مالک (اصح اقوال میں) امام شافعیؒ امام احمدؒ (اصح الروایتین میں) امام ابویوسف، امام محمد، امام زفر، امام اوزاعی (عمدہ ۲/۲۴۳)!

ابن بطال مالکیؒ نے لکھا:۔ اہل ظاہر صرف دونوں شرم گاہوں کو واجب الستر کہتے ہیں، امام شافعی و مالکؒ مابین السرة والركبة کو واجب الستر کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ وامام احمد گھٹنے کو عورت قرار دیتے ہیں،

علامہ قسطلانی شافعیؒ نے کہا:۔ جمہورِ تابعین اور امام ابوحنیفہ، امام مالک (اصح اقوال میں) امام شافعی، امام احمد (اصح الروایتین میں) امام ابو یوسف و امام محمدؒ فخذ کو عورت کہتے ہیں، داؤد ظاہری، امام احمد (ایک روایت میں) اصطخری (شافعیہ میں سے) اور ابن حزم اسکو عورت قرار نہیں دیتے۔

علامہ موفق حنبلیؒ نے کہا:۔ صالح مذہب یہی ہے کہ ناف و گھٹنے کے درمیان عورت ہے ایک جماعت کی روایت سے امام احمدؒ کی یہی تصریح منقول ہے اور یہی قول مالک، شافعی، ابی حنیفہ اور اکثر فقہاء کا ہے، صرف فرجان کو عورت داؤد ظاہری نے کہا ہے، ناف و گھٹنہ امام احمد، شافعی و مالک کے نزدیک عورت میں داخل نہیں ہے امام ابوحنیفہؒ گھٹنے کو بھی عورت مانتے ہیں (لامع ۱/۱۴۴)!

علامہ نووی شافعیؒ نے لکھا:۔ اکثر علماء نے فخذ کو عورت قرار دیا ہے، امام احمد و مالکؒ نے (ایک روایت میں) صرف قبل و دبر کو عورۃ کہا، اور یہی قول اہل ظاہر اور ابن جریر و اصطخری کا بھی ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اِس کو نقل کر کے لکھا کہ ابن جریر کی طرف مذکورہ نسبت محل نظر ہے کیونکہ انہوں نے تہذیب[۱] الآثار میں ان لوگوں کا رد کیا ہے جو فخذ کو عورۃ نہیں کہتے (فتح الباری ۱/۳۲۷)!

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا:۔ امام شافعی و ابوحنیفہؒ فخذ کو عورت قرار دیتے ہیں، رکبہ میں دونوں کا اختلاف ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک فخذ عورت نہیں ہے، اس بارے میں احادیث متعارض ہیں اور قوۃ من حیث الروایۃ مذہب مالک کو حاصل ہے (شرح تراجم ابواب البخاری ۲۰)

محقق ابن رشد مالکیؒ نے لکھا:۔ امام مالک و شافعی و ابوحنیفہ مرد کے لئے حد عورۃ **مابین السرۃ الی الرکبۃ** قرار دیتے ہیں، کچھ لوگ صرف دونوں شرم گاہ کو عورۃ کہتے ہیں، اور بعض لوگ ان کے ساتھ ران کو بھی عورۃ سے خارج کرتے ہیں (بدایۃ المجتہد ۱/۹۸)

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب

اوپر کی تفصیل سے جہاں محدث ابن جریر طبری کے بارے میں مغالطہ رفع ہوا ہے اسی طرح امام مالکؒ کے بارے میں بھی رفع ہو جانا چاہیے، کیونکہ ابن رشد مالکیؒ نے تینوں ائمہ کا ایک ہی مذہب نقل کیا اور دوسرے اقوال بغیر تصریح نام کے کچھ لوگوں کے بتلائے، دوسرے حضرات نے بھی امام مالک کا اصح الاقوال موافق امام ابوحنیفہ و شافعی کے قرار دیا ہے، لہذا شاہ ولی اللہؒ کا امام[۲] مالکؒ کے بارے میں مطلقاً فخذ کے عورۃ نہ ہونے کا مذہب نقل کرنا اور پھر اس کو من حیث الروایۃ قوی بھی کہنا خلافِ تحقیق ہے، اسلئے کہ حسبِ تصریح محدث طبریؒ وغیرہ صورتِ واقعہ اس کے برعکس ہے اور اس کی تفصیل ہم آگے عرض کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دلائل جمہور! علامہ محدث موفق حنبلیؒ نے لکھا:۔ محدث خلال نے اپنی سند سے اور امام احمدؒ نے اپنے مسند میں جرہدؓ سے رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا **غط فخذک** الخ اپنی ران کو مستور رکھو کیونکہ وہ عورۃ ہے، دارقطنی میں حضور علیہ السلام کا ارشاد حضرت علیؓ کے لئے ہے **لاتکشف فخذک** الخ اپنی ران کسی کے سامنے نہ کھولنا اور نہ کسی زندہ یا مردہ کی ران پر نظر ڈالنا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ناف سے نیچے اور گھٹنوں سے اوپر کا حصّہ عورۃ ہے، دارقطنی میں ہے کہ ناف سے گھٹنے تک عورۃ ہے، اس کی طرف نظر نہ کرنا چاہیے (لامع ۱۴۵)

---

[۱] آپ نے اس میں لکھا:۔ جن روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے تو آپ کی ران کھلی ہوئی تھی وہ سب کمزور اسانید کی ہیں، جن سے استدلال نہیں ہوسکتا، اور جو روایات ران کو مستور کرنے کا امر کرتی ہیں اور اس کے کھولنے کو ممنوع قرار دیتی ہیں، وہ سب صحاح ہیں۔ الخ (عمدہ ۲/۲۴۴)

[۲] فیض الباری ۲/۱۵ میں جو مذہب امام مالکؒ نقل ہوا ہے وہ بھی ناقص یا ناسخین کی زلۂ قلم کا نتیجہ ہے، اور امام بخاریؒ کے بارے میں بہتر تحقیق علامہ عینیؒ ہی کی معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے دوٹوک فیصلہ فخذ کے عورۃ ہونے یا نہ ہونے کا نہیں کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ احوط کا اطلاق تعارضِ ادلہ کے موقع پر واجب کے اوپر بھی ہوتا ہے، جس کی تفصیل آخر کتاب الغسل میں گزر چکی ہے لہذا امام بخاریؒ کا اس مسئلہ میں جمہور کے موافق ہونا بھی بہت ممکن ہے، واللہ تعالیٰ اعلم! "مؤلف"!

امام بخاریؒ نے زیر بحث ترجمۃ الباب میں پہلے حضرت ابن عباس، جرہد ومحمد بن جحش سے تعلیقاً رسول اکرم ﷺ سے ''الفخذ عورۃ'' کی روایت کی، اس کے بعد حضرت انسؓ والی حدیث کو موصولاً لائے ہیں۔

محقق عینیؒ نے لکھا:۔ پہلی حدیث ابن عباسؓ کو امام ترمذی نے موصولاً روایت کیا ہے اور اسکی تحسین کی، دوسری حدیثِ جرہد کی امام مالکؒ نے کی اور امام ترمذی نے بھی موصولاً روایت کر کے تحسین کی۔ ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں اس کی تصحیح وتخریج کی ہے (ورواہ ابوداؤد واحمدؒ) تیسری حدیث محمد بن جحش کی روایت طبرانی میں موصولاً موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے معمرؓ کو فرمایا اپنی رانوں کو ڈھانک لو کیونکہ وہ دونوں عورۃ ہیں،

اس روایت کی تخریج امام احمدؒ نے اپنی مسند میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں بھی کی ہے (عمدہ ۲۴۲/۱)!

علامہ قرطبی مالکیؒ نے فرمایا:۔ حدیث انسؓ پر حدیث جرہد کو وجہ ترجیح حاصل ہے کیونکہ اسکے معارض جو بھی احادیث ہیں، ان کا تعلق خاص واقعات واحوال سے ہے، جن میں احتمال حضور علیہ السلام کی خصوصیت کا بھی ہوسکتا ہے، اور اس امر کا بھی کہ پہلے حکم میں نرمی چلی آرہی تھی، اسکے بعد فخذ کے عورۃ ہونے کا حکم ہوا ہو، برخلاف اسکے حدیثِ جرہدؓ وغیرہ میں کوئی احتمال نہیں ہے کہ وہ حکم کلی ہے (عمدہ ۲/۲۴۴) دوسرے وہ حدیث قولی ہیں جو فعلی پر مقدم ہوتی ہیں اس کے بعد علامہ عینیؒ نے حدیثِ مرد یہ امام طحاوی ذکر کی اور اسکا جواب بھی امام طحاوی کی طرف سے نقل کیا ہے اور عینیؒ نے حدیث انسؓ کا یہ جواب دیا کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر جو حسر یا انحسار فخذ نبوی کا ہوا ہو وہ غیر اختیاری اور اضطراری تھا، یعنی اژدہام یا سواری کے دوڑنے کی وجہ سے پیش آیا ہے قصہ حضرت عثمانؓ کا یہ جواب دیا کہ اس حدیث میں اضطراب ہے کیونکہ ایک جماعت اہل بیت نے اس کی روایت دوسرے طریقہ پر کی ہے جس میں فخذین کے کھلنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، علامہ عینیؒ نے کہا کہ علامہ بیہقی نے بھی امام شافعیؒ سے کشفِ فخذین کا مشکوک ہونا نقل کیا ہے اور مسلم کی روایت میں بھی راوی نے، فخذیہ اور ساقیہ شک کے ساتھ روایت کیا ہے، ابوعمر نے بھی اس حدیث کو مضطرب کہا ہے (عمدہ ۲/۲۴۴)!

بحث مراتب اِحکام

یہ بحث انوارالباری جلد چہارم (قسط ششم) ۱۶۹ میں گزر چکی ہے اِس موقع پر بھی حضرت شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں گرانقدر ارشادات سے بہرہ ور فرمایا، ان کا کچھ خلاصہ مزید افادہ کے لئے یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

فرمایا:۔ جس طرح فرائض وواجبات میں بعض زیادہ آکد واہم ہیں دوسروں سے اسی طرح ممنوعات ومکروہات شرعیہ میں بھی مراتب ودرجات ہیں، اور بعض میں زیادہ شدت ہے بہ نسبت دوسروں کے، اسی سے سترِ عورت استقبال واستدبار، نواقضِ وضوء میں خارج من السبلیین ومن غیر السبیلین، مس مراۃ، مس ذکر وغیرہ مسائل ہیں اور سب میں خفت وشدت کے مراتب شارع علیہ السلام ہی کی طرف سے ہیں، یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ران کے اوپر کا حصّہ اور نچلا حصّہ گھٹنے کے قریب کا دونوں ہی عورۃ میں داخل ہیں مگر دوسرا پہلے سے اخف اور کم درجہ کا ہے اور اسی کے لحاظ سے ران کے بارے میں طرفین کے پاس دلائل ہیں، ورنہ اصلِ فخذ (اوپری حصّہ) کے بارے میں کوئی دلیل بھی اس کے عورۃ نہ ہونے کی موجود نہیں ہے۔

بحث تعارض ادلہ

دوسری بات یہ ہے کہ بعض مرتبہ شارع کی طرف سے قصداً مختلف نوعیت کے احکام صادر ہوتے ہیں اور اس کو اختلافِ رواۃ کے سبب نہ سمجھنا چاہیے اور یہ اسی جگہ ہوتا ہے جہاں صاحب شرع کو مراتب کا بیان ملحوظ ہوتا ہے، اور جہاں ایسا ہوتا ہے تو شارع کی طرف سے امرونہی میں ظاہری سطح تو شدت کی طرف ہوتی ہے تاکہ عمل میں کوتاہی نہ ہو، اور تخفیف وتوسیع کے لئے ضمنی اشارات ہوتے ہیں اور اسی سے امام اعظمؒ نے

تعارضِ ادلہ کے وقت تخفیف کی رائے قائم کی ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک خفتِ حکم کا ثبوت اختلاف صحابہ و تابعین کی وجہ سے ہوتا ہے۔

امام صاحبؒ کی دقیق نظر تعارضِ ادلہ کی وجہ سے مراتب احکام کے تفاوت کی طرف گئی اور صاحبین نے تعامل سے فیصلہ کرنا چاہا، صاحبِ[1] ہدایہ نے بھی خفت کو تعارضِ ادلہ ہی کی وجہ سے بتلایا ہے اور تعارض ادلہ کی صورت چونکہ اختلافِ رواۃ کی صورت میں پیش آتی ہے اس لئے اس کو موجبِ خفت سمجھ لیا گیا، حالانکہ نظر شارع میں شروع ہی سے خفت مقصود تھی، حضرت شاہ صاحبؒ نے باب اتباع النساء الجنازہ میں نہینا عن اتباع الجنائز ولم یعزم علینا الخ پر فرمایا:۔ یہاں بھی مراتبِ احکام کی طرف اشارہ ہے کہ نہی تو ہے مگر نہی عزم نہیں ہے، ان مراتب کو بہت سے علماء بھی نہیں سمجھ سکتے، لیکن حضور اکرم ﷺ کے زمانہ مبارکہ کی عام عورتوں کی بھی آپ کی برکتِ صحبت کے باعث اتنی فہم و ذکاوت تھی کہ اہل علم پر سبقت لے گئیں۔

قولہ وغطی النبی صلے اللہ علیہ وسلم رکبتیہ الخ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ممکن ہے کپڑا گھٹنے کے قریب تک ہو جب حضرت عثمانؓ اندر پہنچے تو حضور علیہ السلام نے اس کپڑے کو گھٹنے سے نیچے تک کر لیا ہو، تعبیرات میں ایسا بہت ہوتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ دوسروں کے سامنے گھٹنے ڈھانکنے کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا، اور یہی اس کے عورت میں سے ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے جو حنفیہ کا مذہب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

قولہ وفخذہ علی فخذی، حضرتؒ نے فرمایا:۔ اس میں یہ ذکر نہیں کہ ران کھلی ہوئی بھی تھی، اس لئے ممکن ہے امام بخاریؒ کا مقصد صرف یہ بتلانا ہو کہ ران کی بات اعضاءِ غلیظہ شرم گاہ وغیرہ کی طرح نہیں ہے کہ کپڑے کے ساتھ بھی ان کا مس جائز نہیں ہوتا بلکہ اگر کپڑے پہنے ہوئے ایک کی ران دوسرے کی ران سے مس کرے تو وہ شرعاً حدِ جواز میں ہے۔

قولہ خفت ان ترض فخذی پر فرمایا:۔ یعنی وحی کے بوجھ سے میری ران چکنا چور ہو جانے کے قریب ہو گئی، یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ وحی الٰہی کا بوجھ حضور علیہ السلام کی اونٹنی ''قصواء'' کے سوا اور کوئی نہ اٹھا سکتا تھا شاید اس لئے کہ وہ اس کی عادی ہو گئی تھی، اور اس امر سے اس کو خاص مناسبت ہو گئی تھی، دوسری اونٹنیاں وحی کے وقت بیٹھ جاتی تھیں۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو صوت وحی سے مناسبت ہو گئی تھی اسی لئے وہ اس کو سن سکتے تھے، ان کے سوا کوئی دوسرا اس کو نہ سن سکتا تھا۔

قولہ بغلس فرمایا:۔ راوی کا تغلیس کو خاص طور سے ذکر کرنا، گویا اس کو نئی سی بات سمجھنے کے مترادف ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی عام عادت شریفہ غلس میں نماز صبح ادا کرنے کی نہ تھی، پھر یہ کہ ایسا کرنا غزوہ کی وجہ سے تھا کہ نماز سے جلد فارغ ہو کر جہاد میں مشغول ہوں نہ اس لئے کہ نماز کی سنت وہی تھی، دوسرے یہ کہ غلس میں ادا کرنے سے اس وقت تقلیل جماعت کا خوف نہ تھا کیونکہ سفر کی حالت میں تھے اور سب صحابہ ایک جگہ موجود تھے ایسے وقت حنفیہ بھی یہی تعلیم کرتے ہیں۔ اس موقع پر حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر سو دفعہ بھی حضور علیہ السلام کا غلس میں نماز صبح پڑھنا ثابت ہو جائے تب بھی حنفیہ کو مضر نہیں ہے البتہ مضر جب ہے کہ ان کے پاس اسفار کے لئے کوئی حدیث نہ ہو حضرتؒ نے فرمایا:۔ اگلے باب میں آئے گا فشھد معہ نساء من المومنات متلفعات فی مروطھن ثم یرجعن الی بیوتھن ما یعر فھن احد، فشھد کا صیغہ مذکر لانا اس لئے صحیح ہو گیا کہ فعل اور فاعل میں فصل ہے۔

متلفعات، گھونگھٹ نکالے ہوئے، مروط اونی چادر (حاشیہ بخاری ص ۵۴) میں مرط کے معنی ریشمی یا اونی چادر اور بڑی چادر کے نقل

---

[1] ہدایہ ۵۹/۱ (باب الانجاس) میں ہے:۔ انما کانت نجاسۃ ھذہ الا شیاء مغلظۃ الخ یعنی ان اشیاء کی نجاست مغلظہ اس لئے ہوئی کہ اس کا ثبوت دلیل قطعی سے ہوا ہے یعنی جو دلیل دوسری ادلہ سے متعارض نہ ہو کما فی الحاشیہ پس متعارض ادلہ وارد ہوں گی، تو حکم میں تخفیف آ جائے گی۔

کیے، مبسوط امام محمد[1] میں ہے کہ اگر جماعت کے لوگ سب موجود ہوں تو صبح کی نماز میں تغلیس کی جائے اور امام طحاوی نے اسفار کو اس طرح افضل کہا کہ نماز کی ابتدا تو غلس میں ہو اور ختم اسفار میں، حضرتؒ نے فرمایا کہ میں بھی مختارِ طحاوی ہی کو اختیار کرتا ہوں، خصوصاً اس لئے کہ وہ امام محمدؒ سے بھی مروی ہے اور اس میں تمام احادیث جمع ہو جاتی ہیں، کیونکہ بعض میں اسفار کا حکم آیا ہے، کسی میں ہے کہ آپ نے غلس میں نماز پڑھی اسی لئے فقہ کی کتبِ فتاوی میں جو اسفار کی فضیلت لکھی ہے کہ شروع بھی اسفار میں ہوا اور ختم بھی، اس کو اختیار کرنے سے غلس والی احادیث معمول بہا نہیں رہتیں بلکہ جب اسفار مذکور کو ہی افضل قرار دیا جائے گا تو نبی کریم ﷺ کے اکثری عمل کو مفضول قرار دینا پڑے گا جس کی جراءت کوئی عاقل نہیں کرسکتا، لہذا مختارِ امام طحاوی ہی اولی بالقبول ہے اس حدیث ما یعرفھن احد کا جواب بعض حنفیہ نے یہ دیا کہ اوڑھنی کی وجہ سے نہ پہچانی جاتی تھیں، خواہ اسفار ہی کیوں نہ ہو، لہذا تغلیس ثابت نہ ہوئی، علامہ نوویؒ نے جواب دیا کہ عورت کا امتیاز مرد سے نہ ہوسکتا تھا، لہذا تغلیس ثابت ہوئی (علامہ عینیؒ نے بھی اس توجیہ کو اختیار کیا بہ نسبت معرفت اعیان کے (عمدہ ص۲/۳۵۴) مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کو مرجوح قرار دیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔)

خصوصاً جبکہ اسی حدیث میں زیادتی من الغلس کی بھی ثابت ہے تو حضرت عائشہؓ کا یہ قول قاطع شبہ ہو جائے گا، اس کا جواب یہ ہے یہ زیادت حضرت عائشہؓ کے قول میں نہیں ہے، بلکہ نیچے کے کسی راوی سے آئی ہے لہذا یہ قول مدرج ہوگیا اس کی دلیل یہ قرینہ ہے کہ ابن ماجہ میں یہ زیادتی اس طرح ہے:۔ تعنی من الغلس، جس سے صاف ظاہر ہوا کہ نیچے کے راوی کا کلام ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مراد بتلا رہا ہے، جس کو وہ سمجھا ہے اور امتیاز عورتوں کا مردوں سے مراد نہیں، بلکہ مراد خود آپس میں عورتوں کا امتیاز وعدم امتیاز ہے کہ ہندہ، زینب سے ممتاز نہ ہوتی تھی، اور اس مراد کی طرف خود قرآن مجید میں اشارہ فرمایا گیا ہے، منافقین کی عادت تھی کہ غریب غربا کی عورتیں مسجد کو جاتی تھیں تو ان کو راستے میں چھیڑتے تھے اور شریف خاندان بڑے لوگوں کی عورتوں کو نہ چھیڑتے تھے، لہذا حکم ہوا کہ سب عورتیں بڑی چادروں میں لپیٹ کر اور خوب مستور ہو کر (جس طرح اس زمانے میں برقعوں میں مستور ہوتی ہیں) جایا کریں۔ تاکہ بدباطن اور منافق لوگ ہر دو قسم کی عورتوں میں فرق نہ کرسکیں، کہ ظاہر میں سب یکساں ہوں گی۔ فرمایا "یدنین[2] علیھن من جلا بیبھن ذلك ادنی ان یعرفن فلا یوذین" (احزاب) اے

---

[1] حضرتؒ نے فرمایا:۔ امام محمدؒ کی مبسوط کو مبسوطِ جوز جانی بھی کہتے ہیں کیونکہ جوز جانی اس کے راوی ہیں، پھر اس کی جتنی بھی شروح لکھی گئی ان کے نام بھی مبسوط پر رکھے گئے، فرق اضافات سے کیا جاتا ہے، جیسے مبسوطِ شمس الائمہ، مبسوطِ سرخسی وغیرہ، اسی طرح جامع صغیر امام محمدؒ کی کتاب ہے اس کی بھی سب شروح کے نام اضافات ونسب کے فرق سے رکھے گئے (تقریر بخاری شریف ضبط کردہ حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب عم فیضہم)

[2] روایات میں ہے کہ مسلمان مستورات جب ضروریات کے لئے باہر نکلتیں، تو بدمعاش منافق تاک میں رہتے اور چھیڑ چھاڑ کرتے پھر پکڑے جاتے تو کہتے کہ ہم نے سمجھا نہیں تھا کہ کوئی شریف عورت ہے، لونڈی باندی سمجھ کر چھیڑ دیا تھا (ف ۷) یعنی بدن کے ڈھانکنے کے ساتھ چادر کا کچھ حصہ سر سے نیچے چہرہ پر بھی لٹکا لیں، روایت میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر مسلمان عورتیں بدن اور چہرہ چھپا کر اس طرح نکلتی تھیں کہ صرف ایک آنکھ دیکھنے کے لئے کھلی رہتی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ فتنہ کے وقت آزاد عورت کو چہرہ بھی چھپالینا چاہیے (ف ۸) حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ لکھتے ہیں یعنی پہچانی پڑیں کہ لونڈی نہیں، بی بی ہے صاحبِ ناموس، بدذات نہیں، نیک بخت ہے تو بدنیت لوگ اس سے نہ الجھیں، گھونگھٹ اس کا نشان رکھدیا، یہ حکم بہتری کا ہے (تاکہ انھیں پہچان کر ہر ایک کا حوصلہ چھیڑنے کا نہ ہو) (فوائد حضرت علامہ عثمانیؒ ص۵۵۲)

عورتوں کیلئے آخری صف افضل ہے: نماز جماعت میں سب سے زیادہ فضیلت پہلی صف والوں کی ہے حدیثِ مسلم میں ہے کہ مردوں کے لئے سب سے بہتر و افضل پہلی صف ہے اور کم سے کم اجر آخری صف کا ہے اور عورتوں کے لئے سب سے اعلیٰ و افضل درجہ آخری صف میں نماز پڑھنے کا ہے اور سب سے کم درجہ کا ثواب ان کی اگلی صف کا ہے اوسط طبرانی میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے صفِ اوّل کے لئے تین بار مغفرت مانگی دوسری کے لئے دو بار اور تیسری کیلئے ایک بار مسلم شریف میں حضرت جابرؓ کی حدیث ہے کہ تم لوگ ایسی صف کیوں نہیں باندھتے جیسی فرشتے اپنے رب کے سامنے باندھتے ہیں کہ وہ پہلے صفِ اوّل کو پورا کرتے ہیں، ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ لوگ صف اوّل سے پچھڑتے رہنے کے عادی ہوتے جائیں گے، یہاں تک کہ حق تعالیٰ بھی ان کو جہنم سے قریب کردیں گے (یعنی نماز میں اگلی صفوں کا اہتمام نہ کرنا چونکہ اپنی دنیوی ضرورتوں کو مقدم کرنے کی وجہ سے ہوگا، اور عرض صرف فرض کے بوجھ کو اپنی سر سے ٹال رہ جائے گی اس لئے اس کی نحوست رفتہ رفتہ جہنم سے قریب کردے گی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نبی! اپنی ازواج! بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سب کو حکم دے دیجئے کہ اپنی بڑی چادروں میں خوب مستور ہو کر باہر نکلا کریں، اس سے وہ پہچانی جائیں گی (کہ شریف عورتیں ہیں) لہٰذا وہ بد باطن لوگوں کی ایذا سے محفوظ رہیں گی حضرتؒ نے فرمایا کہ علامہ نوویؒ کی توجیہ خلافِ واقع اور خلافِ اشارۂ نص ہے۔

میرے نزدیک عدم معرفت اشخاص ہی شریعت کا مقصود ومطلوب ہے، اور اسی کی طرف حضرت عمرؓ کے ارشاد سے بھی رہنمائی ہوتی ہے کہ انہوں نے حضرت سودہؓ کو الا قد عرفناك یا سورة! فرمایا تھا، غرض یہاں شریفہ کو وضیعہ سے پہچاننا ہی مراد ہے تاکہ غریب مسکین عورت سمجھ کر چھیڑنے کا حوصلہ نہ ہو۔

دورِ حاضر کی بے حجابی

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ ازواجِ مطہرات، بناتِ طاہرات اور عام مسلمان عورتوں کیلئے حجابِ شرعی کا حکم ان کے لئے قید وبند کے مرادف نہیں تھا جیسا کہ دشمنانِ اسلام سمجھاتے اور باور کراتے ہیں بلکہ ان کی نجابت وشرافت کی حفاظت کے واسطے بطور ایک نہایت مضبوط ومستحکم حصار کے تجویز کیا گیا تھا، تاکہ بدچلن، بدباطن اور غنڈہ ایلیمنٹ کو شریف خواتین کے اخلاق وکردار بگاڑنے اور عزت وناموس پر حملہ کرنے کا وسوسہ وخیال تک بھی نہ آسکے، اور وہ ان کی طرف سے پوری طرح مایوس ہو جائیں، اسی لئے ضرورت کے وقت مردوں سے پست ونرم آواز میں بات کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی، تاکہ بداخلاق روگی کو کوئی برا خیال لانے کا موقع بھی حاصل نہ ہو آج کل اسلامی تعلیمات سے ہٹ کر بے حجابی اور زمانہ جاہلیت کی سی عریانی بہت عام ہوتی جارہی ہے اور اس کے نقصانات بڑے دور رس ہیں، خصوصاً ہندوستان میں کہ وہ صرف بدکرداری واخلاقی گراوٹ ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ نوبت ذہنی ومذہبی ارتداد تک پہنچ رہی ہے۔ والعیاذ باللہ العلی العظیم۔

قولہ فاجریٰ۔ یعنی اپنی سواری کو دوڑایا، تاکہ کفار پر شدت سے حملہ کریں یا ان پر رعب ڈالیں۔

قولہ ثم حسر الا زار عن فخذہ: ۔ محققِ عینیؒ نے لکھا: ۔ حُسِر صیغہ مجہول ہے اور اس کے صحیح ہونے کی دلیل روایتِ مسند احمد ہے جس میں فانحسر ہے، اور ایسے ہی روایتِ مسلم وطبری میں بھی ہے اور اسماعیلی نے اس حدیث کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے: ۔ "فاجری نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی زقاق خیبر اذ خر الا زار" تو خرور بھی بمعنی وقوع انحسار کی طرح لازم ہی ہے یہی زیادہ صواب ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے قصداً اپنی ازار ران مبارک سے نہیں ہٹائی، البتہ اژدحام کی وجہ سے یا سواری کو تیز دوڑانے کے سبب ران کا حصہ کھل گیا تھا اور یہی حضور علیہ السلام کی جلالتِ قدر کے شایانِ شان بھی ہے کہ آپ کی طرف سے کشفِ فخذ قصداً کا انتساب نہ کیا جائے، خصوصاً جبکہ آپ سے قولی ارشاد الفخذ عورة کا ثبوت بھی ہو چکا ہے اور حضرت انسؓ نے جو اس کی نسبت حضور علیہ السلام کی طرف کی ہے وہ شاید اس لئے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) صحیح ابن حبان کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے صفِ اوّل پر رحمت وبرکت نازل کرتے ہیں۔ محقق عینیؒ نے یہ سب احادیث بخاری شریف کی حدیثِ ذیل کے تحت نقل کی ہیں: ۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ۔ اگر لوگوں کو اذان اور صفِ اوّل کا ثواب واجر عظیم معلوم ہو جائے، اور پھر آپس کے تنافس کی وجہ سے رفعِ نزاع کی کوئی صورت بجز قرعہ اندازی کے باقی نہ رہ جائے تو وہ قرعہ ڈال کر اذان دینے اور صفِ اوّل میں جگہ پانے کا استحقاق حاصل کر کے رہیں گے، اور اگر لوگوں کو نماز کے لئے تیاری واہتمام کر کے جلد مسجدوں میں پہنچنے کا اجر وثواب معلوم ہو جائے تو وہ ضرور ایک دوسرے سے سبقت کریں گے اور اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ عشاء اور صبح کی نمازوں کا اپنے وقتوں میں ادا کرنے کا کتنا بڑا اجر وثواب ہے تو وہ ضرور گھسٹتے ہوئے بھی مسجدوں میں پہنچ جائیں گے (عمدہ ۲۴۴/۲ باب الاستہام فی الاذان)

ان سب احادیث سے صفِ اوّل کی نماز کا کتنا بڑا درجہ اور صفِ آخر کا کم درجہ بتلایا گیا، مگر یہ سب مردوں کے لئے ہے عورتوں کے لئے اس کے برعکس صفِ آخر کو سب سے بڑا درجہ صرف اس لئے دیا گیا کہ ان کو جتنا بھی زیادہ بعد اور دوری غیر مردوں سے ہو سکے بہتر ہے کیونکہ اس سے ہزاروں آفات وشرور اور فتنوں سے حفاظت رہے گی اور جب نماز جیسی عظیم الشان عبادت کے موقع پر (جو خود بھی فوحش ومنکرات اور برائیوں سے دور کرنے کی خاصیت رکھتی ہے اس قسم کی رہنمائی کی گئی تو دوسرے مواقع کے اختلاطِ رجال ونساء کی جس قدر بھی قباحت نظرِ شارع میں ہو سکتی ہے وہ بالکل ظاہر وباہر ہے۔ واللہ یوفقنا لکل خیر ولما یحب ویرضی. "مؤلف"!

انہوں نے حالتِ مذکورہ میں ران مبارک کوکھلا دیکھا تو یہی گمان کرلیا کہ آپ نے قصداً ایسا کیا، حالانکہ واقع میں ایسا نہ تھا (عمدہ ۲/۲۴۸)!

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ قاموس میں حسر کو بھی لازم لکھا ہے، لہذا اس کا فاعل ازار کو کہیں گے، خصوصاً جبکہ مسلم کی روایت میں بھی انحسر ہے، پھر فرمایا کہ بخاری شریف ہی میں ص ۸۶[1] پر (باب ما یحقن بالا ذان من الدماء) فخذ النبی علیہ السلام کی جگہ یہ الفاظ حضرت انسؓ ہی سے مروی ہیں وان قدمی لتمس قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، یہی حدیث ہے (آخر کے اعتبار سے) متناً وسنداً، لہذا یہاں سے استدلال صحیح نہیں ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حسر الازار بمعنی وسّعہ ہو، یعنی ازار کو ران کے مقام پر ڈھیلا کیا تھا تا کہ ران سے چمٹا ہوا نہ رہے اور ایسا کرنے میں اتفاقی طور سے ران کا کچھ حصّہ کھل گیا ہو، جیسا کہ عام طور سے ایسا ہو جاتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ آخری احتمال اس روایت کے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے جو محقق عینیؒ نے کرمانی کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ بعض نسخوں یا بعض روایات میں عن فخذ کی جگہ علی فخذ ہے یعنی جو حصّہ ازار کا ران پر تھا اس کو آپ نے کھولا اور ڈھیلا کیا (عمدہ ۲/۲۴۸)!

امام مسلم اس حدیث کو ''باب غزوۂ خیبر'' میں لائے ہیں، اور وہاں علامہ نوویؒ نے لکھا:۔ اس حدیث سے بعض اصحاب مالک نے فخذ کے عورۃ نہ ہونے پر استدلال کیا ہے، ہمارا اور دوسرے حضرات کا مذہب یہی ہے کہ وہ عورت ہے اور اس کی دلیل احادیثِ کثیرہ مشہورہ ہیں اور اِس حدیث کا جواب ہمارے اصحاب نے یہ دیا کہ اس موقع پر فخذ کا کُھل جانا حضور علیہ السلام کی اختیار سے واقع نہیں ہوا، اور اس میں یہ بھی نہیں کہ باوجود امکان سترِ کے حضور اس کو دیر تک کھولے ہی رہے ہوں۔

بعض اصحاب مالک نے یہ بھی کہا کہ حق تعالیٰ حضور علیہ السلام کی رفعتِ شان کی خاطر اس پر بھی قادر تھے کہ ان کو انکشاف عورۃ کے ساتھ مبتلا نہ فرماتے، (لہذا فخذ کو عورۃ قرار دینا ہی بہتر ہے تا کہ حضور کے اکرام کے خلاف صورت نہ سمجھی جائے) اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ اگر ایسی صورۃ غیر اختیاری طور سے پیش آئے تو وہ کسی کے لئے بھی نقص کی بات نہیں ہے نہ اس کو کسی کے لئے ممنوع یا خلافِ شان کہا جا سکتا ہے۔ (نووی ۲/۱۱۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ بعض لوگ اس قسم کے افعال کا صدور نبی اکرم ﷺ کی شان رفیع کے خلاف سمجھتے ہیں اس لئے متمنی ہیں کہ ایسی کسی بات کا صدور آپ کی طرف منسوب نہ ہو جس کو شارع نے ناپسند کیا ہے میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا، کیونکہ لیلۃ التعریس میں حضور علیہ السلام پر نیند کا غلبہ ہوا جس کی وجہ سے صبح کی نماز قضا ہوگئی، اور ایک دفعہ نسیان ہوا کہ نماز کے لئے حالتِ جنابت میں کھڑے ہوئے، پھر تحریمہ سے قبل ہی آپ کو یاد آ گیا اور فوراً غسل فرما کر تشریف لائے پھر نماز پڑھائی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کے سامنے بحالتِ عریانی آنا پڑا۔

متکلمین نے کہا کہ جس چیز کو لوگ خلافِ مروّۃ سمجھیں اس کا وقوع وصدور حضرات انبیاء علیہم السلام سے جائز نہیں، میں کہتا ہوں کہ کشفِ فخذ اگر واقع بھی ہوا ہو تو وہ عرب والوں میں کسی طرح بھی خلافِ مروّۃ نہیں تھا کہ وہ تو طوافِ بیت اللہ تک بھی بحالتِ عریانی کرتے تھے۔

وجہ یہ ہے کہ ایسے افعال کا مدت العمر میں صرف ایک دوبار واقع ہو جانا خلافِ شان نہیں ہے پھر جبکہ اس میں کوئی خاص ضرورت و مصلحت بھی ہو تو معاملہ اور بھی ہلکا ہو جاتا ہے، البتہ اگر ایسے امور کا بار بار تکرار ہو اور ان کے کرنے والے تساہل برتیں، یا ان کو معیوب نہ سمجھیں تو ان کو ضرور خلافِ مروّۃ اور ضدِ شرافت ونجابت سمجھا جائے گا۔

قولہ بساحۃ قوم، ساحۃ آنگن، یعنی مکانوں کے سامنے کا صحن (یہاں مراد بستی کے سامنے کا میدان ہے) جمع ساحات (عمدہ ۲/۲۴۸)

قولہ الخمیس، لشکر کو خمیس اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں پانچ حصے ہوتے ہیں، مقدمہ، ساقہ، قلب اور جناحین، اور میمنہ، میسرہ، قلب وجناحین کو بھی کہتے ہیں۔ (عمدہ ۲/۲۴۹)

قولہ عنوۃ، یعنی قہراً (فتح الباری ۱/۳۲۷-عمدہ ۲/۲۲۹) محقق عینیؒ نے یہ بھی لکھا کہ بعض حضرات نے اس کے معنی صلحاً کے بھی کئے ہیں

[1] فیض الباری ۲/۱۶ میں اس کی جگہ ۸۳ غلط چھپ گیا ہے، تصحیح کرلی جائے۔ ''مؤلف''

لہذا یہ لفظ اضداد میں سے ہو جائے گا، پھر لکھا کہ محدث شہیر ابوعمر (ابن عبدالبر) نے صحیح اسی کو قرار دیا کہ خیبر کی ساری آراضی عنوۃً (غلبہ سے) فتح ہوئی ہے الخ (عمدہ ۲۴۹)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حنفیہ فتح خیبر کو عنوۃً وغلبۃً مانتے ہیں اور شافعیہ صلحاً کہتے ہیں، یہ حدیث حنفیہ کی حجت ہے اسی طرح فتح مکّہ میں بھی اختلاف ہے حنفیہ عنوۃً کہتے ہیں اور شافعیہ صلحاً۔

امام طحاویؒ نے مستقل باب قائم کر کے تقریباً نو ورق پر بحث کی ہے اور غلبہ کو ثابت کیا ہے دونوں کے احکام چونکہ الگ الگ ہیں اس لئے بحث وتحقیق کی ضرورت پڑی، میں اس بارے میں بہت متحیر رہا کہ امام شافعیؒ نے اس فتح کو باوجود اس قدر حرب وضرب کے کیونکہ صلحاً کہہ دیا، اور حافظؒ کو بھی تشویش پیش آئی ہے لیکن پھر مجھے واضح ہوا کہ انہوں نے اس کو صلحاً اس لئے کہا ہوگا کہ آخر میں صلح ہی کی صورت پیش آئی ہے، لہذا ابتدائی قتال کے حالات کو نظر انداز کر دیا واللہ تعالیٰ اعلم!

قولہ فجمع السبی، یعنی جنگ ختم ہونے پر قیدی بچے اور عورتیں جمع کی گئیں، کیونکہ عرب مردوں کا غلام بنانا جائز نہیں، ان کے لئے تو ہمارے یہاں اسلام ہے یا تلوار، اور اہل خیبر سب یہودی عرب تھے۔

قولہ خذ جاریۃ من السبی غیرھا:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ مسلم شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت صفیہؓ کو حضرت دحیہؓ سے سات راس (غلام وباندیاں) دے کر خرید لیا تھا اور یہ خریدنا مجازاً تھا، یعنی حضرت دحیہؓ کی تطییب خاطر کے لئے چھ یا سات غلام وباندیاں عطا فرمادی تھیں، تا کہ حضرت صفیہؓ کی علیحدگی ان پر گراں نہ ہو حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید فرمایا کہ میں نے ایک مستقل یادداشت اس بارے میں تیار کی ہے کہ حضور علیہ السلام کے سب نکاح اسباب سماویہ کے تحت انجام پائے ہیں، چنانچہ حضرت صفیہؓ کے لئے بھی ایسی ہی صورت ہوئی کہ جنگ خیبر سے قبل انہوں نے خواب دیکھا کہ چاند میری گود میں آ گیا، یہ خواب اپنے شوہر کو سُنایا تو اس نے ان کو ایک تھپڑ مارا اور کہا تو چاہتی ہے کہ اس شخص سے نکاح کرے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے چنانچہ اس خواب کے مطابق حضور علیہ السلام سے نکاح ہوا ان ہی حضرت صفیہ کا یہ بھی بیان ہے کہ ایک بار میرے باپ اور چچا نبی کریم ﷺ کے پاس گئے اور توراۃ کے متعلق کچھ گفتگو کی، پھر گھر آ کر والد نے چچا سے کہا کیا وہی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا ہاں! پھر پوچھا کیا ارادہ ہے؟ کہا:۔ میرا ارادہ ہے کہ آخر دم تک مخالفت کروں گا۔

ام المومنین حضرت صفیہؓ

آپ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھیں، اور سردار بنی قریظہ وبنی نضیر حُیَی بن اخطب کی بیٹی تھیں (یہ دونوں قبیلے مدینہ طیبہ سے جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہو گئے تھے) کنانہ بن ابی الحقیق کی زوجیت میں تھیں، جو جنگ خیبر میں مارے گئے تھے۔ (عمدہ ۲/۲۴۹)

قولہ فاعتقھا النبی صلے اللہ علیہ وسلم وتزوجھا، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ شافعیہ کے نزدیک عِتاق ہی مہر نکاح تھا، اور شیخ ابوعمرو بن صلاح (استاذ علامہ نوویؒ) نے **جعل عتقھا صداقھا** میں بہت مدققانہ بحث کی ہے، اور ان کے قریب نقول لائے ہیں، فتح الباری ۲/۱۰۲[1] میں دیکھی جائے، حنفیہ کہتے ہیں کہ صورت واقعہ اس طرح تھی کہ حضرت صفیہؓ اولاد ہارون علیہ السلام سے تھیں، اس لئے حضور علیہ السلام نے ان پر احسان کر کے آزاد کر دیا، پھر نکاح معروف طریقہ پر کر لیا اور چونکہ حضرت صفیہؓ نے احسان اعتاق کے بدلے میں اپنا مہر معاف کر دیا اور کچھ نہ لیا تو راوی نے اسکو اس طرح تعبیر کر دیا کہ آزاد کرنا ہی مہر ہو گیا، پہلے بخاری شریف میں حدیث بھی گزر چکی

---

[1] اس موقع پر حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ابن صلاح حفاظ شافعیہ میں سے ہیں اور حافظ ابن حجرؒ کو حدیث تو صفت نفس ہے مگر تجر وملکہ فقہ واصول فقہ کا شیخ موصوف کو زیادہ حاصل ہے بہ نسبت حافظ کے۔ "مؤلف"!

ہے"باب تعلیم الرجل امته" جس میں اعتقها فتزوجها آچکا ہے اس سے بھی معلوم ہوا تھا کہ مستقل طور سے آزادی اور پھر معروف طریقہ پر نکاح کرنا بڑی فضیلت رکھتا ہے اگر نفس اعتاق ہی مہر ہوتا تو اعتاق اس شرط پر ہوتا کہ نکاح ہو جائے گا۔

ہماری یہ توجیہ اپنے مذہب کی تائید کیلئے نہیں بلکہ وقعی بات اور ظاہر بھی یہی ہے جسکی طرح طرف اعتقها فتزوجها کے الفاظ اشارہ کررہے ہیں۔ بعض اہل علم اس طرف بھی گئی ہیں کہ اعتاق بشرط التزوج ہو تو پھر ایجاب وقبول کی بھی الگ سے ضرورت نہیں، یہ بھی درست نہیں کیونکہ خود لفظِ تزوج بتلا رہا ہے کہ اسکی ضرورت ہے، اور صرف اعتاق اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔

قولہ قال نفسھا، حضرتؒ نے فرمایا کہ تأل کار اور انجام کا بیان ہے یعنی جب حضور علیہ السلام نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کردیا اور انہوں نے اپنا مہر ساقط کردیا تو مہر بجز اُن کی ذات کے الگ سے کوئی چیز باقی نہ رہی، کیونکہ سقوطِ مہر کی وجہ سے ظاہری طور پر نہ کسی چیز کا لینا ہوا نہ دینا، بلکہ ان کی ذات ہی تھی، جس کو لیا دیا گیا، لہذا یہ تعبیر عرفی تھی، کسی فقہی مسئلہ کا بیان نہیں، غرض میرا ظنِ غالب یہی ہے کہ اس واقعہ میں حضور علیہ السلام نے پہلے حضرت صفیہؓ کو آزاد کیا اور پھر نکاح فرمایا تاکہ مطابق حدیثِ مذکور کتاب العلم کے ڈبل اجر حاصل کریں۔

حافظ ابن حزم کا مناقشہ عظیمہ

محقق عینیؒ نے حدیث الباب کے تحت "ذکر الاحکام المستنبطة" میں مذاہب کی تفصیل نقل کر کے اکابر ائمہ ومحدثین کا اس واقعہ کو حضور علیہ السلام کی خصوصیت ہونا بیان کیا، اور امام طحاویؒ کے دلائل خصوصیت کا ذکر کیا پھر لکھا کہ اس بارے میں ابن حزم نے مناقشہ عظیمہ کیا ہے اور کہا کہ خصوصیت کا دعویٰ اس موقع میں جھوٹا ہے اور جو احادیث اسکے لئے ذکر کی گئی ہیں وہ غیر صحیح ہیں۔

ہم نے ابن حزم کی تمام باتوں کا رد اپنی شرح معانی الآثار میں کیا ہے جو چاہے اس کی مراجعت کرے۔ (عمدہ ۲/۲۵۳)!

المجلی فی رد المحلی

کئی جگہ ذکر ہوا کہ محدث شہیر حافظ ابن حزم ظاہری نے "المحلّی" فقہ وحدیث ورجال میں نہایت بلند پایہ کتاب لکھی ہے جو دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس پر ایک مصری عالم شیخ احمد محمد شاکر کا حاشیہ بھی چھپا ہے، جنھوں نے بعض مواقع میں ابن حزم پر نقد بھی کیا ہے، مگر وہ خود بھی غیر مقلد وسلفی تھے اگرچہ قاضی بننے کے لئے مصنوعی حنفی بنے ہوئے تھے (کیونکہ مصری حکومت کا مذہب حنفی ہے اور وہاں قاضی کا حنفی المذہب ہونا ضروری ہے ہماری ان سے بزمانہ قیام مصر کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔ حافظ ابن حزمؒ نے ائمہ مجتہدین اور ان کے مذاہب کے بارے میں نہایت تیز لسانی اور تلخ کلامی سے کام لیا ہے اور وہ اپنے مزعومات کے اثبات اور دوسروں کی تحقیقات کو گرانے میں حدودِ انصاف سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں، احادیثِ صحیحہ پر غیر صحیحہ ہونے کا حکم کردیتے ہیں اور اکثر مواضع میں رجال پر بھی غلط تنقید کر گزرتے ہیں، ائمہ مجتہدین کے مذاہب بیان کرنے میں بھی[۱] غلطی کرتے ہیں، مثلاً چار باب کے بعد بخاری ۵۵ "باب الصلوٰۃ علی السطوح والمنبر" میں حدیث آئے گی جس میں حضور علیہ السلام کا نمازِ جمعہ منبر پر پڑھانے کا ذکر ہے تاکہ سب حضرات صحابہ آپ کی نماز کو دیکھ لیں، اور ضرورت کے وقت امام کا اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر نماز پڑھانا حنفیہ کے نزدیک بھی جائز ہے، مگر ابن حزم نے امام ابوحنیفہؒ کی طرف غلط نسبت کردی کہ وہ اس کو ناجائز کہتے ہیں (عمدہ ۲/۲۷۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اسی حدیث پر ابن حزم گزرے تو دعویٰ کردیا کہ وہ نمازِ نفل تھی، اور پھر نفل کی جماعت کو بھی اسی سے ثابت کردیا حالانکہ یہ جمعہ کی جماعت تھی، جیسا کہ بخاری میں ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ ابن حزم سے خطأ فاحش ہوئی ہے، تذکرۃ الحفاظ

---

[۱] نقل مذاہب میں غلطی! حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ علامہ نوویؒ بھی حنفیہ کا مذہب نقل کرنے میں بہت غلطی کرتے ہیں انہوں نے تقریباً ایک سو مسائل میں ایسی غلطی کی ہے البتہ حافظ ابن حجرؒ کم غلطی کرتے ہیں مجھے اس وقت ان کی غلطی مسئلہ باب زکوٰۃ کی یاد ہے۔

۱۴۶ تا ۱۵۵ میں ابن حزم کے مفصل حالات مع مناقب ومثالب دیئے ہیں، اور آخر میں وہ مختصر تبصرہ کیا جو حافظ ابن تیمیہؒ کے متعلق بھی کیا ہے کہ بجز رسول اکرم علیہ ﷺ کے ہر شخص کے اقوال میں سے کچھ لئے جاتے ہیں اور کچھ چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور یہ بھی لکھا کہ وہ امتحان، سختی وجلاوطنی میں اس لئے مبتلا ہوئے کہ درازلسانی کے عادی تھے اکابر اور ائمہ مجتہدین کا استخفاف کرتے اور ان کے رد میں نہایت سخت لہجہ اور غیر مہذب محاورہ استعمال کرتے تھے ایسی صورتِ حال میں نہایت ضرورت تھی کہ ان کی اغلاط کا بہترین مدلل رد بھی شائع ہو۔ حافظ حدیث قطب الدین حلبی حنفی (م ۷۳۵ھ) نے ان کے رد میں ''القدح المعلی فی الکلام علی بعض احادیث المحلی'' تالیف کی تھی، مگر اسکے قلمی نسخے بھی نایاب ہیں، دورِ حاضر کے محدث شہیر علامہ مفتی سید محمد مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری دام ظلہم نے اپنی شرح کتاب الحجہ للامام محمدؒ میں سے اس طرف کچھ توجہ فرمائی ہے، اور اب خدا کا شکر ہے انہوں نے ہم خدام کی گزارش پر محلی کی تمام جلدوں کا مستقل طور سے مطالعہ فرما کر اسکی قابل نقد چیزوں پر محققانہ فقیہانہ، ومحدثانہ بحث کی ہے، جسکو بالاقساط شائع کرنے کا ارادہ بھی کرلیا گیا ہے امید ہے کہ اہل علم خصوصاً علوم حدیث کا شغل رکھنے والے علماء، اساتذہ ومؤلفین اس کی قدر کریں گے، اور اس کی ہر قسط شائع ہوتے ہی خرید لیں گے تا کہ آئندہ اقساط شائع کرنے میں سہولت ہو۔

عروس، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مرد عورت دونوں کو کہتے ہیں۔ نطع، چمڑے کا دستر خوان، حضور علیہ السلام نے چمڑے کے دستر خوان پر کھانا نوش فرمایا ہے، لہذا پاک چمڑے کا دستر خوان سنت ہے باقی آپ نے خوانِ تپائی پر کھانا نہیں کھایا، اس لئے وہ خلافِ سنت ہے صرف وقتِ ضرورت اسکی اجازت ہوگی، بعض اردو تراجم کی کتابوں میں خوانِ کا ترجمہ دستر خوان کر دیا گیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ دستر خوان کا استعمال مسنون اور خوان کا مکروہ ہے۔

حلیس: حلوے کی قسم ہے۔

قولہ من کان عندہ شیئ فلیجی ء بہ، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا:۔ بظاہر یہ بات مستبعد ہے کہ حضور علیہ السلام نے ولیمہ کے لئے صحابہ کرامؓ کی مدد طلب کی ہو، کیونکہ ولیمہ شوہر ہی کے مال سے ہوتا ہے اور آپ نے اور کسی نکاح میں بھی کوئی چیز کسی سے طلب نہیں فرمائی ہے پھر اس وقت حضور علیہ السلام کو ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ جنگ خیبر کے بعد آپ کو مالِ غنیمت کا خمس حاصل ہوا تھا تو سوال یہ ہے کہ صحابہ کرام سے مطالبہ کیسا تھا؟ جواب یہ ہے کہ آپ نے ان سے ان کی ملکیت کی چیزیں طلب نہیں فرمائیں، بلکہ جو چیزیں ان کو صرف کرنے کے لئے دی تھیں، ان کا بچا ہوا فاضل حصّہ واپس طلب کیا ہے، اور حکم بھی یہی ہے کہ دارالحرب میں امام جو کچھ مجاہدین کو صرف کرنے کے لئے دیتا ہے وہ لوگ ان چیزوں کے بقدر صرف شدہ کے مالک ہوتے ہیں، فاضل کے نہیں، اور پوری چیزوں کے مالک جب ہی ہوتے ہیں کہ دارالحرب سے ان کو منتقل کر کے دارالاسلام میں لے آئیں۔ لہذا فاضل اشیاء کو امام وقت کے پاس لوٹا دینا ضروری وواجب ہوتا ہے لہذا واپسی کے بعد جس حصہ مال میں حضور علیہ السلام نے ولیمہ کے لئے تصرف فرمایا، وہ اپنی پانچویں حصّہ خمس میں سے کیا، جو آپ کا خالص حق اور مملوک تھا اسکی تائید حدیث بیہقی سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ جس کے پاس جو کچھ بچا ہوا ہو وہ لاکر جمع کرے، لہذا کوئی اپنے پاس کی بچی ہوئی کھجوریں لایا، کوئی ستو لایا، کوئی گھی بچا ہوا لایا، یہاں سے حنفیہ کے مسلک کی تائید بھی ہوئی، جو کہتے ہیں کہ مالِ غنیمت کی تقسیم دارالحرب میں صحیح نہیں، اور دارالاسلام میں لے جا کر جب پوری طرح اس پر تسلط ہوگا، جب ہی صحیح ہوگی، دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ دارالحرب میں بھی ملکیت وتسلّط پورا ہو جاتا ہے دارالاسلام کی شرط نہیں ہے۔ (لامع ۱۴۷/۱) محقق عینیؒ نے آخر میں ولیمہ کا حکم لکھا اور لغات کی تحقیق بھی فرمائی:۔

ولیمہ کا حکم! ہمارے یہاں ولیمہ سنت ہے اور دعوتِ ولیمہ بھی قبول کرنا سنت ہے، اور دوسری دعوتوں کا بھی اور یہی قول امام احمد وامام مالک کا (ایک روایت میں) ہے، امام شافعیؒ نے دعوتِ ولیمہ قبول کرنے کو واجب اور دوسری دعوتوں کا قبول کرنا مستحب قرار دیا ہے۔ اور یہی قول امام مالک کا دوسری روایت سے ہے۔

لغات: عربی میں مختلف کھانوں کے نام یہ ہیں:۔ ولیمہ، (شادی کا کھانا) وکیرہ (تعمیر مکان سے فراغت کی خوشی کا کھانا) خُرس وخراس (مسرت ولادت کا کھانا) خُرسہ (زچہ کا کھانا) عذار واعذار (مسرتِ ختنہ کا کھانا) نقیعہ (سفر سے واپس آنے والے کا کھانا) نُزل ونُزُل (مہمان کی پہلی ضیافت کا کھانا) قِریٰ (مہمان کا ہر کھانا) جَفلیٰ (عمومی دعوت) نَقریٰ (خصوصی دعوت) مادبہ (وہ کھانا جو کسی دعوت یا شادی کے موقع پر تیار کیا جائے)

باب فی کم تصلی المراء ۃ من الثیاب

وقال علمۃ لو وارت جسدھا فی ثوب جاز

(عورت کتنے کپڑوں میں نماز پڑھے، عکرمہ کہتے ہیں، کہ اگر ایک کپڑے میں اپنا بدن چھپالے تو جائز ہے)

(۳۶۲) حدثنا ابوالیمان قال انا شعیب عن الزھری قال اخبرنی عروۃ ان عآئشۃ قالت لقد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی الفجر فشھدمعہ' نسآء من المؤمنات متلفعات فی مروطھن ثم یرجعن الیٰ بیوتھن مایعرفھن احد

ترجمہ! حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ کی فجر کی نماز میں آپ کے ہمراہ کچھ مسلمان عورتیں بھی اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی حاضر ہوتی تھیں اور جب وہ اپنے گھروں کو واپس ہوتیں تو اتنا اندھیرا ہوتا کہ کوئی شخص عورتوں کو پہچان نہ سکتا تھا۔

تشریح! امام بخاریؒ یہ ثابت کررہے ہیں کہ عورت اگر چادر میں بھی اچھی طرح لپٹ کر نماز ادا کرلے تو نماز درست ہے کیونکہ حدیث الباب میں صرف چادروں میں نماز پڑھنے کا ذکر ہے ان کے ساتھ دوسرے کپڑوں کا ذکر نہیں ہوا ہے۔

تفصیل مذاہب! اس سلسلے میں محقق عینیؒ نے محدث ابن بطال کے حوالہ سے حسب ذیل اختلاف نقل کیا:۔ امام ابوحنیفہ وامام مالک وامام شافعیؒ کے نزدیک قمیص ودوپٹہ میں نماز پڑھے، عطاء نے قمیص، تہبند ودوپٹہ تین کپڑوں کے لئے کہا، ابن سیرین نے چادر کا اضافہ کرکے چار کپڑے بتلائے، ابن المنذر نے کہا کہ تمام بدن چھپائے بجز چہرہ[1] اور ہتھیلیوں کے، خواہ ایک کپڑے سے یہ غرض حاصل ہوجائے یا زیادہ سے میں سمجھتا ہوں کہ متقدمین میں سے کسی نے بھی تین یا چار کپڑوں کا حکم نہیں کیا، بجز استحبابی طور کے، اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن کی رائے ہے کہ عورت کا سارا بدن مستور ہونا چاہیے حتیٰ کہ ناخن بھی، اور یہ ایک روایت امام احمدؒ سے بھی ہے امام مالک وشافعیؒ نے قدم عورت کو واجب الستر قرار دیا ہے، اگر نماز میں قدم یا بال کھلے ہوں تو امام مالکؒ کے نزدیک جب تک اس نماز کا وقت باقی ہے اس کا اعادہ ضروری ہے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اعادہ ہمیشہ کیلئے ضروری ہوگا، امام ابوحنیفہ وثوری نے عورت کے قدم کو واجب الستر قرار نہیں دیا، لہذا قدم کھلے اگر نماز پڑھ لے گی تو نماز میں کوئی خرابی نہیں ہوگی، لیکن اس میں امام صاحبؒ سے دوسری روایت بھی ہے (عمدہ ۲/۲۵۵)

محقق عینیؒ نے امام ابوحنیفہ وجمہور کا مذہب تو نقل کیا مگر ان کی طرف سے حدیث الباب کا جواب نہیں دیا اگرچہ ضمناً ابن المنذر کی بات سے جواب ہوجاتا ہے کہ کسی نے بھی ایک سے زیادہ کپڑے کیلئے وجوبی حکم نہیں دیا ہے، حافظؒ نے اس موقع پر اس طرح لکھا:۔ ابن المنذر نے جمہور کا قول درع وخمار میں وجوبِ صلوٰۃ کا نقل کرکے لکھا کہ اس سے مراد بدن اور سر کا ضروری طور سے چھپانا ہے، پس اگر ایک ہی کپڑا اتنا بڑا ہو جس سے سارا

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام اعظمؒ کا اصل مذہب یہی ہے کہ کفین ووجہ کا نماز کے اندر اور باہر بھی چھپانا فرض نہیں ہے اور نظر بھی ان کی طرف جائز ہے، مگر اربابِ فتویٰ نے فسادِ زمانہ کی وجہ سے انکو بھی چھپانے کا فتویٰ دے دیا ہے (العرف ۱۷۴)

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱/۱۴۲ میں امام شافعیؒ کا مذہب نماز کے اندر تو وجہ وکفین کے استثناء ہی کا ہے، مگر نماز کے علاوہ وجہ وکفین کو بھی اجنبی کے سامنے کھولنا جائز نہیں۔ ''مؤلف''

بدن اور اسکے باقی حصہ سے سر بھی چھپ سکے تو نماز درست ہو جائے گی پھر کہا کہ عطاء وغیرہ کے اقوال بھی استحباب پر محمول ہیں (فتح ۱/۳۴۸)!

جماعتِ نمازِ صبح کا بہتر وقت

محقق عینیؒ نے لکھا:۔حدیث الباب سے امام مالک، شافعیؒ، احمد و اسحٰقؒ نے نماز صبح کیلئے افضل وقت اندھیرے میں پڑھنے کا اختیار کیا ہے، اور حنفیہ کے لئے (جو اسفار میں یعنی صبح کو اچھی روشنی میں جماعت کو افضل کہتے ہیں) بہت سی احادیث ہیں جو ایک جماعتِ صحابہ سے مروی ہیں، ان میں سے ابوداؤد کی حدیثِ رافع ابن خدیج بھی ہے جس میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے،

اصبحوا بالصبح الحدیث ۔(صبح کی نماز خوب صبح ہو جانے پر ادا کیا کرو، اس سے تمہیں اجر عظیم ملے گا) ترمذی نے بھی اس حدیث کی روایت و تحسین کی ہے، نسائی و ابن ماجہ میں اصبحوا بالصبح مروی ہے اور ایک روایت اصبحوا بالفجر کی ہے ابن حبان نے اسفروا بصلوۃ الصبح فانہ اعظم للاجر اور فکلما اصبحتم بالصبح فانہ اعظم لاجرکم کے الفاظ روایت کئے ہیں طبرانی میں فکلما اسفر تم بالفجر فانہ اعظم للاجر مروی ہے اس کے بعد عینی نے دوسرے صحابہ کی احادیث بھی نقل کی ہیں اور اسفارِ حنفیہ کو عمدہ دلائل سے ثابت کیا ہے، پھر محدث ابن ابی شیبہؒ سے حضرت ابراہیم نخعیؒ کا یہ قول نقل کیا:۔

''اصحابِ رسول اکرم ﷺ کسی امر پر ایسے مجتمع نہیں ہوئے جیسے کہ صبح کی نماز روشنی میں پڑھنے پر جمع ہوئے ہیں'' اس قول کو امام طحاویؒ نے شرح الآثار میں بہ سندِ صحیح نقل کر کے لکھا کہ یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے کہ صحابہ کرام حضور اکرم ﷺ کے خلاف کسی امر پر مجتمع ہو جائیں۔

حافظ ابن حزم کے طرزِ استدلال پر نقد

محقق عینیؒ نے موصوف کا قول نقل کیا کہ اسفار کی حدیث تو ضرور صحیح ہے مگر اس سے استدلال اس لئے نہیں کرنا چاہیے کہ خود حضور علیہ السلام کا عمل اندھیرے میں نمازِ صبح پڑھنے کا ثابت ہے، اس کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ صرف حضور علیہ السلام کے عمل سے افضلیت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ ہو سکتا ہے اس کے سوا دوسری بات افضل ہو مگر امت کی وسعت و سہولت کے پیش نظر اسکو اختیار فرمایا ہو، برخلاف اس کے جو بات حضور علیہ السلام کے قول ارشاد سے ثابت ہو گئی (اور اس کا اقرار حافظ ابن حزم نے بھی کیا ہے) وہی فیصلہ کن ہونی چاہیے الخ (عمدہ ۲/۲۵۶)!

نطقِ انور! حضرتؒ نے فرمایا:۔بظاہر ابتداءِ عہد نبوی میں نمازِ صبح غلس میں ہوتی تھی اگرچہ اس قدر غلس اور اندھیرے میں نہیں جو امام شافعیؒ کا مسلک ہے، وجہ یہ کہ وہ زمانہ شدت عمل کا تھا (جلیل القدر صحابہ اسلام لائے تھے جو اعلیٰ کمالاتِ نبوت کا مظہر بنے تھے، پھر وہ حضرات نمازِ تہجد کی بھی پابندی کرتے تھے، لہذا صبح کی نماز جماعت کے ساتھ بہ آسانی پڑھ لیتے تھے، پھر جب اسلام پھیلا اور بہ کثرت لوگ اسلام میں داخل ہو گئے، اور مجموعی طور سے ان میں (بہ نسبت سابقین اولین کے) ضعف[1] ظاہر ہوا تو نمازِ صبح میں اسفار پر عمل ہونے لگا، تاکہ جماعت میں کمی نہ ہو۔

---

[1] حضرتؒ کا اشارہ سورۂ انفال کی آیت الآن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفا کی طرف ہے کہ ابتداءِ ہجرت میں گنے چنے مسلمان تھے جن کی غیر معمولی قوت و جلادت (دلیری و بہادری) اور صبر و استقامت معلوم تھی، ان کیلئے حکم تھا کہ دس گنے کفار کے مقابلہ میں بھی ثابت قدم رہ کر لڑیں، پھر جب بہ کثرت مسلمان ہو گئے تو وہ بات نہ رہی اور ضعف آ گیا اس لئے صرف دوگنی تعداد کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا ضروری اور بھاگنا حرام ہوا، حضرت علامہ عثمانیؒ نے فوائد ۲۳۹ میں لکھا:۔طبیعتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جو سخت کام تھوڑے آدمیوں پر پڑ جائے تو کرنے والوں میں جوشِ عمل زیادہ ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرتا ہے لیکن وہی کام جب بڑے مجمع پر ڈال دیا جائے تو ہر ایک دوسرے کا منتظر رہتا ہے، اور جوش حرارت اور ہمت میں کمی ہو جاتی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے فرمایا کہ اوّل کے مسلمان یقین میں کامل تھے، ان پر حکم ہو گیا کہ دس گنے کافروں پر جہاد کریں، پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے اس لئے حکم ہوا کہ دوگنوں پر جہاد کریں۔یہی حکم اب بھی باقی ہے لیکن اگر اس سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔حضور علیہ السلام کے وقت میں ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔غزوۂ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ بحمد اللہ بھری پڑی ہے۔

پس اگر اب بھی کوئی ایسا موقع ہو کہ سب لوگ ایک جگہ موجود ہوں اور جماعت کے لئے بہ سہولت جمع ہوسکیں تو غلس میں نماز پڑھی جائے گی، جیسا کہ مبسوطِ سرخسی باب التیمم میں ہے۔ اور بخاری باب وقت الفجر ۸۲ میں سہل بن سعد کی حدیث آئیگی کہ میں گھر میں سحری کھاتا تھا، پھر جلد ہی مسجد میں پہنچتا تھا تا کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ صبح کی جماعت میں شریک ہوجاؤں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ تغلیس رمضان میں ہوتی تھی، اوراس کا دستور ہمارے یہاں دارالعلوم دیوبند میں بھی اکابرؒ کے زمانہ سے ہے۔[1]

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت ابوبکر وعمرؓ کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ جماعت فجر کی ابتداءً غلس میں اور انتہاء اسفار میں ہوتی تھیں۔ اور اسی کو امام طحاویؒ نے اختیار کرلیا ہے، پھر حضرت عثمانؓ کے دور میں پوری نماز اسفار میں ہونے لگی تھی، جس کو متاخرین حنفیہ نے اختیار کیا ہے۔

بَابُ اِذَا صَلّٰی فِیْ ثَوْبٍ لَّهٗ اَعلامٌ وَنَظَرَ اِلٰی عَلَمِهَا

(ایسے کپڑے میں نماز پڑھنے کا بیان، جس میں نقش ونگار ہوں اوران پر نظر پڑے)

(۳۶۳) حدثنا احمد بن یونس قال انا ابراھیم بن سعید قال حدثنا ابن شھاب عن عروۃ عن عآئشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی فی خمیصۃ لھا اعلام فنظر الیٰ اعلامھا نظرۃً فلما انصرف قال اذھبوا بخمیصتی ھٰذا الیٰ ابی جھم واتونی بانبجانیۃ ابی جھم فانھا الھتنی انفاعن صلوٰتی وقال ھشام ابن عروۃ عن ابیہ عن عآئشۃ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کنت انظر الیٰ علمھا و انا فی الصلوٰۃ فاخاف ان یفتننی.

ترجمہ! حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک ایسی چادر میں نماز پڑھی، جس میں نقش ونگار تھے آپ کی نظر اس کے نقوش کی طرف پڑی تو جب آپ فارغ ہوئے، تو فرمایا، کہ میری اس چادر کو ابوجہم کے پاس لے جاؤ اور مجھے ابوجہم سے انبجانیہ چادر لادو، کیونکہ اس خمیصہ چادر نے ابھی مجھے میری نماز سے غافل کردیا (اور ہشام کی روایت میں ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ میں نماز میں اس کے نقش پر نظر کرتا رہا، لہذا مجھے یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں یہ فتنہ میں نہ ڈال دے۔

تشریح! حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ جس کپڑے میں نقش ونگار ہوں اور نماز میں ان کی طرف دھیان بٹے تو نماز تو ایسا کپڑا پہن کر ہوجائے گی، مگر بہتر نہیں، کیونکہ خشوع وخضوع صلوٰۃ کے خلاف ہے چنانچہ حضور علیہ السلام نے بھی ایسا ہی کیا کہ نماز تو پڑھ لی مگر اس کپڑے کو واپس کردیا۔

محقق عینیؒ نے لکھا: معلوم ہوا کہ معمولی درجہ کا فکری اشتغال مانعِ صلوٰۃ نہیں اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے ابن بطالؒ نے فرمایا: معلوم ہوا کہ نماز میں اگر نماز سے باہر کی کسی چیز کا بھی خیال آجائے گا تو نماز درست ہوجائے گی اور بعض سلف سے جو منقول ہے کہ اس سے نماز کی صحت پر اثر پڑے گا، وہ معتبر نہیں، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں خشوع اور پوری طرح اسی طرف دل کا متوجہ ہونا مطلوب ہے، لہذا حتی الامکان اپنے ارادہ سے دوسرے خیالات نہ آنے دے اور جو خود آجائیں ان کی طرف توجہ نہ دے۔

نیز معلوم ہوا کہ مسجد کی محراب اور دیواروں کو بھی نقش ونگار وغیرہ سے آراستہ کرنا بہتر نہیں کیونکہ نمازی کا دل اُن کی طرف متوجہ ہوگا اور کرتے کی آستین (ودامن وغیرہ) پر بھی نقش ونگار کرانا بہتر نہیں (جن کے ساتھ نماز پڑھے گا) یہ بھی معلوم ہوا[2] کہ ظاہری چیزوں کی شکلوں وصورتوں کے

---

[1] اس دستور کے ساتھ غالبًا یہ اضافہ مستحدث وغیر مستحسن ہے کہ اوّل وقت نمازِ صبح ادا کرکے ۸۔۹ بجے تک سوتے بھی ہیں کیونکہ الصبحۃ تمنع الرزق (صبح کے وقت سونا رزق کو کم کرتا ہے) اسلئے اگر اشراق تک ذکر وتلاوت میں مشغول ہوں اور بعد طلوع آفتاب یا دوپہر کے وقت سوئیں تو بہتر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔ ''مؤلف''

[2] اس سے آج کل کی فلم بینی اور مصور رسالوں کی عریاں تصاویر کا بھی حکم معلوم ہوا کہ ان چیزوں کے بُرے اثرات ونتائج سے تو کسی طرح انکار ہو ہی نہیں سکتا، انسان کے اندر حق تعالیٰ نے پانچ لطیفے عالم امر ومجردات کے ودیعت رکھے ہیں، یہ لطائف اعلیٰ ترین قسم کے آئینوں سے مشابہ ہیں جو عالم خالق ومادیات کے ادنیٰ ترین غبار سے بھی دھندلے ہوجاتے ہیں، اس لئے ان کو ہر غیر مباح صورت کے عکس وپرتو سے بچانا قلوب ونفوس کی سلامتی وصفائی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اثرات مقدس نفوس اور مزکی قلوب پر بھی پڑتے ہیں چہ جائیکہ کم درجہ کے نفوس و قلوب پر، (کہ ان پر تو اثر اور بھی زیادہ ہوگا) (عمدہ ۲/۲۶۰)

سوال و جواب: محقق عینیؒ نے عنوانِ مذکور کے تحت لکھا: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو **ما زاغ البصر وما طغیٰ** تھی جو شبِ معراج کے سلسلہ میں بتلائی گئی۔ اور اُس سے ظاہر ہوا کہ آپ مناجاتِ خداوندی کے وقت اکوان و اشیاءِ عالم کی طرف سے قطعاً یکسو ہو جاتے تھے، پھر کیونکر آپ کے بارے میں یہ خیال کیا جائے کہ کپڑے کے نقش و نگار کی وجہ سے آپ کو فتنہ و آزمائش میں پڑنے کا ڈر رہا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شبِ معراج میں آپ اپنے بشری مقتضیات و طباع سے الگ ہو گئے تھے، جس طرح آپ کا آگے کی جانب دیکھنے کی طرح اپنے پیچھے[1] دیکھنا بھی ثابت ہے، پھر جب طبیعتِ بشری کی طرف رجوع ہوتا تھا تو آپ کے اندر بھی دوسروں کی طرح بشری مؤثرات و مقتضیات پائی جاتی تھیں۔

دوسرا ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ مراقبہ کی حالت میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے متبعین تک کو بھی یہ صورتیں پیش آئی ہیں کہ ان کو کسی دوسری طرف کا خیال و دھیان تک نہ آیا، حتی کہ مسلم بن یسار کے قریب میں مکان کی چھت گر گئی اور ان کو خبر نہ ہوئی، پھر حضور علیہ السلام کو نقش و نگار کی طرف خیال و توجہ کیسے ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ اس وقت اپنی طباعِ بشریہ سے نکال لئے جاتے ہیں، لہٰذا ان کو اپنے وجود کی بھی خبر نہیں رہتی، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ تھی کہ کبھی تو آپ طریقِ خواص پر چلتے تھے، اور کبھی غیرِ خواص پر، اسی لئے جب پہلے طریق

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ مکن ایدا سے بتاں! خراب دلم آخر ایں خانہ را خدائے ہست

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ اپنے مواعظ میں بھی یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔ قلبِ مومن خانہ خداوند تعالیٰ ہے اسکو ناجائز خواہشات کا مرکز بنا کر تباہ و برباد نہ کرنا چاہیے واضح ہو کہ جہاں قلبِ مومن کی وسعت پہنائی بے پایاں ہے قلب کافر و مشرک کی تنگی و تنگنائی کی بھی حد نہیں ہے۔

تحقیق حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ! حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ نے حدیث "لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن" کی خوب تشریح فرمائی ہے اور اس بارے میں قلبِ مومن و کافر کا فرق بھی واضح کیا ہے کہ قلبِ مومن لامکانی اور چندی و چونی سے مبرّا ہے اس لئے اس میں ذاتِ اقدس لامکانی کی گنجائش ہے، قلبِ کافر و لامکانی سے اتر کر گرفتارِ چندی و چونی ہو چکا ہے، اور اس نزول و گرفتاری کے سبب اس نے دائرہ مکانی میں داخل ہو کر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو ضائع کر دیا ہے۔ "اولئک کالانعام بل ھم اضل" عرش بھی اپنی غیر معمولی وسعت، عظمت و فراخی کے باوجود چونکہ مکانی ہے لامکانی روح کے مقابلہ میں دانہ رائی کے برابر بلکہ اس سے بھی کم حیثیت رکھتا ہے بلکہ قلبِ مومن چونکہ محلِ انوارِ قدم و ازل ہوا اور اس نے قدیم و ازلی (خداوند تعالیٰ) کے ساتھ بقاء حاصل کیا ہے، عرش اور جو کچھ اس کے احاطہ میں ہے اگر اس میں گر جائے تو محو و گم ہو جائے، اور کچھ نشان اس کا باقی نہ رہے، ملائکہ بھی یہ خصوصیت نہیں رکھتے جو قلبِ مومن کو حاصل ہے کیونکہ وہ بھی داخلِ دائرہ مکان اور چونی و چندی کے ساتھ متصف ہیں اسی لئے انسان خلافتِ رحمان کا مستحق ہوا۔ (مکتوبات ۵/۷۰)

عالمِ خلق و عالمِ امر! حضرت مجدد صاحبؒ اور دوسرے حضرات صوفیہؒ نے عالمِ خلق سے مراد جسمانی عالم قرار دیا یعنی عرش اور اس سے نیچے کا تمام حصہ آسمان و زمین وغیرہ، اور عالمِ امر سے مراد مجردات کا عالم جو عرش سے اوپر ہے۔

اُسی عالمِ امر سے انسان کے پانچ لطائف (قلب، روح، سر، خفی و اخفی) ہیں جن کے تزکیہ، جلاء و تنویر سے سلوکِ نقشبندیہ کی ابتداء ہوتی ہے حضرت محدث پانی پتیؒ نے آیت "الا لہ الخلق والامر" کے تحت یہی تشریح کی ہے (تفسیر مظہری ۳/۳۷۷ مطبوعہ برہان دہلی) اور حضرت تھانویؒ نے اسی آیت کے تحت تفسیر بیان القرآن میں لکھا: ابن ابی حاتم کی روایت حضرت سفیان سے روح المعانی ۸/۱۳۸ میں ہے کہ خلق تو ماتحت العرش کے لئے اور امر عرش سے اوپر کے واسطے، اور بعض حضرات کے یہاں عالم امر کا اطلاق عالم مجردات پر شائع و ذائع ہے، صوفیہ نے جو لطائف کو عالم امر سے کہا ہے اور اس کو فوق العرش بھی کہا ہے اس سے اس کی اصل نکل آئی، یعنی فوق العرش کی تفسیر یہی ہے کہ وہ مادیات سے نہیں۔ (تفسیر بیان القرآن ۸/۵۶) حضرت علامہ عثمانیؒ نے بھی فوائد ۳۷۶ میں عالمِ خلق و عالمِ امر سے متعلق تحقیق "روح" کے سلسلہ میں عمدہ نوٹ دیا ہے۔

غالباً سفیان مذکور وہ سفیان بن عیینہ (م ۱۶۸ھ) ہیں جو بہت بڑے محدث تھے، امام احمد، امام شافعی، امام محمد و اصحابِ صحاح ستہ کے استاذ اور حضرتِ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے تلمیذِ حدیث تھے۔ "مؤلف"!

[1] ممکن ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہونا بھی اسی قبیل سے ہو کہ بعض آثار کی بناء پر حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ نے اس کو تحریر فرمایا، اور بہت سے دوسرے حضرات نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ **والعلم عنداللہ العلیم الخبیر** ۔ "مؤلف"!

پر ہوتے تو فرماتے "لست کاحدکم" (میں تمہاری طرح نہیں ہوں) اور جب دوسری طریق پر ہوتے تو فرماتے تھے "انما انا بشر" (میں بھی تم جیسا بشر ہی ہوں) اس وقت آپ اپنی طبعی حالت کی طرف لوٹا دیئے جاتے تھے (عمدہ ۲۶۰/۲)

ایک اشکال وجواب

امام بخاریؒ کی موصول حدیث الباب میں ہے کہ حضور علیہ السلام نقش ونگار کی طرف متوجہ ہوئے، پھر مقطوع روایت میں فتنہ میں پڑنے کا ڈر ذکر ہے، اس پر حافظ اور دوسرے شارحین قسطلانیؒ وغیرہ نے دونوں باتوں کو متضاد خیال کر کے تاویل کی ہے اور پہلی بات کا انکار کر کے اس کا مطلب دوسرے جملہ کے مطابق قرار دیا ہے یعنی غفلت بھی پیش نہیں آئی،

اس پر حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے بہت اچھا نقد کیا کہ تمام علماء نے اسی حدیث سے تو نماز میں اس سے غیر متعلق فکر وخیال آ جانے پر بھی نماز کی صحت پر استدلال کیا ہے پس اگر کسی درجہ میں بھی غفلت پیش نہیں آئی اور صرف اس کا خوف وخطرہ ہی تھا تو استدلال مذکور کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ لہذا بہتر توجیہ اور صورتِ تطبیق یہ ہے کہ الہاء کا تحقق ووجود تو مان لیا جائے، مگر وہ فتنہ میں پڑنے سے بہت کم درجہ کا تھا، جس میں غیر متعلق خیال وفکر میں استغراق کی صورت ہوتی ہے، اور وہ صورت حضور علیہ السلام کے لئے پیش بھی نہیں آئی۔ اگرچہ آپ کو اس کا ڈر ضرور ہوا،

اس کے بعد آپ نے تقریرابی داؤد سے یہ توجیہ وجیہ بھی نقل کی کہ ہوسکتا ہے حضور علیہ السلام کی نقش ونگار کی طرف وہ توجہ حق تعالیٰ جل ذکرہٗ کی عجیب صنعت کا فکر وخیال ہو جس کو آپ نے اپنے مرتبہ عالیہ کی نسبت سے ایک درجہ کا نقص خیال فرمایا ہوگا، اور اس کے اشتغال سے یہ لازم نہیں کہ آپ حضور جنابِ باری کی طرف سے غافل ہوگئے ہوں، چنانچہ اس قسم کی بات ہم بہت سے لوگوں میں مشاہدہ بھی کرتے ہیں کہ وہ دو کاموں میں بیک وقت مشغول ہوتے ہیں اور کسی ایک امر کی ادائیگی میں بھی نقص واقع نہیں ہوتا۔ (لامع ۱۴۷/۱)!

نطقِ انور! حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ کسی امر میں اس اقدر مشغول ومستغرق ہوجائیں کہ ان کو دوسری چیزوں کی حس وشعور ہی باقی نہ رہے اسی لئے جب حضور علیہ السلام کے نماز پڑھتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ دا ہنی جانب کھڑے ہوگئے تو آپ نے نماز ہی میں ان کو گھما کر دائیں جانب کھڑا کرلیا تھا اُن حضرات کی یہ شان تھی، یہ تحقیق حافظ عینیؒ کی تحقیق مذکور سے مختلف ہے لیکن تمام ہی جوابات مذکورہ میں اعلیٰ علمی تحقیقی وتدقیقی شان موجود ہے رحمهم الله تعالىٰ رحمة واسعة۔

مسئلہ! حضرتؒ نے فرمایا:۔ فقہ حنفی میں ہے کہ مالِ وقف سے اگر کوئی شخص مسجد میں نقش ونگار کردے تو ضامن ہوگا لیکن میرے نزدیک یہ جب ہے کہ وقف کنندہ کی مرضی نہ ہو اور خلافِ مرضی نقش پر صرف کیا گیا ہو، اس لئے اگر اس کی اجازت ومرضی سے ہو تو ضامن نہ ہوگا۔

(فیض الباری ۱۸/۲ میں حضرتؒ کی رائے مذکور درج ہونے سے رہ گئی ہے)

بَابُ اِنْ صَلّٰی فِی ثَوْبٍ مُّصَلَّبٍ اَوْ تَصَاوٍ

اگر کسی کپڑے میں صلیب یا دیگر تصاویر بنی ہوں اور اس میں نماز پڑھے تو کیا اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور اس بارے میں ممانعت کا بیان،

(۳۶۴) حدثنا ابو معمر عبدالله بن عمرو قال ناعبدالوارث قال ناعبدالعزیز بن صهیب عن انس قال کان قرام العآئشة سترت به جانب بینها فقال النبی صلی الله لعیه وسلم امیطی عناقرامک هذا فانه لا تزال تصاویره تعرض فی صلوتی

ترجمہ! حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک پردہ تھا اسے انہوں نے اپنے گھر کے ایک گوشہ میں ڈال لیا تھا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے سامنے سے اپنا پردہ ہٹا دو اس لئے کہ اس کی تصویریں برابر میرے سامنے نماز کی حالت میں آڑے آتی رہیں۔

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ یہاں مقصود نماز کا مسئلہ ہے تصویر کا مسئلہ بتلانا مقصود نہیں ہے اسی تصویر کے بارے میں تین صورتیں ہیں (۱) تصویر بنانا یا فوٹو لینا یہ حرام ہے، خواہ چھوٹی تصویر ہو یا بڑی (۲) نماز کی حالت میں تصویر کا حکم اس میں یہ تفصیل ہے کہ پامال اور حقیر حالت کی تصاویر اور جو بہت ہی چھوٹی ہوں درجہ جواز میں ہیں، باقی سب مکروہ (۳) تصویر وصلیب والے کپڑے کا پہننا بھی مکروہ ہے زیادہ تفصیل فتح القدیر (مکروہات صلوٰۃ) میں ہے جو زیلعی سے ماخوذ ہے اور موطاء امام محمد میں بھی ہے، قرام:۔ پتلا کپڑا، تصویر:۔ جاندار کی ہوتی ہے تمثال:۔ عام ہے جاندار کی بھی ہوتی ہے اور غیر جاندار کی بھی (فتح الباری ۳۲۹/۱ عمدہ ۲/۲۶۲) میں قرام کے معنی ہلکا اور پتلا پردہ رنگ برنگ کا)

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا:۔ صلیب کی شکل — اس طرح ہے اور دائرۃ المعارف میں بہت سی شکلیں لکھی ہیں تقریباً ۱۶۔۱۷ قسمیں ہیں۔

محقق عینیؒ نے لکھا:۔ شافعیہ کے نزدیک تمام تصاویر مطلقاً مکروہ ہیں، خواہ وہ کپڑوں پر ہوں یا فرش وزمین وغیرہ پر، کوئی فرق نہیں کیا، کیونکہ انہوں نے ممانعت کی عام احادیث سے استدلال کیا ہے، ائمہ حنفیہ، امام مالک، امام احمد (ایک روایت میں) اور محدث ثوری ونخعی کے نزدیک جو تصاویر زمین پر بچھائی جانے والی چیزوں پر ہوں، وہ ممانعت سے خارج ہیں کیونکہ وہ پاؤں میں روندی جاتی ہیں اور حقیر وذلیل ہوتی ہیں۔ محدث ابو عمرؒ نے ابوالقاسم سے نقل کیا کہ امام مالکؒ قبوں اور گنبدوں وغیرہ کے اوپر کی تصاویر کو مکروہ بتلاتے تھے، فرشوں اور کپڑوں کی تصاویر میں کچھ حرج نہ سمجھتے تھے، البتہ جس قبہ میں تماثیل ہوں اس کی طرف نماز کو بھی مکروہ فرماتے تھے۔ اور یہ سب حضرات لٹکائے ہوئے پردوں کی تصاویر کو بھی مکروہ فرماتے تھے۔ فرشوں میں جواز کی دلیل یہی حدیث الباب ہے جو نسائی شریف میں یہ تفصیل ذیل مروی ہے:۔

حضرت عائشہؓ کے اس پردہ کو جو انہوں نے گھر کے ایک حصہ میں لٹکا رکھا تھا اور جس کی طرف حضور علیہ السلام نے نماز پڑھ کر ناگواری کا اظہار فرمایا تھا، آپ نے اتار کر دو ٹکڑے کر دیئے جو دو تکیوں کے غلاف بنے اور حضور علیہ السلام ان پر تکیہ لگا کر آرام فرماتے تھے، دوسرے الفاظ یہ ہیں:۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے گھر میں تصویروں والا ایک کپڑا تھا، جو میں نے گھر کے ایک حصہ پر ڈال دیا، حضور علیہ السلام نے اس کی طرف نماز پڑھی تو فرمایا عائشہ! اس کو اُتار دو، اس کو دیکھ کر دنیا کے خیالات میرے سامنے آگئے، آپ کے اس فرمان کے بعد میں نے اس کپڑے سے تکیے بنا لئے۔ الخ (عمدہ ۲/۲۶۲)!

معلوم ہوا کہ شریعت کا منشا تصاویر ومجسموں کی بے توقیری ہے اور ان کو عزت ومحبت کے مقام سے گرانا ہے، لہذا ہر وہ صورت جس سے ان کی تعظیم ہوتی ہو ممنوع ہوگی، اور جس سے اہانت ہوگی، وہ مطلوب، باقی مجسمے یا تصاویر بنانا یا فوٹو لینا بہر صورت ناجائز وحرام ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کی مشابہت کے علاوہ عبادتِ غیر اللہ اور بہت سے مفاسد، برائیوں وبد اخلاقیوں کا جو دروازہ کھلتا ہے اس سے کوئی منصف عاقل انکار نہیں کرسکتا۔ اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه، وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه!

---

[۱] اسی سے دیوار قبلہ میں لٹکائے جانے والے کتبات کا مسئلہ بھی سمجھا جائے!" مؤلف"

بَابُ مَنْ صَلّٰے فِیْ فَرُّوْجِ حَرِیْرٍ ثُمَّ نَزَعَه'

(حریر کا جبہ یا کوٹ پہن کر نماز پڑھنا پھر اس کو (مکروہ سمجھ کر) اتار دینا)

(۳۶۵) حدثنا عبدالله بن یوسف قال اللیث عن یزید عن ابی الخیر عن عقبة بن عامر قال اھدی النبی صلی الله علیه وسلم فروج حریر فلبسه' فصلی فیه ثم انصرف فنزعه' نزعاً شدیداً اکالکاره له' و قال لا ینبغی ھٰذا للمتقین.

ترجمہ! حضرت عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک جبہ ہدیہ کیا گیا، آپ نے اسے پہن لیا، اور اس میں نماز پڑھی، جب فارغ ہوئے تو اس زور سے کھینچ کر اتار ڈالا، گویا آپ نے اسے مکروہ سمجھا، اور فرمایا کہ پرہیزگاروں کو یہ (کپڑا) زیبا نہیں۔

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے ''فروج'' کا ترجمہ کوٹ کیا، اور فرمایا کہ مسلم شریف میں قباءِ دیباج کا ذکر ہے۔ نہانی جبریل سے معلوم ہوا کہ آپ کی یہ نماز ریشمی کپڑا پہننے کی حرمت سے قبل تھی اور شاید یہ آپ کا نہی سے قبل اُس قباءِ حریر کو اُتار دینا اس لئے ہوگا کہ آپ تحریم ممانعت سے پہلے بھی حق تعالیٰ کی مرضیات ہی پر نظر رکھتے تھے۔

محقق عینی رحمہ اللہ کے افادات

فروج وقبا دونوں حسب تحقیق علامہ قرطبی ایسے کپڑے تھے، جن کی آستینیں تنگ، کمر چست ہوتی تھی، اور ان کے پیچھے شگاف ہوتا تھا، یہ لباس حرب و جنگ اور سفر کے لئے مناسب تھا۔

راویِ حدیث لیث بن سعد کے متعلق کرمانی (شارحِ بخاری) نے کہا کہ خلیفہ منصور عباسی نے ان پر ولایتِ مصر پیش کی، مگر انہوں نے قبول نہ کی میں کہتا ہوں کہ کچھ دنوں تک ان کا ولایت کے عہدہ پر رہنا بھی نقل ہوا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر تھے۔

حدیث الباب میں ہے کہ جس قباءِ حریر کو پہن کر حضور اکرم ﷺ نے نماز پڑھی تھی، وہ آپ کو ہدیۃً ملی تھی، عینیؒ نے لکھا کہ اس کو دومۃ الجندل کے بادشاہ، اکیدر بن عبدالملک نے ہدیہ کیا تھا، ابونعیم نے ذکر کیا کہ وہ اسلام لے آیا تھا اور حضور اکرم ﷺ کے لئے دھاریدار ریشمی چادروں کا جوڑا بطور ہدیہ بھیجا تھا، لیکن ابن الاثیر نے کہا کہ اس نے حضور اکرم ﷺ کے لئے ہدیہ ضرور بھیجا تھا، اور آپ نے مصالحت بھی کر لی تھی، مگر اسلام نہیں لایا تھا اس میں اہل سیر کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور جس نے اس کے اسلام لانے کا بھی ذکر کیا اس نے کھلی غلطی کی ہے وہ نصرانی تھا اور جب حضور اکرم ﷺ نے اس سے مصالحت فرمالی تو وہ اپنے قلعہ کی طرف لوٹ گیا تھا، پھر وہیں رہا تا آنکہ حضرت خالدؓ نے اس کو دورِ خلافتِ صدیقی میں دومۃ الجندل کے محاصرہ کے وقت قید کیا اور بحالتِ شرک و نصرانیت ہی قتل کرا دیا۔

دومۃ الجندل ایک قلعہ تھا جو شام و عراق کی سرحد پر تھا، دمشق سے ۷ مرحلے دور (۱۱۲ میل) اور مدینہ طیبہ سے ۱۲ مرحلے (۲۰۸ میل) پر (عمدہ ۲/۲۶۴) نقشہ میں تبوک کا فاصلہ بھی مدینہ طیبہ سے ۱۳ مرحلے کا ہی معلوم ہوتا ہے، جہاں تک حضور اکرم ﷺ رجب ۹ھ میں ۳۰-۴۰ ہزار صحابہ کرامؓ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

اُکیدر کا اسلام! ''صدیق اکبر'' (مطبوعہ برہان) اور بعض دوسری اردو کتابوں میں بھی چھپ گیا ہے کہ اکیدر مدینہ طیبہ حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ وہ بغاوت وارتداد کے باعث قتل کیا گیا تھا، مگر جیسا کہ ہم نے محقق عینیؒ سے نقل کیا یہ بات صحیح نہیں ہے، اور صحیح یہی ہے کہ وہ عہد شکنی اور جزیہ ادا کرنے سے انکار پر قتل ہوا تھا۔

دومتہ الجندل کے واقعات

ربیع الاول ۵ھ میں غزوۂ دومتہ الجندل کا واقعہ پیش آیا، یعنی حضور علیہ السلام کو خبر پہنچی کہ وہاں کفار کا جم غفیر اس لئے جمع ہو رہا ہے کہ "مدینہ طیبہ" پر حملہ کرے، اس لئے آپ ایک ہزار صحابہ کرام کے ساتھ اس طرف روانہ ہوئے، راستہ میں معلوم ہوا کہ ایسا اہم کوئی اجتماع نہیں ہے بعض نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب حضور کی خبر آمد سن کر منتشر ہو گئے اس لئے آپ لوٹ آئے، اس کے بعد سریہ دومتہ الجندل کا واقعہ ہوا، جس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف[1] شعبان ۶ھ میں وہاں تشریف لے گئے، اور وہاں کے عیسائیوں میں تین روز تک وعظ و تبلیغ فرماتے رہے، جس سے وہاں کا سردار مسلمان ہو گیا تھا، تیسرا واقعہ سریہ دومتہ الجندل کا ۹ھ میں پیش آیا جس میں حضور اکرم ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت خالدؓ کو وہاں بھیجا تھا، آپ نے وہاں کے حاکم اکیدر کو قید کر کے حضور علیہ السلام کی خدمت میں مدینہ طیبہ بھیج دیا تھا، آپ نے اس کی جان بخشی کی اور جزیہ ادا کرنے کے وعدہ پر اس کا علاقہ اسی کے سپرد کر دیا تھا۔ چوتھا واقعہ دور خلافتِ صدیقی (۱۲ھ) میں پیش آیا ہے کہ حضرت خالدؓ نے دومتہ الجندل کا قلعہ فتح کر کے اس کے دونوں سردار اکیدر اور جودی بن ربیعہ کو قتل کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

بَابُ الصَّلٰوۃِ فِی الثَّوْبِ الْاَحْمَرِ!

(سُرخ کپڑے میں نماز پڑھنے کا بیان)

(۳۶۶) حدثنا محمد بن عرعرة قال حدثنی عمر بن ابی زآئدة عن عون بن ابی جحیفة عن ابیه قال رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قبة حمرآء من ادم ورایت بلالاً اخذ وضوٓء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورایت الناس یبتدرون ذٰلک الوضوٓء فمن اصاب منه شیئاً تمسح به و من لم یصب منه شیئاً اخذ من بلل ید صاحبه ثم رایت بلالاً اخذ عنزة له' فرکذها و خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حلة حمرآء مشمراً صلی الی العنزة بالناس رکعتین ورایت الناس والدوآب یمرون من بین یدی العنزة

ترجمہ! حضرت ابو جحیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو چمڑے کے ایک سرخ خیمہ میں دیکھا، اور بلال کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے رسولِ خدا ﷺ کے لئے وضو کا پانی مہیا کیا، اور لوگوں کو دیکھا کہ وہ اس وضو (کے پانی) کو ہاتھوں ہاتھ لینے لگے، چنانچہ جس کو اس میں سے کچھ مل جاتا تو وہ اسے (اپنے چہرہ پر) مل لیتا تھا، اور جسے اس میں سے کچھ نہ ملتا وہ اپنے پاس والے کے ہاتھ سے تری لے لیتا، پھر میں نے بلال کو دیکھا کہ انہوں نے ایک غزہ (شیامدار ڈنڈا) اٹھا کر گاڑ دیا اور نبی کریم ﷺ ایک سُرخ پوشاک میں (اپنی

---

[1] حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بڑے مالدار تجارت پیشہ صحابہ میں سے تھے اور آپ تبلیغ اسلام اور امدادِ مجاہدین و مساکین میں بھی بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، آپ نے حضرت عائشہؓ سے حدیث سُنی کہ مالدار جنت میں گھسٹتے ہوئے داخل ہوں گے (یعنی حسابِ اموال کی وجہ سے دیر لگی گی، تو آپ نے فرمایا کہ میں تو جنت میں کھڑے ہو کر داخل ہوں گا، اور سات سو اونٹوں کو مع ان کے سامانِ تجارت کے اللہ کے راستہ میں دے دیا، غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ نے دو سو اوقیہ سونا (۸ ہزار درہم) چندہ دیا، ایسے ہی ایک موقع پر حضور علیہ السلام کے زمانہ میں چار ہزار درہم صدقہ کئے، پھر چالیس ہزار درہم کا صدقہ کیا، اس کے بعد ضرورت ہوئی تو چالیس ہزار دینار صدقہ کئے، ایک دفعہ پانچ سو اونٹ اللہ کے راستہ میں دیئے، ایک بار ڈیڑھ ہزار اونٹنیاں دیں، پھر پانچ سو گھوڑے جہاد کے لئے دیئے وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ!

ملی و اجتماعی امدادوں کی اہمیت! ضرورت ہے کہ صحابہ کرام کے اسوۂ مبارکہ کو اپنایا جائے، اور ہر ملک کے مسلمان اپنی ملی و اجتماعی ضرورتوں کی غیر معمولی اہمیت کو سمجھیں، صحابہ کرام نے باوجود اپنی غربت و افلاس کے بھی حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں اور بعد کو بھی بیسیوں غزوات و سرایا میں زیادہ سے زیادہ مالی امداد دی، اور تن من دھن کی قربانیاں پیش کیں، جن کی وجہ سے مسلمان تھوڑی سی مدت میں آدھی دنیا پر چھا گئے تھے، اور آج بھی جن قوموں میں ایسا جذبہ ہے، آگے بڑھ رہی ہیں، لیکن موجودہ دور کے مسلمان اپنے اسلاف کے طریقوں کو بھول گئے اور اپنی ذاتی و شخصی منافع کو ملی و اجتماعی مفادات پر ترجیح دینے لگے، جس کی وجہ سے قعرِ مذلت میں گرتے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحیح سمجھ و احساس عطا فرمائے! آمین

چادر) سمیٹتے ہوئے برآمد ہوئے اور عنزہ کی طرف لوگوں کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی، میں نے لوگوں کو اور جانوروں کو دیکھا کہ وہ عنزہ کے آگے سے نکلتے جارہے تھے (اور حضور بدستور نماز ادا فرماتے رہے)

تشریح! مردوں کیلئے سُرخ رنگ کے کپڑے کا استعمال کیسا ہے، اس کو امام بخاریؒ بتلانا چاہتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس بارے میں فقہِ حنفی کے ۷ یا ۸ قول ہیں، مخدوم ہاشم عبدالغفور صاحب سندھی ٹھٹہ والوں نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں سب اقوال نقل کئے ہیں، یہ سب انتشار متاخرین کے یہاں ہوا ہے اگر ہمیں "تجرید القدوری" مل جاتی تو اس پر اقتصار کر لیتے اور اختلاف وانتشار سے بچ جاتے، حافظ ابن تیمیہؒ حنفیہ کی نقول اسی کتاب سے لیتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک یہی سب سے زیادہ معتبر ذریعہ تھا فقہِ حنفی کے لئے۔

میرے نزدیک اس مسئلہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ رنگ اگر عصفر وزعفران کا ہو تو مکروہ تحریمی ہے، ان دونوں کے علاوہ اگر سُرخ گہرے رنگ کا اور شوخ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے، تحریمی نہیں، اور ہلکا ہو تو مکروہ تنزیہی بھی نہیں ہے اور سفید کپڑے پر اگر سرخ دھاریاں ہوں تو وہ بھی بلا کراہت جائز ہے، بلکہ بعض حضرات نے اس کو مستحب بھی کہا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اسکو خود پہنا ہے پھر یہ مسئلہ کپڑے کا ہے چمڑے کا نہیں، (کہ اس کے کسی رنگ میں کراہت نہیں ہے) اور یہ مسئلہ مردوں کے لئے ہے، عورتوں کیلئے سب رنگ بلا کراہت درست ہیں۔

"حلة حمراء" پر فرمایا:۔ یہی موضع ترجمہ ہے، شارحین بخاریؒ نے لکھا کہ اسکی زمین سفید تھی اور اس پر صرف دھاریاں سُرخ تھیں، میں نے تتبع کیا تو احکام القرآن ابن عربی میں اسکے لئے روایت بھی مل گئی، بظاہر شارحین کے سامنے بھی وہی روایت ہوگی، مگر حوالہ نہیں دیا۔

راء یت الناس یبتدرون ذلك الوضوء پر فرمایا:۔ اس سے تبرک بآثار الصالحین ثابت ہوتا ہے یعنی صحابہ کرام کے اس فعل سے کہ حضور اکرم ﷺ کے وضوءِ مبارک کا پانی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے اور ہاتھوں پر لے کر اپنے چہروں پر ملتے تھے، اور اگر کسی کو وہ میسر نہ ہوتا تھا تو دوسروں کے ہاتھوں کی تری سے اپنے ہاتھ مل کر تبرک حاصل کرتا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے تبرکات سے فائدہ حاصل کرنا نہ صرف درست بلکہ مستحب ہے اور اس کا اہتمام کرنا صحابہ کرامؓ کے طریقہ کی پیروی ہے البتہ ایسے امور میں غلو اور حدودِ شریعت سے تجاوز کو ضرور روکا جائے گا۔ واللہ الموفق!

محقق عینیؒ نے بھی اس سے تبرک مذکور کا اثبات کیا ہے، (ملاحظہ ہو عمدہ ۲/۲۶۸)!

مشمرا، کا ترجمہ اڑستے ہوئے، سمیٹتے ہوئے (یعنی چادر کو ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے کہ نیچے نہ گرے)!

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا رد

محقق عینیؒ نے لکھا:۔ بعض لوگوں نے اس حدیث پر لکھا کہ اس سے تو سُرخ کپڑے کے پہننے کا جواز نکلتا ہے مگر حنفیہ اس کے خلاف ہیں، (فتح ۱/۳۳۰) میں کہتا ہوں کہ حنفیہ جواز کے خلاف نہیں ہیں، اور اگر یہ قائل (حافظؒ) حنفیہ کا مذہب جانتے تو ایسی بات نہ کہتے،

اور اس قائل نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ مزید یہ دعویٰ کر دیا کہ حنفیہ نے حدیث الباب کی تاویل کر کے کہا کہ اس جوڑ میں چادریں تھیں، جن پر سُرخ دھاریاں تھیں (فتح ۱/۳۳۰)!

ہم پہلے حضرت شاہ صاحبؒ سے نقل کر چکے ہیں کہ یہ تاویل نہیں ہے بلکہ حدیث سے ثابت ہے، جو احکام القرآن میں مروی ہے اور محقق عینی نے لکھا کہ حنفیہ کو تاویل کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ وہ لباسِ احمر کی حرمت ہی کے قائل نہیں ہیں، اور حدیث الباب سے جس طرح دوسروں نے جواز سمجھا، حنفیہ نے بھی سمجھا ہے، البتہ انہوں نے کراہت کا حکم دوسری حدیث ممانعتِ لباس معصفر کی وجہ سے کیا ہے اور دونوں حدیث پر عمل کرنا، صرف ایک پر عمل کرنے سے بہتر ہے، لہذا پہلی حدیث سے جواز اور دوسری سے کراہت پر استدلال کیا گیا۔

حافظ نے یہ بھی لکھا: حنفیہ کے دلائل میں سے حدیثِ ابی داؤد بھی ہے جوضعیف الاسناد ہے(فتح ۱/۳۳۰) عینی نے اس پر لکھا کہ اسکے قائل (حافظؒ) نے عصبیت کی وجہ سے اس امر سے خاموشی اختیار کرلی کہ اسی حدیثِ ابی داؤد کو ترمذی نے ذکر کر کے حسن قرار دیا ہے(عمدہ ۲/۲۶۶)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ موجودہ مطبوعہ نسخہ فتح الباری میں یہ عبارت بھی ہے(وان وقع فی بعض نسخ الترمذی انه قال حدیث حسن لان فی سنده كذا)اس لئے عینی کا سکوت والا اعتراض بظاہر درست نہیں رہتا، لیکن ممکن ہے یہ ناقص ومبہم عبارت بعد کو بڑھائی گئی ہو، اور اُس وقت کے نسخہ میں نہ ہو جو عینی کے سامنے تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

محقق عینیؒ نے آخر میں اس سوال وجواب کی طرف بھی تعرض کیا، جس کو حافظ نے ابن التین سے نقل کیا ہے اور لکھا کہ گویا اس قائل نے بعض حنفیہ سے عدم جواز لباس احمر کا مذہب نقل کر کے اس پر اعتراض وجواب کی بنیاد بھی قائم کردی، حالانکہ نہ یہ مذہب کی نقل ہے بعض حنفیہ سے صحیح ہے اور نہ عدمِ جواز والی بات حنفیہ کا مذہب ہے، لہذا جوابِ مذکور کی بھی ان کو ضرورت پیش نہیں آئی۔(عمدہ ۲/۲۶۷)!

(نوٹ) بعض مواقع میں ہم اس قسم کے اعتراض وجواب کو تفصیل کے ساتھ اس لئے نقل کردیتے ہیں کہ حنفی مسلک کے ساتھ جو زیادتیاں یا ناانصافیاں ہوئی ہیں، ان کے کچھ نمونے سامنے آجائیں، اور کسی تحقیق کے بارے میں جو رائے قائم کی جائے وہ پوری بصیرت سے ہو اس طرح نہ ہم دوسروں پر کوئی زیادتی کریں گے اور نہ ان کی زیادتیوں کے ہم شکار ہوں گے۔ واللہ یقول الحق وهو یهدی السبیل!

ماءِ مستعمل کی طہارت

حافظ نے لکھا کہ امام بخاریؒ کا ماءِ مستعمل کی طہارت پر استدلال پہلے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا(فتح ۱/۳۳۰) محقق عینیؒ نے لکھا: حدیث الباب سے ماءِ مستعمل کی طہارت بھی معلوم ہوئی، اور اس کو جو حنفیہ کے خلاف سمجھا گیا ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ وہ بھی اس کو طاہر ہی کہتے ہیں، نجس نہیں کہتے، حتی کہ اس کا پینا جائز اس سے آٹا گوندھنا درست، البتہ اس سے وضو وغسل کرنا صحیح نہیں، اور اس کے بارے میں جو امام صاحبؒ سے نجاست کی روایت ہے اوّل تو حنفیہ کا اس پر عمل نہیں ہے دوسرے اس کا مطلب نجاستِ حکمی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ نجس گناہوں کا ازالہ گنہگار بدن سے ہوتا ہے، لہذا حضور علیہ السلام کے فضلِ وضو پر تو اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ بدن بھی ہرلحاظ سے طاہر ومقدس تھا پس وہ پانی تو طہور بھی تھا بلکہ ہر طاہر واطیب سے زیادہ مطہر تھا۔(عمدہ ۲/۳۶۸)!

باب الصلوٰة فی السطوح والمنبر والخشب قال ابو عبدالله ولم یدالحسن باسا ان یصلی علی الجمد والقناطیر وان جری تحتها بول اوفوقها او امامها اذا کان بینتما سترة وصلی ابو هریرة علی ظهر المسجد بصلوٰة الامام وصلی ابن عمر علی التلج.

(چھتوں پر اور منبر پر اور لکڑیوں پر نماز پڑھنے کا بیان، امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ حسن (بصری) نے برف پر اور پلوں پر نماز پڑھنے کو جائز سمجھا ہے اگرچہ پلوں کے نیچے یا اس کے اوپر یا اس کے آگے پیشاب بہہ رہا ہو، جبکہ ان دونوں کے درمیان میں کوئی حائل موجود ہو، حضرت ابو ہریرہؓ نے مسجد کی چھت پر امام کے ساتھ شریک ہو کر نماز پڑھی۔)

(۳۶۷) حدثنا علی بن عبد الله قال ناسفیان قال نا ابوحازم قال سألوا سهل بن سعد من ای شئ المنبر فقال مابقی فی الناس اعلم به منی هو من اثل الغابة عمله' فلان مولیٰ فلانة لرسول الله صلی الله علیه وسلم وقام علیه رسول الله صلی الله علیه وسلم حین عمل ووضع فاستقبل القبلة کبر وقام الناس

خلفه فقرأ وركع وركع الناس خلفه، ثم رفع راسه، ثم رجع القهقرى فسجد على الارض ثم عاد على المنبر ثم قرأ ثم ركع ثم رفع راسه، ثم رجع قهقرے حتىٰ سجد بالارض فهٰذا شانه، قال ابوعبدالله قال على بن عبدالله سالنى احمد بن حنبل عن هٰذاالحديث قال وانما اردت ان النبى صلى الله عليه وسلم كان اعلىٰ من الناس فلاباس ان يكون الامام اعلىٰ من الناس بهٰذا الحديث قال فقلت فان سفين بن عيينة كان يسئل عن هٰذا كثيراً فلم تسمعه منه قال لا

ترجمہ! ابوحازمؒ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے سہل بن سعدؓ سے پوچھا کہ منبر (نبوی) کس چیز کا تھا، وہ بولے اس بات کا جاننے والا، لوگوں میں مجھ سے زیادہ (اب) کوئی باقی نہیں رہا ہے وہ مقام غابہ کے جھاؤ کا تھا، فلاں عورت کے فلاں غلام نے رسولِ خدا محمد ﷺ کے لئے بنایا تھا جب وہ بنا کر رکھا گیا تو رسول خدا ﷺ اس پر کھڑے ہوئے، اور قبلہ رو ہو کر تکبیر (تحریمہ) کہی اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے، پھر آپ نے قراءت کی اور رکوع فرمایا اور لوگوں نے آپ کے پیچھے رکوع کیا، پھر آپ نے اپنا سر اٹھایا، اس کے بعد پیچھے ہٹے، یہاں تک کہ زمین پر سجدہ کیا، امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ علی بن عبداللہ نے کہا کہ (امام) احمد بن حنبل نے مجھ سے یہ حدیث پوچھی اور کہا کہ میرا مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ لوگوں سے اوپر تھے، تو یہ حدیث اسکی دلیل ہے کہ کچھ مضائقہ نہیں اگر امام لوگوں سے اوپر ہو، علی بن عبداللہ کہتے ہیں، میں نے کہا کہ (تمہارے استاد) سفیان بن عیینہ سے تو یہ حدیث اکثر پوچھی جاتی تھی، کیا تم نے اسے ان سے نہیں سُنا، وہ بولے کہ نہیں۔

(۳۶۸) حدثنا محمد بن عبدالرحيم قال نايزيد بن هٰرون قال انا حميد الطويل عن انس بن مالك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم سقط عن فرسه فجحشت ساقه، او كتفه، والىٰ من نسآئه شهرا فجلس فى مشربة له، درجتها من جذوع النخل فاتاه اصحابه يعودونه، فصلىٰ بهم جالساوهم قيام فلما سلم قال انما جعل الامام ليؤتم به فاذاكبر فكبروا واذاركع فاركعواواذاسجد فاسجدوا و ان صلى قآئماً فصلوا قياماً ونزل لتسع وعشرين فقالوا يارسول الله انك اليت شهراً فقال ان الشهر تسع و عشرون.

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ (ایک مرتبہ) اپنے گھوڑے سے گر پڑے تو آپ کی پنڈلی یا آپ کا شانہ چھل گیا، اور آپ نے اپنی بی بیوں سے ایک مہینہ کا ایلا کر لیا تھا، چنانچہ آپ اپنے ایک بالا خانہ میں بیٹھ گے، جس کا زینہ کھجوروں کی شاخوں کا تھا، پس آپ کے اصحاب آپ کی عیادت کے لئے آپ کے پاس آئے آپ نے بیٹھے بیٹھے انھیں نماز پڑھائی، اور وہ کھڑے ہوئے تھے، جب آپ نے سلام پھیرا، تو فرمایا کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، لہذا جب وہ تکبیر کہے، تو تم بھی تکبیر کہو، اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ اور وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور آپ انتیسویں تاریخ کو اُتر آئے، تو لوگوں نے کہا، یارسول اللہ آپ نے ایک مہینہ کا ایلا فرمایا تھا، تو آپ نے فرمایا کہ (یہ) مہینہ انتیس دن کا ہے۔

تشریح! اس باب میں امام بخاریؒ نے بہت سے اہم مسائل و مباحث کی طرف اشارات کئے ہیں، مثلاً زمین پر نماز پڑھنے کی طرح پلوں، چھتوں اور منبر یا اُس جیسی اونچی چیز پر نماز پڑھنا، مٹی پر سجدہ کرنے کی طرح لکڑی برف وغیرہ پر سجدہ کا جواز، امام کھڑا ہو کر نماز پڑھائے، تو مقتدی کھڑے ہوں، ورنہ امام کی طرح بیٹھ کر نماز ادا کریں، وغیرہ!

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: منبر سے اونچی جگہ پر نماز پڑھنے اور پڑھانے کے جواز کی طرف اشارہ کیا اور خشب (لکڑی) سے بتلایا کہ جس طرح مٹی پر نماز و سجدہ ادا ہوسکتا ہے اسی طرح لکڑی وغیرہ پر بھی ہوسکتا ہے، اسی کے بعد اس ضمن میں امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ کے برف پر نماز پڑھنے کا بھی ذکر کیا۔

محقق عینیؒ نے لکھا کہ برف کی تہ اگر جمی ہوئی ہو اور سر اس پر ٹک سکے تو ہمارے نزدیک بھی اس پر سجدہ جائز ہے لیکن اگر وہ بکھرا ہوا ہو اور پیشانی اس پر نہ جم سکے تو سجدہ صحیح نہ ہوگا، مجتبیٰ میں ہے کہ اگر برف پر سجدہ کیا یا گھاس کے ڈھیر پر یا دُھنی ہوئی روئی پر تو وہ درست ہے بشرطیکہ پیشانی سجدہ کی جگہ پر اچھی طرح ٹک جائے، اور اس کی سختی محسوس ہو اور فتاویٰ ابی حفص میں ہے کہ برف گندم، جو، جوار وغیرہ پر سجدہ کیا جائے تو نماز ہو جائے گی، لیکن دھان پر سجدہ کرنے سے نہ ہوگی، کیونکہ اس پر پیشانی نہ جمے گی اور غیر منجمد برف وگھاس وغیرہ پر بھی نہ ہوگی الا یہ کہ ان کی تہ اچھی طرح جمالی جائے، جس سے جائے سجدہ کی سختی محسوس ہو سکے (عمدہ ۲/۲۶۹)!

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حنفیہ کے یہاں جنسِ ارض کے سوا دوسری چیزوں پر بھی نماز وسجدہ درست ہے، اور اسی کو امام بخاریؒ نے بھی اختیار کیا ہے امام مالکؒ کے نزدیک فرض نماز کا سجدہ زمین یا اس کی جنس سے بنی ہوئی چیزوں چٹائی، بوریہ وغیرہ پر ہونا چاہیے، غیر جنس ارض پر مکروہ[1] ہوگا، مثلاً فرش وقالین پر، مگر امام بخاریؒ آگے باب الصلوٰۃ علی الفراش قائم کر کے اس کے عدم کراہت ثابت کریں گے۔ نوافل میں امام مالکؒ کے یہاں بھی توسّع اور عدم کراہت ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ہمارے یہاں چارپائی پر بھی نماز بلاعذر درست ہے کیونکہ اس پر پیشانی اچھی طرح ٹک سکتی ہے اور روئی پر اس لئے صحیح نہیں کہ اس پر پیشانی نہیں جمتی، اور برف پر بھی پیشانی کو اچھی طرح نہیں جما سکتے اور اس کی سخت ٹھنڈک کی وجہ سے ہاتھوں پر زور دے کر صرف کو مساس کر سکتے ہیں جبکہ سجدہ میں پوری طرح سر کو جائے سجدہ پر ڈال دینا شرط وضروری ہے۔ لہذا برف کو تخت وچارپائی پر قیاس کرنا درست نہیں۔

قولہ والقناطر ۔ یعنی پلوں پر بھی نماز درست ہے اگرچہ ان کے نیچے اور اوپر یا سامنے پیشاب بہتا ہو بشرطیکہ اس پیشاب کی جگہ اور نمازی کے درمیان فصل ہو، یعنی اتنی جگہ پاک وصاف ہو جہاں نماز پڑھ رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام بخاریؒ کی اس تشریح سے معلوم ہوا کہ وہ بھی حنفیہ کی طرح ماکول اللحم جانوروں کے پیشاب کو نجس مانتے ہیں، کیونکہ یہاں صرف غیر ماکول اللحم جانوروں یا آدمیوں کے پیشاب مراد لینا بہت مستبعد ہے ایسے مواقع میں پلوں کے پاس اور پانی کی جگہوں پر تو بہ کثرت ماکول اللحم جانور ہی آتے ہیں اور ان کی عادت ہے کہ پانی پینے کی جگہ ہی کھڑے ہو کر پیشاب بھی کرتے ہیں آدمیوں کی یہ عادت نہیں اور نہ وہ پلوں پر جا کر پیشاب کرتے ہیں۔ اور یہاں جو امام بخاریؒ نے حضرت حسنؒ کا قول پیش کیا ہے ان سے طحاوی ۱/۶۶ میں بھی یہ تصریح منقول ہے کہ وہ ابوالِ ابل، بقر وغنم کو نجس ومکروہ قرار دیتے تھے۔ اور درمختار میں جو حاوی قدسی سے نقل ہوا کہ اصطبل کی چھت پر نماز مکروہ ہے، اس کی وجہ بظاہر وہاں کی ناگوار بدبوئیں ہیں، وہاں ایسی چھت پر نماز کا مسئلہ بتلانا مقصود نہیں جس کے نیچے نجاست ہو،

قولہ وصلے ابوھریرۃؓ ۔ اس سے امام بخاریؒ نے بتلایا کہ اگر امام نیچے ہو اور مقتدی اوپر کسی چھت وغیرہ پر تب بھی نماز درست ہوگی، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہی مذہب حنفیہ کا بھی ہے اگر امام کے انتقالات وحرکات کا علم مقتدی کو ہو سکے تو اقتدا درست ہے خواہ ان دونوں کے درمیان کوئی کھڑکی ودریچی ہو یا نہ ہو۔

قولہ من اثل الغابۃ ۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ جھاؤ کا بڑا درخت اَثل کہلاتا ہے اور چھوٹا طرفا۔ غابہ عوالیِ مدینہ میں معروف جگہ ہے، علّامہ عینیؒ نے لکھا کہ یہ جگہ مدینہ طیبہ سے نو میل پر ہے، جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنیاں رہتی تھیں اور وہ جگہ ان کی چراگاہ تھی، وہیں پر عرنیین

---

[1] العرف الشذی ۱۶۱ میں عدمِ جواز کی نسبت امام مالکؒ کی طرف غلط چھپ گئی ہے کیونکہ ان کا مذہب صرف کراہت کا ہے ملاحظہ ہو ہدایۃ المجتہد ۱/۱۰۱ وغیرہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہاں یہ بھی فرمایا کہ شیخ ابن ہمامؒ کا مختار یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے وقت صرف قدم رکھنے کی جگہ اور موضع سجدہ کی طہارت ضروری وفرض ہے گھٹنوں اور ہاتھوں کے رکھنے کی جگہ پاک ہونا ضروری نہیں، لہذا اگر ایسی جگہ نماز پڑھنی پڑے جہاں سینہ کے سامنے کی جگہ نجاست تھی تب بھی نماز درست ہوگی لیکن بلاعذر ومجبوری کے ایسی جگہ نماز پڑھنا مکروہ ہوگا، دوسرے یہ کہ صرف وہی نجاست مفسدِ نماز ہے جس کو نمازی خود اٹھائے، اور نماز کی حالت میں مثلاً کوئی نجس بچہ وغیرہ آ کر سوار ہو جائے تو نماز درست ہوگی، ملاحظہ ہو فتح القدیر ۱/۱۴۱-۱۳۳ ''مؤلف''!

کا قصہ پیش آیا تھا، یاقوت نے غابہ کو مدینہ سے چار میل پر بتلایا ہے بکری نے کہا کہ دو غابہ تھے، علیا اور سفلی جامع میں ہے کہ جہاں بھی گھنے درخت ہوں اس کو غابہ کہتے ہیں (عمدہ ۷۰۴/۲)!

قولہ عملہ فلان ۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حافظ ابن حجرؒ نے اختیار کیا کہ منبر نویں سال ہجرت میں بنایا گیا تھا (فتح ۲/۲۷۱ باب الخطبۃ علی المنبر) مگر میرے علم میں ایسی روایات ہیں جن سے منبر کا اس سے بہت زیادہ پہلے ہونا معلوم ہوتا ہے، آٹھویں سال سے دوسرے سال تک کی روایات موجود ہیں، اس طرح کہ کسی واقعہ کا ذکر ہوا اور اس میں منبر کا بھی ذکر آ گیا ہے اور وہ واقعہ دیکھا گیا تو دو ایک سال تک کا تھا۔

میں نے حافظ سے یہ معارضہ اس لئے کیا کہ بعض جگہ ان امور کے تعین سے فائدہ عظیم حاصل ہوتا ہے بعض نے یہ کہا کہ اسطوانہ حنانہ کے علاوہ ایک چبوترہ بھی تھا، جو اس سے پہلے منبر بنایا گیا تھا، اور یہ منبر جس کا ذکر یہاں ہوا جمعہ کے دن لایا گیا تھا اور تین درجہ کا تھا۔

قولہ ثم رجع القہقری ۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ منبر سے اترنا بحالتِ نماز چونکہ صرف دو قدم اترنا تھا (دوسرے درجہ پر ہوں گے، ایک قدم نیچے کے درجہ پر رکھا ہوگا اور دوسرا سجدہ کی جگہ پر رکھا ہوگا، دو قدم ہوئے) لہذا وہ عمل قلیل تھا، اور ابن امیر الحاج نے لکھا کہ زیادہ چلنا بھی اگر رک رک کر ہو اور متوالی و مسلسل نہ ہو تو وہ بھی مفسدِ نماز نہیں ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا:۔ درمختار میں ہے کہ اگر امام کا ارادہ قوم کو نماز کا طریقہ سکھانا ہو تو وہ اونچی جگہ پر کھڑا ہو سکتا ہے علامہ نوویؒ نے بھی اس کو جائز بلکہ بوقت ضرورت مستحب لکھا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس مسئلہ میں اب توسع کر کے جائز قرار دینا مناسب نہیں، کیونکہ ایسی ضرورت کا لحاظ صرف صاحبِ تشریع کے لئے تھا، موجودہ دور کے امام نماز سے پہلے یا بعد کو نماز کا طریقہ سمجھا سکتے ہیں اور اتنا کافی ہے۔

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ[1] پر حیرت

فرمایا:۔ بڑی حیرت ہے کہ موصوف نے اس حدیث کی نماز کو نافلہ قرار دیا ہے، اور پھر اس سے جماعتِ نفل کے جواز پر استدلال کیا ہے، اور اس کا انکار کرنے والے پر سختی سے رد کیا ہے، حالانکہ صحیح بخاریؒ میں اس نماز کے نمازِ جمعہ ہونے کی صراحت موجود ہے۔ (امام بخاری کتاب الجمعہ میں اس حدیث کو لائیں گے)

قراءتِ مقتدی کا ذکر نہیں

حضرتؒ نے فرمایا:۔ حدیث الباب کی کسی روایت میں یہ ذکر نہیں کہ حضور علیہ السلام نے قراءت کی، اور آپ کے ساتھ مقتدیوں نے بھی قراءت کی، اس کی وجہ یہ کہ جہری نماز میں امام کے ساتھ قراءت نہ کرتے تھے، اور اس کا حکم امام شافعیؒ کی کتاب الام میں بھی نہیں ہے، صرف مزنی نے بواسطہ ربیع امام شافعیؒ سے جہری نماز میں قراءتِ مقتدی کی روایت نقل کی ہے، یہ بات یاد رکھنے کی اور اہم ہے۔

قولہ قال فانما اردت الخ ۔ امام بخاریؒ کی اس عبارت کی شرح میں کئی اقوال ہیں:۔ (۱) قال کا فاعل و قائل امام احمدؒ ہوں اور اردتُ صیغہ متکلم ہو، یعنی امام احمد نے شیخ علی بن المدینی سے کہا کہ میں نے آپ کی اس روایت کردہ حدیثِ سفیان بن عیینہ سے سمجھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے اوپر ہو کر نماز پڑھائی، لہذا امام کا اونچی جگہ پر ہونا جائز ہے، شیخ نے اس پر کہا کیا تم نے خود سفیان بن عیینہ سے یہ

---

[1] حضرتؒ نے فرمایا:۔ یہ ابن حزم مالکیہ کی کوشش سے شہر بدر کر دیئے گئے تھے، اور پھر جنگل بیابان میں ہی وفات پائی جبکہ ان کے پاس کوئی بھی نہ تھا، دس ہزار ورق تصنیف کئے تھے، جن میں سے "المحلی" طبع ہو گئی ہے، جس کی اغلاط پر حافظ قطب الدین حلبی حنفی (م ۷۳۵ھ) نے نقد کیا ہے، اس کا نام "القدح المعلی" تھا، مگر طبع نہیں ہوئی۔ تذکرۃ الحفاظ ۱۱۴۷/۳ میں تعداد چار سو مجلدات اسی ہزار صفحات پر مشتمل بتلائی ہے اور لکھا کہ آپ کی کوئی تصنیف غلطی سے خالی نہیں ہے۔ وغیرہ نقد۔

[2] اب علامہ محدث مفتی سید مہدی حسن شاہ جہانپوری عم فیضہم نے "المجلی" کے نام سے المحلی کے مخدوش مواقع کا ردِ جید لکھا ہے جس کو بہ اقساط شائع کرنے کا بہت جلد انتظام ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ "مؤلف"

حدیث نہیں سُنی حالانکہ ان سے تو اکثر اس مسئلہ کے بارے میں سوال کیا جاتا تھا، اور وہ یہی حدیث روایت کیا کرتے تھے، امام احمد نے کہا کہ نہیں، یعنی اس تفصیل کے ساتھ نہیں سُنی۔

حضرت شاہ صاحبؒ وحضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اسی شرح کو پسند کیا ہے اور اس کو شیخ الاسلامؒ کی شرح پر ترجیح دی۔ (لامع ۱۵۰/۱)

(۲) اردت، صیغہ خطاب ہو، امام احمدؒ نے شیخ سے کہا کہ آپ نے بظاہر اس حدیث سفیان سے یہی سمجھا ہے کہ امام کے اونچی جگہ پر ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں الخ اس شرح کو علامہ سندیؒ نے اختیار کیا ہے (حاشیہ بخاری السندی ۵۵/۱)!

(۳) قال کا فاعل وقائل علی بن المدینی ہوں، یعنی میرا مقصد اس روایت سے یہی ہے کہ حضور علیہ السلام نے اونچی جگہ پر ہو کر امامت کی ہے لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں، اور امام احمد سے کہا کہ کیا تم نے سفیان سے یہ حدیث نہیں سُنی، جبکہ تم نے ان سے روایات بھی کی ہیں، اور ان سے اکثر اس مسئلہ میں سوال بھی کیا جاتا تھا، اس شرح کو شیخ الاسلام (حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے پوتے) نے اپنی شرح بخاری میں اختیار کیا ہے اور مطبوعہ بخاری ص۵۵ کے بین السطور بھی درج ہے۔

ذکر شیخ الاسلام وملّا علی قاری رحمہ اللہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر فرمایا کہ شیخ الاسلام کا حاشیہ بخاری بہت عمدہ وجید ہے اور انہوں نے بہت مواضع میں حافظ وعینیؒ کی تحقیقات کا خلاصہ بھی عمدہ کیا ہے بعض اکابر نے ان کو علم وفضل کے لحاظ سے ان کے دادا مرحوم پر ترجیح دی ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے جلالین پر بھی ان کا حاشیہ کمالین کے نام سے ہے اور وہ ملا علیؒ قاری کے حاشیہ جمالین سے بہتر ہے، میں نے اِس کو سطحی درجہ کا پایا اور احادیث کے بارے میں بھی ان سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں احقر نے بھی محسوس کیا کہ بعض مواقع میں تحقیق کا معیار نازل ہو گیا ہے ابھی سقوط عن الفرس اور ایلاء کے بارے میں آگے تحقیق آرہی ہے، جس میں حافظ ابن حجرؒ کی طرح ملا علیؒ قاری سے بھی مسامحت ہوگئی ہے تاہم حضرت شاہ صاحبؒ کا نقد اپنے اعلیٰ محدثانہ معیارِ تحقیق کے لحاظ سے ہے ورنہ "مرقاۃ" جیسی کامل ومکمل شرح کی افادیت اور مؤلف کی جلالتِ قدر کا انکار ہرگز نہیں، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ!

قولہ سقط عن فرسہ۔ عمدہ ۲/۲۷۳ میں ہے کہ یہ واقعہ ذی الحجہ ۵ھ میں پیش آیا ہے (مطابق مئی ۶۲۷ء) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ محدث ابن حبان نے ۵ھ کا واقعہ بتلایا ہے، حضور علیہ السلام گھوڑے پر سوار ہو کر غابہ کو جانا چاہتے تھے، گھوڑے نے ایک کھجور کے درخت کی جڑ پر گرا دیا، جس سے آپ کے پائے مبارک میں چوٹ لگی اور پہلو بھی چھِل گیا، اور آپ نے بالاخانہ پر قیام فرمایا، معذوری کی وجہ سے مسجد میں نماز نہ پڑھ سکے، دوسرا واقعہ ایلاء کا ۹ھ میں پیش آیا ہے، اس میں بھی آپ نے بالاخانہ پر قیام فرمایا تھا، مگر معذور نہ تھے، اس لئے نمازیں مسجد ہی میں ادا فرماتے تھے، لہٰذا دونوں واقعات الگ الگ زمانہ کے ہیں، راوی نے صرف اس مناسبت سے دونوں کو ایک روایت میں جمع کر دیا کہ آپ نے دونوں میں بالاخانہ پر قیام فرمایا تھا، واقعہ سقوط میں اس لئے کہ صحابہ کرام کو عیادت کے لئے الگ جگہ میں آنے جانے کی سہولت ہو اور واقعہ ایلاء میں ازواجِ مطہرات سے دوری واجتناب کی غرض سے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی مسامحت

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظ نے دونوں واقعات کو ایک ہی سال میں قرار دیدیا[1] ہے، جو قطعاً غلط ہے اور تعجب ہے کہ حافظ

---

[1] حافظ نے اس موقع پر حدیث الباب کے تحت تعیین واقعہ سقوط کر طرف توجہ نہیں کی، پھر فتح نہیں کی، پھر فتح الباری ۱/۱۱۹ (طبع خیریہ) میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایسے متیقظ سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوگئی؟ یہ غلطی ان کو بعض رواۃ کی تعبیر کے سبب ہوئی ہے کہ انہوں نے قصہ سقوط وقصہ ایلاء کو ایک ساتھ ذکر کردیا، حضرتؒ نے فرمایا کہ رواۃ کی تعبیری غلطی کی طرف حافظ زیلعی نے بھی متنبہ کیا ہے راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام مسلم نے باب الاسام میں یہ طرقِ متعددہ حدیثِ انسؓ بابتہ انفکاکِ قدم مبارک روایت کی ہے مگر کسی میں بھی ایلاء کا ذکر نہیں ہے اور یہی صورت حدیثِ عائشہ وجابرؓ کی ہے، مسلم میں حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے چاروں احادیث میں امام زہریؒ ہیں، جنھوں نے ایلاء کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

اور بخاری شریف میں بھی ۹۶ (باب انما جعل الامام لیوء تم بہ) میں جو روایت زہری عن انس ہے اس میں ایلاء کا ذکر نہیں ہے لیکن یہاں ۵۵ (حدیث الباب) اور ۲۵۶ اور ۳۳۵ اور ۷۹۷ اور ۹۸۹ میں چونکہ روایت بواسطہ حمید طویل ہے۔

(بواسطہ ابن شہاب زہری نہیں) اس لئے ان سب میں ایلاء کا بھی ذکر شامل کردیا گیا ہے اور یہ شامل کرنے کی وجہ راوی کے ذہن میں صرف یہ اشتراک ہے کہ واقعہ سقوط ۵ھ اور واقعہ ایلاء ۹ھ دونوں میں حضور علیہ السلام نے بالا خانہ میں قیام فرمایا تھا، اس امر کا خیال نہیں کیا کہ دونوں الگ الگ واقعات ہیں جن میں کئی سال کا فصل ہے لیکن حافظ ایسے محقق مدقق سے یہ امر بہت ہی مستبعد ہے کہ انہوں نے صرف ایک راوی کی اس تعبیر مذکور کے باعث یہ فیصلہ کردیا کہ ایلاء کے دوران ہی میں سقوط کا واقعہ بھی پیش آیا ہے اور اسی پر حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی تعجب وحیرت کا اظہار فرمایا ہے۔

گھوڑے سے گرنے کا واقعہ

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا:۔ ''سیرۃ محمدی'' تالیف مولوی کرامت علی صاحب تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ میں حالات نہایت بسط وتفصیل سے دیئے گئے ہیں، لیکن اس میں اس واقعہ کو نہیں لکھا، یہ کتاب اچھی ہے مگر بے اعتنائی سے خراب اور غلط چھپی ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ احقر نے دوسری متداولہ کتبِ سیرت میں بھی اس واقعہ کو نہیں پایا، حالانکہ احادیثِ صحاح میں اس کا ذکر آتا ہے اور تعیین زمانہ احقر کے نزدیک اس طرح ہے:۔ غزوۂ خندق شوال ۵ھ (مطابق فروری ومارچ ۶۲۷ء) میں ہوا ہے، اس سے واپسی پر حضور اقدس ﷺ ذی قعدہ ۵ھ (اپریل ۶۲۷ء) میں غزوۂ بنی قریظہ کے لئے تشریف لے گئے اس سے فارغ ہو کر آپ نے پانچ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) باب انما جعل الامام لیوء تم بہ کے تحت بہت عمدہ تفصیلی بحث کی ہے اگرچہ شافعی مسلک کے خلاف مسلکِ حنابلہ کی تقویت کر گئے ہیں۔

حافظ ابن حزمؒ کا رد! اس موقع پر حافظ نے ابنِ حزم کی بحث کو لاطائل ولا حاصل قرار دیا ہے جس میں انہوں نے حضور علیہ السلام کی نمازِ مرضِ وفات میں سواء حضرت ابوبکرؓ کے باقی تمام صحابہ کرام کے کھڑے ہو کر اقتداء کرنے کا انکار کردیا ہے اور دعوی کردیا کہ اس کا صراحۃً کوئی ثبوت نہیں ہے حافظ نے لکھا کہ جس امر کی نفی کا دعوی ابن حزم نے کیا ہے اس کو امام شافعیؒ نے ثابت کیا ہے اور مصنف عبدالرزاق میں بھی صراحت ہے کہ صحابہ نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی ہے۔ الخ (فتح ۲/۱۲۱)

حافظ ابن حبان کا رد! حافظ نے لکھا کہ ابن حبان نے حدیث مسلم عن جابر سے استدلال کیا کہ صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام کے پیچھے نماز تو کھڑے ہو کر ہی شروع کی تھی مگر پھر وہ لوگ بیٹھ گئے تھے، لیکن ان کا یہ استدلال درست نہیں کیونکہ یہ صورت مرضِ وفات میں پیش نہیں آئی، بلکہ سقوط عن الفرس والے واقعہ میں پیش آئی ہے آخر میں حافظ نے ابن حبان کے حوالہ سے لکھا کہ گھوڑے سے گرنے اور قدم مبارک کی ہڈی اپنی جگہ سے ہٹ جانے کا واقعہ ذی الحجہ ۵ھ میں پیش آیا تھا (فتح ۲/۱۲۲)

پھر حافظ نے فتح الباری ۴/۸۷ (باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا راء یتم الھلال فصوموا) کے تحت حدیث حمید الطویل عن انسؓ سے خود یہ اخذ کیا کہ ایلاء کے زمانہ میں ہی انفکاکِ رجل بھی ہوا ہے چنانچہ فتح الباری ۹/۲۴۳ میں واقعہ ایلاء کے ضمن میں لکھا کہ اسی حالت میں انفکاکِ رجل کا حادثہ پیش آیا، جیسا کہ حدیثِ انسؓ سے ثابت ہوا جو اوائل الصیام میں گزر چکی ہے اور ۹/۳۴۵ میں ضمن واقعہ ایلاء لکھا کہ حدیث انسؓ اوائلِ صلوۃ میں حضور علیہ السلام کے گھوڑے سے گرنے کے مشہور قصہ کی اور آپ کے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی زیادتی بھی مروی ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حافظ نے حمید طویل والی روایاتِ بخاری کی تعبیرات سے یہی سمجھا کہ ۹ھ میں ہی سقوطِ فرس والا حادثہ پیش آیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! ''مؤلف''

ماہ مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا ہے یعنی ماہ ذی الحجہ ۵ھ، محرم ۶ھ صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی (مطابق مئی، جون، جولائی، اگست وستمبر ۶۲۷ء) اسی دوران قیام مدینہ منورہ میں یہ حادثہ پیش آیا ہے آپ کسی ضرورت سے غابہ کے جنگل میں جانا چاہتے ہوں گے۔

گھوڑے کی سواری کی چونکہ بڑی فضیلت ہے خصوصاً جہاد کے لئے تیاری وغیرہ کے سلسلہ میں، اور آپ کو خود بھی فطری طور سے اس سواری کا شوق تھا، عمدہ گھوڑے آپ کی سواری میں رہتے تھے، برق رفتار گھوڑے کی سواری آپ کو بہت ہی مرغوب تھی، چنانچہ ایک دفعہ مدینہ طیبہ میں باہر سے کسی غنیم کے حملہ کا خطرہ محسوس کیا گیا تو آپ نے حضرت ابوطلحہؓ کا گھوڑا ''مندوب'' نامی سواری کے لئے لیا اور ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر شہر سے باہر دور تک دیکھ کر آئے اور فرمایا کہ کوئی بات خطرہ وگھبراہٹ کی نہیں ہے اور اس گھوڑے کو تو ہم نے بحر پایا (یعنی دریا کی طرح رواں دواں، جو رکنے کا نام نہیں لیتا) اس وقت حضرات صحابہ بھی نکلے تھے، جو حضور علیہ السلام کی واپسی میں ملے اور دیکھا کہ آپ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہیں، اور گردن میں تلوار لٹکی ہوئی تھی، محقق عینی نے لکھا کہ اس سے آپ کی تواضع وانکساری کا حال معلوم ہوا اور یہ کہ شہسواری کا فن خوب آنا چاہیے تاکہ ضرورت کے وقت بے تامل میدان میں جاسکے، اور تلوار وغیرہ ہتھیار بھی ساتھ رکھے تاکہ وقتِ ضرورت اس کا مددگار ہو۔

حضور علیہ السلام نے مدینہ طیبہ کے باہر گھوڑ دوڑ کے میدان بھی بنوائے تھے، جن میں ایک سات میل کا لمبا تھا اور دوسرا ایک میل یا کچھ زیادہ کا تھا، گھوڑ دوڑ کی مسابقت میں ایک طرف سے ہار جیت کی شرط بھی درست ہے دونوں طرف سے مال کی شرط ہو تو حرام ہے، خود حضور علیہ السلام کا ایک گھوڑا اللُحیف نامی تھا جو بہت تیز رفتار تھا اور عمدہ ۱۴۷/۱۴ میں ہے کہ اس کو لحیف اسی لئے کہتے تھے کہ وہ دوڑنے کے وقت گویا زمین کو لپیٹتا تھا نیز آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص خدا کی راہ میں جہاد کے لئے گھوڑا پالے گا، قیامت کے دن اس کی میزان میں اُس گھوڑے کی گھاس، دانا، لید و پیشاب بھی وزن کیا جائے گا اور فرمایا کہ گھوڑوں کی پیشانی میں حق تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے خیر وفلاحِ دارین لکھ دی ہے، یعنی اجر وغنیمت۔ (یہ سب احادیث بخاری شریف کتاب الجہاد میں ہیں) اور مسند احمد وبیہقی میں ہے کہ حضور علیہ السلام کا اپنا ایک گھوڑا سَجہ نامی تھا، جس کو آپ نے بازی میں دوڑایا تو اس نے بازی جیتی اور آپ کو مسرت ہوئی (بیہقی ۱۰/۲۱) ممکن ہے یہی صبا رفتار گھوڑا ہو جس سے گرنے کا اتفاقی حادثہ پیش آیا، چونکہ وہ بہت ہی تیز رفتار تھا، اور اسی لئے دوسرے عمدہ گھوڑوں کے مقابلہ میں بازی بھی جیت لیتا تھا، ایسے براق صفت گھوڑے کے بارے میں دنیا کا کون سا شہسوار دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی اتفاقی طور سے اس کی پیٹھ سے نہیں گرسکتا، لہٰذا یہ خیال نہ کیا جائے کہ جب حضور اکرم ﷺ بہت بڑے شہسوار تھے تو گھوڑے سے کس طرح گر گئے؟ کیونکہ برق رفتار عربی گھوڑوں سے گرنا بھی بڑے شہسواروں ہی کی شان ہوسکتی ہے، دوسرے تو ان پر سوار ہونے کی جراَت بھی نہیں کرسکتے۔ واضح ہو کہ یوں بھی عربی نسل کے گھوڑے عمدگی و تیز رفتاری وغیرہ میں ساری دنیا کے گھوڑوں سے بہتر ہوتے ہیں، اس واقعہ سے حضور اکرم ﷺ کی سپاہیانہ ومجاہدانہ شان بہت نمایاں معلوم ہوتی ہے اور یہ تعلیم ملتی ہے کہ ہر ایک مسلمان کو بھی ایسی ہی زندگی گزارنی چاہیے۔ واللہ الموفق!

ممکن ہے بہت سے اہل سیر نے اس واقعہ سقوط کو اسی لئے ذکر نہ کیا ہو کہ اس پر لوگ شبہ کریں گے، لیکن ایسے خیالات کی وجہ سے صحیح وقوی السند واقعات کا ذکر نہ کرنا کسی طرح درست نہیں قرار دیا جاسکتا۔

بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

اس کا جواز صرف عذر کی حالت میں ہے، اور خود نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں صرف تین بار عذر کی وجہ سے بیٹھ کر فرض نماز ادا فرمائی ہے (۱) غزوۂ احد میں (۳ھ) (۲) سقوط عن الفرس کے وقت (۵ھ میں) (۳) مرضِ وفات میں (۱۱ھ) (ملاحظہ ہو لامع الدراری ۱/۱۵۱)

قولہ وآئی من نسائہ شھرا۔ یہ واقعہ ۹ھ کا ہے جو عام الوفود کہلاتا ہے یعنی اس سال کے ابتدائی ۶ ماہ کے اندر قبائل عرب کے

وفود حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اسلامی تعلیمات حاصل کرتے تھے۔

ایک سال کے اہم واقعات

تعیین واقعات وزمانہ اس طرح ہے:۔ماہ جمادی الاول ۸ھ (م ستمبر ۶۲۹ء) میں غزوۂ موتہ پیش آیا، اس کے بعد ماہ جمادی الاخری ۸ھ اور رجب (اکتوبر ونومبر) میں حضور علیہ السلام کا قیام مدینہ طیبہ میں رہا، ماہ شعبان ۸ھ (دسمبر ۶۲۹ء) میں خلفاءِ قریش بنو بکر نے خلفائے مسلمین خزاعہ پر بغیر اعلانِ جنگ حملہ کر دیا تھا، اور رؤسائے قریش نے بنو بکر کی مدد کی، مدینہ طیبہ دور تھا، وہاں سے بنو خزاعہ کو مدد جلد نہ مل سکتی تھی، اس لئے انہوں نے مجبور ہو کر حرمِ کعبہ میں پناہ لی، مگر رئیسِ قریش نوفل نے وہاں بھی ان کو مامون نہ ہونے دیا اور حدودِ حرم کے اندر خزاعہ کا خون بہایا گیا، اس پر خزاعہ کے چالیس اونٹنی سوار فریاد لے کر مدینہ طیبہ پہنچے، آں حضرت محمد ﷺ نے واقعات سُنے تو آپ کو سخت رنج ہوا، آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا کہ تین صورتوں میں سے کسی ایک کو مان لیں (۱) مقتولوں کا خوں بہا دیں (۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں (۳) اعلان کر دیں کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا، قرطہ بن عمر نے قریش کی طرف سے جواب دے دیا کہ تیسری صورت منظور ہے چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے غزوۂ مکہ کہ تیاری شروع کر دی، ۱۰ رمضان ۸ھ کو دس ہزار مجاہدین صحابہ کے ساتھ مکہ معظمہ کا رُخ کیا اور فتحِ مبین حاصل ہوئی، یعنی فتح مکہ (جس کے حالات طویل اور عجیب وغریب ہیں)

اس کے بعد حنین وطائف کے غزوات پیش آئے، ان سے فارغ ہو کر آپ نے جعرانہ سے عمرہ کیا، مکہ معظمہ پر عتاب بن اسید کو خلیفہ مقرر کیا، جنھوں نے ۸ھ کا حج کرایا، آپ مع صحابہ کے مدینہ طیبہ کو لوٹ گئے، اور ۱۴ ذی قعدہ ۸ھ کو مدینہ طیبہ پہنچ گئے (م فروری ومارچ ۶۳۰ء تقریباً) وہاں آپ نے ماہ ذی الحجہ ۸ھ، محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاولی وجمادی الاخری ۹ھ (م اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر واکتوبر ۶۳۰ء) قیام فرمایا، اس عرصہ میں کوئی غزوہ یا باہر کا سفر پیش نہیں آیا، البتہ باہر کے قبائلی وفود آتے جاتے رہے اور اسلامی تعلیمات حاصل کرتے رہے اسی عرصہ میں غالباً جون جولائی اگست میں سے کسی ماہ میں ایلاء کا واقعہ پیش آیا ہے، کیونکہ آپ ایلاء کے زمانہ میں دن کا وقت پیلو کے درخت کے پاس گزارتے تھے، اور رات بالاخانہ پر، محترم مولانا بنوری عم فیضہم نے متعارف السنن ۴۲۹/۴/۳ میں فتح الباری ۲۵۳/۹ کے حوالہ سے "يظل في الايلاء تحت شجرة ويبيت في المشربة" کے الفاظ نقل کئے، ممکن ہے اُن کے نسخہ فتح الباری میں ایسی ہی عبارت ہو، میرے نسخہ میں ۲۳۳/۹ پر یہ عبارت ہے:۔"كان يبيت في المشربة ويقبل عند اراكة على خلوة بئر كانت هناك" (رات کا وقت بالاخانہ پر گزارتے تھے اور دوپہر کا وقت ایک پیلو کے درخت کے پاس گزارتے تھے جو وہاں کے کنوئیں کی خلوہ گاہ پر واقع تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موسم گرمی کا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

وفاء السمهودی میں ہے کہ آپ ایلاء کے زمانہ میں دن کا وقت کنویں پر جو پیلو کا درخت تھا اس کے نیچے گزارتے تھے اور رات بالاخانہ میں گزارتے تھے۔ (انوار المحمود ۲۳۱/۱)

اس کے بعد رجب ۹ھ (م نومبر ۶۳۰ء) میں غزوۂ تبوک پیش آیا اور وہاں سے حضورِ اقدس ﷺ رمضان ۹ھ (م دسمبر ۶۳۰ء) میں مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے اور قیام فرمایا، نویں سال ہجرت کے حج (ذی الحجہ ۶ مارچ ۶۳۱ء) کا امیر حضرت ابوبکرؓ کو بنا کر مکہ معظمہ روانہ فرمایا، اور حضرت علیؓ کو مامور فرمایا کہ حج کے موقع پر سب کفار ومشرکین کو سورۂ براءت کی چالیس آیات پڑھ کر سنا دیں اور اعلان کر دیں کہ آئندہ کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا اور مشرکین مکہ سے کئے ہوئے سارے معاہدے چار ماہ کے بعد ٹوٹ جائیں گے۔

اس کے بعد تقریباً پورے سال دسویں ہجری میں حضور علیہ السلام کا قیام مدینہ طیبہ ہی میں رہا، کسی غزوہ میں یا باہر تشریف لے

جانا نہیں ہوا، عرب کے قبائل اور سردار حاضرِ خدمت ہو کر اسلام سے مشرف اور تعلیمات اِسلام سے مستفید ہوتے رہے۔

۲۶ ذی قعدہ ۱۰ھ کو حضور علیہ السلام نے صحابہ کے ساتھ حجۃ الوداع کے لئے مکہ معظّمہ کا قصد فرمایا اور ۹ ذِی الحجہ ۱۰ھ (مطابق ۱۰ مارچ ۶۳۲ء) کو آپ کی سیادت و قیادت میں حج ادا ہوا، بعد واپسی محرم و صفر ۱۱ھ (م اپریل و مئی ۶۳۲ء) مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا ۲۵ مئی ۶۳۲ء کو جیشِ اسامہ مقرر فرمایا، اور ۸ جون ۶۳۲ء کو سفرِ آخرت فرمایا۔ علیہ الف الف صلوات و تسلیمات مبارکۃ طیبۃ۔ واقعہ ایلاء کی بقیہ تفصیل و وجوہ و اسباب اپنے موقع پر آئیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

شرح مواہب وسیرۃ النبی کا تسامح

المواہب اللد نیہ اور شرح ۹۷/۳ میں بھی علامہ قسطلانی شارح بخاری اور علامہ زرقانی (مالکی شارحِ موطاء امام مالکؒ) دونوں سے تسامح ہوا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ کی طرح ۹ھ ہی میں ایلاء اور سقوط دونوں کو مان لیا ہے، پھر علامہ زرقانیؒ سے مزید مسامحت یہ ہوئی کہ بحوالہ روایتِ شیخین وغیرہما عن انسؓ سقوط و ایلاء کو یکجا نقل کیا، حالانکہ ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ صرف بخاری میں بواسطہ حمید الطّویل عن انسؓ سقوط کے ساتھ ایلاء کا ذکر مروی ہے باقی مسلم شریف وغیرہ میں نہ حمید الطّویل کے واسطہ سے روایت لی گئی ہے اور نہ ان کی روایت میں ایلاء کا ذکر سقوط والے واقعہ کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ سب امام زہریؒ کے واسطہ سے حضرت انسؓ کی روایت نقل کرتے ہیں، جس میں ایلاء کا ذکر نہیں ہے اور خود بخاری ۹۶ میں بھی جو روایت ابن شہاب عن انسؓ ہے، اس میں بھی ایلاء کا ذکر نہیں ہے غرض اس معاملہ میں ایسے اکابر محدثین کو بھی مغالطہ لگ گیا ہے، اور حسبِ ایماء حضرت شاہ صاحبؒ صرف محدث زیلعی اس تفرد پر متنبہ ہوئے ہیں، محقق عینیؒ نے اگرچہ دونوں واقعات کو ایک ساتھ اور ایک سال میں تو نہیں کہا، مگر حافظ اور دوسرے حضرات کی غلطی پر متنبہ بھی نہیں کیا۔

پھر ہمارے اردو کے سیرت نگار بھی اس غلطی پر متنبہ نہ ہو سکے چنانچہ سیرت النبی ۱۵۱/۱ میں ایلاء کا ذکر کر کے لکھا:۔ ''اتفاق یہ کہ اس زمانہ میں آپ گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آیا'' الخ اور ۱۹۴/۲ میں لکھا:۔ ''۹ھ میں آپ نے ایلاء کیا تھا اور نیز گھوڑے پر سے گر کر چوٹ کھائی تھی تو ایک مہینہ تک اسی (بالا خانہ) پر اقامت فرمائی تھی''

ہوائی جہاز کی نماز کا مسئلہ

امام بخاریؒ نے چونکہ اس باب میں چھتوں وغیرہ پر نماز کا مسئلہ بیان کیا ہے اس لئے یہاں ہوائی جہاز کی نماز کا مسئلہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کیونکہ ہوائی سفر کا رواج بہت عام ہو جانے کی وجہ سے اس کی ضرورت ہے، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱۵۰/۱ میں لکھا:۔ ''کشتی اور بحری جہاز ہی کی طرح ریلیں اور ہوائی جہاز وغیرہ بھی ہیں کہ ان میں فرض و نفل نماز درست ہے مگر سمتِ قبلہ کا استقبال ضروری ہے حتی کہ اگر نماز پڑھتے ہوئے سواری گھوم جائے، تو نمازی کو بھی گھوم جانا چاہیے اگر استقبال قبلہ کسی عذر سے ممکن نہ ہو تو جس طرف کو نماز پڑھ سکتا ہو پڑھ لے، ایسے ہی اگر سجدہ پر قدرت نہ ہو تو اشارہ سے نماز ادا کر سکتا ہے، لیکن یہ سب اس وقت ہے کہ اُتر کر کامل نماز نہ پڑھ سکتا ہو یا اترنے کی جگہ تک پہنچنے میں نماز کا وقت ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو''۔

حضرت اقدس تھانویؒ نے لکھا:۔ جن عذروں کی وجہ سے اونٹ گھوڑے وغیرہ پر نماز جائز ہے، مثلاً یہ کہ اُترنے میں خوفِ ہلاکت ہو یا اترنے پر قادر نہ ہو تو نماز فرض ہوائی جہاز پر جائز ہے، بدوں عذر کے جائز نہیں، اسی لیے ہوائی جہاز چلانے والوں کے لئے جو اس کے اتارنے یا ٹھیرانے پر قادر ہیں یہ عذر شرعاً معتبر نہ ہوگا۔

(دفعِ اشتباہ) ہوائی جہاز کو مثل دریائی جہاز کے نہ سمجھا جائے کیونکہ یہ بواسطہ پانی کے زمین پر مستقر ہے اور اس کا استقرار پانی پر اور پانی کا استقرار زمین پر بالکل ظاہر ہے۔ (بوادر النوادر ۱۲۶)!

ہوائی جہاز وغیرہ کی نماز کے بارے میں مزید تحقیق

بحث مذکور کہنے کے بعد معارف السنن ۳۹۵/۳ اور اعلاء السنن ۱۲۲/۷ میں بھی اس سلسلہ کی بحث و تحقیق پڑھی۔ اور مندرجہ ذیل معروضات کا اضافہ مناسب سمجھا گیا۔

(۱) ہوائی جہاز کی نماز میں شرطِ استقبالِ قبلہ کے سقوط کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی ،جبکہ ریل وبس میں اس کو لازم وضروری قرار دیا گیا ہے، بوادر النوادر ۱۲۷ میں جو مضمون مولانا حبیب احمد صاحب کا چھپا ہے اور اس کو حضرت اقدس مولانا تھانویؒ کی تائید وموافقت حاصل ہے اس میں بھی ہوائی جہاز میں استقبال قبلہ کو لازم قرار دیا گیا ہے اور لکھا کہ وہ گھر اور کشتی و بحری جہاز کی طرح ہے، (جن میں استقبال سے معذوری کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہوتی۔)

(۲) ریل اور بس کے بھی سب احکام یکساں نہیں معلوم ہوتے ، کیونکہ ریل میں جو سہولت کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر نماز پڑھنے اور استقبال قبلہ کرنے کی ہے وہ اب تک کی رائج شدہ بسوں میں حاصل نہیں ہے، اس لئے اگر اتر نا دشوار ہو یا استقبالِ قبلہ نہ ہو سکے، اور نماز کا وقت نکلنے کا خوف ہو تو قیام وقعود واستقبال کی شرائط اٹھانی پڑیں گی اور نماز اشارہ سے ادا کرنی ہوگی ،اور اس نماز کو لوٹانے کے بارے میں ریل کی طرح مسئلہ ہوگا، جو محترم علامہ بنوری دام فیضہم نے لکھا ہے۔

(۳) گھوڑے، اونٹ وغیرہ سواری پر نفل نماز پڑھنے میں تو وسعت ہے کہ اشارہ سے اور بغیر استقبالِ قبلہ بھی پڑھ سکتا ہے، لیکن اس طرح ان پر سوار رہتے ہوئے فرض نماز کی ادائیگی صرف اسی وقت جائز ہے کہ رُکنے اور اُترنے میں دشمن یا درندوں کی وجہ سے جان کا خوف ہو، اور نماز کا وقت بھی ختم ہونے کا ڈر ہو اس کے سوا اگر دوسرا کوئی عذر ہو تو جائز نہیں مثلاً گارے کیچڑ اور دلدل میں چل رہا ہو تو اتر کر کھڑے ہو کر اشارہ سے پڑھے گا، اگر بیٹھ سکتا ہو لیکن سجدہ نہ کر سکتا ہو تو اتر کر بیٹھ کر اشارہ سے پڑھے گا، کیونکہ ہر فرض کا سقوط بقدرِ ضرورت ہی ہو سکتا ہے (کذا فی البدائع ۱۰۹/۱)

(۴) بدائع کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ پہلا درجہ کھڑے ہو کر مع رکوع وسجدہ متعارف نماز پڑھنے کا ہے، اس پر قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر رکوع وسجدہ متعارف کرے گا، اگر بیٹھ کر متعارف سجدہ نہ کر سکے تو بیٹھ کر رکوع وسجدہ اشارہ سے کرے، اور بیٹھ بھی نہ سکے تو لیٹ کر اشارہ سے ادا کرے گا، الخ، اس لئے معارف السنن ۳۹۵/۳ کی عبارت وان لم يمكنه القيام فيصلى ايماءً الى اى جهة توجهت به الطيارة الخ سے جو ایہام ہوتا ہے وہ رفع کر لیا جائے ،یعنی قیام اگر نہ ہو سکے تو ریل و بحری جہاز کی طرح بیٹھ کر بطریق معروف نماز پڑھے گا اور بیٹھ کر سجدہ نہ ہو سکے تو اشارہ سے رکوع وسجدہ کرے گا اور اس کی مثال رکوبِ دابہ کے ساتھ حالتِ خوف کے لئے تو درست ہے دوسرے حالاتِ عذر کے لئے نہیں، جس کی تفصیل اوپر کر دی گئی۔

سفر میں نماز کا اہتمام

خصوصیت سے فرض نماز کے اندر ادائیگی کے لئے وقت نماز سے قبل وضو کا اہتمام چاہیے تاکہ پورے وقت کے اندر جب بھی موقع ملے ادا کی جا سکے، اور سفر میں اول وقت تو نماز ادا کر لینا زیادہ بہتر ہے، اگر اوّل وقت سے بے فکر ہوگی تو آخر تک ادا ہو ہی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اگر شرائطِ ادائیگی پورے وقت میں مفقود ہوں تو آخر وقت میں جس طرح ہو خواہ اشارہ سے ہی پڑھ لے، اور بعد کو احتیاطاً اس کا اعادہ کرے۔ اگر فرض ساقط ہو چکا ہوگا تو یہ نفل ہو جائے گی۔

موجودہ موٹر بسوں میں اگر لمبا سفر ہو تو نماز کی ادائیگی سب سے زیادہ مشکل ہے اس لئے باوضو ہو تو پانچ منٹ کے لئے کسی اسٹینڈ پر بھی اتر کر فرض نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

ریل، بس، بحری جہاز اور ہوائی جہاز میں اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہو تو پڑھے گا کیونکہ قیام فرض ہے بلا عذر ترک نہیں کر سکتے، کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر جائز ہے، اس کے لئے کوئی عام قاعدہ مقرر نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ سواری اور سوار دونوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

قولہ یعودونہ یعنی واقعہ سقوط میں حضرات صحابہ کرام حضور اکرم ﷺ کی عیادت کے لئے حاضر ہوتے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ بات ایلاء کے واقعہ سے تعلق نہیں رکھ سکتی، بخاری میں حضرت عمرؓ سے قصہ ایلاء میں مروی ہے کہ انہوں نے صبح کی نماز مسجد نبوی میں حضور علیہ السلام کے پیچھے پڑھی، بخلاف قصہ سقوط کے کہ اس میں بعض روایاتِ صحیحہ کے مطابق حضور کے قدم مبارک میں انفکاک واقع ہوا تھا، اس لئے وہ ان دنوں تو مسجد نبوی کی نمازوں میں شرکت بھی نہ فرما سکتے تھے۔ دونوں قصوں کی یہی مغایرت بہت کافی ہے پھر حافظؒ سے کیونکر غفلت ہوئی اور دونوں کو ۹ھ کے اندر قرار دیدیا، یہ امر موجبِ حیرت ہے۔

قولہ انما جعل الا مام لیوء تم بہ ۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام و مقتدی کی نمازوں میں باہم نہایت قوی ربط و تعلق ہے اور اس کی رعایت حنفیہ نے کی ہے شافعیہ کے یہاں اقتداء کا مقصد صرف افعالِ صلوٰۃ میں اتباع ہے یہاں تک کہ انہوں نے **سمع اللہ لمن حمدہ** کو بھی مقتدی پر لازم کیا ہے، (گویا دونوں کی نمازیں احکام میں الگ الگ ہیں اور اسی لئے ان کے یہاں امام کی فرض نماز کے خلاف مقتدی دوسرے فرض اور نفل نماز کے پیچھے فرض نماز بھی ادا کرسکتا ہے وغیرہ) لیکن اس بارے میں شافعیہ کے ساتھ سلف میں سے صرف ایک دو ہی ہیں۔

قولہ فاذا کبر فکبروا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ بعض طرقِ روایات میں اس کے ساتھ **فاذا قراء فانصتوا** بھی ہے جس کو محدثین نے معلل قرار دیا ہے، لیکن میں نے اس کی حقیقت اپنے رسالہ فصل الخطاب میں کھول دی ہے۔

کھڑے کی اقتداء عذر سے نماز بیٹھ کر پڑھنے والے امام کے پیچھے جائز ہے

حنفیہ و شافعیہ کا یہی مسلک ہے، امام مالکؒ کے نزدیک بالکل جائز نہیں، امام احمدؒ کے یہاں تفصیل ہے کہ امام کو عذر اگر درمیان صلوٰۃ میں طاری ہوا تو مقتدی کھڑے ہو کر پڑھ سکتے ہیں اور اگر عذر شروع ہی سے تھا تو ان کو بھی امام کی طرح بیٹھ کر پڑھنی چاہیے، حنفیہ و شافعیہ نے حدیث الباب کو منسوخ قرار دیا ہے، اور اسی کی طرف امام بخاریؒ بھی گئے، چنانچہ اس کی صراحت صحیح بخاری شریف میں دو جگہ کی ہے راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ وہ دونوں جگہ حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) ۹۶ (**باب انما جعل الامام لیوء تم بہ**) میں، قال ابوعبداللہ الخ امام بخاریؒ نے شیخ حمیدی سے نقل کیا کہ **قولہ علیہ السلام واذا صلے جا لساصلو اجلو سا**، یہ آپ کا ارشاد مرض قدیم (گھوڑے سے گرنے کے واقعہ) میں تھا پھر آپ نے اس کے بعد (مرضِ وفات میں) بیٹھ کر نماز پڑھی اور صحابہ نے کھڑے ہو کر اقتداء کی ہے، اس وقت حضور علیہ السلام نے ان کو بیٹھنے کا حکم نہیں فرمایا، اور حضور کے آخر سے آخر فعل ہی کو معمول بہ بنایا جاسکتا ہے۔

(۲) ۳۴۵ **باب اذا عاد مریضاً** میں امام بخاریؒ نے لکھا:۔ ''شیخ حمیدی نے کہا یہ حدیث منسوخ ہے میں کہتا ہوں اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ نے آخری نماز بیٹھ کر پڑھائی ہے جس میں لوگ آپ کے پیچھے کھڑے تھے''

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تحقیق

فرمایا:۔میرا جواب یہ ہے کہ حاصل حدیث مشاکلت امام و ماموم کا استحباب بتلانا ہے، کہ امام اقتداء ہی کے لئے ہے، یہاں جوازِ قیام وقعود کی تفاصیل بتلانا مقصود نہیں ہے اس کے لئے شرع کی دوسرے اصول وقواعد دیکھنے ہوں گے،جن کا حاصل اقتدا قاعد کا غیر مطلوب ہونا نکلتا ہے لیکن اگر اقتداء کی نوبت آ ہی جائے تو مطلوب مشاکلت ہے،جس قدر بھی ہو سکے۔یہ تو حدیثِ قولی کا منشا ہوا، باقی وہ واقعہ جزئیہ جوابوداؤد میں مروی ہے،اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرات حضور علیہ السلام کے پیچھے اقتداکرنے والے نفل نماز پڑھ رہے تھے کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ انہوں نے ظہر کی نمازِ فرض مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھ لی ہوگی، یہ بہت مستبعد امر ہے کہ حضور علیہ السلام کی علالت کے دوران تمام دنوں میں مسجد جماعت سے معطل رہی ہے،لہذا اپنی نماز فرض ادا کر کے جب حضور علیہ السلام کے پاس عیادت کے لئے پہنچے اور آپ کو دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ بھی آپ کے ساتھ برکت حاصل کرنے کے واسطے جیسے ان کی عادت تھی شریک ہو گئے ہوں گے،رمضان شریف میں بھی ایسا ہی کیا تھا کہ آپ کے پیچھے اقتداء کرلی، پھر آپ دوسرے یا تیسرے روز تراویح فرض ہو جانے کے ڈر سے تشریف نہ لائے ،غرض صحابہ کرام کی یہ نماز صرف تحصیلِ برکت وفضیلت کے خیال سے تھی ،فرض کی ادائیگی نہ تھی ،بعض لوگوں نے اس کو فرض سمجھ لیا جو غلط ہے ،مزید تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ان شاءاللہ تعالیٰ!

حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید فرمایا:۔اگر کہا جائے کہ حدیثِ صلوٰۃ بحالتِ مرض وفات کے اندر اضطراب ہے بعض راویوں نے حضور اکرم ﷺ کو امام بتلایا ،بعض نے حضرت ابوبکرؓ کو،اس لئے وہ ناسخ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے ،اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات ان کے خلاف ہوسکتی ہے، جو حضور علیہ السلام کے صرف ایک بار مرض کی حالت میں باہر تشریف لانے کے قائل ہیں،میرے نزدیک یہ ثابت ہے کہ حضور چار نمازوں میں تشریف لائے ہیں،بعض میں امام تھے اور بعض میں مقتدی حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ حضرت عائشہؓ کی بہت سی روایات سے یہ بات یقین کو پہنچ گئی کہ اس نماز میں حضور علیہ السلام ہی امام تھے۔(فتح ۱۰۷/۲) دوسری یہ کہ حنابلہ جس حدیث سے استدلال کرتے ہیں،اس میں بھی اضطراب ہے۔کیونکہ وہی حدیث انسؓ مسلم شریف میں اس طرح ہے کہ حضور علیہ السلام نے ہم کو بیٹھ کر نماز پڑھائی ،اور ہم نے بیٹھ کر ہی اقتداء کی (فتح الملہم ۵۳/۲)لہذا حدیثِ سقوط میں بھی اضطراب ہوگیا۔اگرچہ تاویل کی گنجائش ہر جگہ نکل سکتی ہے۔

ایک مسئلہ کی تصحیح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔جو شخص فرض نماز پڑھ کر مسجد میں جائے اور وہاں جماعت ہو رہی ہو تو فتح القدیر میں ہے کہ نفل کی نیت سے شریک ہو۔اور صاحبِ درمختار نے بھی اسکو نقل کر دیا ہے مگر اس میں غلطی ہوگئی ہے،حنفیہ کا اصل مذہب یہ ہے کہ دوبارہ فرض ہی کی نیت سے شرکت کرے،اگرچہ ہوگی نفل ہی، کیونکہ فریضہ پہلی بار پڑھنے سے ساقط ہو چکا ہے،جس طرح بچے نمازِ ظہر وعصر پڑھتے ہیں تو ان کی نماز نفل ہی ہوتی ہے اور تعجب ہے کہ حافظؒ نے ہمارا مذہب صحیح نقل کیا ہے جبکہ وہ شافعی ہیں اور حنفیہ سے نقل مذہب میں غلطی ہوگئی ، میں نے دیکھا کہ امام محمدؒ کی جامع صغیر و کتاب الحج و کتاب الآثار وموطا ئیں اور مبسوط شمس الائمہ،سب میں اعادہ کا لفظ لکھا ہے،اور امام طحاوی نے دو جگہ لفظِ اعادہ ہی لکھا ہے اور وہ فقیہ النفس واعلم مذہب الامام ابی حنیفہؒ ہیں۔لہذا ہمارا مذہب اعادہ ہی کا لفظ ادا کرنا ہے،نفل کا نہیں، یہ بات کتب فقہ میں آتی ہی ہے کہ صرف ان نمازوں میں دوبارہ شرکت کرے،جن کے بعد نفل جائز ہیں،جیسے ظہر وعشاء باقی تین نمازوں میں نہیں۔

قولہ فقال ان الشھر ھکذا ۔یعنی کبھی مہینہ ۲۹ کا بھی ہوتا ہے،حضرتؒ نے فرمایا کہ سبب ایلاء میں اختلاف ہے،بعض نے قصہ ماریہ قبطیہ ،بعض نے مطالبہ نفقہ،اور بعض نے قصہ عسل لکھا ہے۔

لطیفہ! حافظ نے لکھا:۔یہ بات لطائف سے ہے کہ ایک ماہ کی مہاجرت وترکِ ربط وکلام وغیرہ کی حکمت یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات

کی تعداد نو تھی تین دن کے حساب سے ۲۷ دن ان کے ہوئے، حضرت ماریہ باندی تھیں ان کے واسطے دو دن کل ۲۹ ہوئے کیونکہ یوں مشروعیت صرف تین دن کی مہاجرت کی ہے (فتح ۲/۲۴۳)!

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مہاجرت میں تناوب کی صورت چونکہ رکیک تھی، اس لئے ایک ساتھ سب سے مہاجرت فرمائی۔

مسئلہ! یہ ایلاء لغوی تھا کہ حضور علیہ السلام نے ایک ماہ کے لئے ازواجِ مطہرات سے مہاجرت فرمائی، اور قسم کھائی کہ اتنے دن تک ان سے ربط نہ رکھیں گے، اور ایلاء شرعی یہ ہے کہ کم از کم چار ماہ تک بیوی سے الگ رہنے اور صحبت نہ کرنے کی قسم کھالے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر اس مدت کے اندر قسم کے خلاف کرے تو کفارہ دے گا، اور اگر چار ماہ گزر گئے تو بیوی پر طلاق بائن پڑ جائے گی، اور بغیر نکاح حلال نہ ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

حافظ رحمہ اللہ کی طرف سے مذہبِ حنابلہ کی ترجیح وتقویت

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ عذر کی وجہ سے امام اگر بیٹھ کر نماز پڑھے، تو بلا عذر کے اس کی اقتداء کرنے والے کو بیٹھ کر نماز پڑھنا حنفیہ، شافعیہ و جمہور کے نزدیک درست نہیں ہے صرف حنابلہ اس کو درست کہتے ہیں، اور عجیب بات ہے کہ حافظ ابن حجرؒ باوجود اپنی عظیم علم وتبحر کے شافعی مذہب کے مقابلہ میں مذہبِ حنابلہ کو قوی کہہ گئے ہیں، میرے نزدیک مذہبِ احناف وشوافع ہی راجح وقوی ہے اور اس کے دلائل اپنے موقع پر آجائیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ حافظ نے اس موقع پر نہ صرف مسلکِ شافعی و جمہور کو کمزور سمجھا، بلکہ امام بخاریؒ کی نسخ والی تحقیق کو بھی نظر انداز کر دیا، حالانکہ وہ امام بخاری کی رائے کو بھی غیر معمولی اہمیت دینے کے عادی ہیں۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ کا خلافِ عادت طرزِ عمل

آپ نے باب قائم کیا کہ امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی کس طرح نماز پڑھیں الخ۔

علامہ خطابیؒ نے لکھا کہ ابوداؤد نے اس حدیث کو بروایتِ حضرت عائشہؓ و جابر وابی ہریرہؓ ذکر کیا ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر کی نماز کا ذکر نہیں کیا جو آپ نے (مرضِ وفات) میں بیٹھ کر پڑھائی تھی اور لوگوں نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کی تھی، حالانکہ یہ حضور علیہ السلام کے دونوں عمل میں سے آخری عمل تھا، اور امام ابوداؤدؒ کی عادت بھی ابوابِ کتاب کے سلسلہ میں ایسی تھی کہ وہ ایک حدیث کو ایک باب لاتے تھے تو اس کے معارض حدیث کو اگلے باب میں ذکر کرتے تھے، میں نے سنن ابی داؤد کے کسی نسخہ میں اس دوسرے باب کو نہیں پایا، میں نہیں سمجھ سکا کہ اُن سے اس آخری واقعہ کے ذکر سے ایسی غفلت کیونکر ہوئی جبکہ یہ سننِ نبویہ کے اصول وامہات میں سے ہے اور اسی کے موافق اکثر فقہاء کا مذہب بھی ہے۔

خطابی کی اس عبارت کو نقل کر کے محقق عینی نے لکھا:۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ترک یا تو سہو وغفلت سے ہوا یا چونکہ اس بارے میں ابوداؤد کی رائے مسلکِ امام احمد کے مطابق تھی اس لئے اس کی مخالف ومناقض امر کو ذکر نہیں کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم! (عمدہ ۲/۵۷۲)

لمحہ فکریہ! اب تک یہ بات اربابِ صحاح میں سے صرف امام بخاریؒ سے متعلق معلوم تھی کہ وہ صرف اپنے تفقہ ورائے سے مطابقت رکھنے والے ابواب قائم کرتے ہیں اور اسی کی مستدل احادیث لاتے ہیں، خلاف والی نہیں لاتے، اس علم میں اب اضافہ امام ابوداؤدؒ کے متعلق بھی ہوگیا۔

بَابُ اِذَا اصَابَ ثَوْبُ الْمُصَلِّي امْرَاءَ تَهُ اِذَا سَجَدَ

(جب نماز پڑھنے والے کا کپڑا سجدہ کرتے وقت اس کی عورت کو چھو جائے)

(۳۶۹) حدثنا مسدد عن خالد قال نا سليمان الشيباني عن عبدالله بن سداد عن ميمونة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي و انا حذاءه و انا حائض و ربما اصابني ثوبه اذا سجد قالت و كان يصلي على الخمرة

ترجمہ! حضرت میمونہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نماز پڑھتے (ہوتے) تھے اور میں آپ کے سامنے ہوتی تھی، حالانکہ میں حائضہ ہوتی تھی اور اکثر جب آپ سجدہ کرتے تو آپ کا کپڑا مجھ پر پڑ جاتا تھا، حضرت میمونہؓ کہتی ہیں، کہ آپ خمرہ (بوریہ) پر نماز پڑھتے تھے۔

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ نجاستِ مفسدہ نماز کے لئے وہی ہے جس کو خود نمازی اٹھائے، اور یوں بھی کچھ حرج نہیں کہ نمازی کا کپڑا کسی خشک نجاست پر پڑ جائے، اسی مسئلہ کو امام بخاریؒ نے اس باب اور حدیث الباب میں ثابت کیا ہے۔

علامہ محقق عینیؒ نے لکھا:۔ امام بخاریؒ کی عادت تو یہ ہے کہ وہ تراجم ابواب میں اس قسم کی عبارت جب ذکر کیا کرتے ہیں کہ مسئلہ میں کوئی اختلافی صورت موجود ہو، لیکن یہاں خلافِ عادت کیا ہے کیونکہ اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

حدیث الباب کا دوسرا جزو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام بوریہ پر نماز پڑھتے تھے، اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے جو مروی ہے کہ ان کے واسطے مٹی لائی جاتی تھی، اس کو بوریہ پر رکھا جاتا اور اس پر آپ سجدہ کرتے تھے، تو بشرطِ صحتِ روایت یہ ان کی غایتِ تواضع و خشوع کی بات تھی، نہ اس لئے کہ وہ بوریہ پر نماز کو درست نہ سمجھتے تھے، اور یہ بات کیسی ہو سکتی تھی جبکہ خود حضور علیہ السلام سے بوریہ پر نماز پڑھنے کا ثبوت موجود ہے اور آپ سے زیادہ تواضع و خشوع کسی میں نہیں ہو سکتی۔

حضرت عروہ سے جو ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے کہ وہ بجز زمین کے ہر چیز پر مکروہ سمجھتے تھے، تو اوّل تو ممکن ہے ان کی مراد صرف کراہت تنزیہی ہو، دوسرے یہ کہ حضور علیہ السلام کے خلاف کسی کے فعل وقول کو حجت قرار نہیں دیا جا سکتا (عمدہ ۲/۷۶۲)

یہ آخر میں جو بات علامہ عینی نے لکھی ہے اس کو حافظ ابن حزم وغیرہ بھی بڑے اہتمام سے جگہ جگہ لکھا کرتے ہیں، ظاہر ہے علامہ عینی اور تمام اکابر حنفیہ بھی اس کو مانتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس زریں اصول کو کوئی بھی کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کر سکتا مگر امام اعظم اور ان کے چالیس شرکاءِ تدوین فقہ محدثین و مفسرین و سابقین اولین کے مدارکِ اجتہاد اور حدیثی فقہی تبحر و وسعتِ علم کا صحیح محتاط اندازہ کئے بغیر ان کے مقابلہ میں اس کے استعمال کو محتاط نہیں کہا جا سکتا۔ واللہ المستعان!

(محقق عینی نے عنوان استنباطِ احکام کے تحت لکھا کہ حدیث الباب سے بوریہ پر نماز پڑھنے کا جواز بلا کراہت ثابت ہوا اور حضرت ابن المسیبؒ نے تو اس کو سنت بھی کہا ہے۔)

انوار الباری ۱۲

اردو شرح

صحیح البخاری

پیش لفظ

باسمہ تعالیٰ جل ذکرہٗ:۔ گزارش ہے کہ انوارالباری کی بارھویں قسط ہدیہ ناظرین ہے، جس طرح سابق جلد میں حدیثِ بخاری معراج نبوی کے تحت ''معراج اعظم'' کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان ہوئے تھے، اس جلد میں حدیثِ بخاری ''وافقت ربی فی ثلاث'' کے تحت محدّثِ امتِ محمدیہ ''فاروق اعظم'' سیدنا حضرت عمرؓ کے علمی، دینی وسیاسی کارناموں کا تعارف کسی قدر تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

دین وسیاست کا اٹوٹ رشتہ

جس طرح دین کو سیاست سے الگ کردیں تو وہ چنگیزیت وفسطائیت ہوجاتی ہے، اسی طرح اگر سیاست کو دین سے جدا کردیں تو رہبانیت بن جاتی ہے، اس لئے زعماءِ ملّت وعلماءِ امت کا اہم ترین فریضہ ہے کہ وہ نہ صرف دونوں کے مستحکم رشتہ کو شکست وریخت سے بچائیں بلکہ اس کے استحکام کے لئے اپنی پوری جدوجہد صرف کریں۔ تمام انبیاء علیہم السلام اور خاص طور سے سرورِ انبیاءِ محمد ﷺ اور آپ کے متبعین برگزیدہ زعماء وعلماءِ اور خیارِ امت، نے ادائیگی عبادات وطاعات کے ساتھ اعلاءِ کلمۃ اللہ کا فرض بھی پوری طرح ادا کیا ہے، اور یہ فرض قیام قیامت تک باقی رہے گا، افرادِ امتِ محمدیہ میں سے کوئی فرد بھی کسی وقت اور کسی جگہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا،،

''دیارِ اسلام'' میں چونکہ مسلمانوں کو قوتِ وشوکت حاصل ہوتی ہے اور وہاں ان کے اموال وانفس کے لئے شرعاً ڈبل عصمت مقومہ وموثمہ کا امتیاز مل جاتا ہے، اس لئے ان کی ذمہ داری بھی زیادہ ضرور ہے مگر ''دیارِ حرب'' کے بسنے والے مسلمانوں کو بھی حق تعالیٰ نے عصمتِ موثمہ سے ضرور نوازا ہے، اس لئے اصلِ فرض سے غفلت وہ بھی نہیں برت سکتے۔

''اسلام'' حقوق انسانیت کا نگہبانِ اعظم ہے، وہ ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھتا ہے کہ وہ دنیا میں باعزت زندگی گزارے، اور اپنے معاشی، سماجی، وسیاسی حقوق حاصل کرے اور اپنے دینی ومذہبی نظریات وافکار میں پوری طرح آزاد ہو، اگر کسی ایک انسان کے بھی حقوقِ انسانیت پر زد پڑتی ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس ظلم کو دور کریں اور کرائیں، جب یہ فرض عام انسانوں کے لئے ہے تو مسلمانوں پر بسبب فرضیت اعلاءِ کلمۃ اللہ اور بھی ضروری ہے کہ وہ اس فریضہ کی طرف زیادہ توجہ کریں۔

پوری اسلامی تاریخ پر نظر کر لیجئے کہ سرورِ دوعالم محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی مکّی زندگی سے لے کر آخر تک یہی نظریہ کارفرما رہا کہ اپنے لئے بھی آزادی وعزت کی زندگی میسر ہو، اور دوسروں کے لئے بھی، وہ خود بھی سربلند ہوئے، اسلام کو بھی عزت کا مقام دلایا، دوسری مظلوم قوموں کی بھی بھرپور امداد کی اور ساری دنیا کو عدل وانصاف رواداری ومساوات سے بھر دیا، اور جب سے مسلمانوں میں کمزوری آئی، دولِ یورپ وامریکہ رُوس نے کمزوروں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنالیا ہے۔

درحقیقت مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ دورِ اقتدار ساری دنیا کے لئے امن وسلامتی اور عدل وانصاف کی ضمانت بنا ہوا تھا، اس کے بعد سے لادینی سیاست اور ظلم وستم کا دور دورہ ہے، ایک طرف سے اشتراکیت، کمیونزم اور لامذہبیت کا سیلاب بڑھ رہا ہے تو دوسری طرف سے سرمایہ پرستی اور دوسرے انسانیت کش حربوں سے یورش ہورہی ہے ان حالات میں مسلمان امراءِ، زعماء وعلماءِ کا فرضِ اولین ہے کہ دنیا کی رہ نمائی کریں، اور منظّم ومتحد ہوکر ہر انسانیت دشمن تحریک کا مقابلہ کریں۔

واضح ہو کہ اسلامی سیاست، جارحیت سے یکسر پاک، اور جذبہ خدمتِ خلق سے معمور ہے جیسا کہ ہم نے حضرت عمرؓ کی خلافت کے حالات سے ثبوت پیش کیا ہے، اس جذبہ سے اگر اب بھی کام کیا جائے تو انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہوسکتی ہے۔ اور زعمائے ملّت وعلمائے امت کا فرض ہے کہ اس زندگی کو اپنائیں اور عوام کو بھی اس راہ پر لگائیں، ان کے اندر سیاسی شعور پیدا کریں جو قومی وملی زندگی کا جزو اعظم ہے۔

اس موقع پر ہم مضمون بالا کی تائید میں حضرت علامہ کشمیریؒ کے خطبہ صدارت اجلاس ششم جمعیۃ علمائے ہند منعقدہ ۱۲\۱۳\۱۴ دسمبر

۱۹۲۷ء (بمقام پشاور) سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، جو اہلِ علم وعوام کے لئے مفید ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سب سے پہلے آپ نے ضرورتِ نظام ملی و تقسیم عمل پر تبصرہ فرمایا اور بتلایا کہ جس طرح عالم صغیر یعنی وجودِ انسانی کا نظم قلب ودماغ اور جوارح کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، کیونکہ تمام ملکات واخلاق کا عامل ومنبع قلب ہے، اور معارف وعلوم کا حامل دماغ ہے اور تمام اعمال وافعال کے مظاہر جوارح ہیں، اسی طرح عالم کبیر یعنی مجموعہ عالم کے لئے بھی قلب ہے، جس کو اصطلاحِ شریعت میں اولی الامر یا اصحابِ حل وعقد سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس کا دماغ حکماءِ وعلماءِ شریعتِ غراء ہیں، اور اس کے اعضاء وجوارح عامہ افرادِ خلق اور عوام ہیں، پس اگر علمائے امت وظیفہ دماغ کو باحسن وجوہ انجام دیتے رہیں، یعنی علوم ومعارف کا صحیح طور سے نشر وابلاغ کرتے رہیں اور مہماتِ عمومیہ وخصوصیہ میں صحیح رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہیں تو افرادِ خلق یعنی عوام بھی اعمال صحیحہ بجالانے میں دست وپا کا کام دیتی ہیں اور نظام عالم نہایت منظم اور صحیح طور پر قائم رہتا ہے۔ (ص۴)

یہ بھی واضح رہے کہ تمام مجموعہ عالم کا چونکہ فاعل وخالق ایک ہی ذاتِ اقدس وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے، اس لئے تمام رجحانات کا مرجع اسی کی طرف ہونا چاہیے، یعنی تمام امور اسی ایک ذاتِ واحد کے لئے ہیں اور اسی کی طرف سب لوٹ کر جانے والے ہیں اور تمام افرادِ عالم بمنزلہ ایک کشتی کے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود کی طرف جارہی ہو (ص۵)

اس مجموعہ عالم یا شخص اکبر کی حیات کلمۃ اللہ اور خدائے عزوجل کا نام پاک ہے، جب تک اس ذاتِ اقدس کا نام عالم میں باقی ہے قیامت جو کہ اس شخصِ اکبر کی موت ہی نہیں آسکتی، اور جب نام حق اس میں باقی نہیں رہے گا، مجموعہ عالم پر موت طاری ہوجائے گی، جس کا نام قیامتِ کبریٰ ہے (کمافی روایت مسلم)

جس طرح مجموعہ عالم محتاج نظام ہے، ہماری حیاتِ ملی اور اس کی بقاء بھی بغیر کسی نظام کے باقی نہیں رہ سکتی، منتشر افراد اور پراگندہ اشیاء کا وجود بے معنی اور لاحاصل ہے، اس لئے ان کا فائدہ اور حسن ہمیشہ صحیح ہیئتِ ترکیبی ہی پر موقوف ہے، اور نظام کی روح یہ ہے کہ اجزاءِ عمل کو صحیح طور پر تقسیم کیا جائے، جو شخص جس جزو کا اہل ہو وہی اس کے سپرد کیا جائے، اور وہ اپنے مفوضہ خدمت کو پیشِ نظر رکھ کر نتیجہ واحدہ اور مقصد وحید کی طرف گامزن ہو، اور ہمیشہ "**يدالله على الجماعه**" پر نظر رکھے، یعنی اس امر پر کہ خدا کی نصرت، تائید وحمایت جماعت کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔

بایدت از درسِ تکوین ایں سبق آموختن دستِ قدرت باجماعت ہست وحق باخلقِ خویش

شریعتِ غراء اور ملت بیضاء نے ایک نظام میں مسلک رہنے کی عظیم اہمیت کا احساس دلانے کے لئے اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ اگر دو تین آدمی بھی ساتھ مل کر سفر کریں تو ان کو بھی چاہیے کہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں۔ (ص۶)

بہرحال! بغیر نظام کے شہر، ملک، اقلیم اور ملت واقوام کی بقاء وحیات تو کجا ایک گھر بلکہ شخص واحد کی بقا بھی نہیں رہ سکتی پس اگر اہل اِسلام کو اپنی زندگی وحیات، بقاء وارتقاءِ درکار ہے تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بغیر نظام درست وصحیح تقسیم کار کے کسی طرح ممکن نہیں، اور ظن غالب ہے کہ ہمارا موجودہ تشتت وافتراق ہمارے وجود کو سراسر فنا کے حوالہ کردے گا (ص۷)

آگے آپ نے آیتِ قرآنی **واولی الامر منکم** کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:۔ ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ اس عالم کا قلب جماعت **اولی الامر** ہے اور شرعی نقطہ نظر میں اولیٰ الامر سے مراد ولاتِ امور، حکام اسلام، علماء وجملہ اربابِ حل وعقد ہیں جن کی رائے پر تمام امور کا انتظام انجام پاتا ہو، پھر دوسری آیت میں علم واستنباط کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ اولی الامر سے مراد علماء ومجتہدین ہیں اور صحیح مسلم میں اس آیت کی شان نزول وہ واقعہ بتایا گیا ہے جس میں حضرت فاروق اعظمؓ نے دربارۂ تخییر وایلاءِ حضور اکرم ﷺ استنباط فرمایا تھا۔

بہرحال! دورِ جاہلیت میں تو اولی الامر کا منصب سردارانِ قبائل واشراف کے لئے مخصوص تھا، لیکن اسلام نے قومی عصبیت وتفاخر بالآباء کو فنا کرکے یہ منصب عظمیٰ اہل حل وعقد اور اہل اجتہاد واستنباط اور علماء وداعیانِ امت کے سپرد کردیا، اور ظاہر ہے کہ جب ولاتِ امور

موجود نہ ہوں تو علماء اور اعیانِ امت ہی ان کی قائم مقامی کے مستحق ہیں۔ (ص ۸)

حضرتؒ نے عبارتِ مذکورہ میں خاص طور سے ہندوستان جیسے ممالک کے لئے رہنمائی فرمائی ہے، جہاں ولاۃ و حکامِ اسلام نہیں کہ وہاں صرف علماءِ دین اور غیر علماءِ میں سے اعیانِ ملت وقائدین وزعما اہل اسلام وعوام کی رہنمائی کریں گے۔

حضرتؒ نے ۲۰ میں مجاہدین علمائے ہند کو علماءِ صادقین اور مجاہدین قائدین ملت کو زعمائے ہند کے لقب سے یاد کیا ہے، اور مذہبی وقومی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں دونوں کے باہمی اشتراکِ عمل کو بھی سراہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دیارِ اسلام میں حکام، زعماء وعلماءِ تینوں کو مذہبی، قومی وملکی معاملات میں سر جوڑ کر اتحاد ویکجہتی کے ساتھ اشتراکِ عمل وتعاون کرنا چاہیے، الگ الگ راستوں پر نہ چلنا چاہیے، جس سے ان کے پیرو عوام وجمہور پریشان خیالی وانتشار کا شکار ہوں، اسی طرح دیارِ حرب میں جہاں ولاۃ وحکام اسلام نہیں ہوتے، علماء وزعماء کو متحدہ مساعی جاری رکھنی چاہیں، ان کے گروہ بندی وافتراق میں مبتلا ہونے سے مذہب وملک وقوم سب کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچیں گے اور اس کا بارہا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ''استحسانِ معاہدہ مسلمین یا غیر مسلمین'' کا جلی عنوان قائم کر کے اس امر پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو وطنی وقومی مفاد کے لئے غیر مسلموں سے معاہدہ بھی کرنا چاہیے اور یہودِ مدینہ کے ساتھ معاہدۂ نبوی کو سامنے رکھ کر شرائطِ معاہدہ طے کر کے مکمل یکجہتی کے ساتھ باہمی تعاون کرنا چاہیے، لیکن ایسے معاہدہ کے لئے شرطِ اوّل یہ ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی احکام سے ایک انچ بھی ہٹ کر کوئی معاہدہ نہ کریں، کیونکہ جس معاہدہ کی بنیاد لوگوں کی رضا جوئی اور خالق کی ناراضی پر ہو وہ کسی طرح درست اور پائدار نہیں ہو سکتا، اور مسلمانوں کو مذہبی حقوق اور وطنی مفاد دونوں کو یکساں لازمی طور سے خیال کرنا ہوگا۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں قومیں ایک منصفانہ معاہدہ کر لیں جس میں ملکی وقومی مفادات کے ساتھ جانبین کے مذہبی حقوق اور جان ومال کی حفاظت وسلامتی کی ضمانت بھی دی گئی ہو، اس طرح اگر مسلمان مذکورہ بالا معاہدہ کے تحت اپنے ہمسایہ غیر مسلم بھائیوں کی طرف سے مطمئن ہوں گے۔ اور ان کے ظلم وتعدی کا شکار نہ ہوں گے، تو ان کا رویہ کسی بیرونی حملہ کے وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کے گھر پر بیرونی حملہ کے وقت ہوا کرتا ہے، اگرچہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہی ہو، دوسرے یہ کہ جب مسلمانانِ ہند اپنے معاہدہ مذکورہ کی وجہ سے پابند ہوں گے اور غیر مسلم اقوام ہند سے ان کا معاہدانہ برتاؤ لازمی وضروری ہوگا، تو ایسی حالت میں کسی مسلمان بادشاہ کو مذہباً اس کی اجازت بھی نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے معاہدہ کو توڑے اور ہندوستان پر حملہ آور ہو بلکہ شریعتِ اسلام کی رو سے اس پر واجب ہوگا کہ مسلمانانِ ہند کے اس معاہدہ کا پورا پورا احترام کرے۔

لقولہ علیہ السلام ''ذمة المسلمين واحدة يسعىٰ بهاادنا هم'' (سارے مسلمانوں کا عہد وذمہ داری ایک ہے، ان میں سے ادنیٰ درنہ کا مسلمان بھی کوئی عہد کر لے تو دوسروں پر اس کا احترام کرنا واجب ولازم ہو جاتا ہے)

لہٰذا میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادرانِ وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ معاہدہ کر لیں اور اس معاہدہ کو وہ دیانتداری وخلوص کے ساتھ پورا کریں، سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار ومخلص ہمسایہ پائیں گے، کیونکہ مسلمان بحیثیت مذہب کے قرآن مجید کے حکم کے بموجب معاہدہ کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں (۲۱)!

۲۲ و ۲۳ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کے دارالاسلام نہ ہونے کی بھی وضاحت کی ہے، اور معاہدۂ نبوی مذکورہ کی تفصیلات سے بھی روشناس کرایا ہے، جس سے تمام مسلمانوں خصوصاً علماءِ کرام کو ضرور واقف ہونا چاہیے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے خطبہ میں جمعیۃ علماءِ ہند کی سات آٹھ سالہ قومی وملی خدمات کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور کے علماءِ وصلحائے امت صرف درس وتدریس وعظ وتلقین وامامتِ مساجد تک ہی اپنی خدمات کو موقوف ومنحصر نہ کر دیتے تھے بلکہ ملک وملت کی دوسری خدمات انجام دینا بھی اپنا ملی فریضہ سمجھتے تھے، وہ خدمات مختصراً یہ ہیں:۔

(۱) یورپین غیر مسلم سلطنتوں نے اسلامی ممالک پر ہجوم کیا تو مسلمانانِ ہند پر اپنی مذہبی بھائیوں کی امداد واعانت مذہبی فرض کے طور پر عائد ہوگی، مگر مسلمانانِ ہند اپنی بے بسی وبے چارگی کے باعث کسی قسم کی مادی امداد سے عاجز تھے اس لئے زعماءِ قوم نے ترکِ تعاون کا طریقہ اختیار کیا اور جمعیۃ علماء نے بھی اس حربہ کو مفید سمجھ کر ترکِ تعاون کا مشہور فتوی صادر کیا۔ لاکھوں کی تعداد میں اس کی شائع کیا، برٹش گورنمنٹ نے مزاحمت کی مگر مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی، اس لئے وہ گورنمنٹ کی سخت گیر پالیسی اور دارو گیر وغیرہ کسی چیز سے بھی مرعوب نہیں ہوئے جس سے دوررس سیاسی نتائج ومفادات حاصل ہوئے۔

(۲) جمعیۃ علمائے ہند نے اس امر سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ مسلمانوں کو کسی غیر مسلم کی اعانت ونصرت کے لئے مسلمانوں سے لڑنا حرام ہے، کیونکہ اس کا بدیہی نتیجہ اعلاءِ کلمۃ الکفر ہے اور پرستارانِ توحید پر حرام ہے کہ وہ اعلاءِ کلمۃ الکفر میں شریک ہوں یا اس کے ذرائع ووسائل کو مضبوط کریں۔

(۳) جمعیۃ العلماء نے جزیرۃ العرب کو تسلّطِ غیر مسلم سے محفوظ رکھنے کی فرضیت کا اعلان کیا اور تخلیہ جزیرۃ العرب کے متعلق نصوصِ شرعیہ پیش کر کے اس مسئلہ کو انتہائی روشنی میں پہنچا دیا۔

(۴) خلافتِ اسلامیہ کے تحفظ وبقاء واستحکام کے مسئلہ میں جمعیۃ علماء نے جمعیۃ خلافت مرکزیہ کے ساتھ مکمل ہمنوائی کی اور اس سے متعلق تمام احکام شرعیہ ونصوصِ مذہبیہ پیش کر کے مسلمانوں کو سرگرم عمل کر دیا۔

(۵) مسلمانوں کو باہمی تناصر وتعاون اور دولِ مسلمہ کی حمایت ونصرت کا سبق یاد کرایا اور مشرق ومغرب کے مسلمانوں کو باہمی الفت ومودت، تعاضد وتناصر کی ضرورت اور وجوب سے آگاہ کیا۔

(۶) جمعیۃ علماءِ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے قلوب میں روح ملی تازہ کر دی اور ان کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور حقوق مذہبیہ وقومیہ کے حصول کے لئے تحمل مصائب ومشاق کا خوگر بنایا، یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دورِ ابتلاء میں علمائے صادقین، زعمائے ہند اور عامہ مسلمین سب نے ہی قید وبند کی مصیبتیں برداشت کیں۔

(۷) جمعیۃ علماءِ نے مظلوم موپلاؤں کی امداد واعانت میں بھی پوری سعی کی اور مظلومین سہارنپور کی امداد میں بھی کافی حصہ لیا۔

(۸) شدھی کا شور بلند ہونے پر جمعیۃ علماءِ ہند نے ناواقف وسادہ لوح مسلمانوں کو ارتداد کے جال سے بچانے کے لئے بروقت توجہ کی اور پوری ہمت واخلاص کے ساتھ ارتداد کے سیلاب کو روکا۔

(۹) سب سے زیادہ روشن کارنامہ جمعیۃ علماءِ ہند کا یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں باہمی مصالحت ورواداری پیدا کی اور علماءِ اسلام کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں نمایاں کام کیا، ایسے اصول وضع کئے جن سے علماءِ اسلام باوجود اپنے اپنے مذہبی خیالات ومعتقدات پر قائم رہنے کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مسلمانوں کی مشترکہ ضروریات پر غور کریں! اور مشترکہ مفاد کی تحصیل میں کنفس واحدۃ شریکِ عمل ہوں۔ (۱۵، ۱۶، ۱۷)

حضرت شاہ صاحبؒ کے خطبہ صدارت کے اسّی صفحات کے لآبی قیمہ میں سے قلتِ گنجائش کی وجہ سے صرف چند شہ پارے علماءِ امت کی توجہ کے لئے پیش کر دیئے گئے ہیں۔

والغاقل تکفیہ الاشارہ والله الموفق لکل خیر وسعادہ

وانا الاحقر

سیّد احمد رضا عفا اللہ عنہ

بجنور ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ ۱۶ نومبر ۱۹۷۰ء یوم الاثنین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الصلوٰة على الحصير وصلى جابد بن عبدالله وابو سعيد فى اسفينة قائما وقال الحسن تصلى قائما ما لم تشق على اصحابک تدور معها والافقاعدًا

(چٹائی پرنماز پڑھنے کا بیان، اور جابر بن عبداللہ، اور ابوسعید (خدری) نے کشتی میں کھڑے ہوکر نماز پڑھی، حسن (بصری) نے کہا ہے کہ کشتی میں کھڑے ہوکر نماز پڑھ سکتے ہوتا وقتیکہ تمہارے ساتھیوں پر شاق نہ ہو، کشتی کے ساتھ گھومتے جاؤ، ورنہ بیٹھ کر (پڑھو)

(۳۷۰)حدثنا عبدالله بن يوسف قال انا مالک عن اسحاق بن عبدالله بن ابى طلحة عن انس بن مالک ان جدته، مليكة درعت رسول الله صلى الله عليه وسلم لطعام صنعته له فاكل منه ثم قال قوموا فلا صلى لكم قال انس فقمت الىٰ حصير لنا قداسود من طول مالبس فنضحته، بمآء فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم وصففت اناواليتيم ورآءه، والعجوزمن ورآئنافصلى لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم ركعتين ثم انصرف

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ان کی دادی **ملیکہ** نے رسول اللہ محمد ﷺ کو کھانے کے لئے بلایا، جو خاص آپ کے لئے انہوں نے تیار کیا تھا، جب آپ نوش فرما چکے تو آپ نے فرمایا، اٹھو، میں تمہارے گھر میں نماز پڑھوں گا، حضرت انسؓ کہتے ہیں میں اپنی ایک چٹائی کی طرف متوجہ ہوا جو کثرت استعمال سے سیاہ ہوگئی تھی، میں نے اسے پانی سے دھویا، پھر رسول خدا محمد ﷺ اس پر کھڑے ہوگئے، میں نے اور ایک یتیم نے آپ کے پیچھے صف باندھ لی اور بڑی بی ہمارے پیچھے کھڑی ہوگئیں اور رسول خدا ﷺ نے ہم سب کے ہمراہ دو رکعت نماز ادا فرمائی اس کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ابن بطال کی رائے ہے کہ مصلّی اگر بقدر قامت انسان ہوتو وہ حصیر کہلاتا ہے، اس سے کم ہوتو خمرہ، امام بخاریؒ کی عادت ہے کہ وہ ان تمام افعال پر عنوانات قائم کرتے ہیں جو رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہوئے ہیں اسی لئے یہاں باب الصلوٰة على الحصير قائم کیا، اس کے بعد باب الصلوٰة على الخمرة، اورباب الصلوٰة على الفراش وغیرہ لائیں گے، اس باب کے ضمن میں امام بخاریؒ نے یہ بھی بیان کیا کہ حضرت جابر وابوسعیدؓ نے کشتی میں کھڑے ہوکر نماز پڑھی ہے الخ حافظ نے لکھا کہ اس سے امام بخاریؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے خلاف کی طرف اشارہ کیا ہے اُن کے نزدیک بلا عذر کے یعنی قیام پر قدرت ہوتے ہوئے بھی کشتی میں بیٹھ کر نماز جائز ہے (فتح ۱/۳۳۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اس کے مقابلہ میں امام صاحبؒ کے لئے حضرت انسؓ کا اثر ہے کہ وہ بصرہ سے اپنی زمین پر جاتے تھے تو کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بظاہر کوئی عذر نہ تھا، امام ابو یوسف وامام محمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ بلا عذر کے کشتی میں بیٹھ کر نماز جائز نہیں اور احتیاطًا اسی پر عمل کرنا اولیٰ بھی ہے، پھر ہمارے مشائخ نے ریل کو تخت وچارپائی کی طرح اقرار دیا ہے اس لئے اس میں بھی صرف کھڑے ہوکر نماز کو جائز کہا ہے، دوسرے حضرات نے ریل کو کشتی کے مثل کہا، اور نماز کی کھڑے وبیٹھے دونوں طرح اجازت دی، میرے نزدیک بھی یہی مختار ہے صاحب بدائع نے بھی کشتی وبحری جہاز کی نماز پر عمدہ تفصیلی بحث کی ہے آپ نے لکھا:۔ اگر کشتی پانی یا زمین پر ٹھیری ہوئی ہوتو اس میں نماز صرف کھڑے ہوکر ہی درست ہے، اگر زمین پر ٹھیری ہوئی نہ ہو اور کنارے سے بندھی ہوتو اس سے باہر نکل کر کنارے پر نماز پڑھ سکے تو

اس کے اندر بیٹھ کر درست نہ ہوگی، باہر نکل کر زمین پڑھے گا، جس طرح گھوڑے اونٹ وغیرہ سے اتر کر نماز پڑھ سکتا ہوتو فرض نماز ان پر درست نہیں ہے، اور اگر کشتی دریا میں چل رہی ہوتب بھی کنارے پر آ سکتا ہوتو بہتر کنارے پر ہی نماز پڑھنا ہے، کیونکہ کشتی میں سر چکرانے کا خطرہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنی پڑے گی لیکن اگر کنارے پر نہ آئے اور کشتی ہی میں کھڑے ہوکر پڑھے تب بھی نماز درست ہوگی، حضرت انسؓ سے اس طرح ثابت ہے۔ گھوڑے اونٹ پر کھڑے ہوکر نماز چونکہ پڑھی ہی نہیں جاسکتی اس لئے اس کا مسئلہ الگ رہا۔

امام اعظمؒ کے نزدیک اگر کشتی پر کھڑے ہوکر پڑھ سکتا ہو یا کنارے پر اتر سکتا ہوتب بھی کشتی میں بیٹھ کر رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز فرض ادا کرسکتا ہے اگرچہ اس طرح کرنا بہتر نہیں اور خلافِ اولیٰ ہے۔

امام صاحبؒ کا استدلال حدیثِ انسؓ سے ہے، دوسرے حسن بن زیاد نے اپنی کتاب میں سوید بن غفلہ کی سند سے روایت کیا کہ میں نے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ سے کشتی میں نماز کے بارے میں سوال کیا تو دونوں نے فرمایا کہ کشتی چلتی ہوتو نماز بیٹھ کر پڑھے، ٹھیری ہوئی ہوتو کھڑے ہوکر۔ اس میں انہوں نے قیام پر قدرت وعدمِ قدرت کی کوئی شرط نہیں لگائی۔ تیسرے یہ کہ کشتی کے چلنے کی حالت میں دورانِ راس اکثر ہوتا ہے لہٰذا سبب کو مسبب کی جگہ سمجھ لیا گیا اور ایسا ہی ہوتا بھی ہے خصوصاً جبکہ مسبب پر واقفیت دشوار ہو، یا وہ ایسا ہو کہ سبب کے ہوتے ہوئے اس کا موجود نہ ہونا بہت نادر ہو۔

جس طرح امام صاحب نے مباشرتِ فاحشہ کو خروجِ منی کا قائم مقام قرار دیا کہ عدم خروج نادر ہے ایسے ہی کشتی میں دوران راس نہ ہونا بھی نادر ہے، لہٰذا حکم اکثری حالت پر دیا گیا (یا جس طرح سفر کو قائم مقام مشقت کے قرار دیا گیا کہ ہر سفر میں قصر کا حکم ہوگیا یا جیسے نیند کو قائم مقام حدث کے کیا گیا، کمافی کلام ابن عابدین (الامع ۱/۱۵۲) صاحبین کی مستدل حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ استحباب پر محمول ہے وجوب پر نہیں (بدائع ۱/۱۰۹)

محقق عینیؒ نے لکھا:۔ امام صاحبؒ کے نزدیک جو کشتی میں بہ عذر و بلا عذر ہر طرح بیٹھ کر نماز درست ہے، یہی قول محدث ابن ابی شیبہؒ نے حسن بن مالک ابوقلابہ اور طاؤس کا نقل کیا ہے اور مجاہد سے مروی ہے کہ جنادہ بن ابی امیہ نے نقل کیا کہ ہم ان کے ساتھ غزوات میں جاتے تھے تو کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے (عمدہ ۲/۸۷۲) عینی نے بنایا میں محیط سے نقل کیا کہ مجاہد نے کہا ہم نے جنادہ بن ابی امیہ کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھی اور ہم چاہتے تو کھڑے ہوکر بھی پڑھ سکتے تھے ۱/۹۳۲ (اعلاء السنن ۷/۱۲۲)

محقق عینیؒ نے کشتی کی نماز کو اس باب میں لانے کی وجہ مناسبت ابن المنیر سے نقل کی کہ بوریہ پر نماز اور کشتی میں نماز دونوں زمین کے علاوہ دوسری چیز پر ہیں، گویا بتلایا کہ صرف زمین ہی پر نماز کی ادائیگی ضروری نہیں، اور اس سے زیادہ قوی وجہ مناسبت یہ ہے کہ جس طرح مصلّی وجائے نماز زمین پر ہوتا ہے، اسی طرح کشتی پانی پر ہوتی ہے، لہٰذا دونوں پر نماز درست ہے۔

اعلاء السنن ۷/۱۲۱ میں باب الصلوٰۃ فی السفینۃ کے تحت حضرت ابن عباسؓ کا اثر نقل کیا کہ کشتی میں سوار ہونے والا اور ننگا آدمی بیٹھ کر نماز پڑھے گا رواہ عبدالرزاق فی مصنفہ (زیلعی) اس روایت میں صرف ابراہیم بن محمد مختلف فیہ ہے، مگر امام شافعیؒ نے اسکی ثناء توثیق کی۔

قولہ وصففت انا والیتیم وراءہ والعجوز من ورائنا حافظ نے لکھا کہ اس سے جماعت کی نماز میں نابالغ لڑکے کا مردوں کے ساتھ صف میں کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کا جواز معلوم ہوا، عورتوں کا مردوں کی صفوں سے پیچھے نماز ادا کرنے کا حکم نکلا، اور یہ بھی کہ عورت تنہا ہوتو وہ پیچھے الگ صف میں تنہا کھڑی ہوکر نماز پڑھے گی لیکن اس سے کسی تنہا مرد کے لئے الگ صف میں تنہا کھڑے ہوکر نماز ادا کرنے کا جواز نکلنا درست نہیں ہوگا۔ (فتح ۱/۳۴۳)

یہ آخری بات حافظ نے عجیب کہی، جبکہ خود امام شافعی کا مذہب اور امام مالک وامام ابوحنیفہ کا بھی جواز ہی ہے اگرچہ خلافِ اولیٰ ہوگا، البتہ امام احمد واصحابِ حدیث نے حدیث "لا صلوٰۃ للمنفرد خلف الصف" کی وجہ سے اس کی عدم جواز کا فیصلہ کیا ہے اور ہم اس کو نفی کمال پر محمول کرتے ہیں۔ (کمافی العمدہ ۱/۲۸۲)

مسئلہ محاذاۃ! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ لڑکا اگر تنہا ہو تو اس کو مردوں کی صف میں کھڑا کر لینا چاہیے، لیکن عورت اگر تنہا ہو تو بھی اس کو مردوں کی صف میں کھڑا نہیں کر سکتے، اس کو مؤخر کرنا ضروری ہے، یعنی لڑکوں کا تاخر استحباب کے درجہ میں اور عورتوں کا وجوب کے درجہ میں ہے۔

اس سے امام صاحبؒ کے مسئلہ محاذاۃ کا استنباط بھی واضح ہوا، لہٰذا مولانا عبدالحئیؒ[1] صاحب لکھنویؒ کا اس حنفی مسئلہ کی تضعیف کرنا یا یہ کہنا کہ امام صاحب کے پاس اس مسئلہ کی کوئی دلیل نہیں ہے غلط ہوا، اور میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ قوی ہے کہ کیونکہ مسئلہ اجتہادی ہے اور مجتہد کو حق ہے کہ دقیق فروق کے پیش نظر وہ تاخیرہ بیان کو مرتبہ سنیت میں قرار دے اور تاخیر نسواں کو مرتبہ شرطیت و وجوب میں، مثلاً احادیث سے الگ صف میں تنہا کھڑے ہونے کی کراہت ثابت ہے یہاں تک کہ امام احمدؒ نے تو ایسی نماز کو باطل قرار دے دیا ہے، لیکن باوجود اس کے بھی حضور علیہ السلام نے اس واقعہ میں عورت کو پیچھے کی صف میں تنہا الگ کھڑا کرا دیا اور آپ نے کبھی ایک مرتبہ بھی کسی عورت کو مردوں کی صف میں کھڑا نہیں ہونے دیا، بخلاف لڑکوں کے کہ ان کی جگہ بھی اگرچہ صفوف رجال کے پیچھے ہے مگر تنہا لڑکے کو صف رجال میں تکمیل صف کے لئے کھڑا کرانے کا ثبوت موجود ہے۔

اس سے یہی بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظر شارع میں لڑکے کے لئے تو مردوں کی صف میں کھڑا ہونے کا تحمل بعض صورتوں میں ہو سکتا ہے لیکن عورتوں کے لئے اس کا تحمل کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا، ایسی صورت میں امام صاحبؒ کا محاذاۃ نسواں کو مبطل صلوٰۃ قرار دینا شریعت غراء کی ترجمانی نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ مولانا عبدالحئیؒ صاحبؒ نے صاحب ہدایہ پر بھی اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے حدیث "اخروھن من حیث اخرھن اللہ" کو خبر مشہور کہا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مراد اصولیین کی اصطلاح ہے، یعنی یہ حدیث متلقی بالقبول ہے پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ بہ لحاظ نظر شارع بہت سے امور میں عورتوں کا مرتبہ مردوں کی نسبت سے گھٹا ہوا ہے مثلاً ان میں جماعت نماز نہیں ہے اور اگر کریں بھی تو ان کی امام مرد کی طرح صف کے آگے کھڑی نہ ہوگی بلکہ صف کے درمیان میں کھڑی ہوگی، جس طرح ننگوں کی جماعت ہو سکتی ہے پھر امامت[2] صلوٰۃ کی طرح وہ شرف نبوت سے بھی محروم ہیں۔

بَابُ الصَّلوٰةِ علی الخُمرَةِ

(خمرہ (بوریہ) پر نماز پڑھنے کا بیان)

(۳۷۱) حدثنا ابو الولید قال نا شعبة قال نا سلیمان الشیبانی عن عبد اللہ بن شداد عن میمونة قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی علی الخمرة

ترجمہ! حضرت میمونہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا محمد ﷺ خمرہ پر نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ مولانا موصوفؒ نے بہت سے مسائل حنفیہ میں دوسروں سے بے جا تاثر لے کر اپنے قوی مسائل و دلائل کو ضعیف سمجھ لیا ہے یہ بھی ان ہی میں سے ہے جس کی طرف حضرتؒ نے اشارہ فرمایا ہے اور علامہ کوثریؒ نے بھی مولاناؒ کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے وفوق کل ذی علم علیم۔ "مؤلف"

[2] نماز کی امامت صغری کی طرح امامت کبریٰ بھی اس کے لئے موزوں و پسندیدہ نہیں سمجھی گئی، چنانچہ بخاری ۶۳۰ "باب کتاب النبی صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الی کسریٰ وقیصر" اور ۱۰۵۲ کتاب الفتن میں نیز ترمذی باب الفتن کے آخر میں حضرت ابوبکرؓ کی حدیث آئے گی لن یفلح قوم ولوا امرھم امراءۃ (وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس کی عنان حکومت کسی عورت کے ہاتھ میں ہو) فتح الباری ۱۲/۹۰ اور عمدہ ۱۸/۵۹ میں ہے کہ جمہور نے عورت کے لئے امارت و قضا کے تمام عہدے ممنوع قرار دے دیئے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ نے صرف ان امور کی قضاء کا عہدہ جائز کہا جن میں عورتوں کی شہادت درست ہوتی ہے، لیکن امام مطلق، خلیفہ، یا خود مختار سلطان و بادشاہ کی جگہ دی جانے کا جواز کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے اور ترمذی شریف میں ہے کہ جب عورتوں کے اختیار و مشورہ سے امور کا فیصلہ ہونے لگے گا تو وہ مردوں کیلئے بدترین دور ہوگا۔ (تحفہ ۳/۲۴۶)

تشریح! یہاں خمرہ پرنماز پڑھنے کا جواز بتلایا، جو حصیر سے چھوٹا ہوتا ہے کہ صرف پیروں کے نیچے بچھا لیا جائے یا سجدہ کی جگہ پر (کما حققہ الشیخ الگنگوہیؒ) یعنی حصیر والے ترجمۃ الباب سے بتلایا تھا کہ نماز غیر ارض پر بھی ہوسکتی ہے اور یہاں یہ کہ کچھ حصہ زمین کا خالی ہو اور کچھ فرش یا بوریہ ہو تب بھی نماز میں کچھ حرج نہیں، رہا یہ کہ ایک باب قبل میں بھی حضرت میمونہؓ ہی کی روایت سے حضور علیہ السلام کے خمرہ پر نماز پڑھنے کا ذکر آچکا تھا، پھر یہاں مستقل عنوان قائم کرکے اسی قطعہ حدیث کو لانے کی کیا ضرورت تھی؟ حافظؒ نے وجہ لکھی کہ یہاں اسی ٹکڑے پر مستقل عنوانِ ترجمہ اس لئے قائم کیا کہ امام بخاریؒ کے شیخ ابوالولیدؒ نے اس حدیث کو اتنا ہی مختصر روایت کیا ہے اور پہلی روایت مسدد سے مطوّل تھی (فتح ۱/۳۳۳) محقق عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ کا مقصد اختلافِ سند استخراجِ احکام و مقصودِ شیخ کا بیان ہے کہ ہر شیخ کا مقصد الگ ہوتا ہے ایک وجہ[1] یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے یہ بات ضمناً معلوم ہوئی تھی، یہاں اہمیت کی وجہ سے اس کو مستقل عنوان کے تحت لائے، اور اسی لئے حدیث کی روایت بھی دوسرے شیخ سے کی جنھوں نے صرف اسی مسئلہ کی اہمیت کے تحت صرف اتنا ہی ٹکڑا روایت کیا ہے واللہ تعالیٰ اعلم!

حضرت گنگوہیؒ نے صرف ترجمتین کی توجیہ کی ہے کہ باب الصلوٰۃ علی الحصیر کے بعد باب الصلوٰۃ علی الخمرۃ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس طرف کوئی تعرض نہیں فرمایا کہ حضور علیہ السلام کی صلوۃ علے الخمرۃ کو یہاں مکرر کیوں لائے، اور اس پر مستقل ترجمہ کیوں قائم کیا اس کا جواب صرف حافظ عینیؒ نے دیا ہے، اس لئے اسکو حضرت گنگوہیؒ کے جواب سے مرجوع قرار دینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، جس کو حاشیہ لامع ۱/۱۵۲ میں "وما افادہ الشیخ قدس سرہ من الفرق بین الترجمتین الطف مما ذکرہ الحافظ" الخ سے بیان کیا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

باب الصلوٰۃ علی الفراش وصلی انس بن مالک علی فراشه وقال الشس کنا تصلی مع النبی صلی اللہ علیه وسلم فیسجد احدنا علی ثوبه

(فرش پر نماز پڑھنے کا بیان، اور حضرت انس بن مالکؓ نے بچھونے پر نماز پڑھی، اور کہا کہ ہم نبی کریم محمد ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے تھے، تو ہم میں سے کوئی اپنے کپڑے پر بھی سجدہ کرلیا کرتا تھا)

(۳۷۲) حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک عن ابی النضر مولیٰ عمر بن عبیداللہ عن ابی سلمه بن عبدالرحمٰن عن عائشة زوج النبی صلی اللہ علیه وسلم انها قالت کنت انام بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ورجلای فی قبلته فاذا سجد غمزنی فقبضت رجلی واذا قام بسطتهما قالت والبیوت یومئذلیس فیها مصابیح

(۳۷۳) حدثنا یحیی بن بکیر قال نا اللیث عن عقیل عن ابی شهاب قال اخبرنی عروة ان عآئشة اخبرته ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کان یصلی و هی بینه و بین القبلة علیٰ فراش اهله اعتراض الجنازة

(۳۷۴) حدثنا عبداللہ بن یوسف قال نا اللیث عن یزید عن عراک عن عروة ان النبی صلی اللہ علی هوسلم کان یصلی وعائشة معترضة بینه' و بین القبلة علی الفراش الذی ینامان علیه

ترجمہ! حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ میں رسولِ خدا ﷺ کے آگے لیٹی ہوتی تھی اور میرے دونوں پیر آپ کے قبلہ (کی جانب) میں ہوتے تھے جب آپ سجدہ کرتے تھے تو مجھے دبا دیتے تھے، میں اپنے پیر سکوڑ لیتی تھی، اور جب آپ کھڑے ہوجاتے تھے، میں انھیں پھیلا دیتی تھی، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس وقت تک گھروں میں چراغ نہ تھے۔

---

[1] اس طرح امام بخاریؒ نے دوسرے مواضع میں بھی کیا ہے مثلاً ۱/۷۷ "باب الصلوٰۃ علی النفساء" میں حدیثِ سمرہ لائیں گے کہ حضور علیہ السلام نے نفاس والی عورت کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے وسط میں کھڑے ہوئے، اسی کے بعد متصلاً دوسرا باب "این یقوم من المراة والرجل" قائم کیا اور بقیہ یہی حدیث بہ سندِ آخر سمرہ سے روایت کی وسطِ جنازہ میں کھڑے ہونے کے ثبوت میں۔ "مؤلف"

ترجمہ! حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نماز پڑھتے ہوتے تھے، اور وہ آپ کے اور قبلہ کے درمیان آپ کے گھر کے فرش پر جنازہ کی مثل لیٹی ہوتی تھیں۔

ترجمہ! حضرت عروہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز پڑھتے ہوتے تھے، اور حضرت عائشہؓ آپ کے اور قبلہ کے درمیان میں اس فرش پر جس پر دونوں سوتے تھے سامنے لیٹی ہوتی تھیں۔

تشریح! امام بخاریؒ نے اس باب میں ثابت کیا کہ جس طرح نماز زمین یا اس کی جنس پر درست ہے غیر جنسِ ارض فرش وغیرہ پر بھی درست ہے اس سے امام مالکؒ کے مسلک کی مرجوحیت نکلی، دوسری بات یہ کہ پہنے ہوئے کپڑے کے کسی حصہ پر بھی سجدہ جائز ہے، جو حضرت انسؓ کے اثر سے ثابت ہوا، اس سے شافعیؒ کے مسلک کا مرجوح ہونا ثابت ہوا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ فاذا سجد غمزنی الخ (حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب حضور علیہ السلام سجدہ کرتے تو مجھے دبا دیتے تھے، جس سے میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی تھی، اور جب آپ سجدہ سے اُٹھ جاتے تو پھر پاؤں پھیلا لیا کرتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو (بغیر شہوت) چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اور ابوداؤد[1] میں یہ بھی تصریح ہے کہ حضور علیہ السلام کا ہاتھ میرے پاؤں پر پڑتا تھا، شافعیہ ناقضِ وضو کہتے ہیں۔ لہٰذا اس کی تاویل کرتے ہیں کہ پاؤں پر کپڑا ہوتا ہوگا، لیکن یہ تاویل بعید ہے البتہ استحباب وضو کا ہمارے یہاں بھی ہے تاہم درمختار میں اس کی وجہ خروج عن الخلاف قرار دی ہے، جو مجھے پسند نہیں، اور بہتر وجہ یہ ہے کہ صحیح احادیث دونوں طرف تھیں، اس لئے ہم نے مراتب اَحکام کی رعایت سے وجوب کی جگہ استحباب کو اختیار کرلیا، امام شافعیؒ کے اختلاف کی وجہ سے مسئلہ کا فیصلہ کرنا نبی کریم محمد ﷺ کی اقتداء نہ ہوئی، البتہ اختلاف اِدلہ کے اصول کے تحت حضور علیہ السلام کے فعل کی اتباع ہوتی ہے، لہٰذا اسی اصول کو سامنے رکھنا چاہیے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ بعض الفاظِ حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی وہ نمازِ شبینہ سریر (پلنگ یا تخت) پر ہوتی تھی۔ (ملاحظہ ہو بخاری ۷۲ باب الصلوٰۃ علی السریر)

قولھا اعتراض الجنازۃ، پر حضرتؒ نے فرمایا کہ اس سے مختارِ حنفیہ کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ امام عورت کے جنازہ پر اس کے وسط میں کھڑا ہو کر نماز پڑھائے، جو امام شافعیؒ کا بھی مسلک ہے (اور امام احمدؒ کا بھی)

افادۂ انور! اشارہ کبھی عبارت سے بھی بڑھ جاتا ہے کیونکہ عبارت سے تو صرف ایک واقعہ جز ئیہ کی صراحت ملتی ہے لیکن اشارہ سے زیادہ بات حاصل ہو جاتی ہے مثلاً یہاں حضرت عائشہؓ کی تشبیہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے سے ذہنوں میں یہ بات موجود ہے کہ جنازہ سامنے درمیان میں ہوا کرتا ہے کیونکہ مشبہ بہ کے طور پر وہی چیز بیان کی جاتی ہے جو پہلے سے سب کو معلوم ہو۔

تفصیل مذاہب! ہدایۃ المجتہد ۲۰۱/۱ میں امام ابوحنیفہ وابن القاسم کا مذہب مرد و عورت دونوں کے سینہ کے مقابلہ میں کھڑا ہونا نقل کیا اور یہی امام صاحب کا مشہور مذہب بھی ہے جس کو ابن الہمام نے راجح بتلایا، دوسری روایت امام صاحب سے عورت کے لئے وسط میں کھڑے ہونے کی ہے جو ہدایہ[2] وغیرہ میں مذکور ہے اور امام طحاویؒ نے اسی کو آثار کی وجہ سے راجح قرار دیا ہے۔

---

[1] ابوداؤد باب من قال لمراءۃ لا تقطع الصلوٰۃ ۱۰۲/۱ میں ہے۔ غمز رجلی فضممتھا اتی ثم سجد (آپ میرے پاؤں کو چھوتے تھے تو میں متنبہ ہو کر اپنے پاؤں سمیٹ لیتی تھی، پھر آپ سجدہ کرتے تھے) دوسری حدیث میں ضرب رجلی ہے کہ میرے پاؤں پر ہاتھ مارتے تھے، بخاری ۱۶۴ باب ھل یغمز الرجل الخ میں بھی غمز رجلیّ فقبضتھما موجود ہے۔ ''مؤلف''

[2] الفتح الربانی ۲۴۶/۷ میں ہے:۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک امام مرد و عورت دونوں کے سینہ کے مقابل کھڑا ہو، اور ایک روایت امام صاحب وابو یوسف سے یہ بھی ہے کہ مرد کے سر کے پاس اور عورت کے وسط میں کھڑا ہو، اسی کو امام طحاویؒ نے پسند کیا اور آثار سے قوی بتلایا۔ تحفۃ الاحوذی ۱۴۶/۲ میں لکھا:۔ جو قول امام احمد واسحٰق کا ترمذی نے لکھا ہے وہی امام شافعیؒ کا بھی ہے اور وہی حق ہے اور وہی ایک روایت امام ابوحنیفہؒ سے بھی ہے جس کو امام طحاویؒ نے امام صاحب کے قول مشہور پر راجح قرار دیا ہے، پھر یہ کہ نزاع وجوب وعدم وجوب کا نہیں ہے بلکہ صرف اولویت کا ہے، اور جو کچھ حضور علیہ السلام سے ثابت ہے اسی کو دوسروں کے مقابلہ میں اولیٰ واحسن سمجھنا چاہیے۔

علامہ ابن رشد نے لکھا کہ امام صاحب کے قول (مشہور) کی کوئی دلیل بجز اس کے جو حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے میرے علم میں نہیں آئی حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جب امام صاحب سے دوسری روایت موجود ہے تو وہ بھی ہمارا مذہب ہے اور احادیث میں تاویلات کرنے کی ضرورت نہیں۔ (انوار المحمود ۴۵۵/۲)

ہدایۃ المجتہد میں لکھا کہ امام مالک وشافعیؒ کے یہاں کوئی حد وتعیین نہیں ہے کتاب الفقہ ۴۰۸/۱ میں لکھا:۔ امام احمدؒ کے نزدیک مرد کے سینہ اور عورت کے وسط کے مقابل کھڑا ہو، امام شافعیؒ کے نزدیک مرد کے مقابل سر، عورت کے وسط میں، امام مالکؒ کے نزدیک مرد کے وسط، عورت کے مونڈھوں کے مقابل، امام اعظمؒ سے ایک روایت مثل امام شافعیؒ ہے۔

دوسری مرد وعورت دونوں کے لئے مقابلِ صدر وسینہ صاحب ہدایہ نے لکھا کہ سینہ چونکہ موضعِ قلب ہے، جس میں نورِ ایمان ہوتا ہے لہٰذا اس کے پاس کھڑا ہونا اس کے لئے شفاعتِ ایمان کی علامت ہے۔ واللہ تعالیٰ وعلمہ اتم واحکم!

باب السجود علی الثوب فی شدة الحر وقال الحسن کان القوم یسجدون علی العمامة و القلنسوة ویداه فی کمه

(سخت گرمی میں کپڑے پر سجدہ کرنے کا بیان، حسن بصری نے کہا ہے کہ لوگ عمامہ اور پگڑی پر سجدہ کرلیا کرتے تھے اور ہر ایک کے ہاتھ اس کی آستین میں ہوتے تھے)

(۳۷۵) حدثنا ابوالولید هشام بن عبدالملک قال نا بشربن المفضل قال حدثنی غالب القطان عن بکربن عبدالله عن انس بن مالک قال کنا نصلی مع النبی صلی الله علیه وسلم فیضع احدنا طرف الثوب من شدة الحرفی مکان السجود

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے تھے تو ہم میں سے بعض لوگ گرمی کی شدت سے سجدہ کی جگہ کپڑے کا کنارہ بچھالیا کرتے تھے۔

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ پہلے باب میں امام بخاریؒ نے اپنے کپڑے پر سجدہ کرنے کا جواز مطلقاً بتلایا تھا، اور یہاں سخت گرمی کے وقت کی قید لگا کر اس کا مسئلہ بھی الگ سے بیان کیا، کیونکہ آثار سے بھی دونوں طرح جواز ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ علم معانی میں یہ امر طے شدہ ہے کہ جب کسی مقید پر حکم کیا جاتا ہے تو قیود ہی ملحوظ ہوتی ہیں، جیسے جاءنی زید، جاءنی زید اکبا اور جاءنی زید را کبا امس میں فرق ہے کہ قیود بڑھنے سے اُن کے فوائد بڑھ جاتے ہیں، لہٰذا اس باب کو سابق باب کی شرح و بیان قرار دینا مناسب نہ ہوگا، اور ثوب متصل ومنفصل کی بحث بھی پہلے باب کے تحت آچکی ہے، اس لئے اسکو بھی صرف اس باب سے متعلق نہیں کرسکتے، حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں کورِ عمامہ پر سجدہ مکروہ ہے (جیسا کہ درمختار وغیرہ میں ہے) لہٰذا علامہ قسطلانیؒ کا اس کی کراہت وممانعت کو بمقابلہ حنفیہ مالکیہ کا مذہب بتلانا نقلِ مذہب کی غلطی ہے، جس پر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی تراجم ابواب میں تنبیہ کی ہے۔

حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ قلنسوہ کو عمامہ کی ایک قسم کہا گیا ہے اور بعض نے دو کانوں والی ٹوپی قرار دیا ہے، جس کو ہم کنٹوپ کہتے ہیں۔

بَابُ الصَّلوٰةِ فِي النِّعَالِ

(چپلوں کے ساتھ نماز پڑھنے کا بیان)

(۳۷۶) حدثنا آدم بن ابی ایاس قال نا شعبة قال نا ابومسلمة سعید بن یزید الازدی قال سالت انس بن مالک اکان النبی صلی الله علیه وسلم یصلی فی نعلیه قال نعم

ترجمہ! حضرت سعید بن یزید ازدیؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ کیا رسول خدا ﷺ اپنے چپلوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، انہوں نے جواب دیا کہ ہاں!

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس زمانہ کے نعال (چپل) ہمارے زمانہ کے جوتوں سے مختلف تھے، اور غالب یہ ہے کہ اِن جوتوں میں نماز درست بھی نہ ہوگی، کیونکہ پاؤں ان کے اندر ہوتے ہوئے زمین پر نہیں لگتے بلکہ اوپر لٹکے رہتے ہیں، لہٰذا سجدہ کامل نہ ہوگا۔

اس کے بعد میری رائے ہے کہ چپلوں میں نماز پڑھنا زیادہ سے زیادہ مباح (بلا کراہت) کے درجہ میں ہے مستحب نہیں، لہٰذا شامی میں ایک جگہ اس کو مستحب لکھنا اور دوسری جگہ مکروہ تنزیہی خلاف تحقیق ہے میرے نزدیک حقیقتِ امر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر پہنچنے کے وقت نعلین اتارنے کے حکم سے یہود نے مطلقاً ممانعت سمجھی تھی، اسی لئے ان کے نزدیک کسی صورت میں بھی نعلین کے ساتھ نماز جائز نہیں ہے، اسی غلطی اور شدت کی شریعتِ محمدیہ نے اصلاح کی ہے اور مطلق جواز کو باقی رکھا، بعض روایات میں "خـالـفـوا الیهـود" آیا بھی ہے معلوم ہوا کہ جن روایات میں نعلین کے ساتھ نماز کا حکم آیا ہے، وہ بھی یہود کی مخالف کے لئے ہے اس لئے نہیں کہ وہ فی نفسہ مطلوبِ شرع ہے تا کہ مستحب سمجھ لیا جائے، موطأ امام مالکؒ میں کعبِ احبار سے یہ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نعلین مردہ گدھے کے چمڑے کے تھے اُس لیے اُن کو اتارنے کا حکم ہوا تھا، میں ظاہر قرآن مجید سے یہ سمجھا ہوں کہ نعلین اُتارنے کا حکم "تادباً" تھا اور اسی لئے اس سے پہلے "انـی انـاربك" فرمایا ہے گویا وہ سببِ خلع کی طرف اشارہ ہے لہٰذا اس سے عدم جواز بھی ثابت نہ ہوگا، غرض کہ جواز کے ساتھ ادب کی تعلیم ملتی ہے خواہ امرِ خلع کو اُس وجہ سے سمجھا جائے جو کعب نے ذکر کی ہے یا اس وجہ سے ہو جس کی طرف الفاظِ قرآن رہنمائی کرتے ہیں، اور یہود کے عدم جواز والے حکم کی کوئی گنجائش نہیں ہے شریعتِ محمدیہ نے اسی طرح بہت سے دوسرے مواضع میں بھی مزاعم یہود کی تغلیظ واصلاح کی ہے یعنی جن امور میں بھی ان کو مغالطے لگے، اور وہ حق وحقیقت سے دور ہٹ گئے، ہماری شریعت نے حقیقت واضح کر کے ان کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔

قولہ قال نعم، پر حضرتؒ نے فرمایا:۔ اس سے یہ بات نہیں معلوم ہوئی کہ حضور علیہ السلام نے جو نمازیں نعلین کے ساتھ پڑھی ہیں وہ مسجد میں تھیں یا دوسری جگہوں میں مسجد سے باہر، لہٰذا اس طرف بھی نظر ہونی چاہیے کیونکہ ادب کا لحاظ مقام کے اختلاف سے بھی مختلف ہوجاتا ہے) غالباً حضرتؒ نے یہ بات واقعہ کوہ طور سے "انك بـالـواد المقدس" کی روشنی میں اخذ کر کے فرمائی ہے کہ وہ وقت مکالمہ الٰہیہ کا اور مقام بھی معظم تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

فائدہ مہمہ تفسیریہ! انوارالباری ۲۱۴/۸ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ اہم تفسیری نکتہ گزر چکا ہے کہ قرآن مجید میں جو قصص وواقعات ذکر کئے گئے ہیں ان کے مکالمات میں بجائے الفاظ کے ان کے مدلولات ومفاہیم بیان ہوئے ہیں، یہاں بھی حضرتؒ نے کلام باری جل ذکرہٗ کی خاص شان وخصوصیت بیان کی کہ اس میں ایک ہی قصہ کو مختلف انداز سے ادا کیا گیا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حاضری کوہِ طور کے واقعہ میں ایک جگہ فرمایا:۔ "فـلـمـا اتهـا نـودیٰ یـا مـوسـی انی انـاربك فاخلع نعليك انك بالواد المقدس طوی وانا اختر تك فـاستـمع لمايوحیٰ اننی انا الله لا اله الاانا فاعبد نی واقم الصلوٰة لذكری" (سورہ طٰہٰ) دوسری جگہ یاموسیٰ انه انا الله العزيز الحكيم والق عصاك الآیہ (نمل) تیسری جگہ یاموسیٰ انی انا الله رب العالمين وان الق عصاك (قصص)!

ہر جگہ اجمال وتفصیل اور تقدیم وتاخیر کا فرق ہے، کیونکہ قرآن مجید میں فنِ تاریخ کے طور پر واقعہ کے جزئیات کو ترتیب کے ساتھ پیش کرنا مقصود نہیں، نہ وہ اسکا موضوع ہے، بلکہ اپنے اہم ترین مقصدِ ارشاد وہدایت کے تحت اور غیر معمولی اسرار وحکمتوں کے پیش نظر ایک ہی واقعہ کو مختلف طرزِ بیان میں ادا کیا گیا ہے، اسی لئے زیر بحث واقعہ طور میں یہ فیصلہ ہم نہیں کر سکتے کہ ندائے موسوی کے وقت مکالمہ الٰہیہ میں واقعی ترتیب کلمات کیا تھی؟! مثلاً یہ کہ ابتداءِ ندا میں انـاربک فرمایا تھا یا انـا الـلّٰه ارشاد ہوا تھا وغیرہ صرف اتنی بات یقینی ہے کہ واقعہ

مذکورہ کے سارے کلمات وارشادات ایک ہی وقت وواقعہ کے اندر صادر ہوئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

حضرت شاہ صاحبؒ درسِ بخاری شریف میں بہت سی آیاتِ قرآن مجید کی معتمد تفسیر اور مشکلات کا حل بیان فرمایا کرتے تھے، اسی لئے ہم حسبِ مناسبت مقام، مختلف مواقع میں زیادہ اعتناء کے ساتھ آپ کے گرانقدر اہم تفسیری افادات پیش کرتے ہیں۔

مشکلات القرآن! حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ "قرآن مجید کی حل طلب مشکلاتِ حدیث سے زیادہ ہیں اور ان کی طرف توجہ زیادہ درکار تھی مگر افسوس ہے کہ امت مرحومہ نے اس لحاظ سے قرآن مجید کی خدمت، خدمت حدیث کے برابر بھی نہیں کی، یہاں تک کہ کتب تفاسیر مطبوعہ میں کوئی کتاب فتح الباری شرح بخاری کے درجہ کی بھی موجود نہیں ہے، جس میں صحیح بخاری کی طرح قرآن مجید کے حقائق ودقائق پر پوری روشنی ڈالی گئی ہو اور حلِ مشکلات کی طرف توجہ دی گئی ہو۔ اس سلسلہ میں حضرتؒ کی کتاب مشکلات القرآن مع مقدمہ یتیمۃ البیان علامہ بنوری دام فیضہم کا مطالعہ بھی اہل علم کے لئے ضروری ہے، اس میں عدم تفسیر اور کتب تفسیر سے متعلق بہت اہم وضروری افادات پیش کئے گئے ہیں اور خاص طور سے مفید کتب تفسیر ومضر کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، اور سابقہ کتب تفسیر کے علاوہ اُس وقت کی جدید تفسیر ترجمان القرآن کی غلطیاں بھی واضح طور سے ذکر کی ہیں، اور وہ سب تنقید مولانا آزاد کے مطالعہ سے بھی گزر گئی تھی، جس کا کوئی جواب ان کی طرف سے نہیں دیا گیا، اس کے بعد اب ہمارے زمانہ میں ایک نئی تفسیر تفہیم القرآن شائع ہورہی ہے جس کے بعض مباحث پر نقد انوارلباری میں ضمناً آیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ علماءِ وقت تمام ایسے مواضع کا مطالعہ کرکے مکمل تحقیقی جائزہ لیں، تاکہ جہاں اس کے مفید اجزاء سے فائدہ اٹھایا جائے، اس کے مضر اجزاء خصوصاً خلاف جمہور سلف وخلف تفردات کے علمی ودینی نقصانات سے احتراز بھی ممکن ہوسکے، اور "خذ ماصفا ودع ماکدر" کا زریں اصول اختیار ہو۔ "والدین النصیحۃ"!

بَابُ الصَّلٰوۃِ فِی الخِفَافِ

(موزے پہنے ہوئے نماز پڑھنے کا بیان)

(۳۷۷) حدثنا آدم قال نا شعبۃ عن الاعمش قال سمعت ابراھیم یحدث عن ھمام بن الحارث قال رأیت جریر بن عبداللہ بال ثم توضأ و مسح علیٰ خفیہ ثم قام فصلے فسئل فقال رایت النبی صلی اللہ علیہ وسلم صنع مثل ھٰذا قال ابراھیم فکان یعجبھم لان جریراً کان من اٰخر من اسلم۔

(۳۷۸) حدثنا اسحاق بن نصر قال نا ابواسامۃ الاعمش عن مسلم عن مسروق عن المغیرۃ بن شعبۃ قال وضات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فمسح علیٰ خفیہ و صلے

ترجمہ! ہمام بن حارث روایت کرتے ہیں کہ میں نے جریر بن عبداللہ کو دیکھا، انہوں نے پیشاب کیا، بعد اس کے وضو کیا اور اپنے موزوں پر مسح کیا، پھر نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے، تو ان سے پوچھا گیا، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے ابراہیم کہتے ہیں کہ لوگوں کو یہ حدیث بہت محبوب تھی، کیونکہ جریرؓ آخر میں اسلام لانے والوں میں سے تھے۔

ترجمہ! حضرت مغیرہ بن شعبہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو وضو کرایا تو آپ نے موزوں پر مسح کیا اور نماز پڑھ لی۔

تشریح! دونوں حدیث سے موزوں پر مسح کرنے کا شرعی جواز ثابت ہوا، کیونکہ حضرت جریر بن عبداللہؓ آخر زمانہ نبوت میں اسلام لائے ہیں، لہٰذا ان کا وضوء میں موزوں پر مسح کرنا اور پھر یہ بتلانا کہ میں نے اسی طرح موزوں پر مسح کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو بھی دیکھا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ موزوں کے مسح پر آخر تک عمل رہا ہے۔

بحث ونظر! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا[1]: سورۂ مائدہ کی آیت وامسحوا برء وسکم وار جلکم الی الکعبین سے حضرات صحابہ کرامؓ نے وضوء میں پاؤں دھونے کی فرضیت ہی سمجھی تھی، اسی لئے حضرت جریرؓ کے فعل وروایتِ مذکورہ سے بہت خوش ہوئے تھے، کیونکہ اس آیت سے جو وہم مسح خفین کے منسوخ ہونے کا ہوسکتا تھا، وہ اُن کے فعل وروایت کی وجہ سے ختم ہوگیا تھا، اور یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ مسحِ خفین کا حکم آیتِ مائدہ مذکورہ کے بعد بھی بدستور باقی ہے لیکن حضراتِ صحابہؓ کے علم وفہم کے برخلاف روافض نے یہ سمجھا کہ آیتِ مائدہ مذکورہ کے تحت وضو کے اندر ہر حالت میں اور بغیر موزوں کے بھی پاؤں پر مسح ہی کرنا چاہیے، دھونا فرض نہیں ہے اور خوارج وامامیہ (روافض) کے نزدیک موزوں پر مسح درست نہیں ہے، وہ اسی آیتِ مائدہ سے یہ سمجھے ہیں کہ مسح کا حکم صرف پاؤں کے لئے ہے، لہٰذا موزے پہننے کی حالت میں ان پر مسح جائز نہ ہوگا، ان دونوں فرقوں کے علاوہ تمام ائمہ مجتہدین اور سارے علمائے سلف وخلف کا مذہب یہی ہے کہ بغیر موزوں کے وضو میں پاؤں دھونا فرض ہے اور موزوں کی حالت میں ان پر مسح جائز ہے اور صحابہ کرام میں سے صرف حضرت عائشہؓ ابن عباس وابو ہریرہؓ کی طرف عدم جواز مسح خفین کا قول منسوب کیا گیا ہے، اوّل تو یہ نسبت ضعیف ہے۔ دوسرے اِن حضرات سے بھی ثبوتِ جواز کے لئے قوی روایات موجود ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے وہ خیال ہوا اور پھر اس سے رجوع کرلیا ہو واللہ تعالیٰ اعلم! ائمہ میں سے امام مالکؒ کی طرف بھی انکار منسوب ہوا، لیکن علامہ محدث ابن عبدالبر مالکیؒ نے فرمایا[2]: مجھے معلوم نہیں کہ فقہائے سلف میں سے کسی نے بھی مسح خفین کا انکار کیا ہو، البتہ امام مالکؒ کی طرف اس کی نسبت کی گئی ہے مگر ان سے بھی جو صحیح روایات ہیں وہ ثبوت کی صراحت کرتی ہیں۔

آیتِ مائدہ اور حکمِ وضوء! یہاں ایک اہم وضاحت اس امر کی ضروری ہے کہ آیتِ مائدہ میں جو وضو کا حکم وتفصیل مذکور ہے، آیا وضو کی فرضیت اسی سے شروع ہوئی ہے یا اس سے پہلے بھی تھی، چونکہ اکثر کتبِ متداولہ میں وضو کا اثبات اسی آیت سے کیا گیا ہے، اس لئے یہ حقیقت اوجاگر نہ رہی کہ وضو کا حکم نماز کے ساتھ ہی سے شروع سے موجود تھا، اور یہاں سورۂ مائدہ میں جو مدنی آخری سورتوں میں سے ہے، وضو کا حکم، تعلیم وضو کے لئے نہیں بلکہ ضمنی طور سے ہوا ہے، صاحب روح المعانی نے لکھا:۔ یہ اشکال نہ ہو کہ آیتِ مائدہ میں پاؤں دھونے کے حکم میں کچھ ابہام کی شکل ہے، حالانکہ ایسے اہم فرض کو (غسل وجہ کی طرح) کھول کر بتلانا مناسب تھا (کہ بحث واحتمال کی گنجائش ہی نہ ہوتی) اور کلام الٰہی میں ابہام کی صورت ہونا یوں بھی مستبعد ہے، وجہ یہ ہے کہ وضو کی اصل فرضیت سالہا سال پہلے ابتداءِ بعثت کے وقت ہی ہوچکی تھی، اور اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام کو وضو کا طریقہ بھی تعلیم کردیا تھا، ایسی صورت میں سارے مخاطبین کیفیتِ وضو کو پہلے سے جانتے تھے، اور ان کی اس سے واقفیت ومعرفت آیتِ مائدہ مذکورہ سے استنباط پر موقوف نہ تھی، نہ یہ آیت تعلیم وضو کے لئے اتری ہے، بلکہ اس کی غرض وضو وغسل کا بدل تیمم کو بتلایا ہے اور حکم تیمم سے قبل وضو کا ذکر بطور تمہید ہوا ہے، جس میں زیادہ وضاحت وبیان کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، لہٰذا اس قسم کا ابہام کسی طرح محل اشکال واعتراض نہیں ہے (روح المعانی ۵۷/۶)

صاحبِ تفسیر مظہری نے لکھا:۔ وضو اس آیتِ مائدہ کے قبل ہی سے فرض تھا، جیسا کہ امام بخاریؒ کی روایت قصہ گم شدگی ہار حضرت عائشہؓ سے معلوم ہوتا ہے جو اس آیت کے شان نزول میں وارد ہوئی ہے، علامہ محدث ابن عبدالبرؒ نے فرمایا کہ سارے اہل مغازی جانتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے کبھی کوئی فرض نماز بغیر وضو کے نہیں پڑھی، اور وضو کی فرضیت نماز کی فرضیت کے ساتھ ہی ہوچکی تھی اور باوجود سابق تعامل کے آیتِ وضو مذکورۂ مائدہ کے نزول کی حکمت یہ ہے کہ اس کا فرض ہونا وحی متلو کا جزو بھی بن جائے، میں کہتا ہوں کہ یہ تیمم کے لئے تمہید

---

[1] سورۂ مائدہ مدنی زندگی کی آخری سورتوں میں سے ہے کیونکہ اس کے بعد صرف سورۂ توبہ اور اس کے بعد سورۂ نصر اتری ہے، گویا قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتوں میں سے مائدہ کا نمبر (۱۱۲) توبہ کا (۱۱۳) اور نصر کا (۱۱۴) ہے، تفسیر روح المعانی ۴۷/۶ میں ہے کہ سورۂ مائدہ کا نزول حضور اکرم ﷺ پر سفر حجۃ الوداع میں مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ہوا ہے، آپ اس وقت اپنی اونٹنی پر سوار تھے جس کا ایک بازو وحی الٰہی کے بوجھ کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا اور آپ اس سے نیچے اُتر گئے تھے۔ [2] معارف السنن ۳۳۱/۱

کے طور پر اتری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! (تفسیر مظہری ۳/۴۰)

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا:۔ ابن جریرؒ نے کہا:۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ یہ آیت حق تعالیٰ کی طرف سے اس امر کا اعلان ہے کہ وضو کی فرضیت صرف نماز ادا کرنے کے واسطے ہے، دوسرے اعمال کے لئے نہیں، کیونکہ نبی اکرم ﷺ اس سے پہلے حالتِ حدث میں تمام اعمال سے رُک جاتے تھے تا آنکہ وضو فرما لیتے، صحابہ کرامؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام پیشاب کے بعد نہ ہم سے کلام کرتے تھے، نہ ہم آپ سے، اور اس وقت آپ ہمارے سلام کا بھی جواب[1] نہیں دیتے تھے، یہاں تک کہ رخصت کی یہ آیت نازل ہوئی ''اذا قمتم الی الصّلوٰة الآیہ'' اس کے بعد جب آپ خلاء سے واپس ہوتے اور کھانا پیش ہوتا تو صحابہ عرض کرتے کہ وضو کے لئے پانی لائیں؟ آپ فرما دیتے تھے کہ مجھے وضو کا حکم صرف نماز کے لئے دیا گیا ہے، اور کبھی فرماتے کہ میں نماز تو نہیں پڑھوں گا کہ وضو کروں (تفسیر ابن کثیر ۲/۲۲)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی قدیم عادت ہر وقت باوضو رہنے کی تھی، اور آپ نہ صرف ہر نماز کے لئے وضو فرماتے تھے، بلکہ طعام وسلام وغیرہ کے لئے بھی وضو فرماتے تھے پھر جب رخصت وخفت آئی تو آپ نے کئی نمازیں بھی ایک وضو سے ادا فرمائیں لیکن ہر نماز کے وقت مسواک کا اہتمام پھر بھی باقی رہا ہے۔

علامہ محدث ومفسر ابوبکر بن العربیؒ نے لکھا:۔ میرے نزدیک مائدہ والی آیتِ وضو، جس میں تیمم کا بھی ذکر ہے حضرت عائشہؓ کے قصہ میں اتری ہے، اور وضو پر پہلے ہی سے وحیِ غیر متلو کے تحت عمل درآمد کیا گیا، لہٰذا اس کا ذکر وحیِ متلو سے مکمل کر دیا گیا اور اس کے بعد اس کا بدل بھی ذکر کر دیا گیا اور نواقض طہارت بھی پوری طرح بیان کر دیئے گئے، اس کے بعد سورۂ نساء میں ولا جنبا الا عابری سبیل حتی تغتسلوا کے بعد وان کنتم مرضی الایہ سے آخر تک ان (نواقض) کا پھر اعادہ کیا گیا، اور بعینہ وہی مسائل پھر سے مکرر بیان کئے گئے، اور اس کی نظیر قرآن مجید میں دوسری جگہ نہیں ہے، اور اس امر کی دلیل کہ حضرت عائشہؓ کی مراد آیتِ مائدہ ہی ہے، یہ بھی ہے کہ سارے مدنی مفسّرین نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اذا قمتم الی الصّلوٰة سے مراد نیند سے اُٹھ کر نماز پڑھنا ہے اور یہ صورت حضرت عائشہؓ ہی کے قصہ میں پیش آئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! (تفسیر احکام القرآن ۱/۱۸۵)

علامہ محدث قسطلانیؒ (شارح بخاری) اور علامہ محدث زرقانیؒ (شارحِ موطا امام مالکؒ) نے مواہب لدنیہ اور اس کی شرح میں لکھا:۔ مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اعلیٰ مکہ میں جبل حراء پر حضور علیہ السلام کے لئے بہترین صورت اور اوّل درجہ کی خوشبو کے ساتھ ظاہر ہوئے اور کہا:۔ اے محمد! حق تعالیٰ آپ پر سلام بھیجتا ہے اور فرماتا ہے کہ تم جن وانس کی طرف میرے رسول ہو، لہٰذا ان سب کو کلمہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی طرف بلاؤ، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنا پاؤں زمین پر مارا جس سے پانی برآمد ہوا، اور اس سے وضو کیا، جس کو حضور علیہ السلام دیکھتے رہے، پھر آپ سے کہا کہ اسی طرح سے وضو کریں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نماز کے لئے کھڑے ہوگئے اور آپ کو اپنے ساتھ نماز پڑھنے کو کہا، ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے ہے کہ آپ نے دو رکعت کعبہ کی طرف پڑھیں، وضو ونماز سکھا کر حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان کی طرف چڑھ گئے۔ اور حضور علیہ السلام اس حال میں وہاں سے لوٹے کہ جس پتھر اور مٹی کے ٹیلہ سے بھی گزرتے تھے، وہ آپ کو السلام علیک یارسول اللہ! سے خطاب کرتا تھا، آپ نے گھر پہنچ کر حضرت خدیجہؓ کو اس واقعہ کی خبر دی تو ان پر فرطِ خوشی کا عالم طاری ہو گیا، پھر آپ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور چشمہ پر لیجا کر وضو کیا اور ان کو بھی اسی طرح وضو کرنے کا حکم دیا، اس کے بعد آپ نے ان کو نماز پڑھائی، جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو پڑھائی تھی، یہ بھی روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے امت

---

[1] بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ نے جوابِ سلام نہ دینے کا عذر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔ مجھے پسند نہیں ہوا کہ خدا کا ذکر بغیر طہارت کے کروں تو یہ سب حالات آیت رخصت نازل ہونے سے قبل کے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! ''مؤلف''

میں سے سب سے پہلے نماز پڑھی اور یہ پہلی فرض نماز تھی، کیونکہ دونمازیں صبح وشام کی پہلی امتوں کی طرح اس امت پر بھی ابتداء بعثت سے فرض تھیں، پھر شب معراج میں فرض نمازوں کی تعداد پانچ ہوئی ہے۔

فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ حضور علیہ السلام اسراء سے قبل بھی یقیناً نماز پڑھا کرتے تھے اور ایسے ہی آپ کے صحابہ کرامؓ بھی پڑھتے تھے، محقق زرقانیؒ نے لکھا کہ یہ حدیث ابتداءِ وضو والی متعدد طریقوں سے مروی ہے، جن کے راویوں میں کلام بھی ہے لیکن ان سب کے جمع ہونے سے قوت حاصل ہوگئی ہے اور ثابت ہوا کہ حدیث مذکور کی اصلیت ضرور ہے یہ بھی لکھا کہ حضور علیہ السلام جس طرح جن وانس کی طرف مبعوث ہوئے تھے، فرشتوں کی طرف بھی مبعوث تھے، صحیح ترین قول یہی ہے، جس کو ایک جماعتِ محققین نے اختیار کیا ہے، ان میں بارزی، ابن حزم، سبکی وغیرہ ہیں، اور یہاں صرف جن وانس کا ذکر اس لئے ہوا کہ ابتدا میں آپ کی بعثت ان دونوں کے لئے ہی تھی، اس کی مزید تفصیل اس کتاب کے باب الخصائص میں آئے گی۔ (شرح المواہب ۲۳۴/۱)!

اس موقع پر انبیاء علیہم السلام پر وحی اترنے کے اہم ترین اعداد وشمار بھی مذکور ہیں، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چوبیس ہزار مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا وحی لے کر اترنا نقل ہوا ہے، اس کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

حدیثی فائدہ! وضو کی حدیثِ مذکور کی تخریج اجمالی طور پر ترمذی شریف **باب النضح بعد الوضوء** میں بھی ہے اور امام ترمذی نے حسبِ عادت افادہ کیا کہ اس باب میں ابوالحکم بن سفیان، ابن عباس، زید بن حارثہ اور ابوسعید سے بھی روایات ماثور ہیں۔

زید بن حارثہ والی روایت کی تخریج ابن ماجہ **باب ماجاء فی النضح بعد الوضوء** (۳۶) میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مجھے وضو سکھایا اور نضح کا حکم دیا، اور یہ حدیث حضرت زید بن حارثہ سے مسندِ احمد میں اس طرح ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ابتداءِ وحی کے وقت آئے اور آپ کو وضو ونماز سکھلائی الخ (الفتح الربانی ۲/۵۳) صاحب تحفۃ الاحوذی نے اپنی شرح ۱/۵۵ میں اس کو نقل نہیں کیا ہے اور مسند احمد کی طرف اسامہ والی روایت نقل کی حالانکہ یہ دونوں احادیث ایک ہی جگہ باب النضح بعد الوضوء میں موجود ہیں۔

افاداتِ انوریہ! یہ بحث کہ آیت مائدہ نزول میں مقدم ہے یا آیت نساء، ہم پوری تفصیل سے انوار الباری جلد ہشتم (قسط ۱۰ ۱۷۴) کے بحث ونظر میں درج کر آئے ہیں، یہاں خاص طور سے حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تحقیق کو نمایاں کرنا ہے کہ آیت **وارجلکم الی الکعبین** کی قراءتِ نصب کی صورت میں عطف والی توجیہ مرجوح اور مفعول معہ والی توجیہ راجح ہے، کیونکہ حضرتؒ نے زمانہ درس دارالعلوم دیوبند اور تحریر مشکلات القرآن کے وقت ترجیح مذکور کی رائے اختیار نہیں کی تھی، اور راقم الحروف نے جو حضرتؒ کے آخری دو سال کے درس بخاری شریف ڈابھیل میں شرکت کی تو اس میں ترجیح کی رائے سُنی اور قلمبند کی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ رفیق محترم علامہ بنوری عم فیضہم نے معارف السنن میں ترجیح کا پہلو ملحوظ نہیں رکھا ہے اس لئے کہ آپ نے جامعہ ڈابھیل کے ابتدائی سال[۱] کے درس میں شرکت فرمائی ہے راقم الحروف نے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے اس امر کو غیر معمولی اہمیت دی ہے کہ حضرتؒ کے آخری درس بخاری شریف کی آخری تحقیقات کو زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا جائے کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ ایسے واسع المطالعہ محقق ومدقق محدث کے شایانِ شان یہی معلوم ہوتا ہے۔

حضرتؒ نے مشکلات القرآن میں نزولِ آیتِ مائدہ کے تقدم وتاخر دونوں احتمال کو موجہ قرار دیا ہے اور بظاہر کسی ایک کو ترجیح نہیں دی ہے لیکن ۱۳۶ میں تحریر فرمایا کہ پاؤں دھونے کا فریضہ نزولِ آیتِ مائدہ سے تقریباً ۱۸ سال قبل سے موجود تھا، اس لئے اگر آیتِ مذکورہ

---

[۱] حضرت شاہ صاحبؒ نے جامعہ ڈابھیل میں ۱۳۴۶ھ سے شعبان ۱۳۵۱ھ تک چھ سال بخاری شریف کا درس دیا ہے جس کے آخری دو سال میں راقم الحروف نے شرکت کی اور امالی درس کو قلمبند کیا ہے۔ وللہ الحمد والمنۃ ''مؤلف''!

میں مختلف ومتعدد صورتوں کی طرف اشارہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے یعنی اشکال کی صورت جب ہی تھی کہ آیت مذکورہ ہی سے یہ فریضہ ثابت ہوتا کہ ابہام کی شکل موزوں نہ ہوتی، یہ وہی بات ہے کہ جس کی طرف دوسرے حضرات نے بھی توجہ کی ہے اور ہم ان کے اقوال نقل کر چکے ہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ بظاہر حضرتؒ نے اس مقام پر تقدم نزولِ آیتِ مائدہ کو ترجیح دیدی ہے بظاہر اس لئے کہ ممکن ہے احتیاطاً ایسا فرمایا ہو، کیونکہ تاخر کی صورت میں جبکہ تقریباً ۱۰ھ میں نزولِ سورتِ مائدہ ہوا ہے تو گویا آیت مذکورہ بھی اوّلِ بعثت سے ۲۳ سال بعد اتری ہے اور ۱۸ سال کے لحاظ سے ۵ھ میں اس آیت کا نزول ہوا ہوگا۔

اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ ارجلکم کا نصب عطف کے لئے ہونا مرجوح ہے (اگر چہ اپنی جگہ درست وصحیح ضرور ہے) کیونکہ اس میں شرکتِ حکم مقصود ہوتی ہے اور اس سے ۱۸ سال قبل فراغت ہو چکی ہے اور برابر ۱۸ سال تک اس کے مطابق عمل بھی ہوتا رہا ہے، اب اس کا اعادہ بطور تائید حکم سابق ہوا ہے۔ اور اس صورت میں اگر متعدد صورتوں کی طرف بھی اشارہ ہو تو مضائقہ نہیں ہے، چنانچہ واوِ معیت اور مفعول معہ[1] کی سب صورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ کسی ایک امر میں بھی اگر دو چیزوں کی صرف معیت یا مصاحبت ہوتی ہے تو واؤ کے ذریعہ دونوں کو ایک جگہ ذکر کر دیا جاتا ہے، لہٰذا آیتِ وضو میں بھی واؤ صرف مصاحبت کے لئے ہے، شرکتِ حکم بیان کرنے کے لئے نہیں ہے، اس توجیہ میں خوبی یہ ہوگئی کہ گویا آیت میں وجہ ویدین کو تو ایک خانہ میں رکھا گیا اور راس ورجلین کو دوسرے خانہ میں، اور اشارہ کیا کہ ان دونوں کی نوع الگ الگ ہے، پھر بعض احکام میں دونوں یکساں ہیں اور بعض میں جُدا، مثلاً تیمّم میں سر اور پاؤں دونوں کو ایک ساتھ نظر انداز[2] کر دیا گیا۔ جس کی طرف حضرت ابن عباسؓ نے بھی اشارہ کیا ہے اور شاید الفوز الکبیر میں بھی اس عبارت سے یہی مراد ہے کہ وجہ ویدین دونوں مغسول ہوتے ہیں اور تیمّم میں بھی ان ہی دو کا اعتبار ہے اور راس ورجلین دونوں سے کبھی غسل کا حکم ساقط ہو جاتا ہے، لہٰذا اُن دونوں کا حکم الگ ہے اور اِن کا الگ، اسی لئے ان دونوں کو آیت میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ہاتھ اور چہرے کے دھونے کا حکم تو پہلی امتوں میں بھی رہا ہے، لیکن سر اور پاؤں کے لئے حکم صرف شریعتِ محمدیہ میں ہوا ہے، اور سر کے مسح کی صورت غسلِ رجلین کے ساتھ ابتدائے نبوت ہی سے چلی آرہی ہے جو تمام مخاطبین کے لئے معلوم ومتعین تھی، پھر قرآن مجید کی ایک آیت میں غسل کا بدل تیمّم کو بتلانا تھا اور دوسری میں وضو کا بدل تیمّم کو اسی کے ضمن میں دوسرے اشارات معیت ومصاحبت کے بھی آگئے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ وارجلکم قراءتِ جر کی صورت میں، مسح کے تحت ہو کر بھی حکم غسل صحیح رہتا ہے کیونکہ مسح کے معنی پانی کا لگانا اور بہانا دونوں آتے ہیں، جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے، اور یہ از قبیل اختلاف المعانی بہ اختلاف المحال ہے، لہٰذا سر کے لئے مسح تر ہاتھ کا پھیرنا ہی رہے گا اور پاؤں کے لئے مسح کا مطلب ان پر پانی بہانا ہوگا، جیسے نضح کے معنی اختلافِ محل کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔

---

[1] ہم نے اس کی وضاحت وتفصیل انوارالباری جـ۴ میں بھی کی ہے، مگر غلطی سے طبع اوّل میں کئی جگہ بجائے مفعول معہ کے مفعول بہ چھپ گیا تھا اس کی تصحیح کر لی جائے، مشکلات القرآن ۱۳۶ میں بھی بہت سی مثالوں سے واوِ عطف اور واوِ معیت کا فرق نمایاں کیا گیا ہے اور یہ تحقیق حضرتؒ کی اہل علم ونظر کے لئے بہت ہی قابل قدر ہے جس سے بہت سے اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔ ''مؤلف''!

[2] وضو علی الوضوء کی صورت میں پاؤں پر بھی مسح درست ہے اسی طرح خفین پر بھی مسح درست ہے، غرض آیت میں معیت کی طرف اشارہ کیا گیا، واللہ تعالیٰ اعلم حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ اگر مسحِ خف کو آیت کے تحت نہ لائیں تو قرآن مجید سے اس کا ثبوت ہی ختم ہو جائیگا لہٰذا مسح کے حکم کا جنس ارجل کے لئے باقی رہنا قراءت جر کا مفاد ہے۔

بَابُ اِذَا لَمْ يُتِمَّ السُّجُوْدَ (جب کوئی شخص سجدہ پورا نہ کرے)

حدثنا الصلت بن محمد قال نامهدی عن واصل عن ابی وائل عن حذيفة انه رای رجلاً لايتم ركوعه ولا سجوده فلما قضىٰ صلوته قال له حذيفة ما صليت قال واحبه قال لومت مت علىٰ غيرسنة محمد صلى الله عليه وسلم

ترجمہ! حضرتِ حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنا رکوع اور سجدہ مکمل نہ کرتا تھا، جب وہ اپنی نماز ختم کر چکا تو اس سے حذیفہ نے کہا تو نے نماز نہیں پڑھی (مسروق کہتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ) اگر تو مر جائے گا تو محمد ﷺ کے طریقہ پر نہ مرے گا۔

تشریح! مقصد اس باب کا یہ ہے کہ نماز میں سجدہ پوری طرح نہ کرنے سے نماز درست نہ ہوگی، کیونکہ ایسا کرنے پر شدید وعید آئی ہے، اور حضور اکرم ﷺ کے سوا کسی طریقہ پر عمل کرتے ہوئے موت کا آجانا خسارۂ عظیم ہے، یہاں حدیث میں یہی شدید وعید رکوع کے پوری طرح نہ کرنے پر بھی ہے مگر اس کو امام بخاریؒ مستقل طور سے ابواب صفت الصلوٰۃ میں دوسری سند اور متن کے تغیر کے ساتھ ۱۰۹ میں باب اذالم تیم الرکوع کے تحت لائے ہیں۔

محقق عینیؒ نے فرمایا:۔ یہاں بابِ مذکور (باب اذالم تیم السجود) کے ذکر کا کوئی موقع ہی نہیں ہے، کیونکہ امام بخاریؒ کی عادت بعینہ ایک سند و متن کے ساتھ حدیث مکرر لانے کی نہیں ہے، دوسرے یہ کہ سجدہ کی کیفیت بیان کرنے کے لئے آگے آنے والے ابواب صفۃ الصلوٰۃ ہی زیادہ موزوں ہیں، تیسرے یہ کہ ان ابواب میں نسخہ مستملی میں تو یہ باب سرے سے درج ہی نہیں ہے اور نسخہ اصیلی میں بھی اس جگہ نہیں ہے بلکہ باب السجود علی الثوب فی شدة الحر کے بعد (باب الصلوٰۃ فی النعال سے پہلے) ہے اور وہاں یہ مناسبت ہوسکتی ہے کہ ان دونوں باب کا تعلق احکام سجدہ سے ہے (عمدہ ۲؍۲۹۲) حافظؒ نے اس موقع پر عینی کی طرح تحقیق و تدقیق کا حق ادا نہیں کیا، اور جو توجیہ کی ہے، اس پر عینی نے کچھ نقد بھی کیا ہے، البتہ حافظ نے بھی یہاں اس باب کے ذکر کو بے محل قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا کہ یہاں یہ باب بظاہر ناسخین و ناقلین کی غلطی سے درج ہوگیا ہے، کیونکہ مستملی کے نسخہ میں نہیں ہے، جو ان سب میں زیادہ حفظ اتقان والے ہیں۔ (فتح الباری ۱/۳۳۶)

بَابُ يُبْدِیْ ضَبْعَيْهِ وَيُجَافِیْ جَنْبَيْهِ فِی السُّجُوْدِ!

(سجدہ میں اپنے شانوں کو کھول دے۔ اور اپنے دونوں پہلو علیحدہ رکھے)

(۳۸۰) حدثنا يحيى بن بكير قال حدثنى بكر بن مضر عن جعفر عن ابی هرمز عن عبدالله بن مالك بن بجينة ان النبی صلی الله عليه وسلم وسلم كان اذا صلی فرج بين يديه حتىٰ يبدو بياض ابطيه

۱؎ واضح ہو کہ امام بخاریؒ سے اگرچہ صحیح بخاری شریف کو نوے ہزار علماء نے سُنا ہے، مگر نسخہ بخاری مرتب و روایت کرنے والے اکابر اہل علم چار تھے، ۱؎ حافظِ حدیث علامہ شیخ ابراہیم بن معقل النسفی (حنفی) (م ۲۹۴ھ) ۲؎ شیخ حماد بن شاکر (حنفی) (م ۳۱۱ھ) ۳؎ شیخ فربری (م ۳۲۰ھ) ۴؎ شیخ ابوطلحہ منصور بن محمد بزدوی (م ۳۲۹ھ) ان میں سے اگرچہ ہمارے سامنے فربری والا نسخہ ہے اور اسی کا رواج رہا ہے لیکن ان سب سے زیادہ مرتبہ شیخ ابراہیم نسفی حنفی کا ہے کیونکہ وہ حافظِ حدیث و فقیہ و مفسر بھی تھے اور اختلافِ مذاہب پر بڑی بصیرت رکھتے تھے، آپ کی تصانیف میں المسند الکبیر اور التفسیر کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو الحافظ العلامۃ ابواسحٰق النسفی قاضی نصف وعالمہا ومصنف المسند الکبیر والتفسیر وغیر ذلک، حافظ ابن حجر، حافظ مستغفری و حافظ خلیلی نے بھی حافظ ثقہ، نصیہ و صاحبِ تصانیف وغیرہ لکھا۔

علامہ قریشیؒ نے الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ میں ان کا تذکرہ لکھا ہے، علامہ کوثریؒ نے شروط الائمہ للحازمی کے حاشیہ میں لکھا:۔ اگر ابراہیم بن معقل نسفی اور حماد بن شاکر یہ دونوں حنفی نہ ہوتے تو فربری پوری صحیح بخاری کے سماع عن البخاری میں منفرد رہ جاتے، جس طرح ابراہیم بن محمد بن سفیان حنفی امام مسلم سے سماع میں منفرد ہوجاتے۔

(مقدمہ لامع ۶۵ و امام ابن ماجہ وعلم حدیث للعلامۃ النعمانی ۲۱۴) حافظ ابراہیم بن معقل کا تذکرہ مقدمہ انوار الباری ۲/۸۴ میں بھی ہو چکا ہے اور حماد بن شاکر کا تذکرہ ۲/۸۸ میں ہوا ہے، علامہ فربری کے موجودہ نسخہ کی ان سے بلا واسطہ روایت کرنے والے مستملی و کشمیہنی وغیرہ ہیں، اور بالواسطہ روایت کرنے والے اصیلی و مستغفری وغیرہ ہیں، جن میں سے مستملی کے نسخہ کو ان کے احفظ ہونے کے سبب سے ترجیح ہے۔ واللہ اعلم!" مؤلف"!

ترجمہ! حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان میں اتنی کشادگی رکھتے کہ آپ کی بغلوں کی سپیدی ظاہر ہوتی تھی۔

تشریح! محقق عینیؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے مردوں کے لئے سجدہ کی حالت میں ہاتھوں کو پہلو سے الگ رکھنے کی سنیت معلوم ہوئی، لیکن عورتوں کے لئے پہلو سے ملا کر سجدہ کرنے کا حکم ہے کیونکہ ان کے حق میں ستر مطلوب ہے امام شافعیؒ نے بھی اپنی کتاب الام میں لکھا کہ مردوں کے واسطے کہنیوں کا پہلو سے دور رکھنا اور پیٹ کو رانوں سے الگ رکھنا مسنون ہے لیکن عورت سمٹ کر اور اعضاءِ جسم کو باہم ملا کر نماز پڑھے گی، علامہ قرطبی نے کہا کہ اس بارے میں فرائض ونوافل برابر ہیں۔ (عمدہ ۲/۲۹۴)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام بخاریؒ نے نماز کے لئے سترِ عورت کے احکام کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے، سجدہ کی مذکورہ مسنون کیفیت یہاں ذکر کر کے متنبہ کیا کہ اس سے تستر[1] کے خلاف صورت نہیں بنتی، اور یہاں ان کا مقصود کیفیتِ سجدہ کا بیان نہیں ہے، جس کا شمار صفاتِ صلوٰۃ میں ہے۔

قولہ فرج بین یدیہ پر فرمایا:۔ کہنیوں کو پہلو سے الگ رکھ کر سجدہ کرنے کا حکم اس لئے ہوا تا کہ ہر عضو کا حظ وشرف مستقل طور سے حاصل کر سکے کہ حدیث ہی میں[2] یہ بھی ہے کہ سجدہ میں تمام اعضا سجدہ کرتے ہیں، اگر جسم کو سمیٹ کر اور اعضاء جسم کو باہم ملا کر سجدہ کیا جائے گا تو سب اعضا سمٹ کر بمنزلہ عضو واحد ہو جائیں گے، اور ہر ہر عضو کو مستقل طور سے سجدہ کا حصہ نہ مل سکے گا، جو مطلوب[3] شرع ہے۔

عورتوں کے الگ احکام

جیسا کہ اوپر امام شافعیؒ اور محقق عینی نے اشارہ کیا اور تمام ہی فقہاء سے منقول ہے کہ عورتوں کی نماز مردوں کی نماز سے بہت سی چیزوں میں مختلف ہے، اوّل تو عورتوں کے لئے مساجد سے زیادہ گھروں میں نماز کی فضلیت زیادہ ہے، جبکہ مردوں کے لئے جمعہ جماعات اور عیدین کے بڑے اجتماعات میں فرض نماز ادا کرنے کی بڑی فضلیت ہے، مسجد[4] جتنی زیادہ بڑی اور نمازی جماعت میں زیادہ ہوں، ثواب زیادہ

---

[1] یہ حکم مردوں کے لئے ہے اور عورتوں کے لئے چونکہ تستر وحجاب بدرجہ غایت مطلوب ہے، اس لئے ان کو اس کا مکلّف نہیں کیا گیا واللہ تعالیٰ اعلم!

[2] ابوداؤد میں ہے کہ بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ سات اعضاء جسم سجدہ کرتے ہیں، چہرہ، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں قدم، دوسری حدیث ہے کہ چہرہ کی طرح دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں، (ابوداؤد باب اعضاء السجود ۱۲۸/۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہاتھوں کے سجدہ کی صورت یہی ہے کہ کہنیوں کی طرف سے اونچے رہیں اور ہتھیلیوں کی طرف سے نیچے، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ غالباً اسی وجہ سے سجدہ میں افتراش ذراعین سے ممانعت آئی ہے، کہ علاوہ کتے کی مشابہت کے یہ صورت سجدۂ یدین کے خلاف بھی ہے لیکن باوجود ان سب امور کے بھی عورتوں کے لئے چونکہ ان کا تستر وحجاب ہی محبوب ترین صفت ہے، ان کو افتراشِ ذراعین کی اجازت ہوگئی، اور نہ صرف یہ بلکہ اور بھی وہ سب صورتیں جو مردوں کے لئے افضل تھیں، عورتوں کے لئے صرف تستر کی رعایت سے مفضول ہوگئیں، ظاہر ہے جب نماز میں تستر کی اتنی رعایت ہے تو دوسرے اوقات میں کتنی زیادہ ہوگی، اور بغیر شدید ضرورت کے گھروں سے باہر نکل کر اپنے اعضاءِ جسم کی نمائش کرنی کس درجہ غضبِ الٰہی اور عتابِ نبوی کا موجب ہوگی۔ ''مؤلف''

[3] عورتوں کے واسطے چونکہ شریعتِ محمدیہ کو تستر سب سے زیادہ محبوب ہے اس لئے اس کا شرف وفضل حالتِ نماز میں بھی مقدم ہوا کہ سارے احوال زندگی میں سے حالتِ نماز ہی انسان کے لئے سب سے بہتر واشرف بھی ہے اور حالاتِ نماز میں سجدہ کی حالت کو عظیم شرف حاصل ہے اگر عورت مرد کی طرح کھل کر اور پھیل کر سجدہ کرے گی تو وہ اپنے عظیم شرفِ تستر کو کھودے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

[4] یہ جو کچھ مسجد وغیر مسجد کا فرق اور مرد وعورت کے لئے الگ احکام کی بات ہے اس کا تعلق صرف فرائض سے ہے، باقی سنن ونوافل کی ادائیگی وہ سب کے لئے گھروں میں ہی افضل ہے، حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔ گھروں کے اندر نماز پڑھنے کو لازم پکڑو، کیونکہ سوائے فرض نماز کے اور سب نمازیں گھر کے اندر ہی زیادہ بہتر ہیں، اور فرمایا:۔ نمازوں کی ادائیگی گھروں میں بھی کرو اور ان کو قبریں نہ بناؤ (ابوداؤد ۲۰۳)

انوارالباری ۸۳ میں باب قیام رمضان کے تحت کافی وضاحت ہو چکی ہے اور وہاں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے یہ بھی گزر چکا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہوتا ہے اور حدیث میں یہ بھی وارد ہے کہ نماز جماعت کا ثواب ۲۵ گنا ہے، اور نمازِ صحرا کا ۵۰ گنا ہے لیکن عورتوں کے لئے حضور اکرم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ گھر کے صحن سے زیادہ کمرے کے اندر نماز افضل ہے اور کوٹھری میں کمرے سے بھی زیادہ ثواب ہے، (ابوداؤد) نیز فرمایا عورتوں کے لئے سب سے بہتر مسجدیں ان کے گھروں کے کمرے ہیں اور اِن کے اندر ہو کر نماز پڑھنا سب سے افضل ہے (احمد وطبرانی) حضرت ابوحمید ساعدی کی بیوی نے حضور اکرم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کو محبوب رکھتی ہوں، آپ نے فرمایا میں بھی اس بات کو جانتا ہوں لیکن تمہاری نماز میری مسجد سے زیادہ اپنی قوم کی مسجد میں افضل ہے، اور اس مسجد سے بھی زیادہ اپنے مکان کی چار دیواری کے اندر پڑھنا بہتر ہے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ تم اپنے رہائشی کمروں کے صحن میں نماز پڑھو، اور سب سے بہتر وافضل یہ ہے کہ کمرہ کے اندر ہو کر نماز پڑھو۔

یہ سُن کر وہ بی بی گئیں اور گھر کے بالکل اندر کے حصّہ میں اپنی چھوٹی سی مسجد بنوائی، اور مرتے دم تک اسی تنگ وتاریک کوٹھری میں نماز پڑھتی رہیں (مسند احمد) دوسری حدیث میں ہے کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی کے علاوہ عورت کی سب سے بہتر نماز کی جگہ گھر کے اندرونی کمرے اور کوٹھریاں ہی ہیں معلوم ہوا کہ مسلمان عورتوں کے لئے شریعتِ محمدیہ میں سب سے زیادہ عمدہ اور محبوب ترین صفت شرم وحیا اور تستر وحجاب ہے کہ نماز جیسی مقدس عبادت کی ادائیگی تک میں[1] بھی اس کی رعایت اس درجہ کی گئی ہے، ظاہر ہے ایسی حالت میں نماز گزار کے دل میں کسی بھی بُرے خیال ورجحان کی گنجائش نہیں ہے کہ خداوند قدوس سے قرب وتقرب ومناجات کی حالت ہے مگر شریعت کی گہری نظر نے دیکھا کہ ایسی حالت میں بھی مردوں کے لئے تو اس بات کا موقع مل سکتا ہے کہ وہ شیطانی ونفسانی اثرات کے تحت شہوانی جذبات وخیالات دل میں لائیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ارشاد فرمایا کہ اگر نبی کریم علیہ السلام ہمارے اس زمانہ کے بگڑے ہوئے حالات کو ملاحظہ فرماتے تو مسلمان عورتوں کو مسجدوں میں نماز ادا کرنے سے ضرور ضرور روک دیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا، یہ حضرت عائشہؓ اپنے زمانہ کا حال بتلا گئی ہیں، جو ہمارے موجودہ دور کے حالات کے لحاظ سے ہزاروں ہزار گنا زیادہ بہتر زمانہ تھا، اب تو جنسی میلانات کی پیداوار اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں وقت سے بہت پہلے جوان اور بوڑھی ہو رہی ہیں اور دین وشریعت کا ماحول اچھے اچھے دینی وعلمی گھرانوں تک سے بھی رخصت ہو رہا ہے۔

اوپر کا فرق واختلاف تو نماز ادا کرنے کی جگہ کے بارے میں تھا اس کے بعد خود نماز کے ارکان کی ادائیگی میں بھی فرق ملاحظہ ہو کہ تقریباً پندرہ سولہ چیزوں میں دونوں کے لئے الگ الگ احکام ہیں مثلاً:۔

(۱) تکبیر تحریمہ کے وقت مرد کانوں تک ہاتھ اٹھائیں، عورتیں صرف شانوں تک۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ نوافل وسنن کو گھروں میں ادا کرنے کا ثواب بہ نسبت مسجد کے ۲۵ گنا زیادہ ہے اور فرض کا ثواب اس کے برعکس مسجد میں زیادہ ہے اسی لئے خود حضور اکرم علیہ السلام کی عادتِ مبارکہ یہی تھی کہ حجرۂ مبارکہ میں سُنن ونوافل ادا فرماتے تھے اور مسجد نبوی میں صرف فرض پڑھتے تھے، یہی معمول صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی رہا، گھروں سے ہی وضو اور سنن سے فارغ ہو کر صرف فرض نماز کے لئے مسجدوں کو جاتے تھے، اب یہ سنت تقریباً متروک ہو رہی ہے، جس طرح حضور اکرم علیہ السلام کی سنت فرض نمازوں میں پوری سورت پڑھنے کی تھی کہ آپ نے کبھی بھی ادھوری سورت نہیں پڑھی، مگر اب ائمہ حتیٰ کہ بہت سے علماء بھی اس کی رعایت نہیں کرتے، اور نمازیں غیر افضل اور غیر مسنون طریقہ پر ادا ہو رہی ہیں۔ اللھم اجعلنا من متبعی السنة السنية۔ آمین'' مؤلف''

[1] فقہا نے لکھا ہے کہ نماز میں عورت کو چہرہ، دونوں ہتھیلیاں اور دونوں پیروں کے سوا سر سے پاؤں تک سارا بدن خوب ڈھانک لینا فرض ہے، اسی لئے باریک دوپٹہ اوڑھ کر بھی نماز جائز نہیں، جس میں سے بدن دکھائی دے، خواہ اس جگہ کوئی نامحرم موجود نہ ہو یا صرف محرم موجود ہوں یا صرف شوہر موجود ہو یا کوئی بھی وہاں موجود نہ ہو، ہر حالت میں سارے بدن کا ڈھکنا فرض ہے۔

یہی حکم نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں نامحرم مردوں کے بارے میں بھی ہے کہ مذکورہ تینوں اعضاءِ بدن کے علاوہ کسی حصہ جسم کا ان کے سامنے کھلنا درست نہیں ہے، نہ باریک کپڑوں میں ان کے سامنے آنا جائز ہے، جس سے بدن اور سر کے بال دکھائی دیں، اور خوف فتنہ کے وقت چہرہ اور ہاتھوں اور پاؤں کا کھولنا بھی درست نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!'' مؤلف''

(۲) مرد ناف کے نیچے ہاتھ کی دائیں ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگوٹھے وچھوٹی انگلی سے بائیں کلائی کا حلقہ کریں گے عورتیں سینہ پر بغیر حلقہ کے دائیں ہتھیلی کو بائیں پر رکھیں گی۔

(۳) تنہا نماز پڑھنے والے مرد کو فجر، مغرب وعشاء کی ادا یا قضا نمازوں میں قراءت بلند آواز سے کرنے کا اختیار ہے لیکن عورتوں کو کسی وقت بھی بلند آواز سے قراءت کرنے کا اختیار نہیں، ان کو ہر وقت آہستہ آواز سے قراءت کرنی چاہیے۔

(۴) مردوں کو رکوع میں اچھی طرح جھکنا چاہیے کہ سر اور سرین وپشت برابر ہو جائیں اور پنڈلیاں سیدھی ہوں، عورتوں کو صرف اتنا جھکنا کافی ہے کہ ان کے ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں۔

(۵) رکوع میں مرد ہاتھ کی انگلیاں کشادہ کر کے گھٹنوں پر رکھیں گے، عورتیں ملا کر رکھیں گی۔

(۶) مرد رکوع کی حالت میں اپنی کہنیاں پہلو سے الگ رکھیں گے، عورتیں ملی ہوئی۔

(۷) سجدہ کی حالت میں مرد پیٹ کو رانوں سے، بازو کو بغل سے اور کہنیوں کو پہلو سے جدا رکھیں گے اور بانہوں کو زمین سے اٹھا ہوا رکھیں گے، برخلاف اس کے عورتیں پیٹ کو رانوں سے، کہنیوں کو پہلو سے ملا کر اور بانہوں کو زمین پر بچھا کر سجدہ کریں گی۔

(۸) مرد سجدہ میں دونوں پاؤں کھڑے رکھ کر انگلیوں کو قبلہ رُخ کریں گے، عورتوں کو اس کی ضرورت نہیں، وہ پاؤں کو کھڑا نہ کریں گی بلکہ داہنی طرف کو نکال دیں گی، اور خوب دب کر اور سمٹ کر سجدہ کریں گی۔

(۹) سجدہ سے سر اٹھا کر مرد اپنا پیر کھڑا کر کے اس کی انگلیاں قبلہ رُخ کرے گا، اور بایاں پیر بچھا کر اسی پر بیٹھے گا، دونوں ہاتھ زانوؤں پر گھٹنوں کے قریب رکھے گا، عورتیں اپنے دونوں پاؤں داہنی طرف کو نکال کر بائیں سرین پر بیٹھیں گی، دونوں ہاتھ کی انگلیاں خوب ملا کر رانوں پر رکھیں گی۔

محدثِ کبیر لیث بن سعد کا ذکر

یہاں حدیث الباب کے تحت امام بخاریؒ نے لیث بن سعدؒ کی متابعت بھی ذکر کی ہے، اس مناسبت سے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: امام شافعیؒ سے ان کی بڑی تعریف منقول ہے، ان کو امام مالک سے زیادہ افقہ فرمایا کرتے تھے، اور جب تک مصر رہے ان کی قبر پر برابر حاضر ہوا کرتے تھے، سب سے زیادہ ان کی ملاقات میسر نہ ہونے کا قلق وافسوس ظاہر کیا کرتے تھے۔

ابن خلکان نے ان کو حنفی بتلایا ہے، محض تحصیلِ علم کے لئے مصر سے مکہ معظمہ، وہاں سے مدینہ طیبہ، اور پھر عراق گئے امام طحاوی نے ان کی ایک حدیث "من کان لہ امام فقراءۃ الا مام لہٗ قراءۃ" امام ابو یوسف سے روایت کی ہے جو صرف اہل کوفہ کے پاس تھی مکہ معظمہ مدینہ منورہ وغیرہ میں کہیں نہ تھی، لیث اس کو عراق سے لے گئے اور مصر میں اس کو مشہور کیا، اور مصر والوں نے اس کی تلقی بالقبول کی، میرے نزدیک یہ حدیث ٹھیک اسی طرح ہے، حافظ ابن حجرؒ نے ان کے مناقب میں مستقل رسالہ "الرحمۃ الغیثیۃ فی الرحمۃ اللیثیۃ" لکھا ہے، جس طرح حافظ ذہبی نے امام اعظم اور صاحبین کے مناقب میں رسالہ لکھا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری شریف میں یہی الفاظ ارشاد فرمائے تھے، جو ہم نے اُس وقت نوٹ کئے تھے اور یہاں نقل کئے ہیں فیض الباری ۲/۲۸ میں دوسری طرح ہے۔[1]

---

[1] تذکرہ امالی حضرت شاہ صاحبؒ! فیض الباری اور انوار الباری کے بیان ومضمون میں بہت سی جگہ فرق نظر آئے گا، اور ممکن ہے ہمارے اپنے فہم وضبط سے پیدا شدہ بہت سی غلطیاں حضرتؒ کی طرف منسوب ہو جائیں، اس لئے یہ چند سطریں لکھی جا رہی ہیں، اس وقت حضرتؒ کے امالی درس حدیث میں سے العرف الشذی، انوار المحمود، معارف السنن اور انوار الباری سامنے ہیں جن میں سے صرف العرف الشذی آپ کی حیات میں شائع ہوئی تھی، یہ زمانہ صدارتِ تدریس دار العلوم کی یادگار ہے، جب آپ ترمذی وبخاری دونوں کا درس دیا کرتے تھے۔ اور حدیثی ابحاث وتحقیقات کو دونوں کے درس پر تقسیم فرمایا کرتے تھے، اسی زمانہ کے درس میں ایک بار حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے بھی شرکت فرمائی تھی، اور فرمایا تھا کہ حضرت شاہ صاحب کے درس کی شان بہت عجیب ہے، اور آپ کے صرف ایک ایک جملہ کی شرح میں ایک ایک رسالہ تصنیف کیا جا سکتا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ حضرتؒ کے درس کا ایک ایک لفظ نہایت قیمتی ہوتا تھا، قاری صحیح (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام بخاری کے رواۃ میں سے جلیل القدر امام حدیث ومجتہد ہونے کے باوجود امام بخاری نے ان کے فضل وکمال پر کوئی روشنی نہیں ڈالی، اوراپنی تاریخ کبیر ص۳۶۳ میں صرف ان کے سن ولادت وفات اور عمر بتانے پر اکتفا کیا ہے، یہ بھی نہیں بتایا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) طور سے قراءت کرتا کہ ایک حرف واعراب کی غلطی بھی حضرت کو برداشت نہ تھی، حضرتؒ پوری توجہ سے سُنتے اور جہاں بولتے، اوراس مقام کا حق ادا فرمادیتے تھے، ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک سال کسی بحث کو مختصر بیان کرتے اور دوسرے سال بسط وتفصیل سے اس لئے اگر تمام سالوں کے امالی ایک جگہ جمع کر کے کوئی مجموعہ مرتب کیا جاسکتا تو وہ سب سے بہتر ہوتا۔

العرف الشذی کی تالیف سب سے پہلی کوشش تھی، اور مواد کی کثرت وفراوانی کے لحاظ سے اس میں حضرتؒ کے درسِ ترمذی شریف کی کافی جھلک آگئی ہے اس وقت چونکہ بخاری شریف کے درس میں اس کے خاص مضامین پر الگ سے بولتے تھے، اس لئے العرف میں گویا سال کا نصف درس آیا تھا، العرف میں اگرچہ بہت سی خامیاں اور طباعت کی غلطیاں بھی تھیں تاہم اس کے مؤلف مولانا محمد چراغ صاحب دام ظلہم کا اساتذہ وطلبہ حدیث پر احسانِ عظیم ہے کہ اس کے ذریعہ انہوں نے علوم انوریہ اور تحقیقات نادرہ علمیہ کے دروازے کھول دیئے اور پھر عموماً مدارس عربیہ میں بھی اسی کے طرزِ تحقیق پر درس حدیث کا سلسلہ شروع ہوا، اگرچہ اب پھر انحطاط کا دور شروع ہوگیا ہے تاہم دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سیّد فخر الدین صاحب دام ظلہم العالی اور پاکستان میں حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اور حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوری دامت فیوضہم خاص طور سے حضرت شاہ صاحبؒ کے تحقیقاتی درس کی امتیازی خصوصیات کو باقی رکھنے میں کامیاب ہیں۔

دوسری کوشش انوار المحمود کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، جس کی تالیف ۴۴ھ میں ہوئی، یہ کام کافی محنت وکاوش کے ساتھ ہوا اور طباعت سے قبل حضرت شاہ صاحبؒ کے ملاحظہ میں بھی آگیا تھا، اگرچہ بالاستیعاب نہ دیکھ سکے، تاہم آپ نے جن مواضع کو دیکھا ان کی عبارت ومضمون کے لحاظ سے توثیق فرمائی اوراس کی کوشش کو بھی سراہا کہ حتی الامکان عباراتِ شارحینِ شروح کی مراجعت کر کے درج کی گئیں اور العرف سے اس کو بہتر قرار دیا، یہ بھی تاکید فرمائی کہ اسی طرح طبع کرادیں مگر کتابت وطباعت کی غلطیاں نہ ہونے پائیں، افسوس ہے کہ اس مجموعہ کی طباعت واشاعت حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات میں نہ ہوسکی، کیونکہ آپ کی وفات صفر ۵۲ھ میں ہوگئی، اور انوار المحمود جلد اول کی طباعت ذی الحجہ ۵۲ھ میں ہوئی ہے، اور جلد دوم کی تو ۵۶ھ میں ہوئی ہے (واضح ہو کہ انوار المحمود ۵ے) میں حضرتؒ کا سنِ وفات ۵۳ھ غلط چھپ گیا ہے۔ نفحۃ العنبر کے دونوں ایڈیشنوں میں بھی غلط چھپ گیا ہے۔ البتہ یتیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن ۴ میں ۵۲ھ صحیح چھپا تھا۔

انوار المحمود میں بھی بہت سی جگہ عبارات ومضامین کی خامیاں ہیں اور کتابت وطباعت کی غلطیاں تو بہت ہی زیادہ ہیں، تاہم بااستعداد طلبا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور مؤلفؒ نے حوالوں اور شروح کی مراجعت کا نہایت اہم وضروری کام بھی بڑی حد تک انجام دیدیا ہے، جعل الله سعيه مشكورا، تیسرے نمبر پر فیض الباری کا کام آتا ہے، جس کی تالیف حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد شروع ہوئی، اور حضرتؒ کے ملاحظہ میں اس کا کوئی حصہ نہیں آسکا، مؤلف فیض الباری حضرت مولانا محمد بدر عالم صاحبؒ کواس کام کے لئے احقر ہی نے آمادہ کیا تھا اور مجلس علمی'' کی سرپرستی ہی میں تالیف کا سب کام ہوا ہے، حضرت مولانا موصوف اس کام کو موجودہ صورت سے کہیں زیادہ بہتر طریقہ پر کر سکتے تھے، مگر ان کے تعلیمی مشاغل وذمہ داریاں مانع رہیں، جن کے باعث وہ حوالوں اور شروح کی مراجعت کا کام نہ کر سکے، نیز اس کے ساتھ عبارات، تعبیرات ومضامین کی خامیاں بھی کافی رہ گئیں، زمانہ قیام مصر (۳۸ھ) میں احقر اور رفیقِ محترم مولانا سیّد محمد یوسف صاحب بنوری دامت فیوضہم نے طباعت کے وقت کام کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ وہ فیض الباری کے کام کی نگرانی فرمائیں اور احقر نصب الرایہ کی، اس وقت دفعتہً اور خلاف توقع فیض الباری کے مسودات میں ایسی خامیاں سامنے آئیں کہ ان کی اصلاح بھی دورانِ طباعت ممکن نہ تھی، اس لئے مولانا موصوف نے تقدمہ میں ان کی طرف اشارات کردیئے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غور سے نہیں پڑھا جاتا اور بہت سے لوگ فیض الباری کو حضرت شاہ صاحبؒ کی اپنی تالیف جیسا مرتبہ دیتے ہیں، پاکستان سے مولانا مفتی محمد یوسف صاحب فاضلِ امینیہ دہلی، استاذِ جامعہ عربیہ اکوڑہ خٹک نے مودودی جائزہ کتاب میں اپنے علم ویقین کے حوالہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ فیض الباری کا مسودہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ملاحظہ سے گزر چکا تھا، چونکہ ایسے ظن وتخمین کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے، اس لئے تنبیہ کرنی پڑتی ہے۔

فیض الباری کے بعد ''معارف السنن'' کا کام شروع ہوا، اوراس کام کو حضرت مولانا سیّد محمد یوسف صاحب بنوری دام فیضہم نے زمانہ قیام ڈابھیل میں ہی مجلسِ علمی کی سرپرستی میں شروع فرمادیا تھا، خدا کا شکر ہے اس کی پانچ جلدیں کراچی سے شائع ہوچکی ہیں، اور وہ اس وقت نہ صرف حضرت شاہ صاحبؒ نے امالی درس حدیث کا بہترین ومستند مجموعہ ہے بلکہ ترمذی شریف کی مکمل شرح اور سارے علوم سلف وخلف کا نہایت بلند پایہ گنجینہ وذخیرہ بھی ہے، نظرِ بد سے بچنے کے لئے طباعت کی غلطیاں کہیں کہیں اس میں بھی ہوگئی ہیں، جو امید ہے آئندہ ایڈیشنوں میں دور کردی جائیں گی۔

ان سب کے بعد اور آخر میں ''انوار الباری'' کا نمبر آتا ہے، جس کی اصل حقیقت تو بکل معنی الکلمه ''جهد المقل'' سے زیادہ نہیں، مشہور ہے کہ حضرت یوسف علی نبینا علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے خریداروں میں ایک غریب ضعیف بوڑھی بھی اپنی بے بضاعت پونجی لے کر حاضر ہوئی تھی اور انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھوانے والے تو ہر زمانہ میں رہے ہیں، سنتے ہیں کہ بندر کو ایک گرہ ہلدی کی مل گئی تھی اور وہ پنساری بن بیٹھا تھا، کچھ ایسا ہی ملتا جلتا حالِ کم سواد راقم الحروف کا بھی ہے توفیق ایزدی سے آخر کے دو سالوں میں بخاری شریف کے درسِ انوری میں شرکت اور امالی درس قلمبند کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا، اس وقت محض ایک شوق کی کارفرمائی اور علم کی اپنی معمولی سی تشنگی بجھانے کے جذبہ سے زیادہ کوئی نیت نہ تھی، بڑی کوشش یہ تھی کہ ہر مسئلہ میں حضرتؒ کی اپنی خاص آراء اور حاصلِ مطالعہ چیزوں کو ضرور نوٹ کرلوں اور حضرتؒ کے اردو الفاظ کو بعینہا قلمبند کروں، اور اب جتنا کام بھی ہورہا ہے ان ہی کی روشنی میں کر رہا ہوں، حضرت مولانا محمد بدر عالم صاحبؒ بھی اُن آخری دو سالوں میں شریکِ درس رہے اور حضرت کے امالی درس کو قلم بند کیا، مگر وہ حضرتؒ کی اردو تقریر کو عربی زبان میں ضبط کرتے تھے، جس کی وجہ سے بہت سی چیزیں آگے پیچھے ہوگئی ہیں اور حوالوں میں غلطی ہوگئی، پھر اگر ان حوالوں اور کتبِ شروح کی مراجعت کرلی جاتی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ کن بڑے بڑے اکابر سے علم حاصل کیا، اور کتنے بڑے بڑے حضرات ان کے تلمیذ حدیث ہوئے ہیں، حالانکہ خود اپنی اس تاریخ کبیر میں بھی دوسروں کے تذکرہ میں ان کے قول کو بطور سند پیش کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ رجال و تاریخ کے علم میں بھی ان کی عظمت وسیادت کے قائل ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے ان کے اکابر شیوخ کے نام ۴۳ ذکر کئے، پھر ایک جماعتِ اقران واصاغر کا حوالہ بھی دیا، اور ۴۸ ان کے تلامذۂ حدیث ذکر کئے، جن میں مشہور حافظ حدیث عبداللہ بن مبارکؒ بھی ہیں، جن کیلئے امام بخاری نے تاریخ کبیر ۲/۲۱۲/۲ میں سلام بن ابی مطیع کا قول "ماخلف بالمرو مثله" نقل کیا ہے اور اپنے رسالہ جزء رفع الیدین میں ان کو اعلم اہل زمانہ بھی فرمایا اور پھر طنز کیا کہ بے علم لوگوں کے لئے بہتر تھا کہ وہ ابن مبارک ہی کا اتباع کر لیتے بجائے اس کے کہ انہوں نے دوسرے بے علم لوگوں کا اتباع کیا۔ اندازہ کیجئے کہ بقول امام بخاری اعلم اہل زمانہ ابن مبارک نے حضرت لیث بن سعد کی بھی شاگردی کی ہے، جو امام اعظم وامام ابو یوسف کے تلمیذ حدیث تھے، اور اتنے بڑے پایہ کے فقیہ و مجتہد و محدث تھے کہ امام مالکؒ کے ستر مسائل میں غلطی کی نشان دہی کی، اور امام شافعیؒ نے تو ان کو امام مالکؒ سے زیادہ افقہ قرار دیا۔

حافظؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا کہ لیث کثیر العلم، صحیح الحدیث تھے، اور فرمایا کہ اہل مصر میں ان سے زیادہ اصح الحدیث واثبت دوسرا نہ تھا، کسی نے کہا کہ فلاں نے تو ان کی تضعیف کی ہے تو امام احمد نے فرمایا ہم اس کو نہیں جانتے، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے بڑوں کی تضعیف کرنے والے بھی ہر زمانہ میں رہے ہیں مگر ان کی رائے کو وقعت نہیں دی گئی۔

حافظ نے امام شافعی کا یہ قول بھی نقل کیا کہ "لیث امام مالک سے زیادہ اثر کا اتباع کرتے تھے" یہ ایک حنفی المسلک فقیہ محدث کے لئے بہت بڑا کریڈٹ ہے، عبداللہ بن صالح نے کہا کہ میں بیس سال لیث کے ساتھ رہا، وہ اس پوری مدت میں عام لوگوں کے ساتھ ہی صبح وشام کا کھانا کھاتے رہے، ابن حبان نے کہا کہ لیث فقہ، ورع، علم وفضل اور سخاوت کے لحاظ سے اپنے زمانہ کے سادات میں سے تھے، خلیلی نے کہا کہ اپنے وقت کے امام بلا مقابلہ تھے۔ الخ (تہذیب ۸/۴۵۹)

تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۲۴ میں بھی آپ کے مناقب وفضائل ذکر ہیں، حافظ کا مذکورہ بالا رسالہ نظر سے نہیں گزرا آپ کا تذکرہ مقدمہ انوار الباری ۲/۲۱۹ اور ۱/۴۵ میں بھی ہوا ہے، اس میں ذکر کر چکے ہیں کہ جب بھی امام صاحب کی خبر حج سُنتے تھے تو مصر سے ضرور مکہ معظمہ حاضر ہوتے، اور امام صاحب سے استفادہ کرتے تھے، اس طرح جس قدر علمی استفادہ کیا ہوگا، اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے کیونکہ امام صاحب بکثرت حج کرتے تھے لیکن اس قسم کے واقعات افسوس ہے کہ دوسروں نے ذکر کرنے کا حوصلہ نہیں کیا۔ رحمة الله رحمة واسعة

امام بخاریؒ کے وہ نہ صرف اساتذہ میں سے ہیں، بلکہ ان کے اقوال تاریخ بخاری میں بہ طورِ سند پیش ہوئے ہیں، آج اگر ایسے جلیل القدر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تب بھی صحت ہو جاتی، حضرت شاہ صاحبؒ درس کے وقت برجستہ اور بہت تیز بولتے تھے، اور نقول وحوالوں میں سر مو بھی غلطی نہ کرتے تھے، اس لئے اگر ایسی کوئی غلطی کسی تالیف میں ان کی طرف سے منسوب ہوتی ہے تو اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے، اپنی یادداشتوں پر بھی کامل بھروسہ نہیں، خصوصاً اپنی کم علمی و بے ایضاعتی کے باعث، مگر اس کی توثیق کے لئے کافی وقت حوالوں اور کتب شروح کی مراجعت ومطالعہ میں صرف کرتا ہوں، تب کچھ لکھتا ہوں۔

ناظرین انوار الباری کے بیشتر خطوط تقاضوں کے آتے ہیں، اور بعض احباب ناراض بھی ہوتے ہیں کہ اس طرح جوں کی چال کب تک چلو گے اور پوری شرح کب مکمل ہوگی؟ مگر میں اپنی مجبوری ومعذوری کو خود ہی جانتا ہوں، تنہا بھی ہوں، کیونکہ علوم وکمالاتِ انوریہ کے حاملین مجھ سے اتنی دور ہیں کہ ان سے کوئی مدد بھی نہیں مل سکتی، اس لئے ناظرین سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے، اب تک بھی جتنا کام ہوا وہ مخلصین کی دعاؤں کی بدولت ہی ہو سکا ہے، ورنہ یہ عاجز تو اس سے بھی عاجز تھا۔ واللہ الموفق والمعین!

[۱] علامہ ابن ندیم نے امام اعظمؒ کے بارے میں لکھا تھا کہ مشرق سے مغرب تک روئے زمین کے تمام خشکی وتری کے حصوں میں دور ونزدیک جو کچھ بھی علم کی روشنی پھیلی وہ امام صاحبؒ ہی کی تدوین کا صدقہ ہے، ایسے امام ہمام کو بے علم اور گمراہ تک کہہ دیا گیا، اس سے زیادہ تکلیف دہ بات کیا ہو سکتی ہے؟ والی اللہ المشتکی۔

حضرت لیث بن سعدؒ کو ابن خلکان وغیرہ نے حنفی کہا، قاضی ذکریا انصاری نے شرح بخاری میں اس کو یقینی قرار دیا، حافظ ابن ابی العوام نے ان کو تلمیذ امام اعظم ثابت کیا، امام شافعیؒ کو ان کی فقہ وحدیث کے مدون نہ ہونے کا افسوس وملال رہا۔

محدث، فقیہ وامام رجال کی کوئی مدون کتاب ہمارے پاس ہوتی تو موجودہ حنفیت دشمنی میں مزید کی ضرور رونما ہوتی، جس طرح ہمیں امید ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہؒ کی طباعت اور منظرِ عام پر آجانے سے بداندیشوں کی بہت سی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں ختم ہوجائیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

یہاں یہ چیز بھی نمایاں کرنی ہے کہ امام لیث بن سعد اپنے زمانہ کے اتنے بڑے جلیل القدر محدث تھے کہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ وہ ایک ایسی حدیث کو جو اس وقت بجز عراق کے دوسری جگہ معلوم ومشہور نہ ہوئی تھی عراق کے ائمہ حنفیہ وغیرہم سے اخذ کر کے مصر لے گئے، اور وہاں کے علماء محدثین وفقہا میں اس کی تلقی بالقبول بھی کرادی، یہ معمولی بات نہ تھی خصوصاً ایسے وقت میں کہ کچھ فقہاء ومحدثین امام کے پیچھے جہری نمازوں میں بھی وجوب قراءۃ فاتحہ کے قائل موجود تھے، جن کو آئندہ دور میں امام بخاریؒ وغیرہ آگے بڑھا کر اور نمایاں کر کے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر بحث فرماتے ہوئے اسی حدیثِ لیث بن سعد بروایتِ امام طحاوی کو اپنے نزدیک سند کے لحاظ سے دوسری سب احادیث سے زیادہ اہمیت دیتے تھے کیونکہ اس کی سند میں چار جلیل القدر امام حدیث وفقہ موجود ہیں، جس کی نظیر بہت کم ملے گی۔ محترم علامہ بنوری عم فیضہم نے حضرتؒ کے اس ارشاد کو نمایاں کرتے ہوئے مزید تقویت وتائید کا سامان بھی فراہم کیا ہے جو بہت قابل قدر سعی ہے۔ ملاحظہ ہو معارف السنن ۲/۵۰۰، ۲/۱۸۷، ۲/۲۵۵

مسائل اختلافیہ میں ''فاتحہ خلف الامام'' کے مسئلہ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ شاید کسی دوسرے مسئلہ کو نہیں، اسی لئے اکابر محدثین نے اس پر پورا زور صرف کردیا ہے اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اس کی تحقیق میں گویا بطور ''حرفِ آخر'' کلام فرمایا ہے، پھر حضرتؒ کی پوری تحقیق کو جس وضاحت اور دلائل کے ساتھ مکمل کر کے علامہ بنوری نے پیش کردیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء!

حد یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بیانِ مذاہب تک میں بڑوں بڑوں سے غلطی ہوگئی ہے، حتی کہ امام ترمذیؒ جیسے متثبت بھی تسامح سے نہ بچ سکے اور محدث کبیر ابوعمر ابن عبدالبر نے الاستذکار میں امام لیث بن سعد کا مذہب امام شافعیؒ کے موافق قرار دیا ہے، حالانکہ امام شافعیؒ جہری وسری دونوں نمازوں میں مقتدی کے لئے قراءتِ فاتحہ کو واجب کہتے ہیں، اور لیث جہری میں امام اعظم، امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی، ابن مبارک واسحٰق بن راہویہ کی طرح مانع قراءت ہیں، اور سرّی میں صرف استحباب کے قائل ہیں (کما صرح بہ الحافظ ابن تیمیہ فی فتاواہ ۲/۱۶۶، ۲/۱۶۷ طبع مکتبہ دار العروبہ قاہرہ) حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا کہ سری نماز میں امام اوزاعی ولیث بن سعد کے نزدیک قراءتِ فاتحہ خلف الامام مستحب ہے اور اسی کو میرے جدامجد ابوالبرکات نے اختیار فرمایا تھا اور یہی امام احمدؒ کا مشہور قول بھی ہے، جو امام شافعیؒ کا قدیم قول تھا، اور حالتِ جہر امام میں مقتدی کا قراءت کرنا امام احمد کے ایک قول میں ناجائز وحرام ہے، اگر پڑھے گا تو نماز باطل ہوجائے گی، اور دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ نماز باطل نہ ہوگی۔

حضرت لیث بن سعد کے تذکرہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کا مذہب مصر میں شائع ہوگیا تھا (معارف السنن ۳/۲۶۵) اور جہاں انہوں نے امام ابویوسف سے روایتِ حدیث کی ہے، امام موصوف نے بھی ان سے اپنی کتاب الخراج میں حدیث روایت کی ہے، اور ان دونوں ہی حنفی المسلک اماموں کا اتبع للاثر ہونا مخالفینِ حنفیہ تک نے تسلیم کیا ہے۔ رحمهم الله تعالیٰ کلهم رحمة واسعه!

باب فضل استقبال القبلة يستقبل باطراف رجليه القبلة قاله ابو حميد عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم

(استقبالِ قبلہ کی فضیلت کا بیان، اپنے پیروں کی انگلیوں کو بھی قبلہ رُخ رکھنا چاہیے اس کو ابو حمید نے نبی کریم علیہ السلام سے نقل کیا ہے)

(۳۸۱) حدثنا عمرو بن عباس قال نا ابن مهدی قال ثنا منصور بن سعد عن ميمون بن سياه عن انس بن مالک قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلى صلوتنا واستقبل قبلتنا واكل ذبيحتنا فذلک المسلم الذی له ذمة الله و ذمة رسول الله فلا تخفروا الله فی ذمته

(۳۸۲) حدثنا نعيم قال نا ابن المبارک عن حميد الطويل عن انس بن مالک قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امرت ان اقاتل الناس حتىٰ يقولوا لآ اله الا الله فاذا قالوها و صلوا صلوتنا واستقبلوا قبلتنا و اكلوا ذبيحتنا فقد حرمت علينا دمآوهم واموالهم الا بحقها و حسابهم على الله و قال على بن عبدالله حدثنا خالد بن الحارث قال نا حميد قال سال ميمون بن سياة انس بن مالک فقال يآ اباحمزة وما يحرم دم العبد وماله فقال من شهد ان لآ اله الا الله واستقبل قبلتنا و صلى صلاتنا واكل ذبيحتنا فهو المسلم له ما للمسلم وعليه ما على المسلم وقال ابن ابی مريم انا يحيى بن ايوب قال نا انس عن النبی صلى الله عليه وسلم

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کوئی ہماری (جیسی) نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ ایسا مسلمان ہے، جس کے لئے اللہ اور اللہ کے رسول کا ذمہ ہے، تو تم اللہ کی ذمہ داری میں خیانت نہ کرو،

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا علیہ السلام نے فرمایا مجھے اس وقت تک لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جب تک وہ لا الہ الا اللہ نہ کہہ دیں، پھر جب وہ یہ کہہ دیں اور ہماری (جیسی) نماز پڑھنے لگیں اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرنے لگیں اور ہمارا ذبیحہ کھالیں تو یقیناً ان کے خون اور مال حرام ہو گئے مگر حق کی بناء پر (جو اسلام نے ان پر مقرر کر دیا ہے) باقی ان کا حساب اللہ کے حوالے ہے اور علی بن عبداللہ نے کہا ہے کہ ہم سے خالد بن حارث نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حمید طویل نے بیان کیا، کہ میمون بن سیاہ نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ اے ابوحمزہ! وہ کون سی چیز ہے، جس سے آدمی کا جان و مال دونوں (دست درازی سے) محفوظ ہو جاتے ہیں، تو انہوں نے کہا کہ جو شخص اس بات کی گواہی دے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور ہمارے قبلہ کا استقبال اور ہماری طرح نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے جو حقوق دوسرے مسلمانوں کے ہوں گئے وہ اس کے بھی ہوں گے، اور اس کے ذمہ بھی وہ سب حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ذمہ ہیں۔

تشریح! محقق عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے احکام ستر کے سب اقسام ذکر کرنے کے بعد یہاں استقبالِ قبلہ کا بیان کیا ہے پھر اس کے ذیل میں مساجد کے احکام بھی بیان کریں گے، اور یہی ترتیب بہتر بھی ہے کیونکہ جو شخص نماز شروع کرنا چاہتا ہے سب سے پہلے اس کو ستر عورت لازم ہے، پھر استقبالِ قبلہ، اور ادائیگی فرض نماز چونکہ مساجد میں مطلوب ہے اس لئے ان کے احکام بھی ساتھ ہی بیان کرنا زیادہ موزوں ہوا پھر امام بخاریؒ نے فرضیتِ استقبال قبلہ وفضیلت کے ذیل میں اس امر کی بھی فضیلت بتلا دی کہ استقبال کلی طور سے، یعنی جمیع اعضاءِ جسم سے اور جتنا بھی زیادہ سے زیادہ ہو سکے اس کو حاصل کرنا چاہیے حتی کہ حالتِ سجدہ وتشہد میں بھی پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ کی طرف

متوجہ کرے، اورامام نسائیؒ نے تو اس پر مستقل باب الاستقبال باطراف اصابع القدم القبلة عندالقعود للتشهد قائم کیا ہے۔

پھر علامہ عینیؒ نے حافظ ابن حجرؒ کے اس تسامح پر بھی تنبیہ کی کہ انہوں نے کہا امام بخاریؒ نے یہاں تمام اعضاء کے لئے استقبالِ قبلہ کی مشروعیت بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے، علامہ نے فرمایا کہ امام بخاری نے صرف فضیلت کا عنوان قائم کیا ہے، اور اسی کا ارادہ کیا ہے مشروعیت کا نہیں، اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔ (عمدہ ۲/۲۹۵)!

افادۂ انور! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اگر امام بخاریؒ کی غرض یہاں فرضِ استقبال کا بیان ہے اور دوسرے اعضاء سے بھی استقبال کو بوجہ فضیلت ضمناً بیان کر دیا ہے تو یہاں شرائطِ صلوٰۃ کے طور پر اس کو لانا برمحل ہے، ورنہ زائد امور کا بیان صفۃِ صلوٰۃ کے تحت زیادہ موزوں ہے پھر فرمایا کہ جیسی کبیر (شرح منیۃ المصلی ۲۸۵) میں وضعِ قدم سے توجیہ اصابع القدم الی لقبلة مراد سمجھ کر اس کو فرض قرار دیا ہے اور بغیر اس کے نماز کو باطل ٹھیرایا ہے، وہ غلط ہے، یعنی سجدہ کی حالت میں وضع قدم زمین پر ضرور فرض ہے اور وضع قدم سے مراد وضع اصابع قدم بھی درست ہے (اسی لئے اگر ایسا جوتہ پہن کر نماز پڑھے، جس میں پاؤں کی انگلیاں زمین پر نہ ٹکیں تو نماز نہ ہوگی) لیکن وضع اصابع سے مراد توجیہ اصابع الی القبله سمجھنا درست نہیں، کیونکہ توجیہ کا درجہ صرف سنت وفضیلت کا ہوگا، اور اس کے بغیر نماز مکروہ ہوگی باطل نہ ہوگی، غالباً محقق عینی نے بھی مشروعیت وفضیلت کے فرق کی طرف اشارہ کر کے اسی پر تنبیہ کی ہے، جس کو حضرتؒ نے مزید افادہ کے ساتھ واضح فرما دیا۔ وللہ درہما، رحمہما اللہ رحمتہ واسعۃ!

قولہ من صلے صلاتنا الخ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ان ہی احادیث سے اہل قبلہ کا لقب اہل اسلام کے لئے اخذ کیا گیا ہے وجہ یہ ہے کہ یہ اہل اسلام کی بڑی اور کھلی ہوئی علامات ہیں، جن سے بڑی آسانی کے ساتھ دین اسلام والے دوسرے اہل مذاہب سے ممتاز ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ لوگ ہمارے ذبیحہ سے پرہیز کرتے ہیں، ہماری جیسی نماز نہیں پڑھتے، اور اپنی عبادات میں ہمارے قبلہ کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے، لہٰذا یہ تینوں چیزیں اہل اسلام کے لئے شعار کے درجہ میں ہوگئی ہیں، لیکن یہ مطلب نہیں کہ جن لوگوں میں یہ تینوں چیزیں پائی جائیں، ان کو ضرور مسلمان سمجھا اور کہا جائے گا خواہ وہ دین کی چیزوں کا انکار بھی کر دیں، اور خواہ وہ حضور علیہ السلام کے ارشاد ہی کے مطابق دین اسلام سے خارج بھی ہو جائیں، جس طرح تیر کمان سے دور ہو جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص پورے دین کو مانتا ہو اور اس پر عمل بھی کرتا ہو مگر ایک چھوٹی سے چھوٹی سورتِ قرآنی کا انکار بھی کرے یا اس کا حکم نہ مانے، یا جان بوجھ کر اس کو غلط معنی پہنائے، تو اس کے کفر میں شک نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ کہ کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے، انبیاء علیہم السلام کی اہانت کرے، ان کے خلافِ شان سخت نامناسب الفاظ استعمال کرے، دین کی تحریف کرے، احادیثِ رسول اکرم ﷺ اور اخبار وواقعات ومعجزاتِ علیہم السلام کا انکار واستہزاء کرے وغیرہ تو اس کو کیسے داخلِ اسلام قرار دیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ہمارے زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی نے ان سب موجباتِ کفر کا ارتکاب کیا جبکہ ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی ثبوتِ کفر کے لئے کافی تھا، مگر افسوس ہے کہ ہمارے اس دورِ جہالت کے بعض اہل علم نے بھی جن کو کتبِ فقہ وعقائد وکلام پر عبور نہیں تھا، مرزا کی تکفیر میں تردد کیا، اور کہا کہ ہم احتیاط کرتے ہیں اور یہ نہ سمجھا کہ جس طرح اکفارِ مسلم پر دلیری کرنا گناہ ہے بالکل اسی طرح عدم اکفارِ کافر بھی گناہ ہے، اور اسی لئے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قتالِ مانعین زکوٰۃ کے بارے میں حضرت عمرؓ کے تردد کو دیکھ کر فرمایا تھا "اجبار فی الجاھلیة وخوار فی الاسلام"؟ (کہ زمانہ جاہلیت میں تو بڑے دلیر اور بہادر تھے، اب یہ اسلام کے زمانے میں بزدلی اور کمزوری کیسی؟) اس کے بعد پھر جلد ہی حضرت عمرؓ نے بھی اپنی رائے بدل دی اور فرمایا کہ میرا دل بھی اس بات کے لئے کھل گیا، جس کے لئے حضرتِ ابوبکرؓ کا دل کھل گیا تھا، اور وہ سمجھ گئے کہ احتیاط کا اقتضاء بھی وہی تھا، جس کو حضرت ابوبکرؓ نے اختیار کیا تھا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہاں حضرتؒ نے جو کچھ بیان فرمایا وہ بہت مختصر ہے، کیونکہ اس نہایت عظیم ومہم مسئلہ پر برسہابرس قبل، زمانہ صدارتِ تدریس دارالعلوم دیوبند میں مستقل رسالہ اکفارالملحدین لکھ چکے تھے اور آپ کا یہ مشہور ومعروف رسالہ اہل علم ودرایت کے لئے مشعلِ راہ بن چکا ہے، جس کو پڑھ کر اہل علم کے لئے علوم وحلِ مشکلات کے دروازے کھلتے ہیں، عجیب وغریب نادر علمی تحفہ ہے، جس میں بیسیوں کتبِ متدا ولہ وغیر متدا ولہ کے نوادرِ نقول واقتباسات درج ہوئے ہیں، حضرتؒ فرماتے تھے کہ دیوبند کے زمانہ میں جب میں نے دیکھا کہ مرزائی فتنہ نے بڑے زور شور سے سر اٹھایا ہے اور کچھ دنیادار لالچی علماء بھی اس کے ساتھ ہوگئے ہیں اور قرآنی آیات واحادیث کی تحریف پر تُل گئے ہیں، اور ہمارے بہت سے اہلِ حق علماء بوجہ قصورِ استعداد ومطالعہ جوابات سے عاجز ہو رہے ہیں تو مجھے نہایت تشویش لاحق ہوئی اور دل ودماغ پر یہ فکر ہر وقت مسلط رہنے لگا کہ خدانخواستہ ہمارا صحیح دین مغالطوں کی نذر ہو کر نابود ہو جائے گا اور علمائے حق اس کی حفاظت کا حق ادا نہ کر سکیں گے، یہ خیال تقریباً چھ سال تک رہا، اور اس زمانہ میں میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی تھی، لیکن پھر ایک دم یہ خیال بدل گیا اور یقین ہوگیا کہ یہ دین باقی رہے گا، فرمایا کہ اسی مدت میں یعنی چھ سال تک میں نے برابر صبح وشام مرزائیوں کے رد میں لکھا ہے، اور جو طبع ہوا ہے وہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے، اس طبع شدہ سے آپ کا اشارہ اکفارالملحدین، عقیدۃ الاسلام صدع النقاب اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، اور ختم النبوۃ کے رسائل کی طرف ہے جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دام ظلہم نے جمع وترتیب دے کر شائع کئے تھے، اس کے بعد ڈابھیل کی مجلسِ علمی سے ''خاتم النبیین'' بھی شائع ہوا۔

افسوس صد افسوس کہ باقی ذخیرہ جو یادداشتوں کی شکل میں تھا، وہ محفوظ بھی نہ رہ سکا، جس طرح دوسری یادداشتوں کا ذخیرہ ضائع ہوگیا جو کئی بکسوں میں جمع تھا، زمانہ قیام ڈابھیل میں ایک روز فرمایا تھا کہ میں نے حنفیہ کے لئے اس قدر سامان جمع کیا ہے کہ آج تک مجموعی طور سے تمام سلف علماءِ حنفیہ سے بھی نہیں ہوسکا ہے لیکن افسوس ہے کہ میری یادداشتوں کو صاف اور منقح کرنے کے لئے کوئی صاحبِ سواد نہیں ملا اور نہ امید ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ سراپا علم تھے اور ان سے استفادہ کرنے والے ان کی نسبت سے سراپا جہل تھے، اسی لئے آپ کے تلامذہ بھی الاماشاء اللہ آپ کے علوم وکمالات کو نہ سنبھال سکے، راقم الحروف نے اکثر دیکھا کہ علماءِ وقت مشکلاتِ قرآن کے بارے میں آپ سے استفسار کرتے آپ ان کی تشفی کے لئے توجہ فرماتے اور جوابات دیتے اور آخر میں فرماتے تھے کہ مولوی صاحب! کوئی کہاں تک اترے؟! یعنی کلام الملک العلام ہے وہ کہاں تک نازل ہوتا کہ تمہاری نازل افہام ان کا احاطہ کرلیں، چونکہ حضرتؒ اپنی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں سے علوم عالیہ کے قرب سے فیضیاب وبہرہ ور ہوچکے تھے، اس لئے آپ کے علوم وکمالات بھی ہماری عام دسترس سے باہر تھے، اسی لئے حضرتؒ مایوسی کا اظہار فرمایا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جتنا کچھ درس بخاری شریف اور اپنی علمی مجالس میں بیان فرماتے ہیں، ان کو بھی آپ کے تلامذہ نہ سنبھال سکیں گے، احقر چونکہ حضرتؒ کی ایک ایک بات غور سے سنتا اور لکھتا رہتا تھا، تو کسی قدر مانوس ہوگئے تھے، اور شاید خیال کیا ہوگا کہ ٹوٹی پھوٹی چیزیں دوسروں تک پہنچادے گا، ایک دفعہ مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''مولوی صاحب! یہ صاحب اگر ہمیں پہلے سے مل جاتے تو ہم بہت کام کرلیتے۔''

یہ جملہ اس جگہ صرف تحدیثِ نعمت کے طور پر زبانِ قلم پر آگیا، ورنہ میں اپنے جہل اور کم استعدادی سے ناواقف نہیں ہوں، میں نے اُس وقت ساری کوشش اِس کی کی تھی کہ حضرتؒ کے الفاظ بعینہٖ قلم بند کرلوں، اور آپ کی خاص خاص آراء کو محفوظ کرلوں، اور وہی کوشش انوار الباری کی تالیف میں کام آرہی ہے، یہاں اصل ذکر اس کا تھا کہ حضرتؒ فتنہ مرزائیت کے سیلاب اور اُس وقت کے علماءِ میں مقابلہ کی قوت واستعداد نہ دیکھ کر کتنے فکر مند ہوگئے تھے، اور آپ نے علماءِ وقت کے سامنے اتنا عظیم الشان ذخیرہ پیش کردیا کہ پھر پوری قوت سے اُس سیلاب کو روکا جاسکا، ورنہ حال یہ تھا کہ حضرتؒ نے ایک روز ہندوستان کی ایک مرکزی علمی درس گاہ کے محترم شیخ الحدیث کا واقعہ نقل کیا کہ

انہوں نے مرزائیوں کی تکفیر کے بارے میں احتیاط وتاویل کا پہلو ذکر کیا تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے تو شرح عقائد اوراس کی شروح وحواشی کا مطالعہ بھی نہیں کیا، ورنہ ایسی بات نہ کہتے، اس میں اور تمام کتب عقائد وکلام میں ہے کہ ''ضروریاتِ دین'' کی تاویل وانکار موجبِ کفر ہے، دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ڈابھیل تشریف لے جانے کے بعد مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ چونکہ پوری شدت سے مرزائیوں کا مقابلہ کرتے تھے، اوران کے کفریہ عقائد اپنے درس میں بھی بیان کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے بعض دوسرے اساتذہ سے اگر درس میں مرزائیوں کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو وہ جواب دیتے تھے کہ ''دارالتکیفر'' والوں کے پاس جا کر دریافت کرو (یعنی مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہ سے جو مرزائیوں کی تکفیر کرتے ہیں) یہ گویا دارالعلوم میں علمی اقدار پر سیاسی اقتدار کے تفوق وبرتری کے آثار نمایاں ہونے کی ابتداء تھی، آگے ع قیاس کن زگلستانِ او بہارش را

خیر! بات اکفار الملحدین کی تالیف سے چلی تھی، اور خدا کا شکر ہے اب اس کا اردو ترجمہ بھی پوری تحقیق واحتیاط کے ساتھ ''مجلسِ علمی'' کراچی سے شائع ہوگیا ہے، امید ہے کہ اس سے اہل علم وعوام سب ہی کو نفع عظیم حاصل ہوگا۔

یہاں حدیث الباب کی مناسبت سے چند امورِ ضروریہ بغرض افادہ ذکر کئے جاتے ہیں:۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے احوال ومعاملات کو ظاہر پر محمول کرنا چاہیے، لہٰذا جو شخص شعارِ دین کو ظاہر کرے، اس پر اہل اسلام ہی کے احکام جاری کئے جائیں گے، جب تک کہ اس سے دین کے خلاف کوئی بات ظاہر نہ ہو، آگے لکھا کہ حدیث میں صرف استقبالِ قبلہ واکلِ ذبیحہ وغیرہ کا ذکر اس لئے ہوا کہ بعض اہل کتاب بھی اگر چہ اقرارِ توحید کے ساتھ استقبالِ قبلہ وغیرہ کرتے ہیں مگر وہ ہماری جیسی نماز نہیں پڑھتے، نہ ہمارے قبلہ کا استقبال کرتے ہیں اور ان میں سے بہت سے غیر اللہ کے لئے ذبح کرتے ہیں اور بہت سے ہمارا ذبیحہ نہیں کھاتے، دوسرے یہ کہ کسی شخص کی نماز اور کھانے کا حال بہت جلد اور پہلے ہی دن معلوم ہو جاتا ہے، دوسرے امورِ دین کا حال جلد معلوم نہیں ہوتا، اس لئے بھی صرف اِن چند چیزوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔ (فتح الباری ۱/۳۳۶)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہماری جیسی نماز نہ پڑھیں یا ہمارے امام کے پیچھے اپنی نماز درست نہ سمجھیں، یا ہمارا ذبیحہ نہ کھائیں، تو وہ خود بھی ہم سے کٹ گئے، اور ہمارے دین سے اپنے دین کو الگ سمجھنے لگ گئے، اس لئے ہمارے فیصلہ سے قبل ہی گویا انہوں نے اپنے بارے میں فیصلہ دیدیا ہے۔

محقق عینیؒ نے لکھا: ذبیحہ کا ذکر خاص طور سے اس لئے بھی کیا کہ یہود ہمارے ذبیحہ کے کھانے سے پرہیز کرتے تھے پھر آگے لکھا: حدیث سے ثابت ہوا کہ علاماتِ مسلم میں سے مسلمانوں کا ذبیحہ کھانا بھی ہے اس لئے کہ بہت سے اہل کتاب اور مشرکین مسلمانوں کا ذبیحہ کھانے سے انقباض اور دلی تنگی محسوس کرتے ہیں۔

قولہ حتی یقولوا لا الہ الا اللہ پر لکھا:۔ صرف ان تین باتوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ تینوں دین محمدی کے خواص میں سے ہیں کیونکہ یہود وغیرہم کی نماز میں رکوع نہیں ہے، ان کا قبلہ بھی دوسرا ہے، اور ذبیحہ بھی الگ ہے (عمدہ ۲/۲۹۶)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہود، نصاریٰ، اور مشرکین کے بارے میں تو فیصلہ بہت کھلا ہوا تھا، لیکن خود مسلمانوں کے اندر جو فرقِ باطلہ پیدا ہوئے، ان کے بارے میں ایمان وکفر کا فیصلہ کرنا بہت بڑے علم اور غور وخوض کا محتاج تھا، اس لئے حق تعالیٰ کی مشیت نے اس دورِ تلبیس میں حضرت شاہ صاحبؒ سے اس کام کو لیا، جنھوں نے تمام علماءِ سلف وخلف کی گراں قدر تصریحات وفیصلوں کی روشنی میں ایک جامع ومکمل رسالہ ''اکفار الملحدین'' لکھا یہ رسالہ آپ نے بہ زمانہ صدارت تدریس دارالعلوم دیوبند ۱۳۴۳ھ میں ایک استفتاء کے جواب میں چند ہفتوں کے اندر تالیف فرمایا تھا، اور یہ اُسی زمانہ میں اکابرِ دیوبند کی تقاریظ کے ساتھ شائع بھی ہوگیا تھا۔

حدیث الباب کے مالہ وماعلیہ اور مسئلہ ایمان وکفر کو پوری طرح سمجھنے کے لئے تو اس پورے رسالہ کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے اور اساتذۂ دورۂ حدیث کو خاص طور سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، ہم یہاں اس کا صرف ضروری خلاصہ پیش کردینا کافی سمجھتے ہیں، واللہ المفید:۔

(۱) ایمان وکفر کی کلیدی حقیقت پوری طرح سمجھنے کیلئے ہمارے پاس صحاح کی مشہور حدیث ہے جس کو بخاریؒ ومسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور مسلم شریف کے الفاظ کا ترجمہ بروایت ابو ہریرہؓ یہ ہے:۔رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ مجھے اس وقت تک لوگوں سے جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ لوگ خدا کی توحید اور میری رسالت کی شہادت نہ دیں اور جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس تمام کو نہ مان لیں، جب وہ اس کو اختیار کرلیں گے تو ان کو مسلمانوں کی طرح احکام شریعت کے مطابق جان ومال کی امان حاصل ہوجائے گی، بجز اسلامی ضابطہ کے ماتحت باز پرس کے کہ وہ سب سے برابر ہوگی، باقی ان کے دلوں اور باطن کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، وہی جانتا ہے کہ وہ دل سے ایمان لائے ہیں یا نہیں (مسلم مع نووی ۳۷/۱ کتاب الایمان)

محقق عینیؒ نے لکھا کہ یہ روایتِ ابی ہریرہ بخاری میں بھی ہے (عمدہ ۲۰۹/۱) صاحبِ تحفہ نے شرح ترمذی میں لکھا:۔وفی روایۃ للبخاری حتی یشھدواان لاالہ الا اللہ ویو منوابی وبماجئت بہ وکذافی روایۃالمسلم (تحفۃالاحوذی ۴۵۰/۳)

دوسری روایتِ ابی ہریرہؓ مسلم میں اسی طرح ہے:۔حضور علیہ السلام نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ اس امت کا جو شخص بھی خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی میری بعثت کی خبر سن کر میری نبوت اور ان سب چیزوں پر ایمان لائے بغیر مرجائے گا جو میں لے کر آیا ہوں وہ جہنمی ہے (مسلم مع نووی ۸۶/۱ کتاب الایمان)

تیسری روایت حضرت ابن عمرؓ ہی سے یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ مجھے حکم دیا گیا ہے لوگوں سے جدال وقتال جاری رکھو تا آنکہ وہ خدا کی توحید اور میری رسالت پر ایمان لائیں اور نماز قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں الخ (بخاری ص ۸ ومسلم وغیرہ)

ایک روایت حضرت ابن عمرؓ ہی سے یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔تم میں سے کوئی شخص باایمان نہیں ہوسکتا جب تک اس کی تمام خواہشات ان سب امور کے تابع وموافق نہ ہوجائیں جو میں لایا ہوں (شرح السنہ وصححہ النووی)

معلوم ہوا کہ ہر مومن کے لئے پورے دین اور ضروریاتِ دین کی تسلیم وانقیاد ضروری ہے، کچھ کو ماننا اور کچھ کو نہ ماننا یا بعض باتوں پر عمل کرنا اور باقی چھوڑ دینا تکمیلِ ایمان ودین کے خلاف ہے، چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔میرے سارے امتی جنت میں جائیں گے، مگر جو انکار کرے، صحابہؓ نے پوچھا، وہ کون ہے؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی، اس نے مجھے نہ مانا اور میرا انکار کیا۔

ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ پورے دین کو ماننا اور ان سب باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے، جن کا قابلِ اعتماد ثبوت رسول اکرم ﷺ کے اقوال وافعال سے ملتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس قابلِ اعتماد ثبوت کے ذرائع ووسائل کی پوری تفصیل ووضاحت فرمائی ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔

(۲) مومن وکافر کے فرق کی عملی وضاحت اس عظیم واقعہ سے بخوبی ہوجاتی ہے جو رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد متصلاً ہی دورِ خلافت صدیقی میں پیش آیا، اور حضرت صدیق اکبرؓ نے متبعین نبوتِ کاذبہ اور مانعینِ زکوٰۃ سے قتال وجہاد کیا، یہ واقعہ اجمال وتفصیل کے ساتھ متعدد صحابہ کرام سے کتبِ صحاح میں نقل ہوا ہے، یہاں ہم اس سے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر کا ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں۔فرمایا:۔

اُس وقت اہل عرب میں سے جنھوں نے کفر وارتداد اختیار کیا وہ چار فرقے تھے۔

(۱) جنھوں نے مسیلمہ کذاب کے دعوائے نبوت کی تصدیق کی یا اسود عنسی کے ساتھ لگ گئے، یہ سب لوگ حضور ﷺ کی نبوت وختم نبوت

کے منکر ہوکر دوسرے مدعیانِ نبوت کے متبع ہوگئے تھے، لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مقابلہ میں لشکر آرائی کی اور مسیلمہ کو یمامہ میں اور عنسی کو صنعاء یمامہ میں مع ان دونوں کے متبعین کے قتل کرایا، اکثر ہلاک ہوگئے، کچھ فرار ہوئے، ان کی اجتماعی قوت ختم ہوئی اور زور ٹوٹ گیا۔

(۲) وہ لوگ تھے جو دین سے پھر گئے، شریعتوں کا انکار کیا، نماز، زکوٰۃ وغیرہ امورِ دین سے منحرف ہوکر جاہلیت کی طرف لوٹ گئے، جس پر وہ پہلے سے تھے، اس فرقہ کے لوگ بہت کم تعداد میں تھے، اور ان کی خود ہی کوئی اجتماعی قوت وزور نہ تھا، (شاید اسی لئے ان کے ساتھ کوئی نمایاں صورت مقاتلہ وجہاد کی پیش نہیں آئی ہے کہ اس کا ذکر وتذکرہ کیا جاتا)

(۳) وہ لوگ تھے جنھوں نے نماز وزکوٰۃ میں تفریق کی، یعنی نماز کا اقرار کیا اور فرضیتِ زکوٰۃ کا انکار کیا۔

(۴) وہ تھے جنھوں نے تفریق مذکور تو نہیں کی، نہ اُن دونوں کی فرضیت سے انکار کیا، لیکن امام وقت اور نائب رسول وخلیفہ اوّل حضرت صدیق اکبرؓ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کرنے کے وجوب سے انکار، اور کہا کہ قرآن مجید میں حضور اکرم ﷺ ہی کو حکم تھا کہ لوگوں کی زکوٰۃ وصول کریں، ان کے بعد کسی کو لینے کا حق نہیں، نہ ہم اس کو دیں گے، ان دونوں فرقوں نے تاویل باطل کی راہ اختیار کی تھی، اور صرف ان ہی دونوں کے بارے میں حضرت صدیق اکبرؓ وحضرت عمرؓ کا مناظرہ ومکالمہ پیش آیا ہے، جس کا ذکر کتبِ صحاح وسیر میں آتا ہے۔

اس مناظرہ میں حضرتِ صدیق اکبرؓ نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کے ذریعہ استدلال کیا اور حضرتِ فاروقؓ نے عموم حدیث سے استدلال فرمایا ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ بھی موجبِ عام کو قطعی سمجھتے تھے (جو حنفیہ[1] کا مسلک ہے) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ بخاری وغیرہ کی مذکورہ حدیثِ ابن عمرؓ (نماز وزکوٰۃ والی) اور بخاری ومسلم کی حدیث ابی ہریرہ (جس میں رسول اکرم ﷺ کی لائی ہوئی سب چیزوں پر ایمان لانا ضروری اور نہ ماننے والوں کو کافر سمجھ کر ان سے مقاتلہ کو فرض قرار دیا ہے) یہ دونوں حدیثیں حضرتِ صدیق، حضرت فاروق اعظمؓ کے علم میں نہ تھیں، ورنہ حضرتِ عمرؓ کو حجت وبحث کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور حضرت ابوبکرؓ جانتے تو وہ بھی الا بحقہ کے عموم سے استدلال کرنے یا قیاس سے حجت پکڑنے کی بجائے ان ہی دونوں حدیثوں کو پیش کردیتے، اگرچہ احتمال اس امر کا بھی موجود ہے کہ باوجود واقف ہونے کے اس وقت ان کا استحضار نہ رہا ہو، یا بجائے دلیل[2] نقلی کے دلیل نظری ہی سے استدلال کرنا زیادہ موزوں ومناسب خیال کیا ہو (انوار المحمود ۱/۴۶۵)

یہ مضمون تھوڑے فرق کے ساتھ عمدۃ القاری ۱۱/۲۳۳ اور فتح الباری ۱۲/۲۲۴ - اور ۱۲/۲۲۵ میں بھی مذکور ہے فتح الباری میں قاضی عیاض سے اہل ردّہ کی تین قسم نقل کی ہیں اور ابن حزم کی ملل ونحل سے چار اقسام، جن میں یہ تفصیل ہے کہ جمہور اور اکثریت اہل عرب کی تو بدستور اپنے مکمل اسلام پر رہی جس طرح حضور علیہ السلام کی زندگی میں تھے، ان سے کم وہ تھے جو اسلام کی اور سب باتوں کو مانتے تھے، بجز زکوٰۃ کے، اور یہ تاویل کرتے تھے کہ زکوٰۃ کا دینا صرف حضور علیہ السلام کے ساتھ خاص تھا۔ کہ وہ سببِ تطہیر تھے، اور ان کی نماز بھی

---

[1] حنفیہ کے یہاں مُوجبِ عام قطعی ہے، اس لئے عام کتاب اللہ کی تخصیص خبر واحد یا قیاس سے جائز نہیں سمجھتے، شافعیہ کے نزدیک عام کتاب اللہ ظنی ہے اور وہ اس کی تخصیص خبر واحد اور قیاس دونوں سے جائز کہتے ہیں۔

اس کی پوری بحث کتبِ اصول فقہ میں ہے اور توضیح تلویح ۱۰۶ مطبوعہ نول کشور مع حاشیہ توشیح دیکھی جائے جو لوگ حنفیہ کو اہل الرائے کا طعنہ دیتے ہیں کیا وہ اب بھی حنفیہ کے مقابلہ میں شافعیہ کو اہل حدیث اور غیر اہل الرائے ہی کہیں گے؟ ''مؤلف''!

[2] معلوم ہوا کہ جس کا قلب ودماغ علوم نبوت سے منور ہوچکا ہے ان کی روشنی میں اگر وہ کسی امر کی حقیت پر مطلع ہوجائے تو اس کے لئے صرف دلیل نظری پیش کرنے پر اکتفا کرنا بھی درست ہے جیسے حضرت صدیقؓ نے کیا اور ہمارے نزدیک یہی شان حضرتِ امام اعظم کی بھی تھی جنھوں نے علوم نبوت کی روشنی میں اپنی شوریٰ مجلسِ علمی میں بارہ لاکھ سے زیادہ مسائل کے شرعی فیصلے کرائے، جن میں سے بہت سے مسائل کے صرف نظری دلائل ہمارے سامنے آسکے، اگرچہ وہ سب ہی مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ تھے واللہ تعالیٰ اعلم! ''مؤلف''

وجہِ سکینت تھی، جب یہ دونوں وصف دوسروں کے لئے نہیں تو وہ زکوٰۃ بھی نہیں لے سکتے، تیسرا ان سے کم تعداد میں وہ گروہ تھا جس نے کھلا کفروردۃ اختیار کرلی تھی جیسے طلیحہ وسجاح وغیرہ مدعیانِ نبوت کے متبعین، چوتھا گروہ ایسے لوگوں کا تھا جو متردد تھے، اور منتظر تھے کہ غلبہ جس طرف ہوگا ان کے ساتھ ہو جائیں گے، حضرت ابوبکرؓ نے ان سب گمراہ لوگوں کی سرکوبی کے لئے لشکر روانہ کئے، اور فیروز کے لشکر نے اسود کے شہروں پر غلبہ کر کے اس کو قتل کیا، مسیلمہ کو یمامہ میں قتل کیا گیا، طلیحہ وسجاح اسلام کی طرف لوٹ آئے، اور اکثر مرتدین نے پھر سے اسلام قبول کرلیا، اس کے بعد ایک سال نہیں گزرا کہ سب ہی مرتدین دین اسلام میں واپس آگئے، وللہ الحمد (فتح ۱۲/۲۲۴)!

فتح الباری ۱۲/۲۲۵ میں روافض کا بخاری کی حدیث پر اعتراض اور علامہ خطابی کا جواب پھر حافظ کا نقد ونظر بھی لائق مطالعہ ہے۔

افاداتِ عینی! محقق عینیؒ نے عنوانِ استنباط الاحکام کے تحت ۱۲ فوائد قیمہ تحریر کئے، جن میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) علامہ نوویؒ نے لکھا کہ جو بھی واجباتِ اسلام، کم یا زیادہ کا انکار کرے ان سے قتال کرنا واجب ہے اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ ایک بستی کے لوگ اگر ترکِ اذان پر اتفاق کرلیں تو امام وقت کو ان سے قتال کرنا چاہیے اور یہی حکم تمام شعائرِ اسلام کا ہے (۲) نجات اخروی کے لئے پختہ اعتقاد کافی ہے، دلائل و براہین کا جاننا واجب و شرط نہیں (۳) اہل شہادت میں سے اہل بدعت کی تکفیر درست نہیں (۴) مناظرہ کی کیفیت مذکورہ حدیث سے زیادہ ظاہر ہے یہی ہے کہ حضرتِ صدیقؓ، حضرتِ فاروقؓ اور دوسرے صحابہ حاضرینِ مجلسِ مناظرہ حدیث ابن عمرؓ سے واقف نہ تھے، اور اس میں کوئی استبعاد بھی نہیں ہے کہ ایک مدت تک کوئی حدیث بعض اکابرِ صحابہ سے بھی مخفی رہی ہو اور دوسرے درجہ کے صحابہ اس کو جانتے ہوں، جیسے جزیہ مجوس اور طاعون والی حدیثیں بہت سے صحابہ پر ایک مدت تک مخفی رہیں (عمدہ ۱/۲۱۱)!

علمی لطیفہ! عنوان بیانِ لغات کے تحت علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حافظ ابن حجر نے (فتح ۵۸/ اعصموا کی تحقیق میں) عصمۃ کو عصام سے ماخوذ بتلایا ہے کہ اصل العصمۃ من العصام کہا اعصام اس دھاگے کو کہتے ہیں، جس سے مشکیزہ کا منہ باندھتے ہیں۔

حالانکہ معاملہ برعکس ہے یعنی عصام مشتق ہے عصمۃ سے نہ کہ برعکس، کیونکہ مصادر مشتق منہا ہوا کرتے ہیں، مشتق نہیں لہٰذا ان کو مشتق قرار دینا علم الاشتقاق سے بڑی ناواقفیت کی دلیل ہے (عمدہ ۱/۲۱۰)!

اہل قبلہ کی تکفیر کا مسئلہ

امام بخاریؒ نے یہاں باب فضل استقبال القبلة کے تحت جو احادیث حضرت انسؓ سے نقل فرمائی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ جو بھی توحید کی شہادت دے، اور ہمارے قبلہ کا استقبال کرے، ہماری طرح نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے وہ خدا کی پناہ اور ذمہ داری میں آگیا، لہٰذا خدا کی پناہ میں کوئی خلل اندازی نہ کرو، سب کا فرض ہے کہ اس کے جان و مال کی حرمت سمجھ کر اس کی حفاظت کریں بجز اس کے کہ وہ خود ہی اپنے کو قصاص وغیرہ کسی مواخذہ میں مبتلا کرلے، وغیرہ۔

ان احادیث سے ایک اصولی مسئلہ یہ سمجھا گیا کہ کسی اہل قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ان تین باتوں کے ساتھ اس کے عقائد و اعمال کیسے ہی خلافِ حق اور قرآن وحدیث کے مخالف ہوں، وہ اہل قبلہ ہی باقی رہے گا کیونکہ ان احادیث میں بھی شہادتِ توحید وغیرہ سے اشارہ اس طرف موجود ہے کہ بہ لحاظِ عقیدہ مقتضیاتِ شہادتِ توحید کے خلاف کوئی امر اس سے صادر نہ ہوا ہو اور بہ لحاظِ عمل قبلہ و ذبیحہ کے بارے میں اس نے عامہ مسلمین سے الگ طریقہ اختیار نہ کیا ہو،

سب جانتے ہیں کہ بہت سی احادیث میں صرف توحید سے تمام ایمانیات وعقائد مراد لئے گئے ہیں جیسے من قال لا اله الا الله دخل الجنة اور مسلم وغیرہ سے یہاں بھی ہم ذکر کر آئے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ان تمام چیزوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا جو آپ

لے کر آئے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو شخص ہمارے ذبیحہ سے پرہیز کرے گا، وہ ضرور ہمارے عقائد سے مختلف عقیدہ رکھتا ہوگا، یا جو شخص ہمارے ساتھ یا ہمارے امام کے پیچھے اپنی نماز جائز نہ سمجھے گا[1]، وہ ہم سے مخالف عقائد والا ہوگا۔

ایک مغالطہ کا ازالہ! بعض لوگوں کو قلتِ علم ونظر کے باعث یہ مغالطہ ہوا ہے کہ اہل قبلہ اور اہل تاویل کی تکفیر درست نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے رسالہ اکفار الملحدین میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے، جس کے بعد کسی بھی اہل علم ونظر کے لئے مسئلہ مذکورہ کی صحیح پوزیشن سمجھنے میں دقت پیش نہیں آسکتی، حضرتؒ نے فرمایا کہ ممانعتِ تکفیر اہل قبلہ کا اصل ماخذ سنن ابی داؤد کی یہ حدیث ہے کہ تین چیزیں اصل ایمان ہیں (۱) لا الہ الا اللہ کا اقرار کرنے والے کے جان ومال پر دست درازی نہ کرنا (۲) کسی گناہ کے ارتکاب کی بنا پر اس کو کافر نہ کہنا (۳) کسی عمل کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج نہ سمجھنا الخ (ابوداؤد **باب فی الغز ومع ائمة الجور . کتاب الجهاد** ۱/۳۴۲)

اس حدیث سے دو باتیں خاص معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ کسی گناہ کے ارتکاب کے باعث ایک مسلمان کو کافر یا اسلام سے خارج نہ سمجھا جائے گا، دوسری یہ کہ ارشاد مذکور کا زیادہ تعلق ائمہ جور سے ہے، اسی لئے مذکورہ تین باتوں کے ذکر کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جہاد کا حکم یہ میری بعثت سے دجال کے قتال تک ضرور جاری رہے گا، خواہ ائمہ عدل کے ساتھ ہو کر کیا جائے یا ائمہ جور کے ساتھ ہو کر کرنا پڑے، اس لئے امام ابوداؤدؒ اس حدیث کو عنوانِ مذکور کے تحت لائے ہیں، اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے بھی یہ ہے کہ عدم تکفیر اہل قبلہ کا تعلق دراصل امراء اور حکمرانوں سے ہے کہ ان کی پوری اطاعت ضروری ہے اور جب تک ان سے کھلا ہوا کفر ایسا نہ دیکھ لیا جائے کہ اس کے کفر ہونے پر قرآن وحدیث کی روشنی میں دلیل وبرہان موجود ہو، ان کے خلاف بغاوت کرنا جائز نہیں، جیسا کہ بخاری ومسلم کی احادیث میں مروی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کا کھلا ہوا کفر اگر کسی میں دیکھ لیا جائے تو پھر اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اُس کو قائل کر کے لاجواب بھی کر دیا جائے، یا اس کے کھلے ہوئے قولی یا فعلی کفر وشرک کی اس سے تاویل معلوم کی جائے (کیونکہ اس کے معاملہ کو اُن دیکھنے والے اہل علم ونظر کے فیصلہ ورائے پر محول کر دیا گیا ہے، جن کی نظر قرآن وحدیث کے دلائل وبراہین پر حاوی ہو) کسی گناہ کی وجہ سے عدم تکفیر کی بات امام ترمذیؒ نے ابواب الایمان میں **باب لایزنی الزانی وهو مومن** کے تحت اختیار کی ہے جس کا حوالہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اکفار۵ کے حاشیہ میں دیا ہے۔

حضرتؒ نے اس مغالطہ کو بھی رفع کیا کہ بہت سے جاہلوں نے امام اعظم کی طرف بھی عدم تکفیر اہل قبلہ کی بات مطلقاً منسوب کر دی ہے حالانکہ محقق ابن امیر الحاج نے شرح تحریر ۳/۳۱۸ میں امام صاحب کا قول بھی **و لا نکفر اهل القبلة بذنب** نقل کیا ہے اور ان کا یہ ارشاد حسبِ تحقیق علامہ نوح آفندیؒ صرف معتزلہ اور خوارج کی تردید کے لئے ہے (کہ خوارج گناہ کبیرہ کی وجہ سے مسلمان کو کافر کہتے ہیں اور معتزلہ اس کو ایمان سے خارج اور مخلد فی النار قرار دیتے ہیں، لیکن ہم اہل السنّت والجماعت نہ اس کو گناہِ کبیرہ کے باعث کافر کہتے ہیں نہ اسلام سے خارج اور مخلد فی النار، بلکہ مسلمان اور لائق مغفرت مانتے ہیں) امام صاحب کی طرف غلط بات اس لئے بھی منسوب ہوگئی کہ سب نے آپ کا قول منتقی کے حوالہ سے بغیر بذنب کے نقل کیا ہے، مثلاً شرح مقاصد ۲۶۹ اور مسایرہ ۲۱۴ میں وغیرہا حالانکہ بذنب کی قید موجود تھی، اور اسی لئے حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اپنی کتاب الایمان ۱۲۱ میں لکھا کہ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت اس امر پر متفق ہیں کہ گناہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر نہ کہا جائے تو اس گناہ سے مراد، زنا، شراب خوری وغیرہ معاصی ہوتے ہیں، علامہ نوویؒ نے بھی شرح عقیدہ طحاویہ

---

[1] مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی نے فتاویٰ احمدیہ جلد اوّل ۱۸ میں اپنے ایک متبع کو لکھا:۔ کسی شخص کے پیچھے بھی جو ہم پر ایمان نہیں لایا، نماز نہ پڑھو، تمہارا فرض ہے کہ اُس امام کو ہمارے حالات سے واقف کرو، پھر اگر تصدیق کرے (میری نبوت وغیرہ کی) تو بہتر، ورنہ اس کے پیچھے اپنی نماز ضائع مت کرو، اور اگر کوئی خاموش رہے کہ نہ تصدیق کرے نہ تکذیب تو وہ منافق ہے اس کے پیچھے بھی نماز نہ پڑھو (بحوالہ اکفار الملحدین (عربی) ۱۱۱) "**الیوم اکملت لکم دینکم**" کے بعد کسی بھی نئے عقیدہ یا عمل کو صحتِ نماز وامامت کے لئے فرض وضروری قرار دینا اس امر کی صریح شہادت ہے کہ اس کا دین ومذہب سب مسلمانوں سے الگ ہے، اور علمائے امت نے لکھا ہے کہ کسی کے کافر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو کافر کہتا یا سمجھتا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم!" مؤلف"

میں ۲۴۶ پر اس کی پوری طرح وضاحت کی ہے۔ اور لکھا کہ بذنب کی قید بتارہی ہے کہ فسادِ عقیدہ کی بنا پر ضرور کافر کہا جائے گا، (نقلہ الملا علی قاریؒ فی شرح الفقہ الا کبر ۱۹۶)

فسادِ عقیدہ کے سبب تکفیر

امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابو یوسف و امام محمدؒ سے مروی ہے کہ جو شخص قرآن کو مخلوق کہے وہ کافر ہے (شرح فقہ اکبر ۳۰)

جو شخص رسول اکرم ﷺ کے لئے بُرے الفاظ کہے یا آپ کو جھوٹا کہے یا کسی قسم کی بھی توہین کرے وہ کافر ہے اور اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی (کتاب الخراج امام ابو یوسفؒ ۱۸۲)

حضرت رسول اکرم ﷺ پر سب وشتم کرنے والا کافر ہے اور جو کوئی اس کے کافر ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر ہے، اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ (شفاء قاضی عیاض)

انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کو بھی سب وشتم کرنے والا کافر ہے، جس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی، اور جو شخص ایسے شخص کے کافر ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر ہے (مجمع الانہر، درمختار، بزازیہ، درر، خیریہ)

مواقف میں ہے کہ اہل قبلہ میں سے صرف اسی قول وفعل پر تکفیر کی جائے گی، جس میں ایسے امر کا انکار پایا جائے، جس کا رسول اللہ محمد ﷺ سے ثبوت یقینی طور پر ہو چکا ہو، یا وہ امر مجمع علیہ ہو، حدیث من صلے صلاتنا سے بھی یہی مراد ہے کہ تمام دین کو مانتا ہو اور کسی بھی موجبِ کفر عقیدہ اور قول وفعل کا مرتکب نہ ہو نہ یہ کہ جو شخص بھی یہ تین کام کرے وہ مسلمان ہے خواہ کیسے ہی کفریہ عقائد واعمال کا مرتکب ہو (شرح فقہ اکبر ۱۹۵)

وہ شخص بھی کافر ہے جو ہمارے نبی اکرم ﷺ کے بعد اپنے لئے نبوت کا دعویٰ کرے یا جو آپ کے سوا کسی جدید مدعیِ نبوت کی تصدیق کرے کیونکہ آپ بہ نصِ قرآن وحدیث خاتم النبیین اور آخری پیغمبر تھے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آخری زمانہ میں آسمان سے اُتریں گے، وہ چونکہ پہلے ہی نبی ہیں اس لئے اعتراض نہیں ہوسکتا، دوسرے وہ خود بھی ایک امتی کی طرح قرآنی شریعت کا ہی اتباع کریں گے۔)

چونکہ صریح اور مجمع علیہ نصوص میں تاویل وتحریف یقینی طور پر موجبِ تکفیر ہے، اس لئے وہ شخص بھی کافر ہوگا جو ایسی تاویل وتحریف والے کو کافر نہ کہے یا اس میں توقف وتردد کرے، کیونکہ یہ شخص ایک مسلّم کافر کو کافر کہنے کی مخالفت کر کے خود بھی اسلام کی مخالفت کرتا ہے، جو دین پر کھلا ہوا طعن اور اس کی تکذیب ہے (شرح الشفاء للخفاجی والملا علی قاریؒ)

جو شخص اس بات کو نہ جانتا ہو کہ حضرت مولانا سیّدنا محمد ﷺ آخری نبی ہیں، وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ امر ضروریات میں سے ہے (الاشباہ والنظائر) واضح ہو کہ بابِ مکفرات میں ضروریات سے لاعلمی[1] عذر نہیں ہے۔

اِس امر پر امت کا اجماع ہو چکا ہے کہ جن امور کا حضور ﷺ سے ثبوت بطور اجماع ہم تک پہنچ گیا، ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی موجبِ کفر ہے، اسی طرح جو کوئی حضور علیہ السلام کے بعد کسی کو نبی مانے یا آپ کے کسی ثابت شدہ کو نہ مانے وہ کافر ہے (الفصل لابن حزم

---

[1] آج کل بہت سے نوجوان مسلمان عقائدِ اسلامی اور ضروریاتِ دین سے ناواقفیت کی وجہ سے جنت دوزخ وغیرہ کے وجود سے انکار کر دیتے ہیں، وہ کفر کی حد میں داخل ہو جاتے ہیں اور ناواقفیت عذر نہیں ہے، کیونکہ سارے قطعی امورِ اسلام کا جاننا اور ماننا فرض وضروری ہے، حضرت تھانویؒ نے اپنی تفسیر بیان القرآن ۳/۷، ۲/۴۶ و ۲/۷ میں پوری تفصیل سے لکھا ہے کہ صحتِ نکاح کے لئے مرد وعورت کے کن کن عقائد کی درستی ضروری ہے اور لکھا کہ جو مرد ظاہری حالت سے مسلمان سمجھا جائے لیکن اسکے عقائد کفر تک پہنچے ہوں، تو اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں اور اگر نکاح ہو جانے کے بعد ایسے عقائد ہو جائیں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔

لہٰذا پیغام آنے کے وقت لڑکی والوں پر واجب ہے کہ اوّل عقائد کی تحقیق کر لیا کریں، جب اس طرف سے اطمینان حاصل ہو تب اس پیغام کو قبول کریں ورنہ نہیں، اور اگر پہلے سے معلوم نہ ہوا اور بعد کو خرابی کا علم ہو تو نکاح کے بعد تعلق ختم کرا دیں، یہ سرپرستوں کا فرض ہے، اور منکوحہ لڑکی کو بھی چاہیے کہ وہ علیحدگی اختیار کرے۔

(۳/۲۵۵) جو شخص بھی کسی قطعی حکم شرعی کا انکار کرتا ہے وہ اپنی زبان سے کہے ہوئے اقرار لا الہ الا اللہ کی تردید کرتا ہے (سیر کبیر للامام محمدؒ ۲/۲۶۵ ۴)

نہ صرف ضروریاتِ دین کی تاویل یا انکار کفر ہے بلکہ حنفیہ کے نزدیک ہر قطعی الثبوت امر کا انکار بھی کفر ہے اگرچہ وہ ضروریاتِ دین میں سے نہ بھی ہو (رد المختار ۳/۲۸۴، مسایرہ ۲۰۸)

ضروریاتِ اور قطعیات میں کوئی بھی تاویل مسموع نہیں اور تاویل کرنے والا کافر ہوگا۔ (کلیات ابی البقاء ۵۵۳) ضروریاتِ دین میں تاویل کفر سے نہیں بچا سکتی (عبدالحکیم سیالکوٹی علی الخیالی، اور خیالی میں بھی اسی طرح ہے)

فرقہ اہلِ بدعت اہلِ قبلہ میں داخل ہے اس کی تکفیر میں اس وقت تک جرات نہ کی جائے جب تک وہ ضروریاتِ دینیہ کا انکار نہ کریں، اور متواتراتِ احکام شرعیہ کو رد نہ کریں، اور ان امور کو قبول کرنے سے انکار نہ کریں جن کا دین سے ہونا یقینی (اور بدیہی وضروری) طور پر معلوم ہے (مکتوباتِ امام ربانیؒ ۳/۳۸ و ۸/۹۰)

جو شخص یمامہ والوں کے حق میں تاویل کر کے اُن کو مسلمان ثابت کرے وہ کافر ہے اور جو شخص کسی قطعی اور یقینی کافر کو کافر نہ کہے وہ بھی کافر ہے (منہاج السنہ للحافظ ابن تیمیہؒ ۲/۲۳۰)

ایک مغالطہ کا ازالہ! فقہاء نے ایسے شخص کو مسلمان ہی کہا ہے جس کے کلام میں ۹۹ وجہ کفر کی موجود ہوں اور صرف ایک وجہ اسلام کی، اس کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ حکم عام نہیں ہے، بلکہ اس وقت ہے کہ قائل کا صرف ایک کلام مفتی کے سامنے آئے اور اس کا کوئی دوسرا حال معلوم نہ ہو تو مفتی کو معاملہ تکفیر میں احتیاط کرنی چاہیے لیکن اگر کسی شخص کا یہی یا اس جیسا دوسرا کلمہ کفر اس کی تحریروں میں موجود ہو، جس سے یقین ہو جائے کہ معنی کفری ہی مراد لیتا ہے یا وہ خود اپنے کلام میں معنی کفری کی تصریح کر دے تو باجماعِ فقہاء ایسے شخص پر کفر کا حکم لگایا جائے گا، اور اس کو مسلمان ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

خلاصہ! (۱) عدم تکفیر اہل قبلہ کا حکم غیر ضروریاتِ دین وغیر امور قطعی الثبوت سے متعلق ہے (۲) حکم عدم تکفیر اہلِ قبلہ کا تعلق امراء وحکمرانوں سے ہے (۳) حکم مذکور کا تعلق ذنوب کے ساتھ ہے نہ کہ عقائد وایمانیات کے ساتھ۔

ہم نے اکفار الملحدین کے مضامین کا خلاصہ اوپر پیش کر دیا ہے باقی علماء اور اہل تحقیق ونظر کو پوری کتاب ہی کا مطالعہ کرنا چاہیے، ورنہ دور سے شاید وہ بھی یہی خیال کریں کہ "دار التکفیر" والوں نے یوں ہی بے تحقیق کچھ لکھ پڑھ دیا ہوگا۔ "والناس اعداء ماجهلوا"

مسئلہ حیات ونزولِ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام

یہ مسئلہ بھی ضروریاتِ دین اور متواترات سے متعلق ہے، اس لئے ایمان کا جزوِ اعظم ہے، شروع سے آج تک کتبِ عقائد میں اس کو بڑی اہمیت سے ذکر کیا گیا، اور خاص طور سے امام مسلم نے تو نزول عیسیٰ علیہ السلام کو ابوابِ ایمان کا جزو قرار دیا ہے، پھر یہ کہنا کتنی کم علمی کا اظہار ہے کہ نزول مسیح علیہ السلام کا مسئلہ چونکہ ایک جزئی مسئلہ ہے اس لئے اس کو عقائد وایمانیات کا درجہ حاصل نہیں تقریباً ۳۵ سال پہلے کی بات ہے کہ انقلاب لاہور میں مولانا آزاد کا ایک خط کسی مستفسر کے جواب میں شائع ہوا تھا، جس میں تھا کہ کوئی مسیح آنے والا نہیں ہے، اس کی فکر میں نہ پڑیں، وغیرہ، احقر نے مولانا سے خط وکتابت کی، وہ اس وقت کلکتہ میں تھے، میں نے لکھا کہ آپ نے ایسی بات کس طرح لکھدی جبکہ یہ مسئلہ عقائد وایمانیات میں داخل ہے، جواب آیا کہ اس عقیدہ سے مسلمانوں میں یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ کچھ نہ کریں اور مسیح آئیں گے جب ہی کچھ فلاح کی صورت ہو سکے گی اور یہ ایمان کا جزو نہیں ہے، احقر نے لکھا کہ بخاری ومسلم اور دوسری کتبِ صحاح میں تو ان کی آمد کو کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، اس لئے اگر مسلمان اُس اچھے وقت کی امید وانتظار کریں تو کیا برائی

ہے؟ اور جب نزولِ مسیح علیہ السلام کا ثبوت احادیثِ متواترہ سے ہے تو اِس پر یقین وایمان یا عقیدہ رکھنا تو خود ہی ضروری ہوگیا، اس پر مولانا نے جواب دیا کہ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ احادیث صحاح میں اس کا ذکر ہے، لیکن وہ بطورِ علامتِ قیامت کے ہے، اس لئے ایمان کا جزو نہیں بنتا، اس کے ساتھ پھر بطورِ طنز کے یہ جملہ بھی ارشاد ہوا کہ میں تو حدیث کو ان لوگوں سے بھی زیادہ مانتا ہوں، جو کسی امام کے قول کی وجہ سے حدیث کو ترک کر دیتے ہیں، گویا یہ جملہ اپنی عدم تقلید کی پختگی اور عصبیّت کا اظہار واعلان تھا، اور ساتھ ہی اس امر کا بھی بیّن ثبوت کہ موصوف کو ائمہ مجتہدین خصوصاً ائمہ حنفیہ کے مدارکِ اجتہاد سے متعلق کوئی بصیرت حاصل نہ تھی، بلکہ اتنے قریب ہوکر علماءِ[1] دیوبند کے مسلکِ اعتدال اور طرزِ تدریس وتحقیق سے بھی ناواقف تھے ورنہ ایسے بے محل جملہ سے ہم لوگوں پر طنز وتعریض کیا ضروری تھی؟ خیر!

---

[1] **گفتنی یا ناگفتنی!** بعض لوگوں کا خیال ہے واللہ تعالیٰ اعلم کہ "تذکرہ" میں بھی حنفیہ اور علمائے دیوبند کے خلاف کافی زہر افشانی ہوچکی تھی، اور شاید مولانا آزاد کے الگ دینی ذہن اور مکتبِ خیال کے پیش نظر ہی لاہور میں علماءِ دیوبند نے ان کی امارت قبول کرنے سے اجتناب کیا تھا، مگر قسمت کی خوبی کہ آزادی کے صدقہ میں وہ امارت کا خواب پورا ہوگیا، اور دارالعلوم دیوبند، جمعیۃ علماءِ ہند اور مسلمانانِ ہند کی سربراہی کے وہ بلاشرکتِ غیرے مالک بن گئے جبکہ دینی ذہن وافتادِ خیال کے لحاظ سے وہ مسلمانانِ ہند کے سوادِ اعظم سے کوئی مطابقت نہ رکھتے تھے، اس کے بعد جو کچھ سامنے آیا وہ سب کو معلوم ہے کہ ان کی سربراہی میں مسلمانوں کا زمینداره بالکلیہ منسوخ ہوا کہ تھوڑی تھوڑی سی آراضی بھی بقدرِ گزارہ ان کے پاس باقی نہ رہ سکیں، حالانکہ انگریزی دور میں موروثی کے قانون کو بھی خلافِ شریعت اور مداخلت فی الدین قرار دیا جاچکا تھا اور موروثی جائیداد کی آمدنی کو علماءِ نے ناجائز وحرام کہا تھا، کشمیر میں باوجود وعدوں کے رائے شماری نہ کرائی گئی، فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف کوئی سخت قدم نہ اٹھایا گیا، اردو کا مسئلہ بھی بدستور الجھا رہا، اور مولانا آزاد ہی نے آزادی کے بعد مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا کہ اپنے مستقل سیاسی زندگی کا وجود ختم کردو، چنانچہ کیرالا ومدارس کے سوا سارے مسلمانوں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا، اور وہ بزدل بن کر سیاسی موت مر گئے جس طرح مولانا نے اپنی تفسیر بیان القرآن ۳۲۰/۱ میں آیت **فقال لھم اللہ موتوا ثم احیاھم** کی تفسیر میں خاص تحقیق فرمائی تھی کہ وہ لوگ بزدلی کے باعث دشمنوں سے مغلوب ہوگئے تھے، یہی ان کی موت تھی، پھر خدا نے عزم وثبات کی روح ان میں پھونک دی جس کی وجہ سے وہ دشمنوں کے مقابلہ پر آمادہ ہوسکے اور فتح مند ہوئے، اور یہی ان کی (گویا سیاسی) زندگی تھی (حقیقی موت یا زندگی مراد نہیں) بات اپنی جگہ درست ہے اور اس کو سب جانتے ہیں خصوصاً مسلمان کہ ان کا مذہب تو بغیر سیاست کے بالکل ہی بے روح ہے مگر اس کو مولانا نے آیتِ مذکور کی تفسیر کے طور پر بے محل پیش کیا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ قصہ اہل اذرعات یا بنی اسرائیل ہی کا کسی قدیم زمانہ کا بیان فرمایا ہے، جن کی تعداد چالیس ہزار تک مروی ہے اور وہ سب طاعون وموت کے ڈر سے اپنے شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں کی طرف نکل گئے تھے، اور وہاں بھی موت سے نہ بچ سکے تھے، پھر ایک مدت کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے خدا نے اپنے فضل وقدرت کا اظہار کرنے کے لئے ان کو پھر سے زندہ کر دیا تھا اور یہ موت وزندگی واقعی اور حقیقی تھی (محض سیاسی نہیں) (جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں بھی ہے جس کو مولانا آزاد بھی معتبر تفاسیر میں شمار کرتے تھے)

مولانا مودودی کی مسامحت: اس مقام پر مولانا مودودی سے بھی بڑی مسامحت ہوگئی کہ اس آیت کا مصداق اُن بنی اسرائیل کو قرار دیدیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکل کر وادی تیہ میں گئے تھے، اور وہاں ان کی ایک نسل ختم ہوگئی اور دوسری نسل اٹھی جس نے کنعانیوں پر غلبہ حاصل کیا، انہوں نے لکھا کہ معلوم ہوتا ہے، اس معاملہ کو حق تعالیٰ نے موت اور دوبارہ زندگی کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے (تفہیم القرآن ۱/۱۸۴)

واضح ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے، وہ ان کا نکلنا بحکم خداوندی تھا، اور اس کو حق تعالیٰ نے بڑی تفصیل سے بطور اظہارِ نعمت کے بیان فرمایا ہے کہ ہم نے تمہیں آلِ فرعون کی غلامی سے نکال کر سمندر کو پھاڑ کر راستہ بنا کر بخیریت گزروایا تھا، اور وہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرق کر دیا تھا۔ (بقرہ آیت ۴۹ و ۵۰)

اور سورۂ یونس آیت ۸۹ و ۹۰ سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ وہارون دونوں نے فرعون اور اس کے لوگوں کے لئے ہلاکت کی دعا کی تھی جو قبول کرلی گئی اور بنی اسرائیل کو سمندر سے گزارا گیا تاکہ پیچھے فرعون اور اس کا لشکر بھی چلے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ مع لشکر کے غرق ہوا، اور سورۂ طٰہٰ آیت ۷۷ میں یہ بات بھی کھول دی تھی کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی تھی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور ان کے لئے سمندر میں سوکھی سڑک بنالے تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ سمندر کے بیچ سے گزرنے ہوئے ڈر لگے، اور سورۂ اعراف آیت ۱۳۶ میں **فانتقمنا منھم** الخ فرمایا کہ تب ہم نے فرعون اور اس کے اتباع کرنے والوں سے انتقام لیا، اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا، کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے غفلت برتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ان کو سزا ہی دینی تھی، جس کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنا ایک ظاہری سبب بن گیا تھا کہ سارے مصر کے بڑے بڑے سردار اعیانِ سلطنت وامراء اور شہزادے، کافر ومشرک عوام سب ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام وبنی اسرائیل کا پیچھا کرنے کو نکل کھڑے ہوئے تاکہ ان کو ملک سے نکال دیں یا ختم کر دیں، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی خدائے تعالیٰ کے وعدہ نصرت پر اطمینان سے نکل کھڑے ہوئے تھے، ان کو کچھ خوف فطری طور پر صرف اس وقت ہوا کہ فرعون اور اس کے لوگ ان کے بالکل قریب ہی پہنچ گئے، اِدھر ان کو گھبراہٹ ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو دلاسا دیا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہاں اس مسئلہ پر مزید روشنی کے لئے ابن عطیہ کا ارشاد قابل ذکر ہے کہ:۔ تمام امت محمدیہ کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اِس وقت آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قربِ قیامت میں بجسمِ عنصری تشریف لانے والے ہیں۔ جیسا کہ متواتر حدیثوں سے ثابت ہے، اور اجماع کے بارے میں، ہم یہاں حافظ ابن تیمیہؒ کا قول پیش کرتے ہیں (جن کو مولانا آزاد بھی اپنا بہت بڑا مقتدا تسلیم کرتے تھے):۔ ''صحابہ کرام کا اجماع قطعی حجت ہے اور اس کا اتباع فرض ہے بلکہ وہ سب سے بڑی حجت اور دوسرے تمام دلائل پر مقدم ہے'' (اقامتہ الدلیل ۱۳۰/۳)

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ابن کثیرؒ نے بھی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نزول پر امت کے اجماع اور تواتر کی تصریح کی ہے (فتح الباری ۳۵۷/۶، تلخیص الحبیر باب الطلاق، تفسیر ابن کثیر ۵۸۲/۱ و ۳۲۱/۳/۱۳۲/۴)

لمحہ فکریہ! حضرت شاہ صاحب علامہ کشمیری، حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمان صاحب، راس المتکلمین علامہ عثمانیؒ وغیرہ کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کہ ہم تو خدا کے حکم سے ادھر آئے ہیں وہ ضرور میری رہنمائی کرے گا، اور اُدھر وحی آگئی کہ سمندر پر اپنا عصا مارو، فوراً ہی سمندر پھٹا، اور پہاڑوں کی دروں کی طرح کا راستہ بن گیا، درمیان سمندر تک فرعون اور اس کے بے شمار ساتھی بھی چلتے رہے، یہاں تک کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کے سارے ساتھی ایک ایک دوسرے کنارے پر عافیت و سلامتی کے ساتھ پہنچ گئے، اور فرعون مع اپنے ساتھیوں کے یک دم ہی سب غرق ہو گئے، کوئی ایک بھی نہ بچ سکا۔

سورۂ شعراء آیت ۵۲ میں مزید وضاحت ہے کہ ہم نے موسٰی علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ، تمہارا پیچھا کیا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ نکلنے کا مقصد سارے فرعونیوں کو بطریق مذکور عذاب الٰہی میں مبتلا کرنا تھا، غرض حضرت موسٰی علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنا وحیِ الٰہی کے تحت اور خاص مقاصد و مصالح کے لئے تھا، اس کا حضرت حزقیل علیہ السلام والے واقعہ سے نہ کوئی جوڑ ہے نہ مناسبت، پھر حضرت موسٰی علیہ السلام مع قوم بنی اسرائیل کے کوہِ طور کے میدان میں جا کر رہے، اور بہت سے احوال و واقعات پیش آئے اور ان سب کے بعد یہ حکم ملا تھا کہ جاؤ! ظالم کنعانیوں کو ارضِ فلسطین سے نکال دو اور اس علاقہ کو فتح کر لو، تو ان بنی اسرائیل نے حضرت موسٰی کے ساتھ ہو کر جہاد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہنے لگے اذهب انت وربك فقاتلا اناههنا قاعدون الآیہ (مائدہ) (آپ اور آپ کا پروردگار جا کر جہاد و قتال کر لیں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں) خیال کیجئے کہ اس قصہ کا جوڑ کس طرح اُس دوسرے قصہ سے لگا دیا اور دونوں کو ایک کر دیا، کیا صرف اس لئے کہ خدا کی حقیقی اماتتہ واحیاء والی بات کو ہم عقلی طور پر سمجھنے سے عاجز ہیں۔

پھر حق تعالیٰ نے تو فرمایا کہ جو لوگ موت کے ڈر سے شہروں کو چھوڑ کر نکلے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے موت دے دی اور پھر ان کو ہی زندہ بھی کر دیا تا کہ وہ اس کے فضل و قدرت کا مشاہدہ کر لیں اور آئندہ بزدلی اور ڈر کو دل سے نکال کر احکام الٰہی کی اطاعت پر کمربستہ ہوں اگر ایک نسل ختم ہوئی اور دوسری پیدا ہوئی تو اس سے خدا کے خاص فضل و قدرت کا مظاہرہ کیا ہوا، یہ تو ہمیشہ ہوتا ہی رہتا ہے خاص بات کیا تھی جس کے سبب یہ قصہ اتنے اہتمام سے بیان کیا گیا اور قصہ مذکور بیان کر کے ان اللہ لذوفضل علی الناس کا جملہ کس لئے ارشاد ہوا؟ سب سے زیادہ یہ کہ فقال لهم الله موتوا ثم احیاهم کا منطوق صاف بتلا رہا ہے کہ جن کو موت دی تھی پھر ان ہی کو زندہ فرمایا، عربیت کا صحیح ذوق رکھنے والا کبھی اس سے ایسا نہیں سمجھ سکتا کہ واقع میں جو ایک نسل خود ہی اپنی عمر طبعی پر ختم ہوئی تھی، اور دوسری نسل عادی طریق پر وجود میں آئی تھی تو پہلی نسل کو تو حق تعالیٰ نے موتوا فرمایا اور دوسری کے وجود عادی کو بغیر کسی وجہ خاص کے فاحیاهم سے تعبیر فرما دیا، درحقیقت جیسا کہ مولانا مودودی نے آگے خود ہی ۲۰۲/۱ حاشیہ ۲۹۷ میں لکھا ہے انبیاء علیہم السلام کو بہت سے امور غیبیہ کے عینی کے مشاہدات کرائے گئے ہیں اور احیاء و اماتتہ کے قرآنی واقعات کا تعلق بھی اسی امر سے ہے اور غالباً انبیاء سابقین کے طفیل میں پہلی امتوں کو بھی اس قسم کے مشاہدات کرائے گئے ہیں جن میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ سب چالیس ہزار آدمی مر گئے اور خدا کے حکم سے پھر زندہ بھی ہو گئے اور انہوں نے خدا کے فضل و قدرت کا عینی مشاہدہ کر لیا۔

اسی طرح سرور انبیاء علیہم السلام کو چونکہ سب سے زیادہ امور غیبیہ اور ملکوت السموات کے علاوہ سدرہ وطوبیٰ، جنت اور عرش تک کے مشاہدات کرائے گئے تو آپ کے طفیل میں امت محمدیہ کے افراد کو بھی بہ کثرت امور غیبیہ کا مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

حضرت تھانویؒ نے لکھا:۔ پہلی امتوں میں سے کسی کا قصہ ہے، طاعون یا جہاد سے بھاگے تھے خدا نے یہ بات دکھلائی کہ موت و حیات سب ہی اس کے قبضہ قدرت میں ہے، چنانچہ ان کو ایک دم سے موت آگئی پھر حق تعالیٰ نے ان کو حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا کے بعد زندہ کر دیا تا کہ بلا سبب موت اور بلا سبب حیات دونوں کا ان کو مشاہدہ ہو جائے، اور فضل سے مراد خواہ خود ان کا زندہ کرنا یا اعتقاد درست کر دینا ہے، یا امتِ محمدیہ کو یہ قصہ سنا کر ان کے عقیدہ و عمل کی اصلاح ہے جو بلاشبہ بڑا فضل ہے یعنی ان کو تلقین کی گئی کہ جہاد وغیرہ سے بسبب خوفِ موت پسپا نہ ہوں اور موت و حیات سب قبضہ الٰہی میں سمجھیں (بیان القرآن ۹۸/۲)

بڑے افسوس کی بات ہے کہ جو بھی تھوڑی بہت قیادت کا مقام حاصل کر لیتا ہے، وہ تفسیر ضرور لکھتا ہے، اور بیسیوں جگہ علمائے سلف اور قدیم مفسرین کے خلاف اپنی لئے رائے پیش کر دیتا ہے، قرآن مجید کو سمجھنے کا ارادہ رکھنے والے کس تفسیر کو درست سمجھیں اور کس کو غلط؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح و صواب کی توفیق بخشے اور غلطیوں کے ارتکاب سے محفوظ کرے۔ آمین! ''مؤلف''

دارالعلوم سے علیحدگی[1] چونکہ خاص سیاسی اسباب ووجوہ کے تحت عمل میں لائی گئی تھی اور دارالعلوم کی تاریخ میں وہ گویا علمی اقدار کی شکست اور سیاسی اقدار کی پہلی فتح تھی، اسی لئے ضروری سمجھا گیا تھا کہ ان حضرات کے علمی اثرات کو بھی ختم کیا جائے اور شاید اسی جذبہ کے تحت مرزائیوں کے بارے میں سوال پر طلبہ کو یہ جواب بھی دیا جاتا ہوگا کہ "**دار التکفیر**" والوں سے جاکر دریافت کرو، یہ **دارا لتکفیر** والے وہ چند اساتذہ تھے جو حضرت شاہ صاحبؒ وغیرہ کے مکتبِ فکر کے پیرو تھے، اسی طرح اگر کوئی استاذِ تفسیر مولانا آزاد کی تفسیر پر درس میں کچھ نقد کرتا تھا، تو اس کو بھی اوپر کے حضرات روکنے کی باتیں کرتے تھے، گویا بلاخوفِ لومۃِ لائم احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے فریضہ کو (جو ہمیشہ سے دارالعلوم کا طرۂ امتیاز رہا تھا) سیاسی مصالح کے تحت نظرانداز کرنے کی ابتداء کردی گئی تھی۔

مولانا آزاد کی تفسیر پر نفحۃ العنبر اور مقدمہ مشکلات القرآن میں کافی نقد آچکا تھا، اور جب مولانا آزاد ۳۸ھ میں جامعہ ڈابھیل گئے تھے تو مشکلات القرآن وغیرہ مطبوعاتِ مجلس علمی وہاں ان کو پیش بھی کردی گئی تھیں، اور اب انوار الباری میں بھی حسبِ ضرورت غلطیوں کی نشان دہی ضرور کی جاتی ہے۔

یہ بھی دارالعلوم ہی سے خوشہ چینی کا فیض ہے کہ ہمیں کچھ کام کرنے کی توفیق ملی، مرزائیوں کی تکفیر کا مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے، ساری دنیا کے علماءِ نے ان کے عقائد معلوم کرنے کے بعد بالاتفاق تکفیر کی ہے، اور اکفار الملحدین میں سارے دلائل اسی سے متعلق ہیں اور کفر وایمان کی حدود کیا ہیں، اسی پر ساری امتِ محمدیہ کے علمائے سلف کے فیصلے پیش کئے ہیں یہ کتاب بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی صدارتِ تدریس دارالعلوم دیوبند کے زمانہ میں مع تقاریظ اکابر دارالعلوم شائع ہوچکی تھی، اس لئے یہ بات کم تکلیف دہ نہیں کہ دارالعلوم کی علمی دنیا میں ایسا انحطاط یکدم آجائے کہ مہماتِ مسائل کی تحقیق اور اہم علمی غلطیوں کی نشان دہی کو طعن وطنز اور تعریض کا نشانہ بنایا جائے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام

آپ کا ذکرِ مبارک قصص القرآن مولفہ حضرت مولانا محمد حفیظ الرحمان صاحبؒ میں تفصیل سے کیا گیا ہے، آپ کا زمانہ نبوت حضرت یوشع علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، اور تفسیر ابن کثیر، روح المعانی، اور تفسیر کبیر وغیرہ میں آیت بقرہ **الم تـر الی الذین خرجوا** کے تحت یہی قصہ زمانہ حضرت حزقیل علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے، جمہور مفسرین کی رائے مذکور سے الگ، ایک قول تابعی مفسر ابن جریج کا یہ بھی ہے کہ یہ کوئی

---

[1] دارالعلوم دیوبند کا انقلاب! ۱۳۴۵ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ وغیرہ اکابر کی علیحدگی کے اسباب ووجوہ تو کافی تفصیل طلب ہیں، جن کو مورخ کا قلم لکھے گا، سب سے زیادہ اہم وجہ وہ تجویز تھی جو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم نے ۴۴ھ میں مجلسِ شوریٰ پر اپنا غیر معمولی اثر ورسوخ استعمال کرکے پاس کرائی کہ (حتی الوسع بشرطِ اہلیت اس خاندان (قاسمی) میں اہتمام کو مرتکز رکھا جائے) اور اس تجویز کو شرعی دلائل سے ماخوذ بھی قرار دیا گیا، حالانکہ یہ تجویز علاوہ خلافت شان دارالعلوم ہونے کے، اسلاف واکابر دارالعلوم کے بلند مطمح نظر اور ان کی ہدایات ووصایا کے بھی مخالف تھی، سب سے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، اور مسجد دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے اس کلمہ حق کا اعلان فرمادیا کہ "مدرسہ وقف ہے ارث نہیں" آپ کی ہمنوائی دوسرے حضرات اکابر واساتذہ نے بھی کی اور سب نے دارالعلوم سے احتجاجاً علیحدگی اختیار کرلی، کیونکہ مہتمم صاحب تجویز مذکور کو بدلنے یا دوسری مطلوبہ اصلاحات کے نفاذ کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوسکے، اور اس کے مقابلہ میں انہوں نے ان سب اکابر اور بہت سے اساتذہ کی علیحدگی کو ترجیح دی، بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں (جن کے وہ ہمیشہ بہت ہی مدح رہے تھے) یہ بھی کہہ دیا کہ، شاہ صاحب کو دارالعلوم کی ضرورت ہے، دارالعلوم کو شاہ صاحب کی کوئی ضرورت نہیں، دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں، مگر بظاہر ناقدری کی اتنی بڑی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی، پھر پہلی بات تو غلط ہی ثابت ہوئی، کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ تازندگی مہتمم صاحب کے دارالعلوم کی طرف محتاج نہ ہوئے، البتہ دوسری ایک حد تک درست ہوگئی کہ دارالعلوم کو شاہ صاحب ایسا "چلتا پھرتا کتب خانہ" پھر میسر نہ ہوا، اور نہ شاید اس کو اس کو ضرورت پیش آئی۔

ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ افسوس صد افسوس ع جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی۔

راقم الحروف نے ان حضرات نفوس قدسیہ کی علیحدگی کے بعد بھی چند ماہ دارالعلوم میں گزارے، اور دورہ کا سال پورا کیا تھا، سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ تحریکِ اصلاح کو افساد کا نام دیا گیا، اور مخلصین کو اصحابِ غرض ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، یعنی ع خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنون کا خرد "مؤلف"

واقعہ نہیں بلکہ صرف تمثیل کی صورت ہے لیکن ہمارے علم میں سلف میں سے یہ کسی نے بھی نہیں لکھا کہ یہ واقعہ وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام و بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنے کا ہے، بظاہر یہ سب سے پہلی مولانا مودودی صاحب ہی کی دماغی اختراح ہے اور آپ نے اس کے لئے کسی تفسیر وغیرہ کا حوالہ بھی نہیں دیا، اگر چہ ایسے بڑوں کو کسی کی تائید کی ضرورت بھی نہیں، یہ تو ہم جیسی چھوٹوں کو ہی اسکی فکر وتلاش رہتی ہے۔

جدید تفاسیر! راقم الحروف کا موضوع تفسیری مباحث نہیں ہیں، خصوصاً تفہیم القرآن، یا ترجمان القرآن کی تحقیقات کے مطالعہ کی نوبت تو بہت ہی کم آتی ہے، اگر چہ ارادہ ضرور ہے کہ انوارالباری کے بعد کچھ کام اس سلسلہ کا بھی کیا جائے اور جدید تحقیقاتِ تفسیر یہ کا بھی جائزہ لیا جائے، تاکہ مفید وصالح مواد کے لئے قدردانی اور شکر گزاری کا حق ادا کیا جائے، اور مضر یا غیر مفید تفردات، مسامحات وشطحیات کی نشاندہی کر کے ان کی تردید بھی خوش اسلوبی کے ساتھ ہو جائے۔ ولا مر بیداللہ۔

ترجمان القرآن میں تو مضامین کی غلطیاں کافی تعداد میں نظر سے گزری ہیں، اور ان پر متفرق طور سے لکھا بھی جا چکا ہے تفہیم القرآن سے توقع نہ تھی کہ اس میں ایسے تفردات بھی ہوں گے، جن کی مثال اوپر ذکر ہوئی ہے اس لئے یہاں کچھ لکھنا ضروری سمجھا گیا، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم!

ایمان واسلام وضروریاتِ دین کی تشریح

قرآن وحدیث واجماع سے ثابت شدہ تمام امورِ غیبیہ اور اعمالِ طاعت کو ماننا ایمان ہے اور اعمال کی ادائیگی اسلام ہے، پھر ان تمام ثابت شدہ امور کو ضروریات دین کہتے ہیں اور ان کا انکار یا تاویلِ باطل کفر ہے۔

حضرت مجاہد وقتادہؒ نے آیت یایھا الذین امنوا ادخلوافی السلم کا فه (بقرہ) کی تفسیر میں فرمایا:۔ یہ آیت مسلمانوں کو شریعتِ محمد یہ کے ہر ہر جزو کے التزام طاعت کی دعوت دیتی ہے خواہ فرائض ہوں یا مستحبات، واجب علی الاعیان ہوں یا واجب علی الکفایہ، اگر فرضِ عین ہوں تو اعتقادِ فرضیت کے ساتھ ان کی ادائیگی بھی فرض ہوگی، اور اگر مستحبات ہوں تو ان کے استحباب کا اعتقاد لازم ہوگا اور عمل صرف مستحب کے درجہ میں ہوگا، غرض جن چیزوں کا بھی دین محمدی میں داخل ہونا سب کو معلوم ہو چکا ہے، وہ سب ایمانیات میں داخل ہیں، کیونکہ ایمان رسول خدا کی کامل ومکمل فرمانبرداری کا نام ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے ضروریاتِ دین کی تشریح کے بعد فرمایا:۔ مثلاً (۱) نماز پڑھنا فرض ہے اور اس کے فرض ہونے کا اعتقاد بھی فرض ہے اور نماز سیکھنا بھی فرض ہے اور نماز سے ناواقفیت یا اس کا انکار کفر ہے (۲) مسواک کرنا سنت ہے مگر اس کے سنت ہونے کا اعتقاد فرض ہے اور اس کے مسنون ہونے کا انکار کفر ہے اس کا علم حاصل کرنا سنت ہے، ناواقفیت محرومی کا باعث ہے اور اس پر عمل نہ کرنا عتابِ نبوی اور ترک سنت کے درجہ کے عذاب کا موجب ہے۔

اس کے مسنون ہونے کا انکار اس لئے کفر ہوا کہ اس کا معمولاتِ نبویہ میں سے ہونا سب عام وخاص کو معلوم ہے اور جو چیز بھی اس درجہ کی ہے وہ ضروریاتِ دین میں داخل ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے بھی اپنی فتاویٰ میں پوری تفصیل کے ساتھ ایمان وکفر کی بحث ذکر فرمائی ہے آپ نے فرمایا:۔ جو شخص بھی ضروریاتِ دین کا انکار کرتا ہے وہ اہل قبلہ (اور مسلمان) رہتا ہی نہیں، اس لئے کہ ضروریات دین وہ کہلاتے ہیں جو کتاب اللہ اور احادیثِ متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہو چکے ہیں، ان تینوں کے ذریعہ جتنے بھی عقائد واعمال فرض ونفل وغیرہ ثابت ہیں، ان سب کو ماننا ضروری ہے، پھر عقائد کا جاننا اور ماننا تو سب ہی کا ضروری وفرض ہے، اعمال میں سے فرض کا جاننا فرض اور عمل فرض ہے، مسنون کا جاننا سنت اور عمل بھی سنت، مستحب کا جاننا مستحب اور عمل بھی صرف مستحب کے درجہ میں رہے گا، لیکن ضروریاتِ دین میں سے انکار کسی ایک چیز کا بھی کفر ہوگا۔

تفصیل ضروریاتِ دین! مندرجہ ذیل حقیقتوں پر ایمان ویقین رکھنا ایک مومن کے لئے ضروری ہے:۔ (۱) وجودِ باری تعالیٰ مع تمام

صفاتِ کمال اس طرح کہ وہ اپنی ذات وصفاتِ عالیہ کے لحاظ سے یکتا و بے مثال اور ازلی وابدی ہے اور صفاتِ عیوب ونقصان صفاتِ مخلوق سے اس کی ذات سبحانہ تعالیٰ منزہ ومبرا ہے۔

(۲) حدوثِ عالم، کہ حق تعالیٰ کے سواء پہلے سے کچھ نہ تھا، اس کے سواء تمامی موجوداتِ عالم (علوی وسفلی) اس کی قدرت وارادہ کے تحت موجود ومخلوق ہوئی ہیں (۳) قضاء وقدر پر ایمان کہ جو کچھ دنیا میں اب تک ہوا، یا اب ہو رہا ہے اور آئندہ ہوگا، وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق ہے اور اسی کے ارادہ وقدرتِ کاملہ سے ظہور ووجود حاصل کرتا ہے، اور بندوں کو جن اعمال کا مکلّف بنایا گیا ہے ان کے لئے بندوں کو بھی بقدرِ ضرورت اختیار وارادہ عطا کر دیا گیا ہے، یعنی بندہ نہ مجبورِ محض ہے نہ مختارِ مطلق، اور جس درجہ میں بھی اس کو اختیار وارادہ دے دیا گیا ہے، بقدر اس کے ہی اعمال کی جزاء وسزا مقرر کر دی گئی ہے، جو سراسر عدل ہے، اسی لئے اس کے خلاف عقیدہ رکھنا کہ بندہ کو کچھ بھی اختیار نہیں، یا وہ مکمل طور سے مختارِ مطلق ہے، دونوں باتیں ایمان کے خلاف اور کفر میں داخل ہیں (۴) فرشتے جن اور انسان اس کی اہم ترین مخلوقات سے ہیں (۵) بنی آدم کو اپنی ساری مخلوقات پر شرف بخشا اور ان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا، اور زمین وآسمان کی ساری چیزوں کو اس کے لئے مسخر کیا (۶) بنی آدم میں سے انبیاء علیہم السلام کو منتخب کیا اور ان کو شرفِ نبوت ورسالت سے سرفراز فرما کر جن وانس کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا (۷) ہدایت ورہنمائی کے لئے وحی کا سلسلہ قائم کیا اور کتابیں بھی نازل فرمائیں، مثلاً تورات، زبور، انجیل وقرآن مجید (۸) انبیاء علیہم السلام کی تعداد خدا کو معلوم ہے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر سرورِ دوعالم افضل الرسل محمد ﷺ پر آ کر ختم ہو گیا آپ کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی دنیا میں نہیں آئے گا (۹) آخر زمانہ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام آسمان سے اُتر کر دینِ محمدی کی تائید وتقویت فرمائیں گے، وہ آسمان پر زندہ اٹھائے گئے تھے اور اِس وقت بھی وہاں پر زندہ موجود ہیں اور دنیا میں آ کر اپنے مفوضہ کاموں کی تکمیل کے بعد وفات پا کر حضور اکرم ﷺ کے روضہ مطہرہ مقدسہ میں دفن ہوں گے (قرآن مجید اور صحیح متواتر احادیث سے یہ سب امور ثابت ہیں) (۱۰) انبیاء علیہم السلام کے بعد مرتبہ ان کے صحابہ کا ہے، ان کے بعد تابعین، تبع تابعین علماءِ واولیائے امت کے درجات ہیں (۱۱) انبیاء علیہم السلام کے جن معجزات کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہو چکا ہے، ان کو درست بلا تاویل ماننا ضروری ہے (۱۲) شریعتِ محمدیہ کے تمام احکام جو قرآن مجید وحدیث واجماع وقیاس سے ثابت ہیں، ان سب کو ماننا اور درجہ بدرجہ ان پر عمل کرنا ضروری ہے یعنی فرائض، واجبات، سُنن ومستحباتِ دین سب ہی کو دین کا جزو یقین کرنا تو ضروری ہے باقی عمل کے لحاظ سے فرض پر عمل کرنا فرض اور مستحب ہوگا وغیرہ، اسی طرح نواہی ومنکراتِ دین کا حکم ہے (۱۳) مرنے کے بعد ہر شخص آخرت کی پہلی منزل میں مقیم ہوگا، جس کو ''برزخ'' کہتے ہیں (۱۴) روزِ قیامت کا یقین کہ ایک دن خدا کے حکم سے ساری دنیا زمین وآسمان کی چیزیں فنا ہو جائیں گی (۱۵) روزِ جزاء یعنی حسابِ وکتاب کا دن کہ ہر مکلّف کے سارے اعمال کا جائزہ لے کر جزاء وسزا کا حکم کیا جائے گا (۱۶) جنت وجہنم کا وجود برحق ہے، جنت میں ابدی نعمتوں کے مستحق ہمیشہ رہیں گے اور جہنم میں ابدی عذاب کے مستحق ہمیشہ رہیں گے، اور کسی کے لئے موت نہ ہوگی (۱۷) حق تعالیٰ کے مقرب وبرگزیدہ بندوں کی شفاعت گنہگار بندوں کے لئے، باذن واجازتِ خداوندی ہوگی (۱۸) جنت میں حق تعالیٰ شانہ کی دائمی خوشنودی اور دولتِ دیدار بھی حاصل ہوگی، جو سب نعمتوں سے برتر اور افضل ہوگی۔

کفر کی باتیں! اوپر کی درج شدہ تمام ضروریاتِ دین اور جو دوسری کتبِ عقائد وکلام میں مفصل درج ہیں، سب ہی پر ایمان ویقین رکھنا مومن کے لئے ضروری ہے اور کسی ایک چیز کا انکار بھی کفر کی سرحد میں داخل کرنے کے لئے کافی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی توحید یا کسی صفت یا حدوثِ عالم کا انکار، اور وجودِ جن وملائکہ، برزخ، جنت وجہنم، معجزات وغیرہ یا احکام اسلام میں سے کسی کا انکار یا تاویل بھی کفر ہے، اسی طرح کسی نبی کی نبوت کا انکار یا کسی آیتِ قرآنی کا انکار وتحریف، یا خاتم النبیین کے بعد کسی نبی کی نبوت کا اقرار، یا عالم کو قدیم سمجھنا، یا حق تعالیٰ جل ذکرہ، انبیاء وملائکہ کے بارے میں توہین وتحقیر کے الفاظ استعمال کرنا اور کسی شخص میں کفر کی باتیں ہوتے ہوئے اس کو کافر نہ سمجھنا یا اس کو کافر

کہنے میں تامل وتردد کرنا بھی کفر ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کفر وایمان کی باتوں میں فرق نہیں کرتا، واللہ تعالیٰ اعلم۔ مزید تفصیلات ودلائل کے لئے اکفار الملحدین، اور کتبِ عقائد وکلام کا مطالعہ کیا جائے۔ واللہ الموفق!

باب قبلة اهل المدينة واهل الشام والمشرق' ليس فى المشرق ولا فى المغرب قبلة لقول النبى صلى الله عليه وسلم لا تستقبلوا القبلة بغائط او بول ولكن شرقوا او غربوا

(باب دربارۂ قبلہ اہل مدینہ واہل شام ومشرق، مشرق یا مغرب میں قبلہ نہیں ہے، یعنی نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے قضائے حاجت یا پیشاب کے وقت قبلہ کی طرف منہ نہ کرو، بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کرو۔)

(۳۸۳) حدثنا على بن عبدالله قال نا سفيان قال نالزهرى عن عطاء ابن يزيد الليثى عن ابى ايوب الانصارى ان النبى صلى الله عليه وسلم قال اذا اتيتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها ولكن شرقوا اوغربوا قال ابوايوب فقدمنا الشام فوجدنا مراحيض بنيت قبل الكعبة فنتحرف ونستغفر الله عزوجل و عن الزهرى عن عطاء قال سمعت اباايوب عن النبى صلى الله عليه وسلم مثله

ترجمہ! حضرت عطاء لیثی نے حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت کی کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ جب تم قضائے حاجت کرو تو نہ قبلہ کی طرف رُخ کرو نہ اس سے پیٹھ پھیرو، بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف توجہ کرو، حضرت ابوایوبؓ کا بیان ہے کہ ہم شام گئے تو وہاں ہم نے بیت الخلاء قبلہ کے رُخ پر بنے ہوئے دیکھے لہٰذا ہم ترچھے ہوکر بیٹھتے تھے، اورحق تعالیٰ سے استغفار کرتے تھے۔

تشریح! امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ اہل مدینہ اور کعبہ کے لحاظ سے اسی کی سمت میں واقع ہونے والے ملک شام اور مدینہ طیبہ سے مشرق والے بلاد کا قبلہ ان کی مشرقی ومغربی سمت میں نہیں ہے، اوراسی لئے حضور علیہ السلام نے ارشادفرمایا کہ قضائے حاجت کے وقت مشرق ومغرب کی سمت میں تمہارے لئے رُخ کرنے کی اجازت ہے کہ یہ کعبہ معظّمہ کی تعظیم میں مخل نہیں ہے، امام بخاریؒ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا کے کسی حصّہ کے لوگوں کے لئے بھی مشرق ومغرب کی سمت میں قبلہ نہیں ہے، کیونکہ امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر علامہ زماں سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی تاہم علامہ ابنِ بطال نے امام کی یہی مراد قرار دے کر اس کو صحیح کرنے کی یہ توجیہ کی کہ کعبہ کے مشرق ومغرب میں بھی جن کے بلاد اس خط کے نیچے واقع ہیں جو مشرق سے مغرب تک کعبہ کے اوپر سے گزرتا ہے صرف ان کو چھوڑ کر باقی ان سب کے لئے جو اس خط کے دائیں بائیں آباد ہیں، انحراف کی وجہ سے جواز کی گنجائش ہے، جس طرح حضرت ابوایوبؓ نے کیا کہ شام جاکر عیسائیوں کے زمانہ کے سمتِ قبلہ پر بنے ہوئے بیت الخلاؤں کا استعمال انحراف کے ساتھ کیا، اور چونکہ اس معمولی انحراف کے وہ عادی نہ تھے، اس کو طبعاً وعادۃً مکروہ سمجھ کر استغفار کو بھی اختیار کیا، محقق عینیؒ نے علامہ موصوف کی اس توجیہ کو ذکر کرکے اس پر نہ صرف یہ کہ کوئی نقد نہیں کیا بلکہ اس کو اور زیادہ سنبھال کر پیش کردیا ہے۔ جس سے دونوں توجیہ اپنی اپنی جگہ درست ہوجاتی ہیں، یعنی امام بخاریؒ کی مراد صرف اہلِ مدینہ اہلِ شام اور مدینہ سے مشرق کی سمت والے بلادِ عرب ہوں، تب تو بات صاف ہی ہے لیکن اگر ابنِ بطال والی توجیہ مراد ہو تب بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ مشرق ومغرب سے مراد مشرق ومغرب کی تمام سمتیں ہوسکتی ہیں، ٹھیک درمیانی خطِ مشرق ومغرب کو چھوڑ کر جنوب وشمال کی طرف تھوڑا سا انحراف بھی بول وغائط کے وقت کافی ہے اور یہی تشریق وتغریب ہے، جس میں کعبہ معظّمہ کی تعظیم کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، اور چونکہ ٹھیک درمیانی خط والے بہ نسبت دوسروں کے بہت کم لوگ ہوں گے ان کی طرف گویا اس عام حکم میں تعرض نہیں کیا گیا، محقق عینی نے اس توجیہ میں خاص طور سے انحراف مذکور کے ساتھ عند الغائط کی بھی قید ظاہر کردی تاکہ معلوم ہو کہ جس طرح یہاں امت سے تنگی رفع کرنے کے لئے بول وغائط کے وقت تھوڑے انحراف بہ

سنتِ شمال وجنوب کوشریعت نے کافی قرار دیا ہے، اسی طرح دوسری طرف بھی تنگی رفع کرنے کے لئے نماز میں استقبالِ قبلہ کے واسطے ربع دائرہ تک کا توسع جائز کردیا گیا ہے، دونوں جگہ توسع ملحوظ ہے، وللہ درالمحقق العینیؒ اور شاید اسی لئے عینی نے اس بحث کے شروع میں یہ الفاظ ادا کئے ہیں کہ یہاں ہمیں قلم دبا کر ذراز وردار تحریر لکھنی ہے کیونکہ بعض دوسرے لوگوں نے خواہ مخواہ دوراز کار بحثوں کا رُخ اختیار کیا ہے۔

یہاں سے دوسری حدیثِ ترمذیؒ وغیرہ کی مراد بھی واضح ہوگئی، جس میں ''ما بین المشرق والمغرب قبلة'' وارد ہے، محقق عینی نے لکھا کہ وہ بھی صرف مدینہ اوراس کی سمت پر واقع بلاد وممالک کے لئے ہے، اور جس طرح ان کے لئے وسعت ہے، ایسی ہی وسعت مشرق ومغرب کی سمت میں رہنے والوں کے لئے بھی جنوب وشمال کے لحاظ سے ہوگی، اوراس سے قبلہ کی سمت میں ربع دائرہ تک کی وسعت کا جواز بھی ملتا ہے، یعنی جس طرح اہلِ مدینہ اور دوسرے کعبہ معظمہ سے شمال میں رہنے والوں کیلئے قبلہ کا رُخ ما بین المشرق والمغرب وسیع ہے، اسی طرح اہل مشرق کے لئے ما بین الشمال والجنوب وسعت ہوگی۔

اس پوری بحث کو پڑھ لینے کے بعد جب آپ اُس دائرہ والے نقشہ پر غور کریں گے، جو ہم نے یہاں پیش کیا ہے تو امید ہے کہ اس سلسلہ کی تمام احادیث اورشروح کی مراد منقح ہو جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ، ولہ الحمد پہلے مسجد حرام اور بیت اللہ شریف کا نقشہ انوار الباری ۱۲/۱۴۱ میں شائع ہو چکا ہے۔

بَابُ قَوْلِ اللہ تَعَالیٰ وَا تَّخِذُ وُ مِن مَّقَامِ اِبْرَاهِیمَ مُصَلّی

(ارشادِ باری تعالیٰ کہ مقام ابراہیم کے پاس نماز کی جگہ بناؤ)

(۳۸۴) حدثنا الحمیدی قال نا سفیان قال نا عمرو بن دینار قال سألنا ابن عمر عن رجل طاف بالبیت للعمرة ولم یطف بین الصفا والمروة یأتی امرأته' فقال قدم النبی صلی اللہ علیه وسلم فطاف بالبیت سبعاً وصلے خلف المقام رکعتین فطاف بین الصفا والمروة وقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنة وسألنا جابر بن عبداللہ قال لایقربنها حتی یطوف بین الصفا والمروة

(۳۸۵) حدثنا مسدد قال نا یحییٰ عن سیف یعنی ابن ابی سلیمان قال سمعت مجاهداً اتی ابن عمر فقیل له' هٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم دخل الکعبة فقال ابن عمر فاقبلت والنبی صلے اللہ علیه وسلم قد خرج واجد بلالا قائماً بین البابین فسألت بلالاً فقلت اصلی النبی صلے اللہ علیه وسلم فی الکعبة؟ قال نعم! رکعتین بین الساریتین اللتین علےٰ یساره اذا دخلت ثم خرج فصلے فی وجه الکعبة رکعتین.

(۳۸۶) حدثنا اسحٰق بن نصر قال نا عبدالرزاق قال انا ابن جریج عن عطاء قال سمعت ابن عباس قال لما دخل النبی صلے اللہ علیه وسلم البیت دعا فی نواحیه کلها ولم یصل حتی خرج منه فلما خرج رکع رکعتین فی قبل الکعبة و قال هٰذه القبلة

ترجمہ! حضرت عمرو بن دینار کہتے ہیں:۔ہم نے حضرت ابن عمرؓ سے سوال کیا کہ جس شخص نے عمرہ کے لئے بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا مروہ کی سعی نہ کی تو کیا وہ اپنی بیوی سے صحبت کر سکتا ہے؟ آپ نے بتلایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کا طواف سات مرتبہ کر کے مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت پڑھیں، پھر صفا مروہ کا طواف کیا تھا، تمہارے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی طریقہ کی اتباع کرنی ہے، اس بارے میں ہم نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ طوافِ صفاو مروہ سے پہلے ہرگز بیوی سے قربت نہ کرے۔

ترجمہ! حضرتِ مجاہد روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کے پاس کوئی شخص آیا اور بتایا کہ دیکھو رسول اکرم ﷺ کعبہ معظمہ کے اندر تشریف لے گئے ہیں، حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں اُدھر پہنچا تو حضور اکرم ﷺ باہر آ چکے تھے، اور (گویا) میں بلال کو (اب بھی) دیکھ رہا ہوں کہ دونوں باب کے درمیان کھڑے ہیں، میں نے بلال سے پوچھا کہ رسول اکرم ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! دو رکعت اُن دونوں ستونوں کے درمیان جو داخلہ بیت اللہ کے وقت بائیں جانب ہوتے ہیں پھر حضور اکرم ﷺ نے باہر آ کر دو رکعت کعبہ کے مواجہہ میں پڑھیں۔

ترجمہ! عطاء کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سُنا کہ جب حضور اکرم ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اس کے تمام گوشوں میں دعائیں کیں اور نماز نہیں پڑھی، پھر جب باہر نکلے تو دو رکعت کعبہ معظمہ کے سامنے پڑھیں اور فرمایا کہ یہی قبلہ ہے۔

تشریح! امام بخاریؒ کا اصل مقصد تو نمازوں میں کعبہ معظمہ کی طرف توجہ واستقبال کا حکم ہی بیان کرنا ہے لیکن اس باب میں یہ بھی بتلایا کہ حرم شریف میں بیت اللہ کے پاس ہی ایک جانب مقام ابراہیم بھی موجود ہے، اور طواف کے بعد کی دو رکعت اس کے پاس پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں حضور اکرم ﷺ کے عمل سے بھی ثابت ہوا، لیکن اسی کے ساتھ امام بخاریؒ نے دوسری وتیسری حدیث بھی ذکر کیں تاکہ اصل حکم وجوبِ توجہ الی الکعبہ نظر سے اوجھل نہ ہو جائے، اور ہر حکم کو اپنے اپنے مقام و درجہ میں رکھا جائے۔

مطابقت ترجمہ! یہ وصلے خلف المقام سے حاصل ہوگئی، جو پہلی حدیث الباب میں مذکور ہے اور محقق عینیؒ نے بھی اس کی صراحت کی ہے، پھر نہ معلوم لامع الدراری ۱۵۴/۱ میں ایسا کیوں لکھا گیا کہ ترجمۃ الباب پر یہ اشکال ہے کہ امام بخاریؒ نے اس میں آیتِ قرآنی ذکر کی ہے جس میں مقام ابراہیمؑ پر نماز پڑھنے کا امر ہے، پھر وہ جو روایات اس ترجمہ کے تحت لائے ہیں، ان میں مقام ابراہیم کو مصلے بنانے پر کوئی دلالت نہیں ہے، پھر لکھا کہ حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ نے اسی اشکال کے دو جواب دیئے ہیں، الخ حیرت ہے کہ حضرت شیخ الحدیث دامت کاتہم نے عدم مطابقت اور اشکال و جواب کی بات کہاں سے نکال لی، اشکال کا ذکر حافظ اور عینی دونوں کے یہاں نہیں ہے، اور عینی نے تو صاف مطابقت کی نشان دہی بھی کر دی۔ اور بظاہر حضرت گنگوہیؒ کے نزدیک بھی عدم مطابقت کا کوئی اشکال یہاں نہیں ہے بلکہ وہ امام بخاریؒ کی یہ مراد واضح فرمانا چاہتے ہیں کہ مقام ابراہیم کے پاس نماز کے حکم کے باوجود بھی فرض استقبال کعبہ کے تاکد میں فرق نہیں آیا، کیونکہ حضور علیہ السلام نے صلوٰۃ خلف المقام کے ساتھ بھی استقبالِ کعبہ کو ترک نہیں فرمایا دوسری بات حضرتؒ نے امام بخاریؒ کی یہ بتلائی کہ آیت میں اگرچہ امر ہے مگر وہ سنیت یا استحباب کے لئے ہے وجوب کے لئے نہیں ہے کیونکہ وجوب کے لئے ہوتا تو حضور علیہ السلام مواجہہ بیت اللہ میں نماز نہ پڑھتے، جو دوسری اور تیسری حدیث الباب میں مذکور ہے، اس لئے کہ اس صورت میں مقام ابراہیم حضور اکرم ﷺ کے پیچھے تھا، آگے نہیں تھا اور آگے صرف کعبہ تھا، علاوہ ازیں یہ بات بجائے خود بھی صحیح نہیں ہے کہ روایاتِ باب میں مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے پر کوئی دلالت نہیں ہے، جبکہ پہلی ہی حدیث میں حضور اکرم ﷺ کے مقام ابراہیم میں نماز پڑھنے کا ذکر صراحت سے موجود ہے، یہ تو پوری طرح آیت ترجمۃ الباب کے مصداق پر عمل تھا، لیکن اس پر عمل کے باوجود یہ بھی ظاہر کرنا ضروری تھا کہ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھنا موجبِ شرف و برکت واز دیادِ اجر ہے، یہ نہیں کہ اس کی وجہ سے بیت اللہ کے استقبال کی اہمیت کچھ کم ہوگئی، بلکہ حسبِ تحقیق حضرت گنگوہیؒ اس کا تاکدِ مزید مفہوم ہوا کہ اس کے پاس بھی نماز کی صحت استقبال کعبہ معظّمہ پر ہی موقوف ہے اور اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے وہاں بھی نماز میں استقبال ترک نہیں فرمایا، اور باقی دونوں حدیثیں ذکر کر کے امام بخاریؒ نے اسی مقصد تاکد و وجوبِ استقبال کعبہ کو واضح فرمایا، محقق عینیؒ نے مناسبتِ بابِ سابق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:۔ کہ اس باب کی سابق ابوابِ متعلقہ قبلہ کے ساتھ مناسبت کی وجہ یہ بھی بن سکتی ہے کہ آیت

کریمہ مذکورہ ترجمۃ الباب میں بھی قبلہ کا بیان ہے کیونکہ حسنؒ سے مصلےٰ بمعنی قبلہ ہے اور قتادہ وسدی نے کہا کہ مقام کے پاس نماز پڑھنے کا حکم ہوا تھا، اگر چہ مقام کا قبلہ ہونا صرف اسی صورت میں متعین تھا کہ مقام کو نمازی اپنے اور قبلہ کے درمیان کرلے، کیونکہ دوسری جہات ثلاثہ میں صرف کعبہ کی طرف رُخ کرنے سے نماز درست ہوجاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ فرض تو استقبال بیت اللہ ہی کا ہے مقام کا نہیں اور اسی لئے حضور علیہ السلام نے جب بیت کے پاس خارجِ بیت نماز بغیر استقبالِ مقام پڑھی تو صراحت سے فرمادیا کہ یہی قبلہ ہے (عمدہ ۲/۳۰۲)

افاداتِ عینیؒ! فرمایا: پہلی حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ عمرہ میں سعی واجب ہے جو سارے علماءِ کا مذہب ہے بجز حضرت ابن عباسؓ کے اسی لئے ان کے نزدیک طواف کے بعد احرام کی پابندی ختم ہوجاتی ہے خواہ سعی نہ کرے، حالانکہ یہ رائے ضعیف اور خلافِ سنت ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ طواف کے بعد مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت پڑھی جائیں، پھر بھی اس کو بعض نے سنت اور بعض نے واجب کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ طواف کے تابع ہے، وہ سنت ہو تو یہ بھی سنت ہے وہ واجب ہو تو یہ بھی واجب ہے (عمدہ ۲/۳۰۳)

دوسری حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ میں داخل ہونا جائز ہے اور مغنی میں حج کرنے والے کے لئے اس میں داخلہ اور دو رکعت پڑھنے کو مستحب لکھا ہے، جس طرح حضور علیہ السلام سے ثابت ہے لیکن بیت اللہ اور حطیم کے حصّہ میں جوتوں کے ساتھ داخل نہ ہو کہ خلافِ ادب ہے، علامہ نووی نے یہ اجماع اہل حدیث ثابت کیا کہ بیت اللہ کے اندر دو رکعت پڑھنا مستحب ہے جیسا کہ روایتِ بلال سے ثابت ہے، اور جس روایتِ اُسامہ وغیرہ میں نفی ہے وہ مرجوح ہے، یا اس کو دو واقعات پر محمول کرسکتے ہیں، رہی یہ بات کہ دوسری مشہور روایت میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ مجھے افسوس ہے حضرت بلالؓ کے ساتھ مدت تک رہا لیکن یہ سوال نہ کرسکا کہ حضور علیہ السلام نے بیت اللہ کے اندر کتنی رکعت پڑھی تھیں اور یہاں سوال کرنے کا ذکر ہے تو اس کا بہتر جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے اس وقت صرف یہ سوال کیا تھا کہ حضور علیہ السلام نے بیت اللہ کے اندر کیا کیا، حضرت بلالؓ نے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اشارہ کردیا، جس سے دو رکعت سمجھی گئیں، پھر زبانی طور سے اس کی وضاحت کرانے کو حضرت ابن عمرؓ بھول گئے ہوں گے، جس کا افسوس کیا کرتے تھے الخ (عمدہ ۲/۳۰۵)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا کہ بعض علماءِ نے جو لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اپنے زمانہ میں حضرت عمرؓ سے اپنے زمانہ کے لحاظ سے افضل تھے، وہ شاید ان ہی جیسی وجوہ سے ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو ہر وقت اتباعِ سنت ہی کی دھن لگی رہتی تھی، اور اگر کوئی بات تحقیق سے رہ گئی تو اس کا افسوس کیا کرتے تھے، یہ ان کی عجیب وغریب شان ہی فضیلتِ خاصہ کا موجب تھی اور فرمایا کہ یہاں جو حضرت ابن عمرؓ نے یقین کے ساتھ دو رکعت کا ذکر فرمادیا، وہ اس لئے نہیں تھا کہ حضرت بلالؓ سے پوچھ لیا تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ کم سے کم نماز دو ہی رکعت ہوتی ہے، پس اسی کے قائل ہوگئے (اور حسبِ روایت وتحقیق عینی دو کا اشارہ بھی اس کی تائید میں موجود تھا۔)

تیسری حدیث الباب کے تحت محقق عینیؒ نے "ہذہ القبلۃ" پر لکھا کہ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ یہ قبلہ اور کعبہ معظمہ ہے پھر اس طرح ارشاد فرمانے کی کیا وجہ تھی؟ تو ایک وجہ تو خطابی سے منقول ہے کہ اب قبلہ کا حکم اسی بیت پر ثابت ومستحکم ہوچکا اس کے بعد منسوخ نہ ہوگا، لہٰذا ہمیشہ اسی کی طرف نماز پڑھنی ہوگی، دوسرا احتمال یہ ہے کہ امام کے کھڑے ہونے کی مسنون جگہ بتلائی ہو کہ مواجہہ بیت میں کھڑا ہو، باقی تینوں جوانب وارکان میں نہیں، اگر چہ نماز کی صحت وجواز ان اطراف میں بھی ہے تیسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے صرف ان لوگوں کا حکم بتلایا جو بیت اللہ کا مشاہدہ ومعائنہ کررہے ہوں کہ ان کے لئے مواجہتِ بیت عیاناً ضروری ہے، اپنی اجتہادی رائے سے کام نہیں لے سکتے۔

علامہ نوویؒ نے ایک اور توجیہ بھی لکھی کہ یہی کعبہ وہ مسجد حرام ہے جس کے استقبال کا حکم ہوا سارا حرم نہیں، نہ سارا مکہ اور نہ ساری مسجد حرام جو کعبہ کے گرد ہے بلکہ مسجد حرام کا صرف یہی حصّہ جو کعبہ معظمہ ہے وہی قبلہ ہے۔

نیز ایک روایت میں جو حضور علیہ السلام نے باب بیت اللہ ہی کو قبلہ بیت فرمایا، وہ بھی استحباب پر محمول ہے، کیونکہ نفسِ جواز استقبال تو تمام جہاتِ کعبہ کے لئے حاصل ہے اور اس پر اجماع ہو چکا ہے (عمدہ ۲/۳۰۷)

قولہ ہذا القبلۃ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اس سے اشارہ پورے بیت اللہ کی طرف ہے اور اس کی وجہ سے مالکیہ نے بیت اللہ کے اندر فرض نماز پڑھنے کو ناپسند کیا ہے[۱] کہ پورے کا استقبال نہیں ہو سکتا، لیکن حنفیہ کے یہاں درست ہے اور اس میں ان کے نزدیک زیادہ توسع ہے۔

باب التوجه نحو القبلة حيث كان وقال ابو هريرة قال النبى صلى الله عليه وسلم استقبل القبلة و كبر

(جہاں بھی ہو (نماز میں) قبلہ کی طرف توجہ کرنا، اور حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا قبلہ کا استقبال کر اور تکبیر کہہ)

(۳۸۷) حدثنا عبدالله بن رجاء قال نا اسرائيل عن ابى اسحق عن البراء قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم صلے نحو بيت المقدس ستة عشر شهراً اوسبعة عشر شهراً و كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحب ان يوجه الى الكعبة فانزل الله عزوجل قدنرىٰ تقلب وجهك فى السماء فتوجه لحو القبلة وقال السفهاء من الناس و هم اليهود ما ولهم عن قبلتهم التى كانوا عليها قل لله المشرق والمغرب يهدى من يشاء الىٰ صراط مستقيم فصلے مع النبى صلى الله عليه وسلم رجل ثم خرج بعد ما صلى قمر علىٰ قوم من الانصار فى صلوٰة العصر يصلون نحو بيت المقدس فقال و هو يشهد انه' صلے مع رسول الله صلى الله عليه وسلم و انه' توجه نحو الكعبة فتحرف القوم حتى توجهوا نحو الكعبة .

(۳۸۸) حدثنا مسلم بن ابراهيم قال نا هشام بن عبدالله قال نا يحيى ابن ابى كثير عن محمد بن عبدالرحمٰن عن جابر بن عبدالله قال كان النبى صلى الله عليه وسلم يصلى على راحلته حيث توجهت به فاذا ارادالفريضة نزل فاستقبل القبلة

(۳۸۹) حدثنا عثمان قال ناجرير عن منصور عن ابراهيم عن علقمة عن عبدالله صلى الله عليه وسلم قال ابراهيم لآادرى زاداونقص فلما سلم قيل له' يارسول الله احدث فى الصلوٰة شى قال وماذاك قالوا صليت كذا و كذا فثنىٰ رجليه واستقبل القبلة و سجد سجدتين ثم سلم اقبل علينا بوجهه قال انه

---

[۱] فیض الباری ۲/۳۲ میں غلطی سے مالکیہ کا مسلک عدم جواز درج ہو گیا ہے اور کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱/۱۵۰ میں تفصیل مذاہب اس طرح ہے:۔

مالکیہ! نماز فرض بیت اللہ کے اندر صحیح ہے مگر مکروہ ہے بہ کراہتِ شدیدہ اور وقت کے اندر اس کا اعادہ مستحب ہے، نفل اگر غیر موکدہ ہوں تو وہ اس کے اندر مستحب ہیں، موکدہ ہوں تو مکروہ، مگر اعادہ کی ضرورت نہیں، کعبہ کی چھت پر نماز فرض صحیح نہیں، نفل غیر موکدہ صحیح ہیں، نفل موکدہ میں دو قول برابر درجہ کے ہیں۔

حنابلہ! فرض نماز بیت اللہ کے اندر اور چھت پر بھی صحیح نہیں بجز اس کے کہ کسی دیوار سے بالکل متصل ہو کر پڑھے کہ اس کے پیچھے کچھ حصہ نہ رہے نماز نفل ومنذور درست ہے اور یہ بھی درست ہے کہ باہر کھڑا ہو کر اندر سجدہ کرے۔

شافعیہ! نماز فرض ونفل سب درست ہیں، مگر باب کعبہ کی طرف کو جبکہ وہ کھلا ہو درست نہ ہوگی اور چھت پر جب درست ہوگی کہ اس کے سامنے کم از کم دو تہائی ذراع کی اونچی کوئی چیز ہو۔

حنفیہ! بیت اللہ کے اندر اور چھت پر ہر نماز درست ہے البتہ اوپر مکروہ ہے، کیونکہ اس میں ترک تعظیم بیت اللہ ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے یہاں سب سے زیادہ توسع ہے جیسا کہ حضرتؒ نے اشارہ فرمایا، اور زیادہ تنگی اس مسئلہ میں حنابلہ کے یہاں ہے، واللہ تعالیٰ اعلم "مؤلف"

لوحدث فی الصلوٰۃ لنباتکم به ولکن انمآ انا بشر مثلکم انسیٰ کما تنسون فاذانسیت فذکرونی واذاشک احدکم فی صلوٰته فلیتحر الصراب فلیتم علیه ثم لیسلم ثم یسجد سجدتین

ترجمہ! حضرت براءؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اور آپ چاہتے یہی تھے کہ کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم آجائے، پس اللہ تعالیٰ نے آیت قد نری تقلب نازل فرمائی اور آپ نے قبلہ کا استقبال کیا اس پر سفید لوگوں نے جو یہود تھے طنز کیا کہ اب پہلے قبلہ سے کیوں پھر گئے، حق تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے! مشرق ومغرب سب خدا کے ہیں، وہ جس کو چاہے صراطِ مستقیم کی ہدایت مرحمت فرمادیتا ہے، حضور علیہ السلام کے ساتھ ایک شخص نے نماز پڑھی اور پھر وہ کچھ انصار کے پاس سے گزرا جو عصر کی نماز بیت المقدس کی طرف پڑھ رہے تھے تو اس نے شہادت کے ساتھ بتلایا کہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ کعبہ کی طرف نماز پڑھ کر آیا ہے، اس پر وہ سب لوگ کعبہ کے طرف کو گھوم گئے!

ترجمہ! حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی سواری پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے، جدھر کو بھی وہ چلتی تھی لیکن جب فرض نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تھے تو سواری سے اتر کر اور استقبالِ قبلہ کر کے نماز ادا فرماتے تھے۔

ترجمہ! عثمان، جریر، منصور، ابراہیم، علقمہ، عبداللہ (بن مسعود) روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی، ابراہیم کہتے ہیں، یہ مجھے یاد نہیں کہ آپ نے (نماز میں کچھ) زیادہ کر دیا تھا یا کم کر دیا تھا، الغرض جب آپ سلام پھیر چکے تو آپ سے عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ کیا کوئی بات نماز میں نئی ہوگئی، آپ نے فرمایا، وہ کیا؟ لوگوں نے کہا کہ آپ نے اس قدر نماز پڑھی، پس آپ نے اپنے دونوں پیروں کو سمیٹ لیا، اور قبلہ کی طرف منہ کر کے دو سجدے کئے، اس کے بعد سلام پھیرا، پھر جب ہماری طرف اپنا منہ کیا تو فرمایا کہ اگر نماز میں کوئی نیا حکم ہو جاتا تو میں تمہیں (پہلے سے) مطلع کرتا لیکن میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، جس طرح تم بھولتے ہو میں بھی بھول جاتا ہوں، لہٰذا جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلاؤ، اور جب تم میں سے کسی شخص کو اپنی نماز میں شک ہو جائے تو اسے چاہیے کہ صحیح حالت کے معلوم کرنے کی کوشش کرے، اور اسی پر نماز تمام کرے، پھر سلام پھیر کر دو سجدے کرلے۔

تشریح! محقق عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے اس باب میں نمازِ فرض کے لئے جہتِ قبلہ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت وفرضیت بتلائی ہے، خواہ وہ نمازی سفر میں ہو یا حضر میں، اور پہلے باب سے اس کی مناسبت ظاہر ہے، تحویلِ قبلہ کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

استنباطِ احکام! علامہ عینیؒ نے لکھا:۔ پہلی حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ (۱) احکام کا نسخ درست ہے، اور یہی جمہور کا مذہب ہے، کچھ لوگوں نے جن کی کوئی اہمیت نہیں، اس کو نادرست سمجھا ہے (۲) قرآن مجید سے سنت کا نسخ ہو سکتا ہے یہ بھی جمہور کا مسلک ہے، امام شافعیؒ کے اس بارے میں دو قول ہیں (۳) خبرِ واحد مقبول ہے (۴) نماز کا قبلہ کی طرف ہونا واجب ہے اور اجماع سے اس کا کعبہ معظمہ ہونا متعین ہے (۵) ایک نماز دو سمت میں جائز ہو سکتی ہے (اسی لئے اب بھی اگر تحری کے بعد غلط سمت میں نماز شروع کر دے اور درمیان میں صحیح قبلہ کا علم ہو جائے تو اس کی طرف گھوم جائے گا)

دوسری حدیث الباب سے معلوم ہوا (۱) فرض نماز میں ترکِ استقبالِ قبلہ درست نہیں، اسی لئے حضور علیہ السلام فرض کے لئے سواری سے اتر کر ضرور استقبال کرتے تھے، البتہ شدتِ خوف کا وقت اس سے مستثنیٰ ہے اور مجبوری ومعذوری کی حالت میں سواری پر بھی فرض ہو سکتی ہے (۲) نفل نماز سواری پر بحالتِ سفر تو سب کے نزدیک درست ہے، البتہ حضر میں امام ابو یوسف وغیرہ کے نزدیک درست ہے، امام ابوحنیفہ وامام محمد اور اصطخری شافعی کے نزدیک درست نہیں۔

تیسری حدیث سے معلوم ہوا (۱) افعال میں انبیاء علیہم السلام کو بھی سہو ہو سکتا ہے، علامہ ابن دقیق العیدؒ نے کہا کہ یہی قول اکثر علماءِ

واہل نظر کا ہے لیکن افعال بلاغیہ میں سہو کسی کے نزدیک بھی درست نہیں ہے جیسا کہ قاضی عیاض وغیرہ نے تصریح کی ہے (۲) افعالِ انبیاء علیہم السلام میں نسیان بھی واقع ہوسکتا ہے مگر اس پر ان کو برقرار نہیں رکھا جاتا اور حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو تذکیر وتعلیم فوراً کر دی جاتی ہے۔

محقق عینیؒ نے یہاں سہو ونسیان میں فرق بھی بتلایا ہے کہ نسیان کسی چیز سے غفلت قلب کا نام ہے اور سہو کسی چیز کا قلب سے غافل ہونا ہے، آگے عینی نے کلام فی الصلوٰۃ عامداً وناسیاً اور عددِ رکعات میں شک کی صورتوں کے احکام تفصیل ودلائل کے ساتھ بیان کئے ہیں (۳) حنفیہ کے نزدیک سہو کے دوسجدے سلام کے بعد کے ہیں جیسا کہ حدیث الباب سے بھی ثابت ہوا، اور یہی حضرت علی، سعد بن وقاص، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عمار بن یاسر، عبداللہ بن زبیر اور انس بن مالک سے مروی ہے اور ابن ابی لیلیٰ، ابراہیم نخعی، حسن بصری اور سفیان ثوری کا بھی مذہب ہے، لیکن امام شافعیؒ وغیرہ سلام سے قبل کہتے ہیں، تاہم ہدایہ میں ہے کہ یہ خلاف صرف اولویت واستحباب کا ہے، اور ایسا ہی ماوردی نے الحاوی میں اور ابن عبدالبر وغیرہ نے کہا ہے۔ (عمدہ ۱۴۳/۲)

حافظ کا سکوت! حافظ ابن حجرؒ نے ثم یسلم ثم سجدتین پر خاموشی اختیار کی، اور بغیر جواب ہی کے آگے چلے گئے ایسے موقع پر کہ اپنی مذہب میں کمزوری ہو سکوت اور جہاں کچھ قوت ہو تو دوسروں پر نکیر میں حد اعتدال سے بڑھ جانا، اہل ادب وتحقیق کے لئے موزوں نہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے فرمایا:۔ ہدایہ سے معلوم ہوا کہ خلاف افضلیت کا ہے، البتہ تجرید کی عبارت سے دوسری بات نکلتی ہے، تاہم میں کہتا ہوں کہ ہدایہ ہی کی رائے لینی چاہیے، اگرچہ مرتبہ قدوری کا بڑا ہے، کیونکہ تجرید کی روایت لینے سے اکثر احادیثِ صحاح کی مخالفت لازم آئے گی، اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ اس بارے میں احادیث قولیہ تو سب ہی حنفیہ کی حجت وتائید میں ہیں، جیسا کہ ابوداؤد و بخاری میں بھی ہیں، اور فعلی احادیث دونوں قسم کی ہیں، لیکن کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اختلاف صرف افضلیت کا ہے، اس سے زیادہ کا نہیں۔

افاداتِ انور! فرمایا:۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نفل نماز میں تحریمہ کے وقت استقبال کرنا چاہیے پھر چاہے سواری اپنے راستے پر دوسری جہت میں ہی چلتی رہے لیکن حنفیہ کے یہاں اس میں توسع ہے، انہوں نے تحریر کے وقت بھی استقبال کو شرط نہیں قرار دیا ہے۔

نماز کا قلب تحریمہ ہے یا موضع تامین؟ مجھے اس میں تردد تھا، لیکن اب رجحان یہ ہے کہ آمین کہنے کا موقع ہی قلبِ صلوٰۃ ہے، کیونکہ تحریمہ پالینے میں تو نماز کے لئے جلدی کرنے اور خصوصی اہتمام ہی کا ثواب ہے، لیکن آمین کا موقع حاصل کرنے میں اگلے پچھلے سب گناہوں کی مغفرت کا وعدہ ہے، لہٰذا آمین پالینے کا موقع ہی نماز کا قلب بننے کے واسطے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

باقی رہا یہ کہ رکوع پالینے سے پوری رکعت مل جاتی ہے، لہٰذا وہ قلب ہونا چاہیے تو وہ درست نہیں کیونکہ یہ تو بہت ہی کم ہمت لوگوں کے لئے ایک قسم کی رعایت دی گئی ہے کہ رکوع تک بھی مل گئے تو رکعت ہوگئی وہ کوئی انعام واکرام کا مستحق بنانے والی بات نہیں ہے، اسی لئے حضرت ابوہریرہؓ سے[1] منقول ہے کہ وہ بڑی کوشش واہتمام آمین پالینے کا کیا کرتے تھے، اتنا اہتمام وہ فاتحہ کا بھی نہیں کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود بھی

---

[1] بخاری شریف ۱۰۷ (باب جہر الامام بالتامین) میں آئے گا کہ حضرت ابوہریرہؓ جس زمانہ میں بحرین میں موذن تھے، تو اذان کے بعد اپنے امام مروان کو بلند آواز سے کہا کرتے تھے کہ دیکھنا! میری آمین فوت نہ کرا دینا، اور یہ بھی نقل ہوا ہے کہ امام سے شرط کرلی تھی کہ جب تک میں صف میں نہ پہنچ جاؤں، مجھ سے پہلے ولا الضالین نہ کہہ دینا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام ان کا انتظار کرتے ہوں گے یا حضرت ابوہریرہؓ سستی یا دیر کرتے ہوں، یہ بلکہ حضرت نافع ہی کا قول بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ آمین کو نہ چھوڑتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے تھے کہ امام کے آمین کہنے سے پہلے نماز میں ضرور شریک ہوجاؤ، اور میں نے ان سے اس بارے میں حدیث بھی سنی ہے (یعنی آمینِ امام کے ساتھ آمین کہنے کی فضیلت مغفرتِ ذنوب والی جو آگے بخاری میں بھی ہے)

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر فرمایا:۔ دیکھو حضرت ابوہریرہؓ ایسے جلیل القدر صحابی آمین کے لئے کتنا اہتمام کرتے اور ترغیب دیتے تھے پھر امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کا اہتمام یا ترغیب کیوں نہیں ہوئی؟!

فرمایا موطا امام مالکؒ میں لا تفتنی کی جگہ لا تسبقنی بآمین مروی ہے اس سے پوری طرح واضح ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ فاتحہ خلف الامام کے قائل نہ تھے، واللہ تعالیٰ اعلم!

کچھ لوگوں نے ان کو قراءتِ فاتحہ خلف الامام کا قائل سمجھا ہے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ آمین ہی قبولیتِ صلوٰۃ وغیرہ پر مہر کرنے والی ہے، اور فاتحہ تو امام کی بھی مقتدی کے لئے کافی ہے، بخلاف آمین کے کہ وہ مقتدی کا حصّہ ہے اور امام آمین کے بارے میں مقتدی کا وکیل ونائب نہیں ہوتا۔

بحث ونظر! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ہم پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ جن حضرات نے صرف ایک شخص کے کہنے پر نماز کا رُخ بدل دیا انہوں نے کس طرح ایک سابقہ قطعی امر کو ایک شخص کی خبر سے (جو ظنی ہے) منسوخ قرار دیدیا، کیونکہ ہم تو اصل خبر کو قطعی کہتے ہیں، یعنی ہر حدیثِ رسول کو قطعی سمجھتے ہیں، آگے ظنیت جو آئی ہے وہ تو ہم تک پہنچنے کے ذریعہ سے آئی ہے، لہٰذا یہاں بھی ظنیت طریق میں ہے ناسخ میں نہیں، اور ان حضرات کے لئے طریق کی ظنیت کیوں مانع نہ ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس تحقیق کا ذریعہ تھا، یعنی مدینہ طیبہ جا کر حقیقتِ حال معلوم کر سکتے تھے، لہٰذا اصل یہ قرار پائی کہ جب کوئی امر قطعی الاصل ہو تو ظنی پر بھی عمل میں کوئی جرح نہیں، اور اسی لئے تبلیغ دین کے لئے عدد تواتر کسی کے نزدیک بھی شرط نہیں ہے اور نہ کسی کافر کو یہ کہنے کا حق ہے کہ تمہارا دین اگرچہ اپنی جگہ قطعی ہے، لیکن مجھ تک جو کچھ پہنچا ہے وہ سب اخبارِ آحاد کے ذریعہ پہنچا ہے، لہٰذا وہ مجھ پر حجتِ ملزمہ نہیں ہوسکتا، پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ اس اصل کو اصولیوں نے نہیں لکھا، مجھ کو تنبہ ہوا تو اس کو میں نے نیل الفرقدین[1] اور اکفار الملحدین میں بھی لکھ دیا ہے۔

خبر واحد کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خاص تحقیق

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا حضرتؒ خبر واحد کو بھی اصالۃً اور فی حد ذاتہ قطعی فرمایا کرتے تھے، اور احادیثِ صحیحین کے بارے میں آپ حافظ ابن حجر شافعی، شمس الائمہ سرخسی حنفی، حافظ ابن تیمیہ حنبلی، اور شیخ عمرو بن الصلاحؒ کی رائے کو مرجح خیال کرتے تھے، اور رائے جمہور عدم افادۂ قطع کو مرجوح کہتے تھے اور یہ شعر بھی اس کے حسبِ حال پڑھا کرتے تھے۔

تعیرنا انا قلیل عدیدنا فقلت لھاان الکرا درقلیل

نیز فرمایا کرتے تھے کہ صحیحین کی اخبارِ آحاد اگرچہ اہل اصول کے قاعدہ سے ظنی قرار پاتی ہیں مگر قرائن اور قوتِ طرق کی موجودگی میں وہ بھی قطعی بن جاتی ہیں، لیکن ان کا علم وبصیرت صرف اہل علم ونظر ہی کو حاصل ہوسکتی ہے، ہر شخص کو نہیں، پھر یہ بھی فرماتے تھے کہ افادۂ قطع کی بات اطباقِ امت یا تلقی بالقبول کی وجہ سے نہیں بلکہ درحقیقت اسی وجہ سے ہے اور ہونی چاہیے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے، اور اسی لئے جن احادیث کی مثلاً امام بخاری نے تخریج تو کی مگر ان کے کسی جز و پر باب وترجمہ قائم نہیں کیا تو اس جز و کو بھی ہم قطعی نہ کہیں گے، کیونکہ ان کی عدم تبویب کے باعث اس کے ثبوت میں شبہ پیدا ہو گیا، اور قطعیت جب ہی رہتی ہے کہ کوئی مانع وشبہ موجود نہ ہو۔

---

[1] حضرتؒ نے فرمایا:۔تواتر طبقہ کے بعد اسناد کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسی لئے شریعت نے اس کے بعد کسی مکلّف کو ملزم بنانے کیلئے اس کا اثبات بطورِ تواتر ضروری قرار نہیں دیا، بلکہ علماءِ امت کا فیصلہ یہ ہے کہ جس امر کی بھی سند صحیح ہو اور رسم امام میں وہ موجود ہو تو وہ قرآن ہے اور اسی طرح غیرِ قرآن کے بارے میں بھی ہے کہ جو امور اپنی جگہ قطعی ہیں جیسے دعوت اِسلام تو ان کی تبلیغ صرف اخبارِ آحاد کے ذریعہ ہوجانے پر بھی حجت پوری ہو جاتی ہے، خواہ دعوتِ متواترہ نہ ہو، لہٰذا یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ جب تک کسی کافر کو اسلام کی طرف بطریقِ تواتر نہ بلایا جائے اس کو جاحد ومنکرِ اسلام قرار نہ دینا چاہیے، کیونکہ قطعی امورِ حقہ کی طرف دعوت دینے میں اخبارِ آحاد بھی کافی ہوتے ہیں، اس لئے کہ وہ فی نفسہ اپنی جگہ پر قطعی ہیں، اور جب بھی کوئی طلبِ صادق کے ساتھ ان کی طرف توجہ کرے گا، ان کا اثبات ممکن ہے لہٰذا ان میں سے کسی امر کا بھی انکار ونفی کرنا جحود ہی قرار پائے گا، جس طرح کوئی آنکھ دیکھی چیز کی خبر دے تو اس کی نفی وانکار مکابرہ یا ہٹ دھرمی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ادنیٰ توجہ سے اس امر کی تحقیق کی جاسکتی ہے غرض دوسرے پر کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے اتنا کافی ہوتا ہے کہ وہ بات فی نفسہ قطعی ہو یا اس کے پسِ پشت قطعی دلائل وآثار موجود ہوں، اور بطریق تواتر ہی ہر بات کو ثابت کرنا ضروری نہیں ہوا کرتا۔

اسی طرح امت کے وہ اجماعی فیصلے بھی ہیں جو بطریق آحاد ہم تک پہنچے ہیں کہ وہ بھی مفید قطعیت ویقین ہیں اور اس باب سے ہیں الخ (نیل الفرقدین ۱۳۶ و ۱۳۷) یہ بات حضرتؒ نے اکفار الملحدین ۵۲ میں بھی مختصراً لکھی ہے۔ ''مؤلف''!

حضرتؒ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے سادات حنفیہؒ جو خبر واحد سے کتاب پر زیادتی کا انکار کرتے ہیں وہ نسخ کے درجہ کی زیادتی مراد لیتے ہیں، ورنہ ظن کے مرتبہ کی زیادتی جتنی ہوسکتی ہے اس سے انکار نہیں ہے، لہٰذا اس سے مرتبہ وجوب کی زیادتی مثلاً ہوسکتی ہے، حضرتؒ کی یہ تحقیق اچھی تفصیل سے حضرت مولانا سیّد محمد بدر عالم صاحب مہاجر مدنی قدس سرہٗ نے مقدمہ فیض الباری ۴۵ ومابعد میں نقل کی ہے جو اہل علم کے لئے قابل قدر تحفہ ہے۔

واقعاتِ خمسہ بابتہ سہو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حضرتؒ نے فرمایا:۔ شیخ تقی الدین بن دقیق العید نے ایسے واقعات چار ذکر کئے ہیں، دو کا ذکر بخاری میں ہے۔ (۱) ظہر میں پانچ رکعت پڑھیں۔ (۲) چار والی نماز دو پڑھیں۔ (۳) ابوداؤد ۱۴۶/۱ میں ہے کہ قعدۂ اولیٰ ترک ہوگیا۔ (۴) نماز میں ایک آیت کی بھول ہوئی، نماز کے بعد حضرت ابن مسعودؓ سے سوال کیا، کیا تم نماز میں نہ تھے؟ عرض کیا، حاضر تھا، فرمایا:۔ ''پھر یاد کیوں نہیں دلایا؟'' میں کہتا ہوں ایک پانچواں واقعہ بھی ہے کہ مغرب کی نماز میں ایک مرتبہ قعدۂ اولیٰ پر سلام پھیر دیا تھا، امام بخاریؒ نے سہو کی حدیث کئی مرتبہ ذکر کی ہیں اور مختلف تراجم قائم کر کے ان سے متعدد مسائل کا استنباط کیا ہے، لیکن ترجمہ وعنوان جوازِ کلام الناس کا کہیں قائم نہیں کیا، معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں انہوں نے حنفیہ کی موافقت کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

تحری الصواب کا امر نبوی! حضور علیہ السلام نے جو فرمایا کہ جب تمہیں تعدادِ رکعات وغیرہا میں شک لاحق ہو تو صواب وصحیح بات کو سوچ بچار کر کے متعین کرو، اور پھر اسی کے مطابق اپنی نماز پوری کرلو، اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں شک کی الگ الگ صورتوں میں تین حکم ہیں اگر پہلی مرتبہ شک ہوا تو پھر سے نماز پڑھے، اور نہ دل میں اچھی طرح سوچ کر غلبہ ظن پر عمل کرے، یہ بھی نہ ہو تو متیقن چیز یعنی کم کو صحیح سمجھے، پھر ہمارے مشائخ میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ وہ اس صورت میں سجدۂ سہو نہ کرے (کمافی الجوہرۃ النیرہ ورد المختار نقلاً عن السراج الوہاج) اور یہی قول اقرب ہے، لیکن اکثر کہتے ہیں کہ سجدہ کرنا چاہیے (کمافی الفتح) باقی تیسری صورت میں سجدۂ سہو قطعاً ہوگا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ تمام صورتوں میں اقل ہی کو اختیار کرے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ احادیث سے تائید ہمارے ہی مذہب کی نکلتی ہے، کیونکہ پھر سے نماز پڑھنے کی بھی روایت ہیں مثلاً مصنف ابن ابی شیبہ میں، اور تحری واخذ بالاقل کی بھی ہیں، جیسے مسلم شریف میں اور یہ بخاری میں، لہٰذا ہم نے سب احادیث پر عمل کیا اور شافعیہ نے صرف اقل والی پر کیا اور باقی سب کی تاویل کی، اور تحریِ صواب کو بھی اقل پر ہی محمول کر دیا حالانکہ لغت اس کے بالکل خلاف ہے اور اس کے اصل معنی کو لغو کر دینا درست نہیں، خصوصاً جبکہ شریعت میں غلبہ ظن کا اعتبار بہت سے ابواب میں موجود بھی ہے، لہٰذا اُس نوح کو یہاں غیر معتبر ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں، دوسرے ان کے مذہب پر ایک نوع کو اس کے حکم سے بالکلیہ خالی کر دینا لازم آئے گا، جو درست نہیں ہے۔

باب ماجاء فی القبلة ومن لم یرا لاعادة علی من سها فصلی انی غیر القبلة وقد سلم النبی صلی الله علیه وسلم فی رکعتی الظهر واقبل علی الناس بوجهب ثم اتم ما بقی

(قبلہ کے متعلق جو منقول ہے اور جنھوں نے بھول کر غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنے والے کے لئے اعادہ ضروری خیال نہیں کیا، اور بے شک نبی علیہ السلام نے ظہر کی دو رکعتوں میں سلام پھیر کر لوگوں کی طرف اپنا منہ کر لیا، اس کے بعد جو باقی رہ گیا تھا، اسے پورا کیا تھا۔)

(۳۹۰) حدثنا عمرو بن عون قال نا هشیم عن حمید عن انس بن مالک قال قال عمر رضی الله عنه وافقت ربی فی ثلث قلت یا رسول الله لواتخذنا من مقام ابراهیم مصلی اٰیة الحجاب قلت یا رسول

الـلـه لوامرت نسآئک ان یحتجبن فانه' یکلمهن البر والفاجر فنزلت اٰیة الحجاب واجتمع نسآء النبی صـلـی الـلـه عـلـیـه وسـلم فی الغیرة علیه فقلت لهن عسیٰ ربه' ان طلقکن ان یبدله' ازواجاً خیراً منکم مسلمات فنزلت هٰذه الاٰیة

(۳۹۱)حـدثـنـا عبـدالـلـه بـن یوسف قال انا مالک عن عبدالله بن دینار عن عبدالله بن عمر قال بینا الـنـاس بقبـآء فـی صـلـوٰة الصبح اذجآء هم اٰت فقال ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قدانزل علیه اللیلة قراٰن وقدا امران یستقبل الکعبة فاستقبلوها وکانت وجوههم الی الشام فاستداروا الی الکعبة

(۳۹۲)حـدثـنـا مسدد قال نا یحیی عن شعبة عن الحکم عن ابراهیم عن علقمة عن عبدالله قال صلی النبی صلی الله علیه وسلم الظهر خمساً فقالوا ازید فی الصلوٰة قال وماذاک قالوا صلیت خمساً فثنیٰ رجله' وسجد سجدتین

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا، میں نے اپنے پروردگار سے تین باتوں میں موافقت کی (ایک مرتبہ میں نے کہا، کہ یارسول اللہ ﷺ کاش! ہم مقام ابراہیم کو مصلّی بناتے، پس اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِیْمَ مُصَلًّی اور حجاب کی آیت (بھی میری خواہش کے مطابق نازل ہوئی) کیونکہ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ کاش! آپ اپنی بی بیوں کو پردہ کرنے کا حکم دے دیں اس لئے کہ ان سے ہر نیک و بد گفتگو کرتا ہے پس حجاب کی آیت نازل ہوئی، اور (ایک مرتبہ نبی ﷺ کی بیبیاں آپ پر نسوانی جذبہ وغیرت کے تحت جمع ہوئیں، تو میں نے ان سے کہا کہ اگر حضور علیہ السلام طلاق دے دیں گے، تو عنقریب آپ کا پروردگار تم سے اچھی بی بیاں آپ کو بدلے میں دے گا، جو حکم بردار ہوں گی، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

ترجمہ! حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) لوگ (مقام) قبا میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ یکا یک ان کے پاس ایک آنے والا آیا، اس نے کہا کہ رسول خدا ﷺ پر آج کی رات ایک آیت نازل کی گئی ہے، آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کرلیں، یہ سن کر سب لوگوں نے کعبہ کی طرف منہ کرلئے (اس سے قبل) ان کے منہ شام کی طرف تھے۔

ترجمہ! حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) ظہر میں پانچ رکعتیں پڑھیں، صحابہ نے عرض کیا کہ کیا نماز میں (کچھ) زیادتی کردی گئی؟ آپ نے فرمایا، وہ کیا، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے پانچ رکعتیں پڑھیں، عبداللہ کہتے ہیں، پس آپ نے پیر موڑ کر دو سجدے کیے۔

تشریح! امام بخاریؒ چونکہ جہل ونسیان کو عذر ٹھیرانے میں زیادہ وسیع النظر ہیں، اس لئے یہاں مستقل باب قائم کرکے بتلایا کہ سہو ونسیان کی وجہ سے اگر ایک شخص غیر سمتِ قبلہ کی طرف بھی نماز پڑھ لے گا تو اس کی نماز درست ہوجائیگی جس طرح ان کے نزدیک نجس کپڑے میں بھی بھول سے نماز پڑھ لے تو نماز ہوجاتی ہے، حنفیہ کے یہاں اس قدر توسع نہیں ہے البتہ قبلہ سے انحراف میں حنفیہ کے نزدیک بھی توسع ہے، چنانچہ حالتِ نماز میں حدث طاری ہو تو قبلہ سے پیٹھ پھیر کر وضو کے لئے جاسکتا ہے، اور آکر باقی نماز پوری کرلے گا، بشرطیکہ مسجد سے باہر قریب جگہ وضو کی ہوتے ہوئے دور نہ جائے کیونکہ وضو تو بہرحال مسجد سے باہر ہی کرے گا اور اگر یوں ہی خیال ہوا کہ حدث لاحق ہوگیا ہے، پھر کچھ دور جاکر یقین یا ظنِ غالب عدم وجود حدث کا ہوا تو لوٹ کر باقی نماز پڑھے گا، بشرطیکہ مسجد سے باہر نہ نکلا ہو، اگر مسجد سے نکل کر صحیح خیال آیا تو پوری نماز پھر سے پڑھنی پڑھے گی، اس طرح اگر خیال کیا کہ نماز پوری ہوگئی اور لوٹنے کے بعد یاد آیا کہ کچھ نماز باقی رہ گئی ہے تب بھی واپس ہوکر باقی نماز پڑھ لے گا، بشرطیکہ مسجد سے باہر نہ ہوا ہو۔ (فتح القدیر ۲۷۱/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ فیض الباری ۲/۲۴ سطر ۲۳ میں عبارت بشرط ان لا یخرج من المسجد بے محل درج ہوگئی ہے۔ کمالا یخفی، نیز واضح ہو کہ ساری مسجد کا حکم محلِ واحد کا ہے۔

محقق عینیؒ نے لکھا: عنوان باب میں جو حدیث ذکر ہوئی اس کے ترجمہ سے مطابقت بہ لحاظ اس کے ہے کہ نماز بھول کر غیر قبلہ کی طرف بھی درست ہوسکتی ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے بھولے سے دو رکعت پر سلام پھیر کر لوگوں کی طرف توجہ فرمائی تھی اور اس صورت میں بھی وہ حکماً نماز کے اندر ہی تھے۔

اس کے بعد محقق عینیؒ نے لکھا کہ یہ تعلیق قصہ ذی الیدین والی حدیثِ ابی ہریرہؓ کا ٹکڑا ہے اور ابن بطال اور ابن التین نے جو اس کو حدیثِ ابن مسعودؓ کا جز وسمجھا ہے وہ ان کا وہم ہے کیونکہ حدیث ابن مسعودؓ کے کسی طریقِ روایت میں یہ نہیں ہے کہ حضور علیہ السلام نے دو رکعت پر سلام پھیرا تھا، پھر لکھا:۔

پہلی حدیث الباب کے ترجمہ سے مطابقت اس طرح ہے کہ واتخذوامن مقام ابراهيم مصلی میں مقام ابراہیم سے مراد کعبہ معظّمہ ہے جو ایک قول ہے اور باب بھی قبلہ سے متعلق ہے، یا مراد کل حرم ہے، جو آفاق والوں کے حق میں قبلہ ہے، اور اگر مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہو جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے تو مطابقتِ ترجمہ بہ لحاظ متعلقاتِ قبلہ ہوگی، خود قبلہ کے لحاظ سے نہ ہوگی۔

دوسری حدیث الباب کی مطابقت ترجمہ سے ظاہر ہے کیونکہ اس میں کعبہ معظّمہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تھا، اور ان لوگوں نے پہلے نماز قبلہ منسوخہ کی طرف پڑھی تھی جو غیر قبلہ تھا اور ناواقفیت کے سبب سے وہ بھولنے والے کے حکم میں تھے، اسی لئے نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا گیا۔

تیسری حدیث الباب کی مطابقت بھی واضح ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے سہو کی صورت میں نماز کا اعادہ نہیں فرمایا اور آپ نے سلام کے بعد لوگوں کی طرف توجہ فرمائی، پھر جب پہلی ہی نماز پر بنا کی تو معلوم ہوا کہ کعبہ سے پشت کرنے کی حالت میں بھی آپ حکماً نماز ہی میں تھے، اگر نماز سے خارج ہو جاتے تو سابقہ نماز پر بنا نہ کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ جو خطاءً قبلہ سے انحراف کرے گا اس کی نماز درست ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں (عمدہ ۲/۱۸ا۳)

نطقِ انور! حضرتؒ نے فرمایا:۔ قولہ الظھر خمسا، ایسی صورت میں حنفیہ کے نزدیک چوتھی رکعت پر بیٹھنا ضروری ہے، ورنہ فرض نماز نفل بن جائے گی، لیکن شافعیہ کے مسلک پر اس کی ضرورت نہیں، اور نماز بہر صورت فرض کے طور پر صحیح ہو جائیگی، ہمارا جواب یہ ہے کہ مسئلہ اجتہادی ہے کسی کے پاس دلیلِ شرعی نہیں ہے، البتہ ہمارے پاس تفقہ کے لحاظ سے قوی دلیل موجود ہے، وہ یہ کہ دینِ محمدی میں نماز تین قسم کی ہیں، دو رکعت والی، تین رکعت والی، اور چار رکعت والی، اور ظاہر ہے کہ نماز کے دو یا چار ہونے کا تحقق جو متواتراتِ دین سے ہے صرف قعدہ سے ہوتا ہے، لہٰذا وہ بھی فرض اور ضروری ہوگا کیونکہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوگا، اسی لئے حنفیہ نے کہا کہ ایک رکعت سے کم کا رفض وترک جائز ہے، بخلاف اس کے پوری رکعت ہو جانے پر نماز کا اہتمام فرض ہوگا، کیونکہ وہ متواترات دین سے ہے یعنی شریعت نے اس کو معتد بہ امر قرار دیا ہے جس کو ترک نہیں کر سکتے کہ اس سے دین کے ایک متواتر و مسلم امر کی توڑ پھوڑ یا اس کو بے حیثیت کرنا لازم آتا ہے۔

علامہ نووی نے اقرار کیا ہے کہ یہ واقعہ نسیان والا اور بات کرنے کا بدر سے کچھ قبل کا ہے، لہٰذا یہ تو مسلم ہوا کہ نسخ کلام کی صورت سب کے نزدیک ثابت ہے، اختلاف صرف تاریخ میں ہے کہ کب ہوا؟ لہٰذا حدیث ذی الیدین میں اس کا عذر پیش کرنا محض نفعِ مذہب کے لئے نہیں ہے بلکہ ایسے ثابت شدہ امر کے باعث ہے جو سب کو تسلیم ہے۔

قولہ فثنی رجله وسجد سجدتین۔ پر فرمایا:۔ اگر کہا جائے کہ جب کلام اس وقت نماز کے اندر جائز ہی تھا تو سجدۂ سہو کی کیا ضرورت تھی؟ میں کہتا ہوں وہ نماز کے اندر غیر اجزاء صلوٰۃ کی دخل اندازی کے باعث تھا، اس باب کو اگرچہ علماء نے ذکر نہیں کیا، مگر غالباً اس

وقت مسئلہ یہی رہا ہوگا کہ کلام وغیرہ سے عدم فساد صلوٰۃ کے ساتھ اس کی تلافی سجدۂ سہو سے ہو جاتی ہوگی۔

حدیث الباب اور مناقب وموافقات سیدنا عمرؓ

یہاں پہلی حدیث الباب میں حضرت عمرؓ کی موافقات کا ذکر ہوا ہے، کرمانی شرح بخاری میں ہے کہ **وافقت ربی بمعنی وافقنی ربی** ہے کہ میرے رب نے میری موافقت کی، رعایت ادب کے لئے موافقت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، اور بعض حضرات نے ۲۱ چیزوں میں موافقت ذکر کی ہے جیسا کہ اس کو علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں نقل کیا ہے (حاشیہ بخاری ۵۸/۱)

حافظ نے لکھا:۔ ترمذی میں حدیث ابن عمرؓ ہے کہ کبھی بھی کوئی حادثہ پیش نہیں آیا جس میں دوسرے لوگوں نے ایک رائے دی ہو اور حضرت عمرؓ نے دوسری، مگر یہ کہ قرآن مجید حضرت عمرؓ ہی کی رائے کے موافق اترا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بہ کثرت موافقت ان ہی کی ہوئی ہے لیکن نقل کے مطابق تعیین کے ساتھ پندرہ چیزوں میں موافقت ہمارے علم میں آئی ہے (فتح ۳۴۱/۱)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ تعداد کا اہتمام غالباً وحی قرآن مجید کی موافقات کے پیش نظر رہا ہے، ورنہ حسب ارشاد حضرت ابن عمرؓ مطلق وحی نبوت کی موافقت بہ تعداد کثیر پائی گئی ہے اور ان سب کے بھی شمار کی طرف توجہ کی جاتی تو عدد بہت بڑھ جاتا اس کے بعد مناسب ہے کہ حضرت عمرؓ کے کچھ مناقب اور پھر آپ کی موافقات کا بیان کیا جائے، واللہ الموفق!

مناقب امیر المومنین سیدّنا عمر فاروق رضی تعالیٰ اللہ عنہ

محدَّث ومکلَّم ہونا! حضرت ابو ہریرہؓ سے بخاری ومسند احمد میں، اور حضرت عائشہؓ سے مسلم، ترمذی، نسائی ومسند احمد میں حدیث ہے کہ تم سے پہلی امتوں میں محدث ہوتے تھے، پس اس امت میں اگر کوئی ہے تو وہ عمرؓ ہیں، اور بخاری میں دوسری جگہ حضرت ابو ہریرہؓ سے اس طرح سے حضور علیہ السلام کا ارشاد نقل ہوا کہ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ ہوا کرتے تھے جن سے کلام کیا جاتا تھا بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں اگر میری امت میں ایسا کوئی ہے تو وہ عمرؓ ہیں، اور حدَّثون کے معنی ملہمون کے ہیں کہ ان کے دلوں میں ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے القاء ہوتا تھا، یا ظاہری معنی رکھے جائیں تو وہ بھی صحیح ہیں کہ ان سے فرشتے باتیں کرتے تھے جو اگر چہ بدرجہ وحی انبیاء نہ تھیں، تاہم وہ بھی بہت بڑی فضیلت تھی علامہ تورپشتیؒ نے فرمایا:۔ محدَّث ان کے یہاں وہ شخص ہوتا تھا کہ جس کا ظن وگمان صادق ہوتا تھا، اور درحقیقت ان کے دل میں ملا اعلیٰ کی چیزیں ڈالی جاتی تھیں، گویا وہ اس سے کہی جاتی تھیں، پھر حضور علیہ السلام کا ارشاد مذکور بطور تردد کے نہ تھا کیونکہ یہ امتِ محمدیہ تو افضل الامم ہے جب پہلی امتوں میں ایسے ہوتے تھے تو اِس امت میں تو بدرجہ اولیٰ ان سے تعداد ومرتبہ میں زیادہ ہوں گے، لہٰذا آپ کا ارشاد بطور تاکید و یقین کے ہے، جیسے کہتے ہیں کہ میرا اگر کوئی دوست ہے تو وہ فلاں شخص ہے، جس سے مقصد اس کی کمالِ صداقت کا اظہار ہوا کرتا ہے، نہ کہ تردد وشک یا نفی صداقت (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۵۳۱/۵)

حدیث میں محدَّث سے مراد اہل الہام ہیں، جن کے دل میں کوئی چیز القاء کی جائے، پھر وہ اس چیز کو اپنی حدس وفراست کے نور سے معلوم کرکے خبر دیتے ہیں، بعض نے کہا کہ مراد مصیب ہیں کہ جو گمان کریں درست نکلتا ہے گویا وہ ان کو بتلا دیا گیا ہے بعض نے کہا کہ ان سے فرشتے باتیں کرتے ہیں، بخاری میں مکلمون کی روایت بھی ہے یعنی صواب ان کی زبانوں پر جاری ہوتا ہے اور اسی لئے حضرت عمرؓ نے **وافقتُ ربی** فرمایا (مجمع البحار ۲۴۲/۱)

ارشادات حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ

حضرتؒ نے ''ازالۃ الخفاء'' میں خلفائے راشدین کے کمالات ومناقب اور استحقاقِ خلافتِ خاصہ نبویہ پر سیر حاصل کلام کیا ہے، جو

دوسری کتابوں میں موجود نہیں ہے وہ سب ہی علماءِ کے مطالعہ کی خاص چیز ہے، مگر ہم یہاں کچھ اجزاء بہ سلسلہ محدَّثیت حضرت عمر رضی تعالیٰ اللہ عنہ نقل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:۔ خلفائے راشدین جوہر (نفس) انبیاء علیہم السلام کے مشابہ تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا تو رسولِ اکرم ﷺ کے دل کو سب بندوں کے دلوں سے بہتر پایا، لہٰذا ان کو برگزیدہ کیا، اور رسالت بخشی، پھر دوبارہ بندوں کے دلوں کو دیکھا تو آپ کے اصحاب کے دلوں کو اور بندوں سے بہتر پایا، لہٰذا ان کو اپنے نبی کا وزیر بنایا، اور علامہ ابوعمرؒ نے حضرت عباسؓ کا قول نقل کیا کہ آیت قل الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفىٰ میں برگزیدہ بندوں سے مراد صحابہ کرام ہیں، اور بخاری و مسلم میں حضرت عمرؓ کو اس امت کا محدَّث فرمایا گیا ہے، نیز ترمذی میں روایتِ حضرت عائشہؓ ہے کہ ایک روز رسول اکرم ﷺ گھر میں تشریف فرما تھے، باہر کچھ شور سُنا گیا تو آپ نے دیکھا کہ ایک حبشی عورت کچھ کھیل کھیل رہی ہے اور بچے اس کے گرد جمع ہیں، حضور نے فرمایا:۔ عائشہ! آؤ اور دیکھو، چنانچہ میں گئی حضور کے پیچھے کھڑی ہو کر شانہ مبارک سے اس کا کھیل دیکھنے لگی، آپ نے کئی بار پوچھا کہ تم ابھی سیر نہیں ہوئیں؟ میں ہر دفعہ کہہ دیتی تھی کہ ابھی نہیں تاکہ دیکھوں حضور کے دل میں میری کتنی قدر ہے، پھر یکا یک وہاں حضرت عمرؓ آنکلے تو سب لوگ اس حبشی عورت کے پاس سے بھاگ گئے، اور اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میں شیاطینِ جن وانس کو دیکھتا ہوں کہ عمر سے بھاگتے ہیں، اس کے بعد میں بھی گھر میں لوٹ آئی (ازالہ ۱۲۶/۱)

دارمی میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا، جب آپ نبی بنائے گئے تو کیسے معلوم کیا کہ میں نبی ہوں، آپ نے جواب دیا کہ میرے پاس دو فرشتے آئے، ایک زمین پر اتر گیا، اور دوسرا آسمان وزمین کے درمیان معلق رہا، ایک نے دوسرے سے کہا کہ جن کی نبوت کا فرمان ملاِ اعلیٰ میں جاری ہوا ہے کیا یہ وہی ہیں؟ دوسرے نے کہاں ہاں! اس نے کہا اچھا! ان کو ایک آدمی کے ساتھ وزن کرو چنانچہ مجھے ایک آدمی کے ساتھ وزن کیا گیا تو میں اس سے وزنی نکلا، پھر اس سے کہا کہ دس آدمیوں کے ساتھ وزن کرو تو میں ان سے بھی وزنی نکلا، پھر سو آدمیوں کے ساتھ وزن کیا گیا تو میں ان سے بھی بڑھ گیا، پھر ایک ہزار کے ساتھ وزن کیا گیا تو ان سے بھی وزنی نکلا، اور گویا میں اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ پلّہ کے ہلکے ہونے کے باعث وہ سب لڑھکے جاتے ہیں، اور اس فرشتے نے کہا کہ اگر ان کو تمام امت کے ساتھ بھی وزن کرو گے تب بھی یہ ہی وزنی رہیں گے۔

دوسری روایت احمد بن مردویہ نے حضرت ابن عمرؓ سے اس طرح نقل کی کہ ایک روز رسول اکرم ﷺ آفتاب نکلنے کے بعد باہر تشریف لائے اور فرمایا:۔ فجر سے قبل میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے بہت سی مقالید وموازین (کنجیاں اور ترازو) دی گئیں ہیں، پھر دیکھا کہ ایک پلّہ میں مجھے رکھا گیا اور دوسرے میں میری امت[1] کو، تو میں سب سے وزنی نکلا، اس کے بعد ابوبکرؓ لائے گئے، اور ان کو ساری امت کے ساتھ وزن کیا گیا، تو وہ سب سے وزنی نکلے، پھر عمرؓ لائے گئے، اور سب امت سے وزن میں بڑھ گئے، پھر عثمان لائے گئے اور وہ بھی سب امت سے وزنی نکلے، اس کے بعد وہ ترازو آسمان پر اٹھالی گئی، ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اوّل تو حضور علیہ السلام کے لئے فضلِ کلی حاصل ہے جو لازمہ نبوت ہے، پھر یہی خواب بعینہ خلفاء کے بارے میں دیکھا گیا تو اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ کسی شخص کی خلافت کے بارے میں ارادۂ الٰہیہ قائم ہوتے ہی اس کو بھی فضلِ کلی تمام رعیت پر حاصل ہو جاتا ہے، گو ہنوز اس کو خلافت نہ ملی ہو، اور خلفاء کا اپنی رعیت سے عنداللہ افضل ہونا اور علمِ خداوندی میں برتر ہونا خلافت خاصہ کو لازم ہے اور اس کے ہمراہ وہ افضیلت جو بوجہ سوابق اسلامیہ یا بوجہ اوصافِ خلقیہ مثل حسنِ سیاست وغیرہ کے ہو وہ الگ چیز ہے جو عادتِ الٰہی کے موافق خلیفہ بننے کی حقیقت کو لازم ہے واللہ تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال (ازالۃ الخفاء ۱۲۹/۱)

---

[1] غالباً مراد ساری امتِ دعوت واجابت ہے، جس میں اولین وآخرین اور کفار ومومنین سب شامل ہیں اور گویا جس طرح نبی اپنے وقت میں اکیلا ساری امت سے زیادہ وزندار ہوتا ہے، اسی طرح اس کے خلفاءِ راشدین اور سلاطین وائمہ عدل بھی روئے زمین کے سارے لوگوں پر بھاری، غالب، منصور من اللہ اور خلفاء اللہ فی الارض کے مرتبہ عالیہ سے سرفراز ہوتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم!'' مؤلف''

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حضرت سیدنا عمرؓ کے تذکرہ میں ایک عنوان ''رسالہ تصوف وسلوک'' بھی قائم کیا ہے جس میں واضح کیا کہ حقیقتِ تصوف کی (جس کو شرع نے ''احسان'' سے تعبیر کیا ہے) تین اصل ہیں (۱) اعمالِ خیر کے ذریعہ یقین پیدا کرنا، جو بغیر اخلاص واکثارِ اعمال، اور بلاخشوع وخضوع وترکِ حدیثِ نفس کے حاصل نہیں ہوسکتا (۲) اس یقین سے طبیعت نفس وقلب کے درمیان سے مقامات کا پیدا ہونا، جن میں سے دس اعلیٰ واصولِ مقامات توبہ، زہد، صبر، شکر، رجاء، خوف، توکل، رضا، تفرد محبت ہیں، جب یقین بطورِ جبلّت قلب پر مستولی ہوجاتا ہے اور چاروں طرف سے قلب کو گھیر لیتا ہے تو لامحالہ رجاء وخوف وغیرہ کا تعلق صرف ذاتِ الٰہی سے قائم ہوجاتا ہے اور اعتماد اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہوجاتا ہے، ان مقاماتِ مذکورہ کے علاوہ وہ بھی ہیں جن کی بشارت رسول اکرم ﷺ نے بعض صحابہ کو دی ہے مثلاً صدیقیت، محدثیت، شہیدیت، حواریت وغیرہ، اس سے معلوم ہوا کہ جو یقین وجبلت قلب ونفس کے درمیان سے پیدا ہو صرف اسی کو مقام سلوک کا درجہ دیں گے، لہٰذا اگر کسی شخص کے دل پر یقین مستولی وغالب نہ ہو تو اس کی تمام صفات صرف ذاتی وطبعی ہوں گی، مقاماتِ سلوک سے نہیں (۳) قلب ونفس پر یقین مستولی ہونے پر ہر بات کو یقین کے ساتھ پیش کرنا اور اس کے ہر اقدام میں استقلالِ عظیم کا رونما ہونا، ان تینوں اصول کا حامل ہوتا ہے، اس سے کراماتِ خارقہ اور تربیتِ مریداں وغیرہ احوال ظاہر ہوتے ہیں، اور چونکہ حضرت عمرؓ اس امتِ مرحومہ میں علوم تصوف کے لحاظ سے اعلم صوفیہ تھے اس لئے آپ نے تمام مباحث وعلوم تصوّف کی قولاً وفعلاً وضاحت فرمائی ہے اور بعد وفاتِ نبوی امتِ مرحومہ کی پوری تربیت فرمائی ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ

دوسرے یہ کہ نفسِ ناطقہ کو دو قوتیں عطا کی گئی ہیں، قوتِ عاقلہ اور قوتِ عاملہ، جب پہلی قوت کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ مقام وحی سے سرفرازی کا موجب ہوتی ہے، اور جب دوسری قوت کامل ہوتی ہے تو مقام عصمت حاصل ہوتا ہے، اگر کسی امتی کے نفس ناطقہ میں یہ دونوں قوتیں جمع ہوجاتی ہیں تو ان سے ثمراتِ کثیرہ پیدا ہوتے، اور اس وقت یہ صاحبِ نفس مرشدِ خلائق خلیفہ برحق رسول اکرم ﷺ اور مظہر رحمت الٰہی ہوتا ہے پس قائم مقام وحی محدثیت وموافقتِ وحی ہے اور کشفِ صادق وفراستِ المعیہ نائبِ عصمت ہے، ایسے شخص کے سایہ سے بھی شیطان بھاگتا ہے نیز ان دونوں کے اجتماع سے شہیدیت ونیابت پیغمبر علیہ السلام بھی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت عمرؓ کو محدثیت کا مقام حاصل تھا، چنانچہ حضور علیہ السلام نے اس کی خبر اور بشارت دی ہے اور یہ خبر مشہور ہے، نیز حضرت عقبہ بن عامر نے یہ الفاظ روایت کئے ہیں، **لو کان نبی بعدی لکان عمر بن الخطاب** (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے) یہ روایت سنن ترمذی[1] ومسند احمد میں ہے۔

---

[1] اس سے بتلایا گیا کہ حضرت عمرؓ کے اندر انبیاء علیہم السلام کے اوصاف اور مرسلین کے اخلاق وملکات تھے، اس حدیث کو علاوہ ترمذی کے امام احمد، حاکم، ابن حبان وطبرانی نے بھی اوسط میں روایت کیا ہے، کذا فی الفتح (تحفۃ الاحوذی ۳۱۵/۴)

باب مناقب عمر بخاری میں حدیث **لقد کان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن فی امتی منهم احد فعمر.** کے بعد نقل ہے کہ حضرت ابن عباسؓ آیت **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث الا اذا تمنی** پڑھا کرتے تھے یعنی ولا محدث کی زیادتی کے ساتھ، حافظؒ نے لکھا کہ حضرت عمرؓ کے ذکر کی تخصیص کا سبب یہ ہے کہ آپ سے بہ کثرت موافقاتِ قرآن مجید کا صدور حضور اکرم ﷺ کے زمانہ مبارکہ میں تو ہوا ہی ہے آپ کے بعد بھی بہت سی مرتبہ اصابتِ رائے کا ثبوت ہوا ہے (فتح ۳۷/۷) بعد والی اصابت میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا قائم کرانا ہے کہ حضرت عمرؓ ہی نے اس کی ابتداء اور تکمیل کرائی، ورنہ اس وقت بہت بڑا اختلاف اور فتنہ رونما ہوجاتا، اور یہ بھی حضور علیہ السلام کی پیش گوئی کے مطابق ہوا ہے کیونکہ آپ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں فرمایا تھا جب تک تم موجود ہو کوئی فتنہ لوگوں کی پریشانی کا موجب نہ ہوگا اور یہ بھی حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت سے فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا، چنانچہ اسی طرح واقع بھی ہوا، اور داخلی وخارجی ہر قسم کے فتنوں کی یورش میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا چلا آرہا ہے پھر قیامت تک ان میں زیادتی ہی ہوتی رہے گی، **اللهم اعذنا من شر الفتن کلها وثبت اقدامنا وانصرنا فانک خیر الناصرین**۔ آمین ''مؤلف''

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ جو بات کہتے تھے، قرآن مجید میں بھی اسی کی تصدیق اُترتی تھی اور فرمایا کہ ہم سب کا خیال یہ تھا سکینت لسانِ عمرؓ پر جاری ہوتی ہے، یعنی آپ کے دل سے زبان پر وہ باتیں آتی ہیں، جن سے دوسروں کے قلوب ونفوس سکون وطمانیت حاصل کرتے ہیں (مرقاۃ ۵۳۷/۵) اور فرمایا:۔ ہم سمجھتے تھے کہ حضرت عمرؓ کو شیطان گناہ وخطا کی ترغیب دینے سے ڈرتا ہے، یعنی اس کی جرات نہیں کرسکتا، حضرت ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ اگر صحابہ کرام میں کسی امر پر اختلاف ہوتا تو قرآن مجید میں وہی اترتا تھا جو حضرت عمر فاروقؓ کہتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ سے نقل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق کو حضرت عمرؓ کے دل وزبان پر جاری کردیا ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت میں ابوبکر وعمرؓ کا مرتبہ کوکبِ دری کی طرح روشن وممتاز ہوگا (ابوداؤد وغیرہ) بھیڑیئے اور بیل کی باہم گفتگو والا قصہ بیان کرکے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس قصہ کی صحت تسلیم کرتا ہوں اور ابوبکرؓ وعمر بھی تسلیم کرتے ہیں (حالانکہ اس وقت یہ دونوں وہاں موجود بھی نہ تھے) اسی طرح حضور علیہ السلام کا جنت میں حضرت عمرؓ کے محل کو دیکھنا، اور خواب میں اپنا بچا ہوا دودھ ان کو عنایت کرنا اور خواب میں حضرت عمرؓ کو ٹخنوں تک نیچا خوب بڑا کرتہ پہنے ہوئے دیکھنا، وغیرہ بھی ان کی خصوصی فضیلت ومنقبت کو ظاہر کرتی ہیں، یہ بھی فرمایا کہ جب تک یہ تم میں رہیں گے تم فتنوں سے محفوظ رہوگے اور خود حضرت عمرؓ کو خطاب فرمایا کہ تمہارے اور فتنہ کے درمیان بند دروازہ حائل ہے، یہ اور دوسرے غیر محصور فضائل یہ تو اتر معنوی ثابت ہیں اور متواتراتِ دین میں سے ہیں (ازالۃ الخفاء ۲/۲۹۱ تا ۲/۲۹۵ اردو ترجمہ شائع کردہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

نور یقین کا استیلاء

جب نور یقین قوت عاملہ پر اس درجہ مستولی وغالب ہوجاتا ہے کہ انسان کی قوتِ بہیمیہ وسبعیہ مسخر ومغلوب ہوجاتی ہے تو اُس نور یقین کے ثمرات ونتائج ظاہر ہوتے ہیں مثلاً امرالٰہی کے اتباع میں سخت ہونا خلق اللہ پر شفیق ومہربان ہونا، کتاب اللہ کے احکام سامنے آتے ہی خلاف ارادہ سے رک جانا، لذاتِ نفسانیہ سے بے رغبتی کرنا، وغیرہ اور حضرت عمرؓ کو اس قسم کا نور یقین حاصل تھا، جس پر احادیث کثیرہ دلالت کرتی ہے، فرمایا:۔ رحم اللّٰہ عمر یقول الحق وان کان مرا ترکہ الحق ومالہ من صدیق" (اللہ تعالیٰ عمر پر رحم کرے، حق بات ضرور کہہ گزرتے ہیں اگرچہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو، حق گوئی نے ان کو سب سے الگ تھلگ سا کردیا ہے جیسے ان کا کوئی دوست نہیں" یعنی دنیاداروں میں سے، ورنہ اہلِ ایمان واخلاص تو آپ سے محبت کرتے ہی تھے) اسی نور یقین کے باعث حضرت عمرؓ نے ایلاء کے واقعہ میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں رباح کی معرفت یہ بھی کہہ دیا تھا کہ حضور کہیں یہ خیال نہ فرمائیں کہ حفصہ کی سفارش لے کر آیا ہے، واللہ، اگر حضور مجھے اس کی گردن مارنے کو کہیں گے تو میں اس سے بھی تامل نہ کروں گا۔ جیسا کہ مسلم شریف وغیرہ میں ہے (ازالۃ الخفاء ۲/۳۰۷)

دوسری صورت یہ ہے کہ نور یقین کا غلبہ واستیلاء قوتِ عاقلہ پر ہوجاتا ہے، متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ کو یہ مقام بھی حاصل تھا، چنانچہ آپ کو اس امتِ محمدیہ کا محدَّث فرمایا گیا کہ قرآن یا حدیث آپ کی رائے کے مطابق اترتی تھی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ قرآن یا حدیث آپ کی رائے سے حرف بحرف مطابق ہوئی ہو، اس لئے اگر قرآن وحدیث میں کسی قدر اضافہ اور زائد فائدہ بھی نازل ہوا ہو تو یہ امر موافقت ومطابقت کے مخالف نہیں ہے مثلاً حضرت عمرؓ کی خواہش تھی کہ ازواجِ مطہرات کو حجاب میں رکھا جائے، حتی کہ حاجاتِ ضروریہ کے لئے بھی نکلنے کی ممانعت ہوجائے، اس پر آیتِ حجاب نازل لیکن حاجاتِ ضروریہ کے لئے نکلنے کو مستثنیٰ رکھا گیا، حضور علیہ السلام نے بدلالتِ لفظ یا بدلالتِ معنی جان لیا کہ اصل مقصودِ وحی حجاب ہے، جس کی حضرت عمرؓ نے خواہش کی تھی اور بول وبراز سے روکنے میں حرج ہے، یہ فائدہ حضور علیہ السلام نے زیادہ بیان فرمادیا، جسے حضرت عمر رضی تعالیٰ اللہ عنہ نہیں سمجھ سکے تھے، لہٰذا اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مسئلہ حجاب میں آپ کی موافقت نہیں ہوئی ہے (ازالۃ الخفاء ۲/۳۲۹)

موافقتِ وحی! حدیث الباب ۳۹۰ میں اس کا ذکر ہے اور اس کی عظمتِ شان واہمیت کے پیشِ نظر ہم اس کو مستقل عنوان کے تحت ذکر کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ!

جنت میں قصرِ عمرؓ! حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ میں نے دیکھا کہ جنت میں داخل ہوا، وہاں رمیصاء زوجہ ابی طلحہ کو دیکھا، پھر کسی کے چلنے

کی آہٹ سُنی، پوچھا کون ہے؟ تو بتلایا کہ بلال ہیں، پھر ایک محل دیکھا جس کے ایک جانب صحن میں ایک عورت کو وضو کرتے دیکھا، میں نے پوچھا یہ کس کا محل ہے، انہوں نے بتلایا کہ حضرت عمرؓ کا ہے، میں نے ارادہ کیا کہ اندر جا کر محل کی سیر کروں، لیکن عمر کی غیرت کا خیال کر کے اُلٹے پاؤں لوٹ آیا، حضرت عمرؓ یہ سن کر رو پڑے[1] اور عرض کیا:۔ یارسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، کیا میں آپ کے لئے غیرت کر سکتا ہوں؟ فتح الباری ۳۱/ ۷ میں دوسری روایت کے حوالہ سے ہے کہ آپ نے آگے یہ بھی کہا کہ مجھے جو ہدایت حق تعالیٰ نے عنایت فرمائی وہ تو آپ ہی کے طفیل میں ہے اور جو کچھ عزت و سربلندی عطا ہوئی وہ بھی آپ کے سبب ہے۔

مرقاۃ ۵۴۴/ ۵ میں یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے جب صبح کو یہ خواب بیان کیا تو حضرت بلال کو بلا کر دریافت کیا تم مجھ سے پہلے کس عمل کی وجہ سے جنت میں پہنچ گئے کہ میں گزشتہ رات وہاں داخل ہوا تو آگے آگے چلنے کی تمہارے قدموں کی آہٹ سُنی[2]، پھر میں ایک چوکور سونے سے تعمیر شدہ محل پر پہنچا تو وہاں کے لوگوں (فرشتوں) سے پوچھا یہ محل کس کا ہے؟ انہوں نے بتلایا کی ایک عربی کا ہے، میں نے کہا:۔ میں بھی تو عربی ہوں، کہا ایک قریشی کا ہے، میں نے کہا میں بھی تو قریشی ہوں، ٹھیک بتلاؤ کہ کس کا ہے؟ انہوں نے کہا امتِ محمدیہ میں سے ایک شخص کا ہے، آپ نے فرمایا میں خود محمد ہوں، صاف طور سے بتلاؤ کہ یہ محل کس کا ہے؟ تب انہوں نے کہا کہ عمر بن الخطاب کا ہے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! میری عادت ہے کہ اذان کے بعد دو رکعت ضرور پڑھتا ہوں، اور جب وضو ساقط ہو جاتا ہے تب بھی وضو کر کے دو رکعت پڑھ لینا اپنے ذمہ لازم جیسا کر لیا ہے، آپ نے فرمایا یہ مرتبہ ان ہی دونوں کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔

مماثلت ایمانیہ نبویہ

یعنی حضرت ابوبکر و عمرؓ کو نبی اکرم علیہ السلام کے ایمان و یقین کے ساتھ خصوصی مماثلت و مشابہت کا شرف عظیم حاصل تھا، چنانچہ بخاری و مسلم و دیگر کتب صحاح میں یہ واقعہ نقل ہوا ہے کہ ایک روز آپ نے قصصِ اولین میں سے یہ قصہ بھی بیان فرمایا کہ ایک چرواہا اپنی بکریوں میں تھا، بھیڑیا آیا اور ایک بکری کو لے گیا، چرواہے نے تلاش کر کے اس کو پالیا، بھیڑیا اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا، اب تو تم مجھ سے اسے چھڑا کر لیجا سکتے ہو، مگر جب درندوں کی بادشاہی کا دن آئے گا تو ان کو ہم سے کون چھڑائے گا، اس وقت تو صرف ہم ہی ان کے محافظ[3] وغیرہ سب کچھ ہوں گے،

---

[1] مسلم کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ ہم سب حاضرین مجلس بھی روئے، فتح الباری ۳۱/ ۷ میں ہے کہ حضرت عمرؓ کا رونا یا تو زیادتی خوشی کے سبب تھا، یا شوقِ جنت کے لئے تھا یا بطور خشوع و تواضع کے تھا، اور غالباً دوسرے لوگوں کا رونا بھی جنت و نعیم جنت اور حصول رضائے خداوندی کے شوق کی فراوانی کے سبب ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

[2] بخاری باب فضل الطہور ۱۵۴ میں اس طرح ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت بلالؓ سے فرمایا:۔ تم نے اسلام لانے کے بعد کون سا عمل سب سے زیادہ امیدِ مغفرت و رضائے خداوندی کا کیا ہے، جس کے سبب میں نے جنت میں اپنے آگے آگے چلنے کی تمہاری نعلین کی آواز سنی ہے انہوں نے عرض کیا میں نے اس سے زیادہ پر امید کوئی عمل کیا کہ جب بھی دن رات کے کسی حصے میں کوئی وضو کیا تو اس سے جتنی بھی نماز مقدر تھی وہ ضرور پڑھی ہے۔

حافظؒ نے لکھا کہ امام بخاری اس حدیث کو ذکر بنی اسرائیل میں بھی لائے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ قصہ قبل اسلام کا ہے، اگرچہ بھیڑیئے کے کلام کرنے کا ایسا ہی واقعہ بعض صحابہ کے ساتھ بھی پیش آیا ہے، چنانچہ ابونعیم نے دلائل میں اہبان بن اوس سے نقل کیا کہ میں اپنی بکریوں میں تھا، بھیڑیا آیا اور ایک بکری پر حملہ آور ہوا، میں اس پر چیخا تو بھیڑیا اپنی دم بچھا کر بیٹھ کر مجھ سے کہنے لگا:۔ جس دن تو اس کا دھیان و خیال نہ کر سکے گا (کہ اپنے ہی فکر و غم میں مدہوش ہوگا) اس کی حفاظت کون کرے گا؟ تو مجھے میری اُس رزق سے محروم کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے میرے لئے پیدا کیا ہے'' میں نے تعجب سے اپنی ہتھیلی پر ہاتھ مارا کیا اور کہا:۔ واللہ:۔ میں نے اس سے زیادہ عجیب ماجرا نہیں دیکھا، اس نے کہا واہ! اس سے زیادہ عجیب تو یہی ہے کہ رسول خدا علیہ السلام ان کھجوروں کے باغات کے درمیان رونق افروز ہیں جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں اس کے بعد اہبان بن اوسؓ نبی اکرم علیہ السلام کی خدمتِ مبارک میں پہنچے اور حضور کو اس واقعہ کی خبر دی، اور اسلام لائے۔ (فتح ۱۷/ ۷)

[3] حافظؒ نے لکھا:۔ یعنی اس وقت درندے، بکریوں کو پکڑیں گے تو ان کو ہم سے چھڑانے والا کوئی نہ ہوگا، اس وقت تم ان سے بھاگو گے (یعنی شرور و فتن میں ایسے مبتلا ہو گئے کہ بکریوں کی حفاظت کی طرف دھیان بھی نہ دے سکو گے اور وہ یوں ہی آوارہ پھریں گے) اور ہم سے زیادہ قریب ہوں گے، ہمارا ہی ان پر ہر قسم کا کنٹرول و اختیار ہوگا، جتنی چاہیں گے، کھائیں گے اور جتنی چاہے دوسرے وقت کے لئے بچائیں گے الخ (فتح ۱۸) بہائم کی گفتگو کرنے کا ایک واقعہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر فرمایا کہ ایک شخص اپنی گائے یا بیل کو ہنکا کر لے جارہا تھا اور اس پر بوجھ لاد[1] رکھا تھا، وہ جانور بولا کہ میں اس کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ کھیتی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں، راویِ حدیث نے کہا کہ لوگوں نے یہ سن کر تعجب کے ساتھ سبحان اللہ کہا، اس پر نبی اکرم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا تو اس وقعہ کے حق ہونے پر ایمان و یقین ہے اور ابوبکر و عمر کو بھی اس پر ایمان و یقین حاصل ہے" حافظؒ نے لکھا کہ یہ حدیث بروایتِ ابی سلمہ مزارعۃ میں بھی گزری ہے اور اس میں ابوسلمہ کا یہ قول بھی مروی ہے کہ اس قصہ کے بیان کے وقت حاضرین و سامعین میں ابوبکر و عمرؓ موجود بھی نہ تھے گویا حضور علیہ السلام نے ان دونوں کے صدقِ ایمانی و قوتِ یقین پر بھروسہ کر کے ایسا ارشاد فرما دیا تھا، اور یہی بات اس امر کے زیادہ مناسب بھی ہے کہ اس واقعہ کو ان دونوں کے مناقب میں ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد حافظؒ نے لکھا کہ ابن حبان کی روایت میں راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ ہی سے دونوں قصوں کے آخر میں یہ بھی ہے کہ لوگوں نے کہا "ہم بھی اس پر ایمان لاتے ہیں جس پر رسول خدا علیہ السلام ایمان لائے ہیں" پھر حافظ نے لکھا:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خوارقِ عادات پر تعجب کا اظہار جائز ہے (کیونکہ کچھ صحابہ یا سب نے اولاً اظہارِ تعجب کیا تھا) اور معارف کے ادراک و فہم میں لوگوں کا تفاوت اور فرق مراتب بھی معلوم ہوا (کہ کچھ لوگوں نے یا سب نے ہی اولا اظہار تعجب کیا، اگرچہ آخر میں سب ہی کامل اطمینان و یقین کے مرتبہ پر فائز ہو گئے، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (فتح ۱۸)

بشارۃ علم! بخاری و مسلم میں حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میں نے خواب دیکھا کہ دودھ پیا اتنا کہ اس کی وجہ سے تروتازگی کے اثرات اپنے ناخنوں تک میں محسوس کئے، پھر وہ باقی دودھ عمر کو دیا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر سمجھی تو آپ نے فرمایا علم، حافظؒ نے لکھا کہ ایک حدیث میں یہ بھی اضافہ ہے کہ صحابہ نے عرض کیا:۔ وہی علم جو حق تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے جو آپ کے سیر ہونے کے بعد بچا تو اس کو حضرت عمرؓ نے لے لیا، حضور نے فرمایا تم نے ٹھیک سمجھا، اس صورت میں ایسا ہوا ہوگا کی کچھ صحابہ نے تعبیر حضور علیہ السلام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تاریخ اسلام میں اور بھی بہت معروف و مشہور ہے جو "یوم الاباقر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تاریخِ طبری اور تاریخ ابن الاثیر میں ہے کہ قادسیہ کے مشہورِ عالم تاریخی واقعہ سے قبل حضرت سعدؓ نے عاصم بن عمرو کو میسان کی فتح کے لئے روانہ کیا، عاصم وہاں پہنچے تو دشمن قلعہ میں داخل ہو کر محفوظ ہو گئے، مسلمانوں کو سامان رسد کی دقت پیش آئی اور دودھ و گوشت کا ملنا بھی دشوار ہو گیا، عاصم نے ہرچند کوشش کی مگر گائے بکریاں کہیں سے دستیاب نہ ہوئیں اتفاق سے ایک بن کے کنارے پر اہل فارس میں سے ایک شخص ملا، جو ایک چرواہا تھا، اس سے پوچھا کہ دودھ اور بار برداری کے مویشی کہاں ہیں؟ تو اس نے کہا کہ مجھے خبر نہیں ہے، لیکن اسی وقت بن کے اندر سے ایک بیل نے بلند آواز سے کہا کہ "دشمنِ خدا نے جھوٹ کہا ہم تو یہاں موجود ہیں، یہ سنتے ہی عاصم اس بن میں داخل ہو گئے، سب گائے بیلوں کو ہانک لائے اور لشکر پر تقسیم کر دیا، اس واقعہ کو تفصیل و دلائل کے ساتھ "اشاعتِ اسلام معروف بہ دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" میں بھی ذکر کیا گیا ہے، دیکھو ۱۰۹ الخ اس موقع پر پتھروں اور درختوں کا حضور علیہ السلام کو سلام کرنا اور استوانہ حنانہ کا آپ کے فراق میں رونا جو احادیث صحاح بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں مروی ہیں اور اشاعت اسلام میں بھی ۱۲۲ وغیرہ میں مذکور ہیں، اس مضمون کی تائید کے لئے کافی ہیں، نیز حضرت عمرؓ نے اپنے اسلام سے قبل بچھڑے میں سے حضور علیہ السلام کی بعثت کی بشارت سنی تھی، یہ بھی بخاری میں ہے، اور قربِ قیامت میں یہود سے جو مسلمانوں کی بڑے پیمانہ پر لڑائی ہوگی، اس میں پتھروں کے پیچھے یہودی چھپیں گے اور وہ پتھر مسلمانوں کو بتلائیں گے کہ یہودی یہاں چھپا ہے اس کو قتل کرو۔ (بخاری ۵۰۷ وغیرہ)

رہا یہ کہ جانوروں نے خود کو قربانی کے لئے اپنی خوشی سے کیسے پیش کر دیا تھا، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ابوداؤد و مسند احمد میں حدیث ہے کہ حجۃ الوداع میں ۱۱ ذی الحجہ کو قربانی کی تو ہر اونٹنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتی تھی کہ پہلے مجھے ذبح فرمائیں۔

بذل المجہود ۹۳/۳ میں لکھا:۔ اس سے معلوم ہوا کہ بے زبان حیوانات بھی حضور سے محبت کرتے تھے اور خدا کے راستے میں موت کو آپ کے مبارک ہاتھوں کے ذریعہ پسند کرتے تھے، اور یہ (ظاہر میں سب کے سامنے ان کا آپ سے قریب ہونے کی سعی کرنا) آپ کے بڑے اہم معجزات میں سے ہیں راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ کیا عجیب ہے کہ ہر قربانی کا جانور اسی طرح ہر امتی کے ہاتھوں ذبح ہونے کو بھی اسی طرح پسند کرتا ہو بلکہ حلال ذبیحہ کے جانور بھی، کیونکہ اس طریقہ سے وہ خدا کے احکام کی تعمیل میں اپنی جان جان آفریں کے حوالے کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ فضیلت ان کو موتِ طبعی اور دوسرے طریقوں پر مرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

[1] بخاری ۱۵۷ اور بخاری ۳۱۲ (ابواب المزارعۃ) میں سے ہے کہ اس پر سوار ہو کر چلا رہا تھا (ممکن ہے تھک کر سوار بھی ہو گیا ہو) اور بخاری ۴۹۴ (ذکر بنی اسرائیل) میں اس طرح ہے کہ ایک دن نبی اکرم علیہ السلام نماز صبح کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، اور بیان کیا کہ ایک شخص اپنے بیل کو ہنکائے لئے جارہا تھا پھر اس پر سوار ہوا اور مار کر چلانے لگا، تب اس نے کلام کیا، یہاں برعکس روایت ۱۵۷ بقرہ کا قصہ قصہ ذئب سے مقدم ہے اور بخاریؒ ۵۲۱ میں اختصار ہے کہ فقط قصہ ذئب کا ذکر ہے۔

پوچھی ہوگی اور کچھ نے خود جو تعبیر سمجھی تھی، اس کو آپ کے سامنے پیش کیا ہوگا۔(فتح ۳۲/۷)

قوت عمل! بخاری ومسلم میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کنویں پر ہوں، جس پر ڈول پڑا ہے، میں نے اس سے پانی نکالا جتنا خدائے تعالیٰ کی مشیت میں تھا، پھر اس سے ابوبکر بن ابی قحافہ نے ایک دو ڈول نکالے جس میں کمزوری ظاہر ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، پھر وہ ڈول بڑا ہوگیا (چڑسہ کی طرح جو چمڑے کا بناتے ہیں بڑے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنے کے لئے) ابن الخطاب نے اس سے پانی نکالا، میں نے کسی بڑے قوی شخص کو نہیں دیکھا، کہ اس نے ان کے برابر ڈول کھینچے ہوں، یہاں تک کہ لوگوں نے خوب سیر ہوکر پانی پیا، اور اونٹوں کو بھی پلایا اتنا کہ اس کنوئیں کے چار طرف پانی کی کثرت کی وجہ سے اونٹوں نے اپنے بیٹھنے کی جگہ بنالی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ابوالطفیل سے مندرجہ ذیل خواب کی بھی نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔ میں آج خواب میں پانی کھینچ رہا تھا کہ بھوری وسیاہ بکریاں میرے پاس آکر جمع ہوگئیں، پھر ابوبکر آئے انہوں نے ایک یا دو ڈول آہستہ آہستہ کھینچے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، پھر عمر آئے اور ڈول بڑا ہوگیا، انہوں نے حوض کو پانی سے بھر دیا، جس سے سب لوگ سیراب ہوگئے، میں نے ان سے بہتر کسی کو پانی کھینچتے نہیں دیکھا، سیاہ بکریوں سے میں نے عجم اور بھوری بکریوں سے عرب کی تعبیر لی ہے۔(ازالہ ۱۵۸/۱)

حسب تحقیق محدثین ان خوابوں سے اشارہ ان سیاسی حالات وخدمات کی طرف ہے، جو خلافتِ صدیقی وخلافتِ فاروقی میں ظاہر ہوئے، واللہ اعلم!

اسلام عمرؓ کے لئے دعاءِ نبوی

مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباسؓ وحضرت عائشہؓ سے دعاءِ نبوی مروی ہے کہ "یا اللہ! اسلام کو عمر بن الخطاب سے عزت بخش یا تائید عطا کر، حاکم نے اس روایت کو شرطِ شیخین پر بتلایا، اگرچہ ان دونوں نے اس کی تخریج نہیں کی، علامہ ابن ربیع نے مختصر المقاصد الحسنہ للسخاوی میں لکھا کہ حدیث اللهم ايد الاسلام باحب هذين الرجلين اليك بابی جهل اور بعمر بن الخطاب کی روایت امام احمد وترمذی نے کی ہے اور ترمذی نے اس کو حسن صحیح غریب کہا، لیکن یہ جو مشہور ہے "اللهم ايد الاسلام باحد العمرين" اس کی مجھے کوئی اصل نہیں معلوم ہوئی صاحب مرقاۃ نے لکھا کہ اللهم اعز الاسلام بعمر کے مضمون حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس کو از قبیلہ فعززنا بثالث یا زینو القرآن باصواتکم سمجھنا چاہیے، اور اس کو نوعِ قلب فی الکلام سے بھی قرار دے سکتے ہیں جیسے عرضت الناقة علی الحوض میں ہے اور اسی لئے زینو الاصواتکم بالقرآن بھی وارد ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ اُس ابتدائی دور اخفاءِ دین سے ترقی کرکے اعلاءِ دین کی نوبت حضرت عمرؓ ہی کے ذریعہ آئی، چنانچہ کلام الٰہی میں ارشاد ہوا، یاایها النبی حسبك الله ومن اتبعك من المؤمنين، کہ حضرت عمرؓ نے چالیس کا عدد پورا کردیا، اور پھر آپ ہی کے ذریعہ آخر میں بھی بہ کثرت فتوحاتِ بلاد اور وسیع پیمانہ پر اشاعتِ اسلام کی صورت ظاہر ہوئی، اور ان دونوں زمانوں کے درمیانی عرصہ میں آپ کی سختی وشدت بمقابلہ منافقین ومشرکین بھی خوب ظاہر ہوئی، جس کو اشداء علی الکفار سے بیان کیا گیا ہے، اور جو کچھ خلافتِ صدیقی میں کارہائے نمایاں انجام پائے اور مرتدین کے ساتھ جہاد وغیرہ ہے، وہ سب بھی حضرت عمرؓ کی اعانت ومشورہ ہی سے ہوئے ہیں اور جو کچھ بھی نزاعی صورتیں پیش آئیں اور آپس کی مخالفتیں اور جھگڑے لڑائیاں وہ سب حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ظاہر ہوئے ہیں، آپ کی زندگی میں کسی داخلی یا خارجی فتنہ نے سر نہیں اٹھایا، اور غالباً اسی لئے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تھا:۔ "لو کان بعدی بنی لکان **عمر الخطاب**" اور آپ کے اسلام لانے پر حضرت جرائیل علیہ السلام اُترے اور فرمایا اے محمد! آسمان والوں نے عمر کے اسلام سے بڑی خوشی منائی ہے" (دارقطنی وابوحاتم) مرقاۃ ۵۳۸/۵!

اعلان اسلام پر کفار کا ظلم وستم برداشت کرنا

حضرت عمرؓ اسلام لائے تو آپ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا ''یارسول اللہ'' کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ آپ نے جواب دیا، ہاں ضرور ضرور، جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس کی قسم کہ تم حق پر ہو، زندگی میں بھی اور موت پر بھی، پھر عرض کیا کہ ایسا ہے تو پھر چھپا ہوا اسلام کیسا؟ قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، آپ ہمیں باہر نکل کر اسلام ظاہر کرنے کی اجازت دیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ آپ نے ہمارے دوگروہ بنا دیئے، ایک میں حضرت حمزہؓ (آپ کے چچا تھے جو تین روز پہلے اسلام لائے تھے) اور دوسرے میں میں تھا پھر ہم مسجدِ حرام میں پہنچ گئے، اور میں نے قریش کو دیکھا کہ گویا ان پر ایسی بڑی مصیبت آ پڑی ہے کہ اس جیسی کبھی نہ آئی تھی، اور اسی دن سے حضور علیہ السلام نے مجھے ''فاروق کا خطاب دیا کہ حق تعالیٰ نے میری وجہ سے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا (مرقاۃ ۵۳۸/۵) مسندِ احمد وترمذی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسلام لاتے ہی مسجدِ حرام میں جا کر سب کے سامنے نماز ادا کی، (اس سے پہلے سب مسلمان چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔)

ابن اسحاق کی روایت بواسطہ حضرت ابن عمرؓ اس طرح ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسلام لانے کے بعد پوچھا کہ قریش کا کون سا شخص ایسا ہے جو کسی بات کو جلد مشہور کر دیتا ہے، معلوم ہوا جمیل بن معمر جمحی، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں اس وقت چھوٹا تھا، میں بھی ساتھ ہو گیا، آپ نے اس کے پاس جا کر کہا کہ دیکھو! میں اسلام لے آیا ہوں اور محمد ﷺ کے دین میں داخل ہو گیا ہوں، جمیل نے خاموشی سے اس بات کو سُنا اور فوراً اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے چل دیا حضرت عمرؓ بھی ساتھ ہو لئے، وہ جا کر کعبہ کے دروازہ پر کھڑا ہوا اور نہایت بلند آواز سے قریش کو پکار کر اپنے گرد جمع کر لیا، اور سُنایا کہ عمر بن الخطاب بے دین ہو گیا ہے، حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ ساتھ کہا کہ یہ جھوٹا ہے، میں بے دین نہیں ہوا بلکہ مسلمان ہو گیا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ یہ سُنتے ہی سارے کافروں نے ان پر ہجوم کیا اور میرے والد (حضرت عمرؓ) کافروں کو مارنے لگے اور کافر میرے والد کو، یہاں تک کہ دوپہر کا وقت ہو گیا اور بالآخر میرے والد تھک کر ایک طرف بیٹھ گئے، اور وہ سب لوگ آپ کے پاس کھڑے ہوئے اور پھر مارنا شروع کیا، میرے والد نے کہا کہ جو تم سے ہو سکے کرو، میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر ہم لوگ تین سو بھی ہوتے تو یا تو ہم مکہ کو تمہارے لئے خالی کر دیتے یا تم مکہ ہمارے لئے خالی کر دیتے۔ اسی اثنا میں قریش کا ایک بوڑھا شخص آیا اور وہ حیرہ کی چادر اور تہبند اور ایک عمدہ قمیض پہنے ہوئے تھے اس نے کفار کو سمجھایا کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو، ایک شخص نے اپنے لئے جو چاہا کیا تمہارا اس میں کیا حرج ہے، اور کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ بنی عدی (حضرت عمرؓ کے قبیلہ والے) اپنا آدمی تمہارے حوالے کر دیں گے کہ تم اس کو قتل کر ڈالو، لہٰذا اس کو چھوڑ دو (ازالۃ الخفاء ۱/۱۱۶) یہ شخص عاص بن وائل سہمی تھا، اور اسی قصے میں دوسری روایت سے یہ بھی منقول ہے کہ اس نے آپ کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا تاکہ پھر کوئی آپ کو ایذا نہ دے، مگر حضرت عمرؓ ہی کا بیان ہے کہ چند روز تو اس طرح گزرے مگر میں جب شہر میں جگہ جگہ دیکھتا کہ دوسرے مسلمانوں کو ستایا جا رہا ہے، اور ان کو مارا پیٹا جاتا ہے تو میں اس کو خاموش نہ دیکھ سکا، اور میں نے اپنی ضمانتی عاص بن وائل سے کہہ دیا کہ آپ اپنی ذمہ داری ختم کر دیں میں خدا کی مدد سے ان سب کا مقابلہ کر لوں گا، اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ظلم سے ضرور چھڑاؤں گا۔

دفاعی جہاد! اس قصہ سے معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ کی ۱۳ سالہ زندگی میں اگرچہ مسلمانوں نے کفار کے مقابلہ میں کوئی اقدامی جہاد نہیں کیا، مگر دفاعی جہاد برابر کرتے رہے یعنی دوسروں کی ایذا رسانیوں اور ظلم وستم کے مقابلہ میں اپنی ڈیفنس اور مدافعت وحق خود حفاظتی کا استعمال ضرور کیا ہے، اور یہ فرض مسلمانوں پر بہرصورت عائد رہتا ہے کوئی وقت اور کوئی حالت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے جب بھی کوئی ایک شخص یا

بہت سے لوگ کسی مسلمان مردعورت کی جان و مال وآبرو پر حملہ آور ہوں تو اس کا دفاع (ڈیفنس) جس طرح بھی ممکن ہو کرنا فرضِ عین ہے کیونکہ ہماری جان و مال وآبرو ہمارے پاس خدا کی امانت ہیں، جو ہر مسلمان مردوعورت سے اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے میں خرید کر ہمیں دے رکھی ہیں اور ان کی حفاظت کا فرض ہم پر لازم کیا ہے، لہٰذا ان پر اگر کوئی حملہ کرے تو اس وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ ہم پوری طرح دفاع کر سکتے ہیں یا نہیں بلکہ صرف خدا پر بھروسہ کرکے جتنا بھی ہو سکے کرے، ایسے وقت میں خدا کی غیبی امداد ضرور ضرور اس کو حاصل ہوگی، برخلاف اس کے کہ اگر حملہ آور کے مقابلہ میں بزدلی، لاچارگی یا خوشامد وغیرہ دکھلائی جائے گی تو یہ خدا کے عتاب وغضب کا سبب ہوگی اور اس کی مدد سے بھی محرومی ہوگی، پھر اس سے نہ دین سالم رہے گا نہ دنیا حاصل ہوگی۔

پھر اس وقت تو ساری دنیا نے سلف ڈیفنس، حق خود اختیاری، رائے اور مذہب کی آزادی وغیرہ کو بطور حقوق انسانیت کے تسلیم کر لیا، اگر کسی جگہ اِن حقوق کو سلب کیا جائے تو ساری دنیا سے بھی اس کے لئے اخلاقی امداد حاصل کی جا سکتی ہے۔

اقدامی جہاد! اگر دنیا کے کسی خطہ میں لوگوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہو یا ان کو حقوقِ انسانیت سے محروم کیا جا رہا ہو تو دوسرے یا اقتدار لوگوں کا انسانی و مذہبی فریضہ ہے کہ ایسے لوگوں کی امداد کریں، اور جس صورت سے بھی ممکن ہو ان کو ظالموں کے پنجہ سے رہا کرائیں اور ان کو پورے حقوق دلائیں اور اس کے بغیر چین سے نہ بیٹھیں کیونکہ "**الخلق عیال الله**" ساری دنیا کی مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ اگر خاندان کے کسی ایک فرد کو بھی مشقِ ستم بنایا گیا تو باقی لوگوں سے ضرور اس کا مواخذہ ہوگا جو ان کے معاملہ میں کوتاہی یا غفلت برتیں گے، اور سیاسی غفلتوں اور غلط کاریوں کا بدلہ اس دنیا میں بھی دیا جاتا ہے، تاریخ اس پر شاہد ہے، ایسا جہاد ابتداءِ آفرینش عالم سے لے کر اب تک ہر آسمانی مذہب کا ایک اہم جزو رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، اسلام نے جہاں مذاہبِ سابقہ کے تمام دوسرے اعمال واحکام کی تکمیل کی ہے، جہاد کے بارے میں بھی نہایت مکمل ومفصل ہدایات دی ہیں، جو دنیاوی جنگوں اور لڑائیوں کی برائیوں سے پاک وصاف ہیں، یہ سب ہدایات قرآن وحدیث، فقہ کی کتاب السیر اور کتبِ سیر وتاریخ میں موجود ہیں، ہر دور کے علماءِ اسلام نے ان کو صحیح صورت میں پیش کیا ہے، اور یہ سمجھنا اور کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ کسی دور کے اہلِ علم واہلِ قلم نے جہاد سے انکار کر دیا ہو یا کہا ہو کہ ہمارے یہاں جہاد نامی کوئی چیز نہیں ہے، ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے دور میں بھی جب اسلامی جہاد غلامی، تعدادِ ازدواج وغیرہ پر اعتراضات اٹھائے گئے تو ہندوستان کے تمام علماءِ نے بالعموم اور علمائے دیوبند نے بالخصوص ان کے منہ توڑ جوابات دیئے، اخبارات ورسائل اور مستقل کتابوں کی شکل میں بھی بہت کچھ لکھا گیا، اس سلسلہ میں صاحبِ تفسیر حقانی، علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی وغیرہ کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ اور اکابرِ دیوبند میں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تصانیف رسالہ القاسم والرشید کی خدمات، اور دارالعلوم دیوبند اور نیز دیگر صدہا مدارسِ اسلامیہ عربیہ کے درسِ تفسیر وحدیث کو کیونکر زاویہ خمول میں ڈالا جا سکتا ہے جہاں پر ان سب مسائل کو پوری تحقیق وتفصیل کے ساتھ پڑھایا جاتا رہا ہے اور مخالفوں کے اعتراضات کو پوری قوت کے ساتھ دلائل عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں برابر رد کیا جاتا رہا ہے، پھر خاص طور سے جہاد کے بارے میں تو اکابرِ دیوبند اور دوسرے علماءِ ہند نے انگریزوں کی عظیم تر جابر وقاہر طاقت کے معاملہ میں عملی طور سے بھی وہ کچھ کر دکھایا جس کی اس دور میں نظیر کم ہی ملے گی، ہندوستان میں اگر مغربی فلسفہ اور حکومت متسلطہ سے مغلوب یا متاثر ہو کر چند لوگوں نے اسلامی عقائد میں ترمیم کی یا اہلِ مغرب کے اعتراضات کو وزنی سمجھ کر ان کے جواب میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا تو اوّل تو وہ تعداد میں بہت تھوڑے تھے دوسرے وہ اہل قلم تو ضرور تھے مگر اہلِ علم قطعاً نہ تھے، کیونکہ علومِ دین میں ان کو کوئی بھی درجہ وامتیاز حاصل نہ تھا، ایسی صورت میں اگر کوئی شخص اس دور کی تصویر مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرے تو اس کو کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا:۔

جنگ کے میدان میں شکست کھا کر، انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے دورِ اوّل میں مسلمانوں کے اہل علم واہل قلم نے مغربی فلسفہ کو حق مان کر اسلامی عقائد میں ترمیم کرنا شروع کی، مغربی تہذیب کو بجا و درست سمجھ کر اسلامی تہذیب کی شکل بگاڑنے اور اس کے اندر نئے پیوند لگانے کا سلسلہ جاری کیا، اور اسلام پر اہل مغرب کے اعتراضات کو وزنی سمجھ کر ان کے جواب میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کر لیا ان چیزوں پر نگاہ کرنے کے بجائے ہمارے یہاں کے اہل علم اور اہل قلم نے سرے سے اس بات کا انکار ہی کر دیا کہ ہمارے یہاں جہاد نامی بھی کوئی چیز ہے، اسی طرح جب اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض ہوا تو ہمارے یہاں کے اہل علم واہل قلم نے فوراً اس بات کا انکار کر دیا کہ اسلام میں غلامی کا بھی کوئی قانون ہے، اسی طرح جب ہمارے تعدد ازواج پر اہل مغرب کی طرف سے اعتراض کیا گیا تو ہمارے یہاں کے اہل علم اور اہل قلم اس پر شرمندہ ہو کر طرح طرح کی معذرتیں پیش کرنے لگے، لیکن اب ہمارے اندر ایسے محققین خدا کے فضل سے موجود ہیں جو اس طرح کی ہر کج فہمی کا استیصال کرنے اور مسلمانوں کو غلط فہمیوں سے بچانے میں کامیاب ہو رہے ہیں، (جواب خطبہ استقبالیہ لندن از علامہ ابوالاعلیٰ مودودی، مورخہ ۱۵ دسمبر ۶۸ء شائع شدہ تجلی ماہ جون ۷۰ء)

اس وقت بالکل خلاف توقع ایک چیز سامنے آئی، اس لئے یہ سطور زبانِ قلم پر آ گئیں، ورنہ علامہ مودودی کے بیشتر علمی افادات اور دینی وملی خدمات کی اہمیت وافادیت کے ہم خود بھی کھلے دل سے مقر ومعترف ہیں، چونکہ اوپر کے مضمون میں صحیح علم وفضل کے وارثِ علماءِ حق کا کہیں بھی کوئی ذکر نہیں کیا گیا، اور مطلقاً اُس دور کے اہل علم واہل قلم کی طرف ایک ہی بات غلط منسوب کر دی گئی، تو اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ جیسے ایک سو سال کے اُس دور میں صحیح و سچی بے لاگ بات کہنے والے اہل علم واہل قلم کا کوئی وجود نہ تھا اور اس پوری مدت کے گزر جانے پر اب ہمارے اندر خدا کے فضل سے محققین پیدا ہوئے ہیں، خصوصیت سے باہر کی دنیا میں تو اس طرح کی بات سے اور بھی زیادہ غلط فہمی ہوئی ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت ومدافعت کفار

حضرت عمرؓ سب مسلمانوں کی بالعموم اور حضور اکرم ﷺ کی بالخصوص حفاظت اور مدافعت کفار ومشرکین کا اہتمام فرماتے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے حدیث دفعِ کفار روایت کی ہے یعنی حضرت ابوبکر وعمرؓ کا آں حضرت ﷺ سے کفار کو دفع کرنا، اور یہ ان کے بڑے مناقب میں سے ہے (ازالۃ الخفاء ۲۱۲/۱)

بیہقی میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ مکہ معظمہ کی وادی اضم میں تشریف لے گئے، جہاں قریش کا مشہور بہادر پہلوان رُکانہ بکریاں چرایا کرتا تھا، آپ تنہا تھے، اُس نے غصّہ میں کہا کہ اگر تم سے قرابت نہ ہوتی تو آج میں تمہارا قصّہ ہی پاک کر دیتا، تاہم آؤ ہم دونوں مقابلہ کریں اور تم اپنے خدا سے مدد مانگو اور میں اپنے لات وعزیٰ کو مدد کے لئے پکاروں، اگر تم نے مجھے بچھاڑ دیا تو میں دس بکریاں انعام دوں گا، آپ نے اس کو پچھاڑ دیا اور سینہ پر سوار ہو گئے، اس نے تین بار کشتی لڑی اور چت ہو گیا اور تیس بکریاں انتخاب کرنے کو کہا، آپ نے فرمایا مجھے بکریوں کی ضرورت نہیں، البتہ یہ چاہتا ہوں کہ تم توحید ورسالت کا اقرار کر لو، اس نے کہا کہ کوئی اور معجزہ دکھلاؤ، آپ نے قریب کے ایک بڑے کیکر کے پیڑ کی طرف اشارہ کیا کہ خدا کے حکم سے میرے پاس آ جاؤ، فوراً ہی اُس درخت کے دو حصے ہو گئے اور آدھا درخت ان دونوں کے درمیان آ کھڑا ہوا، رُکانہ نے کہا اچھا! اب اس کو واپس کر دو، آپ نے فرمایا، اگر ایسا ہوا تب تو میری تصدیق کرو گے؟ کہا ہاں! ضرور کروں گا آپ نے درخت کو حکم دیا کہ اپنی جگہ واپس ہو جائے تو وہ فوراً واپس ہو گیا۔

رُکانہ نے کہا کہ اب میرے پاس کوئی عذر نہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ شہر کی عورتیں اور بچے کہیں گے کہ رُکانہ، محمد سے مرعوب ہو گیا، آپ تیس بکریاں چھانٹ کر ریوڑ میں سے لے لیں، آپ نے فرمایا مجھے تمہاری بکریوں کی ضرورت نہیں، اسی اثناء میں حضرت ابوبکر وعمرؓ آپ کو مکہ

معظّمہ میں نہ پا کر سخت پریشان ہو کر تلاش میں نکل چکے تھے، اور ٹیلوں پر چڑھ چڑھ کر نظریں دوڑاتے تھے کہ آپ کو دیکھ لیں، جب آپ کو واپس آتے دیکھا تو دوڑ کر حاضر خدمت ہوئے، اور عرض کیا کہ آپ کو اس طرح تنہا اس وادی میں نہ آنا تھا کہ یہاں رُکانہ جیسا عدوئے اسلام بکریاں چرانے آتا ہے، آپ نے فرمایا:۔ اطمینان رکھو، جس ذاتِ برتر نے مجھے نبوت سے سرفراز کیا، وہ میری حفاظت بھی کرتی ہے الخ (سیرت کبریٰ ۲/۵٦۸)

عمیر[1] بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا، وہ اور صفوان بن امیہ حجر (حطیم بیت اللہ) میں بیٹھے ہوئے مقتولین بدر کا ماتم کر رہے تھے، صفوان نے کہا خدا کی قسم اب جینے کا مزہ نہیں رہا، عمیر نے کہا سچ کہتے ہو، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد کو قتل کر کے آتا، میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے، صفوان نے کہا تم قرض کی اور بچوں کی فکر بالکل نہ کرو، ان کا میں ذمہ دار ہوں، عمیر نے گھر آ کر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچا، وہاں حضرت عمرؓ ایک جماعتِ مسلمین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جنگِ بدر کے حالات بیان کر رہے تھے کہ آپ کی نظر عمیر پر پڑی کہ گلے میں تلوار ڈالے مسجد نبوی کے دروازہ پر اونٹ سے اترا، آپ نے کہا یہ دشمنِ خدا خبیث عمیر بن وہب آ رہا ہے، ضرور کوئی شر لے کر آیا ہے، اسی نے ہماری قوم میں جنگ کرائی ہے اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ حضور علیہ السلام کی خدمت میں آئے، اور آپ کو عمیر کی آمد سے آگاہ کیا، آپ نے فرمایا کہ اس کو میرے پاس لاؤ! حضرت عمر فاروقؓ عمیر کا گلا دبائے ہوئے حضور کے پاس لے کر آئے، آپ نے فرمایا عمر! چھوڑ دو اور عمیر سے فرمایا میرے قریب آ جاؤ۔ پھر پوچھا کس ارادہ سے آئے ہو؟ جواب دیا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں، فرمایا تلوار کیوں حمائل ہے؟ عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں؟ آپ نے فرمایا کیا تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی؟ عمیر یہ سُن کر حیران

---

[1] استیعاب ۲/۴۲۵ میں حضرت عمیرؓ کے حالات اس طرح لکھے ہیں:۔ قریش میں بڑے مرتبہ وعزت والے تھے، بدر میں کافروں کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑے، اور احد سے پہلے مسلمان ہو کر کفار سے لڑے، پھر فتح مکہ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ تھے،

بدر کے دن قریش سے انصار کے بارے میں کہا میں سانپوں کی شکل وشمائل والے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، جو بھوک پیاس کی وجہ سے مرتے نہیں اور جب تک اپنی برابر ہم میں سے نہیں مار ڈالیں گے، لڑائی سے باز نہ آئیں گے، لہٰذا اپنے روشن اور خوبصورت چہروں کو ان کے مقابلے پر لے جا کر اپنی گت خراب مت کرو، قریش نے کہا، چھوڑو ایسی باتیں نہ کرو یہ وقت تو اپنی قوم کو جوش دلانے کا ہے وہ کام کر۔

اس پر عمیر سب سے پہلے اپنے گھوڑے سے اُتر کر میدان جنگ میں کود پڑا اور لڑائی شروع ہوگئی، وہ قریش کے بڑے بہادروں میں تھا اور ہر لحاظ سے ان کے شیاطین میں سے ایک شیطان سمجھا جاتا تھا، اس نے ہی ہمت کر کے عسکرِ نبوی کے اردگرد ایک چکر بھی لگایا تھا کہ لشکر کی تعداد کا اندازہ کرے، بدر کی لڑائی میں اس کا بیٹا وہب قید ہو گیا تھا، پھر عمیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ قتل کے ساتھ مدینہ منورہ گیا تھا کہ موقع دیکھ کر اچانک آپ پر حملہ کرے، اور یہ سازش مکہ معظمہ میں صفوان بن امیہ کے ساتھ ہوئی تھی، جس کی خبر حضور علیہ السلام کو ہوگئی تھی عمیر مدینہ پہنچا تو مسجد نبوی کے دروازہ پر حضرت عمرؓ کو پایا، آپ نے اس کو گردن سے پکڑ کر حضور علیہ السلام کے پاس پہنچایا، اور عرض کیا کہ یہ شیطان قریش بُرے ارادہ سے آیا ہے، حضور نے فرمایا، عمر! اس کو چھوڑ دو اور اپنے پاس بلا کر اپنے جسدِ اطہر سے لپٹا لیا، پھر اس سازش کا ذکر کیا، جس کو سُن کر عمیر اسلام لے آئے رضی اللہ تعالیٰ اور مکہ معظمہ واپس جا کر صفوان کے پاس نہ گئے، حضرت عثمانؓ کی ابتداءِ دور خلافت تک زندہ رہے ان کے صاحبزادے وہب بن عمیرؓ کچھ دن پہلے اسلام لا چکے تھے، حضرت عمرؓ نے جو چار بہادر جلیل القدر صحابہ حضرت عمرو بن العاصؓ فاتح مصر کی امداد کے لئے بھیجے تھے، یہ ان میں سے ایک تھے، دوسرے حضرات زبیر بن العوام، خارجہ بن حذافہ، بسر بن ارطاۃ (یا مقداد) تھے، ایک غیر قوی سند سے یہ بھی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے عمیرؓ کے لئے اپنی چادر مبارک بچھائی تھی، اور فرمایا تھا کہ ماموں باپ کے مرتبہ میں ہیں، لیکن ان کے صاحبزادے وہبؓ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چادر مبارک بچھانے کا اعزاز بہ کثرت اور مشہور روایت سے ثابت ہے، یہ بھی مروی ہے کہ جب عمیرؓ اسلام کے بعد مکہ معظمہ پہنچے تو صفوان سے نہیں ملے اور سیدھے اپنے گھر چلے گئے، اسلام ظاہر کیا اور دوسروں کو بھی دعوت دی، یہ بات صفوان نے سُنی تو کہا کہ میں نے اس کے پہلے میرے پاس نہ آنے ہی سے سمجھ لیا تھا کہ اُلٹ گیا ہے اور صابی ہو گیا ہے لہٰذا اب اس سے نہ کبھی کلام کروں گا، نہ اس کی اور اس کے اہل وعیال کی کوئی امداد کروں گا، اس کے بعد حجر بیت اللہ میں صفوان کو حضرت عمیر نے دیکھا اور پکارا تو اس نے اعتراض کیا، اس پر حضرت عمیرؓ نے اس سے کہا:۔ تم ہمارے بڑے سرداروں میں سے تھے، اس بات پر غور کرو کہ ہم پتھروں کو پوجتے اور ان کے نام پر قربانی کرتے تھے، کیا یہ کوئی دین کی بات ہو سکتی ہے؟ لہٰذا میں تو توحید ورسالت کو مان چکا'' صفوان یہ سن کر بھی کچھ نہ بولا۔ ''مؤلف''

ہوگیا اور بے اختیار بولا کہ آپ ضرور نبی برحق ہیں، بخدا میرے اور صفوان کے سوا اس معاملہ کی کسی فرد کو بھی خبر نہ تھی۔

قریش مکہ نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سُنی تو وہ بھی حیرت میں پڑ گئے اور حضرت عمیرؓ نے مکہ معظمہ واپس جا کر اسلام کی دعوت پھیلائی، اور ایک مجمع کثیر کو اس کی روشنی سے منور کیا (سیرۃ النبی ۳۳۵/۱ بحوالہ تاریخ طبری ۱۳۵۴ و ازالۃ الخفاء ۲/۷۹)

غزوۂ احد کے موقع پر جب کچھ دیر کے لئے افراتفری مچی اور گھمسان کی لڑائی میں اپنے پرائے کی بھی تمیز نہ رہی، حضور اکرم علیہ السلام تک بھی کفار پہنچ گئے تھے تو اس وقت بھی آپ کے ارد گرد رہنے والوں میں حضرت ابوبکر و عمرؓ وغیرہ ۱۲ صحابی رہ گئے تھے جیسا کہ بخاری ۴۲۶ باب ما یکرہ من التنازع والاختلاف فی الحرب، اور ۶۵۵ کتاب التفسیر میں ہے کہ آپ کے پاس سے بہ کثرت صحابہ کرام گھمسان کی لڑائی کی وجہ سے دور ہو گئے بجز ۱۲ صحابہ کے، مورخ کبیر محقق عینیؒ نے اس حدیث کی شرح میں مورخ بلاذری کا قول نقل کیا کہ مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر، عمر، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ، زبیر بن العوام اور ابوعبیدۃ بن الجراح، حضور علیہ السلام کے ساتھ اپنی جگہ پر ثابت قدم رہے تھے اور انصار میں سے حباب بن المنذر، ابودجانہ، عاصم بن ثابت بن ابی الافلح، حارث ابن الصمہ، اسید بن حضیر، سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور کہا گیا ہے کہ سہیل بن حنیف رہ گئے تھے (عمدہ ۲۸۳/۱۴ طبع منیریہ) علامہ محدث قسطلانیؒ نے لکھا کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ آپ کے صحابہ میں سے ایک جگہ ثابت رہنے والے ۱۴ صحابی تھے، سات مہاجرین میں سے جن میں ابوبکرؓ بھی تھے اور سات انصار میں سے تھے، علامہ محدث زرقانیؒ نے اس کی شرح میں قول مذکور کی نسبت محمد بن سعد کی طرف ظاہر کی، اور اوپر کے نام ذکر کئے، پھر لکھا کہ جن لوگوں نے ان حضرات میں حضرت علیؓ کا ذکر نہیں کیا، وہ اس لئے کہ انہوں نے حضرت مصعبؓ کی شہادت ہونے پر حضور کے پاس سے جا کر جھنڈا اسنبھال لیا تھا، لہٰذا ان لوگوں نے ''ثابتین'' میں ان کا نام ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ کے پاس اس روز تیس صحابہ تھے، جن میں سے ہر ایک اپنی زبانِ قال و حال سے حضور علیہ السلام کو یقین دلا رہا تھا کہ پہلے میرا چہرہ آپ کے چہرہ مبارک پر قربان ہوگا، اور پہلے میری جان آپ کی جان پر قربان ہوگی، آپ پر ہمیشہ کے لئے سلامتی نچھاور ہو، ہم آپ کو اپنے جیتے جی رخصت نہ ہونے دیں گے، پھر علامہ قسطلانیؒ نے لکھا کہ حدیث بخاری میں حضور علیہ السلام کے ساتھ ۱۲ صحابہ کا ثابت قدم رہنا ذکر کیا گیا ہے (شرح المواہب ۳۵/۲ بخاری ۴۲۶ میں غیر اثنی عشر رجلا کے حاشیہ میں قسطلانیؒ شرح بخاری سے بھی منہم ابوبکر و عمر الخ نقل کیا گیا ہے۔

حافظؒ نے لم یبق مع النبی علیہ السلام **فی تلک الایام الذی یقاتل فیھن غیر طلحۃ و سعد** کی شرح میں لکھا کہ روایت غیر ابی ذرؒ میں فی بعض تلک الایام کا لفظ مروی ہے جو زیادہ واضح ہے، اور ان کا انفراد بہ لحاظ بعض مقامات کے ہے کیونکہ اس غزوۂ میں حالات مختلف قسم کے پیش آئے ہیں (فتح ۲۵۳/۷)

سیرۃ النبی ۷۸/۳ میں ان جاں نثاروں کا عدد گیارہ ذکر کیا اور جن کے ناموں کی تخصیص کا بغیر حوالہ کے ذکر کیا، ان میں حضرت عمرؓ کا اسم گرامی نہیں ہے، پھر صحیح بخاری کی صرف اُس روایت کو نقل کیا، جس میں فقط حضرت طلحہ و سعدؓ کا ذکر ہے باقی دونوں مذکورہ بالا روایاتِ بخاری کا کوئی ذکر نہیں کیا جن میں بارہ صحابہ کا حضور علیہ السلام کے پہلو میں ثابت قدم رہنا مروی ہے، یہ حال ہماری محققانہ کتابوں کا ہے۔

آگے اسی صفحہ میں حضرت عمرؓ کے بارے میں بعض اربابِ سیر نے وہ بات بھی نقل کردی ہے جو کسی طرح بھی حضرت عمرؓ کے مرتبہ عالیہ کے شایانِ شان نہیں، پھر جبکہ یہی واقعہ بخاری میں بھی مذکور ہے اور اس میں حضرت عمرؓ کا نام نہیں ہے، تو اس کی نقل سے اور بھی زیادہ احتیاط کرنی تھی،

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا:۔ غزوۂ احد میں حضرت عمرؓ کو نمایاں فضائل حاصل ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ جب حضور علیہ السلام اور مسلمان قلعہ بندی کے طور پر پہاڑ پر چڑھ گئے تو حضرت عمرؓ نے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر ایک جماعتِ مہاجرین کے ساتھ کفار کا مقابلہ کر کے ان کو دفع کیا اور ان کو اوپر چڑھنے سے روکا اور جو وہاں چڑھ گئے تھے ان کو وہاں سے اترنے پر مجبور کر دیا، ذکرہ فی السیر۔

دوسرے یہ کہ جنگ اُحد سے واپسی کے وقت ابوسفیان کہنے لگا کہ "اے ہبل! تیرا نام بلند ہو" تو حضور علیہ السلام کے ارشاد پر حضرت عمرؓ نے اسلامی جوش کے ساتھ بلند آواز سے اعلاءِ کلمۃ اللہ کیا اور کہا "اللہ اعلیٰ و اجل" کہ خدا ہی سب سے زیادہ بلند و برتر ہے، تیسرے یہ کہ ابوسفیان نے حضور علیہ السلام اور حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کو پکارا[1] جس سے معلوم ہوا کہ کفار بھی ان دونوں کے بعد آپ ہی کو مسلمانوں کا سب سے بڑا فرد سمجھتے تھے، ابوسفیان نے جاتے وقت یہ بھی کہا کہ چلو برابری ہوگئی، بدر میں ہمارا نقصان زیادہ ہوا تھا، اب تمہارا زیادہ ہوگیا، اس پر حضرت عمرؓ نے ہی جواب دیا کہ برابری کیسی؟ ہمارے مقتولین تو جنت میں جاتے ہیں، اور تمہارے جہنم میں،

تمام سوال و جواب کے بعد ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کو اپنے پاس نیچے بلایا، حضور علیہ السلام نے اجازت دی کہ جا کر سنو، کیا کہتا ہے، حضرت عمرؓ گئے تو کہنے لگا، ہمارا آج کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہم نے محمد کو قتل کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا، اے دشمن خدا تو جھوٹ کہتا ہے وہ تو تیری ساری باتیں سن رہے ہیں اور ہم میں موجود ہیں، ابوسفیان نے کہا، ہم تو اسی خیال میں تھے لیکن تم میرے نزدیک ابن قمیہ سے زیادہ صادق القول ہو، جس نے کہا تھا کہ میں نے محمد کو قتل کردیا ہے (ازالۃ الخفاء ۲/۷۹)

غزوۂ خندق میں بھی حضرت عمرؓ نے اہم خدمات انجام دیں، اول یہ کہ حضور علیہ السلام نے آپ کو اپنی محافظت کے لئے مقرر کیا تھا اور جس جانب سے آپ کو محافظت کے لئے مقرر کیا تھا، اس جگہ بطور یادگار ایک مسجد بھی بن گئی تھی، جو اب تک موجود ہے دوم یہ کہ حضرت عمرؓ و حضرت زبیرؓ نے ایک روز جماعتِ کفار پر حملہ کیا، یہاں تک کہ ان کو منتشر و پریشان کردیا، سوم یہ کہ بوجہ مشغولیت حضرت عمرؓ کی نمازِ عصر فوت ہوگئی جس کا ان کو بہت زیادہ افسوس ہوا تو حضور علیہ السلام نے از رہِ شفقت اپنے آپ کو بھی حضرت عمرؓ کے ساتھ محسوب کیا اور اس طرح ان کے تاسف کی مکافات کی بخاری میں یہ واقعہ ہے (۲/۸۰)

غزوۂ بنی المصطلق میں مقدمۃ الجیش پر حضرت عمرؓ ہی تھے، اور آپ نے کفار کے ایک جاسوس کو پکڑ کر حالات معلوم کرنے کے بعد قتل کردیا تھا، جس سے کفار کے دلوں پر رعب بیٹھ گیا۔

غزوۂ حدیبیہ میں صلح نامہ کے وقت حضرت عمرؓ کی اسلامی حمیت و غیرت خاص طور سے نمایاں ہوئی اور آیت کریمہ فانزل اللہ سکینتہ علیٰ رسولہ وعلی المومنین والزمھم کلمۃ التقویٰ آپ کے حق میں نازل ہوئی اور مراجعت، میں جب مدینہ طیبہ کے پاس پہنچ کر سورۂ فتح نازل ہوئی تو سب سے پہلے حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر سُنائی (۳/۸۱)

غزوۂ فتح مکہ میں بھی حضرت عمرؓ کو بہت سے فضائل حاصل ہوئے الخ (۲/۸۵)

غزوۂ حنین میں جب کچھ دیر کے لئے مسلمانوں کے لشکر میں انتشار و انہزام کی صورت پیش آئی، تو اس وقت جو ۱۰۔۱۲ آدمی سرورِ دو عالم محمد ﷺ کے اردگرد ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہے، ان میں حضرت ابوبکر و عمر بھی تھے، پھر کچھ دیر کے بعد تو سارے ہی مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر کفار کے مقابلہ میں ڈٹ گئے تھے (فتح الباری ۸/۳۱)

---

[1] شرح المواہب ۲/۳۶ میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب دونوں فریق میدانِ جنگ سے ہٹ گئے، تو جاتے ہوئے ابوسفیان نے مسلمانوں کو للکار کر کہا:۔ کیا تم لوگوں میں محمد موجود ہیں؟ حضور علیہ السلام نے جواب دینے سے روک دیا، تین مرتبہ اس نے یہی پوچھا اور مسلمان خاموش رہے پھر بولا، کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ (یعنی حضرت ابوبکرؓ) اس کو بھی تین بار کہا، اور حضور علیہ السلام نے اس کے جواب سے بھی روک دیا، پھر بولا، کیا تم میں ابن الخطاب ہیں؟ یہ بھی تین بار سوال کیا، اور جواب نہ پا کر گھوڑے پر سواری ہی کی حالت میں اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا، دیکھو! یہ سب تو مارے جاچکے ہیں، اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے یہ سن کر حضرت عمرؓ ضبط نہ کرسکے اور حضور علیہ السلام سے اجازت لے کر جواب دیا کہ اے خدا کے دشمن! تو نے جھوٹ کہا جن کا تو نے ذکر کیا ہے وہ سب زندہ موجود ہیں، اور تجھے آئندہ بھی سبق دینے کے لئے باقی ہیں حافظؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے حضرت ابوبکر و عمرؓ کا جو مرتبہ اور خاص مقام حضور علیہ السلام کی نظر میں تھا وہ معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دشمنانِ اسلام کی نظر میں بھی ان دونوں کا ہی مقام سب سے بلند تھا اور وہ جانتے تھے کہ اسلام کا قیام اور ترقی وغیرہ ان دونوں سے وابستہ ہے، اسی لئے ابوسفیان نے ان تینوں کے علاوہ کسی کے بارے میں سوال نہیں کیا (۲/۳۷)

حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا:۔غزوۂ حنین میں بھی حضرت عمرؓ کو بہت سے فضائل نصیب ہوئے، جن میں سے یہ بھی ہے کہ روایاتِ مہاجرین میں سے ایک جھنڈا آپ کو بھی حضورِ اکرم علیہ السلام نے عنایت فرمایا تھا۔ (ازالۃ الخفاء ۸۶/۲)

حضرت عمرؓ کا جامع کمالات ہونا

حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا:۔حضرت عمرؓ کی مثال ایک ایسے عالیشان محل کی ہے جس کے بہت سے دروازے ہوں اور ہر دروازے پر ایک صاحبِ کمال بیٹھا ہو، مثلاً ایک پر اسکندر اور ذوالقرنین جیسے بیٹھے ملک گیری، جہاں بانی، اجتماعِ لشکر، اور ہزیمتِ اعداء اور سطوت و جبروت وغیرہ قائم کرنے کا درس دے رہے ہوں دوسرے پر مہربانی ونرمی، رعیت پروری، عدل وانصاف وغیرہ کا سبق نوشیرواں عادل جیسے دے رہے ہوں، تیسرے پر علم فتاویٰ واحکام کی رہنمائی کے لئے امام اعظم ابوحنیفہ یا امام مالکؒ بیٹھے ہوں، چوتھے پر مرشدِ کامل مثل سیدنا عبدالقادرؒ یا خواجہ بہاؤالدینؒ ہوں، پانچویں پر کوئی محدث مثل ابوہریرہؓ یا ابن عمرؓ ہو، چھٹے پر قاری ہم پلہ نافع وعاصم ہوں، ساتویں پر حکیم مثل جلال الدین رومیؒ یا شیخ فریدالدین عطارؒ ہوں، اور لوگ اس محل عالیشان کے چاروں طرف جمع ہوں، اور ہر حاجت مند اپنی حاجت اس کے صاحبِ فن سے طلب کرتا اور کامیاب ہوتا ہو، نبوت ورسالت کے مرتبہ عالیہ کے بعد اس فضیلت سے زیادہ اور کون سی فضیلت ہوسکتی ہے؟ الخ (ازالۃ الخفاء ۴۲۹/۲)

حضرت عمرؓ کا انبیاء علیہم السلام سے اشبہ ہونا

آنحضرت علیہ السلام نے اس امر کی بھی خبر دی کہ حضرت عمر فاروقؓ استعدادِ نبوت اور قوتِ علمیہ وعملیہ دونوں رکھتے تھے، حدیثِ نبوی سے قوتِ علمیہ کا ثبوت اللہ تعالیٰ کا ان کی زبان پر نطق کرنا، اور ان کا محدث ہونا ہے اور خواب میں دودھ پینا اور آپ کی رائے کا وحی سے موافق ہونا ہے وغیرہ وغیرہ۔

قوتِ عملیہ کا ثبوت، شیطان کا حضرت عمرؓ کے سایہ سے بھاگنا، رؤیائے قمیص میں حضور علیہ السلام کا حضرت عمرؓ کو اتنی بڑی قمیص پہنے دیکھنا جو چلتے وقت زمین پر گھسٹتی تھی، یہ خصوصیت تلووحی کی ہے، پس جب نبوت ختم ہوگئی تو ضروری ہے کہ ایسا شخص خلیفہ ہو جو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو، نیز حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ عمر سے بہتر شخص پر آفتاب نے طلوع نہیں کیا، لہٰذا ضروری تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کسی نہ کسی وقت بہترین شخص اور خلیفہ وقت ہوتے، اور حضور علیہ السلام نے آپ کے لئے دعا فرمائی تھی "عش حميد ادمت شهيدا" اگر خدانخواستہ حضرت عمرؓ غاصب، جابر وظالم ہوتے تو یہ دعا کیونکر صحیح ہوتی (ازالۃ الخفاء ۵۴۸/۱)

معیت ورفاقت نبویہ

بخاری ومسلم میں حدیث ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے جنازے پر آکر حضرت علیؓ نے ان کو خطاب کر کے فرمایا:۔ خدا آپ پر رحم کرے، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دونوں صاحبوں کے ساتھ کرے گا کیونکہ میں نے حضورِ اکرم علیہ السلام کو بہ کثرت یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں اور ابوبکر وعمرؓ اس طرح تھے، میں نے اور ابوبکر وعمرؓ نے فلاں کام کیا، اور ابوبکر وعمرؓ فلاں جگہ کے لئے ساتھ گئے، میں اور ابوبکر وعمرؓ فلاں جگہ داخل ہوئے، میں اور ابوبکر وعمرؓ فلاں جگہ سے باہر نکلے۔ (مشکوۃ ۵۵۹)

بیعت رضوان کے وقت حضرتِ عمرؓ کی معیت

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ آں حضرت علیہ السلام کا اخذِ بیعت کے وقت حضرت عمرؓ کو منتخب کرنا یہ بھی بہت بڑی دلیل آپ کی فضیلتِ عظیمہ کی ہے (ازالۃ ۵۹۵/۱)

حافظ ابن کثیرؒ نے مسلم شریف کی روایت نقل کی کہ حدیبیہ کے مقام پر جس وقت چودہ سو صحابہ کرام سے کیکر کے درخت کے نیچے بیعتِ رضوان جہاد، عدم فرار اور موت پر لی گئی تو حضرت عمرؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے، (ابن کثیر ۱۸۷/۱) اور نووی شرح مسلم میں یہ حدیث ۱۲۹/۲ پر ہے (دیکھو باب استحباب مبایعۃ الامام الجیش عند ارادۃ القتال)

استعدادِ منصبِ نبوت

ترمذی شریف میں حدیث ہے کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوسکتا تو عمر بن الخطاب ہوتے، محدثِ کبیر ملا علی قاریؒ نے لکھا کہ یہ باب عدالت وسیاست وغیرہ کے لحاظ سے ہے، میزان میں اہل حدیث سے اس کی تضعیف منقول ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اس کی تقویت حدیثِ الجامع سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ عمرؓ سے بہتر کسی شخص پر سورج طلوع نہیں ہوا (رواہ الترمذی والحاکم فی مستدرکہ عن ابی بکر مرفوعاً) اور بغوی نے فضائل میں روایت کی کہ جب حضرت عمرؓ نے حضرت ابوسفیانؓ کی بیٹی کو پیغام نکاح دیا تو صحابہ نے کہا کہ یہ لوگ اس رشتہ کو قبول کریں تو بہتر ہے کیونکہ رسول اکرم علیہ السلام نے فرمایا تھا ''مدینہ کی دونوں وادیوں میں عمر سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے'' حدیث لو کان بعدی نبی لکان عمر کو ابن جوزی نے بھی نقل کیا، امام احمد وحاکم نے اپنی صحیح میں اور طبرانی نے بھی روایت کیا، نیز بعض طرق میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں۔ لولم ابعث لبعثت یاعمر (مرقاۃ ۵۳۹/۵)

حضرت عمرؓ وامرھم شوری بینھم کے مصداق

حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا:۔ سورۂ شوریٰ کی آیت والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوۃ میں اشارہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف ہے کہ آپ کا مشہور وصف تصدیق تسلیم وانقیاد اور اقامتِ صلوات میں بلند پایہ تھا، اسی لئے حضور علیہ السلام کی نیابتِ امامت کا شرف حاصل کیا اور دوسرے جملہ امرھم شوری بینھم سے اشارہ حضرت عمرؓ کی طرف ہے کہ آپ کا مشہور وصف شوریٰ تھا آپ کے پورے زمانہ خلافت میں کوئی امر بدوں مشورۂ علماءِ صحابہ نافذ نہیں کیا جاتا تھا، اسی لئے ملّتِ اسلامیہ کے سب سے بڑے اجماعی مسائل وہ ہیں جن پر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اجماع ہو چکا ہے، اور تیسرے جملہ ومما رزقنا ھم ینفقون سے اشارہ حضرت عثمانؓ کی طرف ہے اور چوتھا جملہ والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون حضرت علیؓ پر منطبق ہوتا ہے کیونکہ آپ کے عہد خلافت میں بغاوت وقتال ہوا ہے آگے پانچویں جملہ وجزاء سیئۃ میں حضرت حسنؓ کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی اور چھٹے جملہ ولمن انتصر بعد ظلم سے اشارہ خلافتِ معاویہؓ کی طرف ہے، ساتویں جملہ انما السبیل الخ سے اشارہ جوانانِ بنی امیہ کی طرف ہے، جن کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میری امت کی تباہی قریش کے چند جوانوں کے ہاتھ سے ہوگی، پھر آٹھویں جملہ ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور سے اشارہ علماءِ اخیار کی طرف ہے، جن کے رئیس وسردفتر حضرت علی بن حسین تھے، آپ نے اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ حضور اکرم علیہ السلام نے خلیفہ وقت پر تلوار اٹھانے کو منع فرمایا ہے، سکوت وخاموشی اختیار کی اور باوجود کراہت کے اطاعت قبول کی (ازالۃ الخفاء ۴۶۹/۱)

حضور علیہ السلام کا مشورۂ شیخین کو قبول کرنا

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ جس مشورہ میں تم دونوں جمع ہو جاتے ہو، میں تمہاری رائے کے خلاف نہیں کرتا (رواہ احمد) اور مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کیا آپ نے ابوہریرہؓ کو اپنی نشانی نعلین شریفین دے کر یہ اعلان کرنے کو بھیجا ہے کہ جو بھی دل سے توحید ورسالت کی شہادت دیتا ہو، اس کو وہ جنت کی بشارت دیدیں؟ حضور نے فرمایا ہاں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول

اللہ! ایسا نہ کیجئے ورنہ لوگ آپ کے اس فرمان پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑ دیں گے، اس لئے آپ انھیں عمل کرنے دیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ اچھا! انھیں عمل کرنے دو۔ (ازالہ ۵۹۴/۱)

حضرت عمرؓ کا اجد واجود ہونا

اسلم مولیٰ عمرؓ سے حضرت ابن عمرؓ نے اپنے والد حضرت عمرؓ کے حالات معلوم کئے تو انہوں نے کچھ حالات بیان کئے جوان کو خاص طور سے معلوم تھے، اس پر حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ میں نے رسول اکرم علیہ السلام کے بعد حضرت عمرؓ سے زیادہ دین کے معاملہ میں عملی کوشش کرنے والا اور علم ویقین کے منازل طے کرنے میں ان سے بڑا شہسوار نہیں دیکھا، ابتداء سے آخر عمر تک ان کا یہی حال رہا۔ (بخاری ۵۲۱)

مرقاۃ ۵۴۴/۵ میں اجود کی تشریح احسن فی طلب الیقین سے کی ہے اور فتح الباری وعمدہ میں اموال کی سخاوت لکھی ہے حضرت عمرؓ نے جس طرح اموال کو عام لوگوں پر تقسیم کیا اور ساری قلمرو کے غربا مساکین اور حاجت مندوں کی بلا تخصیص مذہب وملت غنی و مستغنی بنانے کی کوشش کی اور خود ساری لذات وراحتوں سے کنارہ کش رہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

حکم اقتداءِ ابی بکر و عمرؓ

حضور علیہ السلام نے ایک روز ارشاد فرمایا: مجھے نہیں معلوم کتنے دن اور تم میں رہوں گا لہٰذا تم میرے بعد کے اصحاب ابوبکر وعمر کی پیروی کرنا (ترمذی) صاحبِ مرقاۃ نے لکھا کہ اس حدیث کی روایت امام احمد وابن ماجہ نے بھی کی ہے اور حافظ حدیث ابوالنصر القصار نے یہ زیادتی بھی روایت کی ہے کہ یہ دونوں خدائے تعالیٰ کی طرف سے دراز کی ہوئی رسی ہیں، جوان دونوں کو مضبوطی سے پکڑ لے گا، وہ ایسا ہے مضبوط و مستحکم سہارا تھام لے گا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

(گویا لااکراہ فی الدین قدتبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لھا'' کی طرف اشارہ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم!) (مرقاۃ ۵۳۹/۵)

حضرت عمرؓ کا لقب فاروق ہونا

حضرت عمرؓ کا خود بیان ہے کہ میرا جب شرحِ صدر ہوا اور اسلام کی طرف کشش ہوئی تو جس ذات سے مجھے سب سے زیادہ بغض وعناد تھا وہ میرے لئے دنیا ومافیہا سب سے زیادہ پیاری ومحبوب ہوگئی، یعنی ذاتِ اقدس نبوی علے صاحبہا الف الف تحیات وتسلیمات، چنانچہ میں بے تاب ہو کر فوراً حضور کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے دارارقم سے باہر آ کر میرے کپڑوں کو پکڑا اور مجھے ایک جھٹکا دیا، جس کے بعد میں بے صبر ہو کر اپنے گھٹنوں کے بل گر گیا آپ نے فرمایا:۔ عمر! کیا تم اپنی روش سے باز نہیں آئے؟ میں نے فوراً ہی کلمہ شہادت پڑھا، جس پر سارے مجمع نے بلند آواز سے تکبیر کہی، جس کی آواز مسجد کے لوگوں نے سُنی، پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اپنی زندگی میں بھی اور مرتے وقت بھی؟ آپ نے فرمایا، کیوں نہیں، خدا کی قسم تم حق پر ہو زندگی میں بھی اور مرتے دم بھی میں نے کہا پھر چھپنے کی کیا ضرورت؟ (یعنی جبکہ ہم مریں گے تب بھی حق پر ہی مریں گے، آپ کو مبعوث کرنے والے کی قسم ہم تو ضرور باہر نکل کر اسلام کو ظاہر کریں گے، اس پر حضور علیہ السلام نے ہماری دو ٹولی بنا دیں، ایک میں حضرت حمزہؓ دوسری میں میں تھا، اور اسی دن حضور نے مجھے ''فاروق'' کا لقب دیا کہ میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق وباطل کو الگ الگ کیا،

دوسرا قصہ یہ ہے کہ ایک منافق مسلمان کا ایک یہودی سے جھگڑا ہوا، یہودی نے کہا کہ میں اپنا فیصلہ نبی اکرم پر رکھتا ہوں، جو بھی وہ

فیصلہ کریں، منافق نے کہا میں کعب بن الاشرف پر رکھتا ہوں، پھر وہ دونوں حضور علیہ السلام کو حاکم بنانے پر راضی ہوگئے، اور آپ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا، منافق اس فیصلے سے راضی نہ ہوا اور کہا کہ ہم تو عمر کو حَکَم بناتے ہیں، یہودی نے سارا قصہ حضرت عمرؓ کو سُنایا کہ اس طرح بعد کو یہ شخص نبی اکرم کو حکم بنانے پر رضامند ہوا تھا مگر اب ان کے فیصلہ کو رد کر رہا ہے اور آپ کو حکم بناتا ہے حضرت عمرؓ نے اس منافق سے پوچھا کیا ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا اچھا ٹھیرو! میں ابھی آتا ہوں اور گھر میں سے تلوار لا کر اس منافق کو قتل کر دیا، اور فرمایا کہ میرا فیصلہ تو ایسے شخص کے لئے یہی ہے جو خدا اور اس کے رسول کا فیصلہ قبول نہ کرے، حضور اکرم ﷺ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو فرمایا، میرا خیال نہ تھا کہ عمر ایک مومن کے قتل پر جراءت کریں گے، اس پر یہ آیت اُتری ''الم ترالی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت'' اور پھر آپ نے اس شخص کے قصاص کا حکم ختم کر کے حضرت عمرؓ کو اس کے ظلماً قتل کے الزام سے بری قرار دیا اور اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا، لہٰذا ان کا نام ''فاروق'' رکھا گیا۔ (مرقاۃ ۵۳۸/۵ و ۵۳۹/۵)

جنگ بدر میں مشرک ماموں کو قتل کرنا

حضرت عمرؓ کی اسلامی غیرت اور پختگی ایمان کا یہ بھی ایک بڑا ثبوت ہے کہ آپ نے غزوۂ بدر کے موقع پر اپنے حقیقی ماموں کی قرابت کا بھی خیال نہیں کیا، اور جب وہ مقابلہ پر آ گئے، تو ان کو قتل کر دیا، ان کا نام عاصی بن ہاشم بن مغیرہ تھا، سیرۃ النبی ۳۲۹/۱ میں ان کا نام عاص بن ہشام غلط درج ہوا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کے نانا کا نام ہاشم بن مغیرہ تھا، اور آپ کی والدہ کا نام حنتمہ بنت ہاشم بن مغیرہ تھا، اس کو بھی حنتمہ بنت ہشام ابن مغیرہ غلط لکھتے ہیں، ہاشم بن مغیرہ اور ہشام بن مغیرہ دونوں حقیقی بھائی تھے، لہٰذا حضرت عمرؓ کی والدہ حنتمہ ابوجہل کی چچیری بہن تھیں، حقیقی بہن نہ تھیں، علامہ محدث ابن عبدالبرؒ نے لکھا کہ جس نے ام عمر کا نام حنتمہ بنت ہشام کہا، غلطی کی ہے۔ (استیعاب ۴۱۵/۲)

دوسری طرف یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ نے خود فرمایا کہ میں نے بدر میں اپنے خال (ماموں) کو قتل کیا تھا، ملاحظہ ہو الروض الانف ۱۰۳/۲ لہٰذا آپ کے مقتول حقیقی ماموں عاصی بن ہاشم بن مغیرہ تھے، جو آپ کی والدہ کے حقیقی بھائی تھے، لہٰذا سیرت ابن ہشام ۱۰۳/۲ اور الروض ۱۰۳/۲ اور تاریخ ابن خلدون ۸۶/۱ میں مقتولین بدر کے ذیل میں عاصی بن ہشام کا نام درست نہیں ہے، اور الروض ۱۰۴/۲ میں تو خود بھی ہاشم کو حضرت عمرؓ کا نانا لکھا ہے، جب ہاشم نانا تھے تو ان ہی کا بیٹا تو حضرت عمرؓ کا ماموں ہو سکتا ہے، اس طرح الروض کی ہی دونوں عبارتوں میں تعارض موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

شائع شدہ اہم کتبِ سیر کا ذکر

''سیرۃ کبریٰ'' تالیف علامہ رفیق دلاوری میں اس واقعہ کی تصحیح کی طرف توجہ کی گئی ہے، اور موجودہ کتبِ سیرت میں وہ نہایت عمدہ اور قابل قدر ہے، افسوس ہے کہ اس کی تالیف ناقص رہ گئی رحمتہ للعالمین بھی بعض اعتبارات سے عمدہ اور قابل قدر ہے مگر بعض اہم امور کو نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً غزوات کی تفصیل وغیرہ۔

سیرۃ النبی کے اندر خلافِ توقع بہت سی جگہ تحقیق کا حق ادا نہیں کیا گیا، اور مضامین کی غلطیاں بھی ہیں، کاش! اس کی نظر ثانی حضرت سیّد صاحبؒ آخر عمر میں کر لیتے جبکہ انہوں نے اس کے بعض مضامین سے رجوع بھی کر لیا تھا، اور ان کی زندگی میں بڑا انقلاب آ چکا تھا۔

یہ رجوع کی تحریر ابتداءِ محرم ۶۲ھ کی ہی جو معارف جنوری ۴۳ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کا ذکر انوار الباری میں مع اقتباس عبارتِ رجوع کے پہلے ہو چکا ہے، اس سے تقریباً ایک سال دس ماہ بعد والے ایک مکتوب (مورخہ کیم ذی قعدہ ۶۳ھ کا اقتباس ''معارف

القرآن'' مؤلف محترم مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی دام فیضہم میں شائع ہوا، وہ یہ ہے:۔

حضرت سیّد صاحبؒ کے ارشادات

دوسری چیز یہ ہے کہ جمہورِ اسلام جس مسئلہ پر اعتقادی وعملی طور پر متفق ہوں اس کو چھوڑ کر تحقیق کی نئی راہ نہ اختیار کی جائے، یہ طریق تواتر وتوارث کی بیخ کنی کے مرادف ہے، اس گناہ کا مرتکب کبھی میں خود ہو چکا ہوں، اور اس کی اعتقادی وعملی سزا بھگت چکا ہوں، اس لئے دل سے چاہتا ہوں کہ اب میرے عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی اس راہ سے نہ نکلے تاکہ وہ اُس سزا سے محفوظ رہے جو ان سے پہلوں کو مل چکی ہے،

مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک فقرہ اس باب میں بہت خوب ہے، انہوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ''کبھی حضرت شاہ ولی اللہ اور سرسید احمد خاں دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں مگر ایک سے ایمان پرورش پاتا ہے اور ایک سے کفر'' اُس زمانہ کے اکثر لکھنے والے اس نکتہ سے تغافل برت رہے ہیں اور اس لئے خوف لگا رہتا ہے کہ ان سے ایمان کی بجائے کفر کو نشوونما کا موقع نہ ملے، سید سلیمان ندوی، یکم ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ (بہ شکریہ بینات ماہ ستمبر ۱۹۶۸ء کراچی)!

یاد آیا کہ حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں بزمانہ قیام کراچی وفات سے صرف ایک ہفتہ پیشتر راقم الحروف حاضر ہوا تھا، غالباً حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوری دام فیضہم بھی ساتھ تھے، اور باتوں کے ساتھ احقر نے عرض کیا کہ آپ ندوہ میں جدید وقدیم کی آمیزش کا تجربہ کر چکے ہیں، اس پر فوراً برجستہ فرمایا کہ ''جی ہاں! کیا ہے مگر ہر قدم پل صراط پر تھا'' سبحان اللہ! ایک جملہ میں وہ کچھ کہہ دیا جو دفتروں میں نہ سماتا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ!

فوٹو کے جواز، عدم خلود جہنم کے عقیدہ متعدد چیزوں سے رجوع فرمایا تھا، جو ۱۹۴۳ء کے معارف میں شائع ہوا، مگر بعض حضرات اب تک ان کے سابقہ مضامین شائع کر رہے ہیں، اور ان کو شاید یہ علم بھی نہیں کہ سید صاحب ان کے بعض حصّوں سے رجوع کر چکے ہیں، ابھی ۱۲ جون ۱۹۷۰ء کا ہفتہ روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی دیکھا، جس میں تصاویر وفوٹو کے متعلق سید صاحبؒ کا طویل مضمون معارف ۲۷ء سے نقل کر کے شائع کیا ہے۔

اس دور کے تجدد پسند اہل قلم حضرات کو حضرت سیّد صاحب نور اللہ مرقدہ کی نصیحت مذکورہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے، صرف لکھنا اور بے سوچے سمجھے لکھتے چلے جانا، خواہ اس سے علوم سلف وخلف کے قلعے کے قلعے مسمار ہوتے چلے جائیں کوئی کمال نہیں ہے، واللہ یهدی من یشاء الی صراط مستقیم

باب فتنہ کا ٹوٹنا! اس بارے میں حدیثِ بخاری پانچ جگہ آئی ہے باب الصلوٰۃ کفارۃ ۷۵ میں، پھر باب الصدقۃ تکفر الخطیئۃ ۱۹۳ میں، پھر باب الصوم کفارۃ ۲۵۴ میں پھر علامات النبوۃ ۵۰۷ میں، پھر باب الفتنۃ تموج کموج البحر ۱۰۵۱ میں اور الفاظ کا معمولی فرق اجمال وتفصیل کا ہے، حضرت ابووائل حضرت حذیفہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک روز ہم سب حضرت عمرؓ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے دریافت فرمایا تم میں سے کس کو فتنہ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد یاد ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا مجھے یاد ہے آپ نے فرمایا کہ اچھا بتاؤ تم بہت جری ہو سناؤ کس طرح سے ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ جو فتنہ آدمی کو اس کے اہل خانہ، مال، اولاد اور پڑوسی کے بارے میں پیش آتا ہے، اس کا کفارہ نماز، صدقہ، صوم، اور امر بالمعروف ونہی المنکر سے ہو جاتا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا میں تم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھتا، بلکہ اس فتنہ کے بارے میں پوچھتا ہوں، جو سمندر کی موجوں کی طرح جوش مارے گا حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا یا امیر المومنین! آپ کو اس سے ڈرنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کے اور اس کے درمیان بند دروازہ ہے، آپ نے پوچھا وہ دروازہ کھلے گا یا ٹوٹے گا، عرض کیا ٹوٹے گا، آپ نے فرمایا پھر تو وہ بند نہ ہو سکے گا، ہم نے کہا ہاں! بیشک ایسا ہی

ہے، پھر ہم نے حضرتِ حذیفہؓ سے پوچھا کیا حضرت عمرؓ اس دروازہ کو جانتے تھے کہ کون ہے؟ کہا ہاں! وہ اس دروازہ کو اس طرح یقین کے ساتھ جانتے تھے، جس طرح وہ جانتے تھے کہ کل کے دن سے پہلے رات آئے گی، اور میں نے جو بات ان سے کہی وہ کسی شک ومغالطہ والی بات نہ تھی، راوی کہتے ہیں کہ پھر ہماری جراءت یہ نہ ہوئی کہ حضرتِ حذیفہؓ سے یہ بھی پوچھ لیں کہ دروازہ سے کیا مراد ہے؟ لہٰذا ہم نے مسروق کے ذریعہ دریافت کرایا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ حضرت عمرؓ ہیں۔

تشریح! حافظؒ نے لکھا کہ فتنہ سے مراد ان سب امور کے حقوق ادا کرنے کے اندر کوتاہی کے ہیں جس کا کفارہ نماز وغیرہ دات کے ذریعہ ہو جاتا ہے کہ حسنات برائیوں کے وبال کو ختم کراتی رہتی ہیں پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان مذکورہ اعمالِ خیر میں سے ہر ایک اُن سب مذکورہ کوتاہیوں کا کفارہ کردے، یا ایک ایک چیز حسبِ ترتیب مذکورہ ایک ایک بُرائی کا کفارہ بنے، مثلاً نماز خانگی فتنہ کا کفارہ ہو، صدقہ مال کے فتنہ کا، روزہ اولاد کے فتنہ کا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر فتنہ جار کا اور صغیرہ گناہوں کا کفارہ تو حسنات سے ہو ہی جاتا ہے، کبائر کے لئے البتہ توبہ ضروری ہے، علامہ ابن المنیرؒ نے کہا:۔ اہل کا فتنہ یہ ہے کہ تعدد کی صورت میں کسی بیوی کی طرف زیادہ میلان یا ترجیح کا سلوک، اور حقوقِ واجب کی ادائیگی میں کوتاہی وغیرہ، مال کا فتنہ یہ ہے کہ اس میں مشغول ہو کر اداءِ عبادت میں کوتاہی کردے، اولاد کا فتنہ یہ کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دے، پڑوس کا فتنہ یہ کہ اس کے مال وجاہ وغیرہ پر حسد کرے، یا وہ فقیر ہو تو اس کے مقابلہ میں فخر کرے یا اس کی ضرورتوں کی خبر گیری نہ کرے وغیرہ، یہ بطور مثال ہے ورنہ اسباب فتنہ ان سب امور سے متعلق نا قابل شمار ہیں اور اسی طرح مکفرات بھی صرف یہی مذکور نہیں بلکہ دوسرے بہت زیادہ ہیں۔

تموج پر حافظ نے لکھا:۔ اس مثال سے مراد صرف کثرتِ فتن نہیں بلکہ سخت ہیجان واضطراب اور باہمی شدتِ مخاصمت وکثرتِ منازعت کی صورت اور اس کے نتائج باہم سب وشتم اور مارکاٹ کی صورتیں رونما ہونا ہیں، جس طرح سمندر کی موجیں ہیجان وطوفان کے وقت ایک دوسرے پر چڑھتی ہیں، اور باہم زیروزبر ہوتی ہیں۔

لا باس علیک منھا پر لکھا:۔ روایتِ ربعی میں یہ بھی زیادتی ہے کہ وہ فتنے دلوں پر اثر انداز ہوں گے، اور ان کو بگاڑنے کی صورت پیدا کریں گے، پھر جو قلب ان کا کوئی اثر نہ لے گا، اس پر سفید نکتہ لگے گا، یہاں تک کہ جتنے بھی فتنوں کی اس پر یورش زیادہ ہوگی وہ زیادہ ہی سفید ہوتا جائے گا، اور چکنے پتھر کی طرح کہ اس کو کسی فتنہ سے نقصان نہ ہوگا، اور جو قلب ان فتنوں سے دلچسپی لے گا اور ان کے رنگوں میں رنگا گیا، اس پر سیاہ نکتہ لگے گا، یہاں تک کہ وہ برابر اور زیادہ سیاہ ہی ہوتا جائے گا، اور اوندھے رکھے ہوئے پیالے کی طرح ہو جائے گا کہ کسی معروف اور بھلی بات کو بھلی نہ سمجھے گا اور نہ منکر اور بُری بات کو بُری خیال کرے گا، اس کے بعد میں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ان فتنوں کے اور آپ کے درمیان تو مغلق دروازہ حائل ہے۔

ان بینك وبینھا بابا مغلقا پر لکھا:۔ یعنی ایسا بند دروازہ کہ! اس میں سے کوئی چیز آپ کی زندگی میں باہر نہیں آسکتی، ابن المنیرؒ نے کہا:۔ حضرت حذیفہؓ کے اثرِ مذکور سے معلوم ہوا کہ وہ حفاظتِ سِر پر حریص تھے، اسی لئے حضرت عمرؓ کے سوال پر بھی صراحت سے اُن کا جواب نہیں دیا، صرف کنایہ واشارہ پر اکتفا کیا، اور غالباً وہ ایسے امور میں اس کے لئے ماذون تھے، علامہ نوویؒ نے یہ بھی کہا کہ ممکن ہے حضرت حذیفہؓ یہ بھی جانتے ہوں کہ حضرت عمر قتل کئے جائیں گے، لیکن انہوں نے آپ کے سامنے اس کا اظہار پسند نہ کیا ہوگا، کیونکہ حضرت عمرؓ خود بھی جانتے تھے کہ وہی باب ہیں، لہٰذا حضرت حذیفہؓ نے بلا تصریحِ قتل اتنی بات کہہ دی جس سے مقصد حاصل ہو گیا، لیکن ربعی کے طریق روایت سے اس کے خلاف بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شاید حضرت حذیفہؓ نے موت سے کنایہ بہ لفظ فتح کیا ہو اور قتل سے بہ لفظِ کسر، اسی لئے روایتِ ربعی میں ہے، کہ حضرت عمرؓ بھی ان کی بات کو سمجھ گئے چنانچہ فرمایا ''کسر لا ابالک'' یعنی وہ دروازہ ٹوٹے گا؟! تیرا باپ نہ ہو، ناگواری

کے وقت یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔ اگرچہ ربعی کے باقی الفاظِ روایت سے وہی بات نکلتی ہے جو ہم نے دوسری روایات کی روشنی میں پہلے بیان کی ہے کیونکہ اس میں یہ بھی ہے:۔ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ وہ دروازہ ایک شخص ہے، جو قتل ہوگا یا اپنی طبعی موت سے مرے گا، پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ جملہ درحقیقت حضرت حذیفہؓ کی بات پر اور اپنے متعلق سمجھنے پر نہیں، بلکہ ان نصوصِ صریحہ کے باعث ہوگا، جن میں اس امت کے اندر فتنوں کے رونما ہونے اور آپس کے جھگڑوں اور نزاعات کے برپا ہونے کی خبر دی گئی ہے جو قیامت تک برابر پیش آتے رہیں گے، کتاب الاعتصام میں حدیث جابرؓ بھی آنے والی ہے، جو او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض کی تفسیر ہے، پھر آخر میں حافظ نے لکھا:۔ معنی روایتِ حضرت حذیفہؓ کی تائید روایتِ حضرت ابوذرؓ سے بھی ہوتی ہے (رواہ الطبرانی باسناد ثقات) کہ وہ حضرت عمرؓ سے ملے تو آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دبایا، جس پر انہوں نے کہا کہ اے قفل فتنہ! میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے! اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کر کے لوگوں سے کہا تمہیں کسی فتنہ سے واسطہ نہ پڑے گا جب تک یہ تم میں ہیں، بزار کی روایت میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ نے حضرت عمرؓ کو یاغلق الفتنہ کہہ کر پکارا، تو آپ نے اس کا سبب پوچھا حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ آپ ایک دن ہمارے سامنے سے گزرے جبکہ ہم لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے، تو حضور نے فرمایا یہ غلق الفتنہ ہے، یہ جب تک تم میں رہیں گے تمہارے اور فتنہ کے درمیان سخت بند کیا ہوا دروازہ حائل رہے گا۔ (فتح ۶/۳۹۳)

قول عمر اذا کسر لا یغلق ابدا (حضرت عمرؓ کا فرمانا کہ جب دروازہ توڑا جائے گا تو پھر کبھی بند نہ ہو سکے گا، بخاری باب الفتن ۱۰۵۱) اور بخاری باب الصوم ۲۵۴ میں ابدا کی جگہ الی یوم القیامۃ ہے کہ قیامت تک اس دروازہ کے بند ہونے کی توقع نہیں، حافظؒ نے لکھا:۔ حضرت عمرؓ نے یہ بات اس طرح سمجھی کہ توڑنا غلبہ سے ہوتا ہے، اور غلبہ فتنوں ہی کے اندر ہوا کرتا ہے، اور خبر نبوی سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ امت کے اندر جھگڑے ہوں گے، اور یہ بھی کہ ان کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، جیسا کہ شداد کی حدیث میں ہے کہ "میری امت میں جب تلوار چل پڑے گی تو پھر روزِ قیامت تک نہ رُکے گی" اس حدیث کی تخریج طبری نے کی ہے اور ابن حبان نے تصحیح کی ہے اور خطیب نے روایت کی کہ ایک روز حضرت عمرؓ (اپنی زوجہ مطہرہ) ام کلثوم بنت سیّدنا علیؓ کے پاس گئے، دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں، وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا: یہ یہودی (کعب الاحبار) آپ کو ابوابِ جہنم کا ایک باب بتلاتا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا ماشاء اللہ، پھر گھر سے نکل کر کعب بلوایا، وہ آئے اور کہا یا امیر المومنین! قسم بخدا ذی الحجہ کا مہینہ ختم نہ ہوگا کہ آپ جنت میں داخل ہو جائیں گے، آپ نے فرمایا یہ کیا کبھی جنت میں کہتے ہو کبھی جہنم میں؟! کعب نے کہا ہماری کتابِ الٰہی میں آپ کا ذکر ہے کہ آپ جہنم کے ایک دروازہ پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روکتے ہیں، لہٰذا جب آپ کی وفات ہو جائے گی تو پھر وہ اس میں داخل ہو جائیں گے" (فتح ۱۳/۳۸)

سریہ عمر بن الخطابؓ! آپ کے مناقب عالیہ میں سے یہ بھی ہے کہ سرایا نبویہ میں سے ایک سریہ آپ کے نام سے منسوب ہوا، جو تُربہ کی طرف ۷ھ میں گیا تھا، حضرت عمرؓ نے وہاں پہنچنے کے لئے عجیب طریقہ اختیار کیا کہ راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے، ہوازن کو خبر لگ گئی تو آپ کا رعب اتنا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے بھاگ نکلے، اور حضرت عمرؓ ان کے مقام پر پہنچے تو کسی کو نہ پایا (سیرۃ النبی ۱/۶۰۲)

رعب فاروقی اور صورت باطل سے بھی نفرت

ترمذی شریف میں ہے کہ حضور علیہ السلام کسی غزوہ سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے، تو ایک کالے رنگ والی جاریہ نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے نذر مانی تھی آپ صحیح سلامت تشریف لائیں گے تو میں آپ کے سامنے دف بجاؤں گی، اور گاؤں گی، آپ نے فرمایا اگر تم نے نذر مان لی تھی تو خیر پورا کر لو، ورنہ نہیں، اس پر وہ دف بجانے لگی، پھر حضرت ابوبکرؓ آ گئے، تب بھی بجاتی رہی، حضرت علیؓ آئے، تب بھی بجاتی

رہی، پھر حضرت عثمانؓ آ گئے، تب بھی بجاتی رہی، ان کے بعد جب حضرت عمرؓ آئے تو اس نے آپ کے ڈر سے دف کو نیچے ڈال دیا اور اس پر بیٹھ گئی، حضور علیہ السلام نے یہ دیکھا تو فرمایا اے عمر! تم سے تو شیطان بھی ڈرتا ہے۔

علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا:۔ میرے نزدیک بہتر توجیہ اس کی یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے تو نذر کی وجہ سے اور بظاہر دوسری کسی خرابی نہ ہونے کے باعث روکنا ضروری نہ سمجھا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ایسی بات کو بھی پسند نہ کرتے تھے، جو طریق باطل سے ظاہری مماثلت و مشابہت رکھتی ہو اگرچہ وہ حق بھی ہو اور حدِ اباحت میں ہی ہو، اس توجیہ کی تائید اسود بن سریع کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ میں ایک دفعہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے حمدِ خداوندی میں کچھ شعر کہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ مدح کو پسند کرتے ہیں، اپنے اشعار سُناؤ، میں سُنانے لگا، اسی اثنا میں ایک شخص نے آنے کی اجازت چاہی، آپ نے اسکی وجہ سے مجھے خاموش کر دیا (جیسے بلی کو کچھ اشارہ ہش بش کر کے روک دیا کرتے ہیں) وہ شخص اندر آیا اور کچھ دیر بات کر کے واپس چلا گیا، میں نے اپنے اشعار پھر سُنانے شروع کر دیئے، وہ پھر آیا تو آپ نے مجھے پھر روک دیا، میں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کون تھا جس کے لئے آپ نے مجھے روک دیا، آپ نے فرمایا یہ شخص باطل کو ناپسند کرتا ہے، یہ عمر بن الخطاب ہیں (اخرجہ احمد) حضور علیہ السلام نے اس کو باطل فرمایا، حالانکہ ان اشعار میں سب بات حق تھی اور حمد و مدحِ خداوندی تھی، اس لئے کہ وہ جنسِ باطل سے تھی کیونکہ شعر کی جنس تو ایک ہے (وما علمناه الشعر وماينبغي له اور والشعر من مزامير ابليس وغیرہ) اور اسی قبیل سے وہ قصہ بھی ہے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ کے لئے حریرہ پکایا اور آپ کے پاس لے کر گئی، تو اس وقت حضرت سودہ بھی موجود تھیں اور رسول اکرم ﷺ درمیان تھے، دوسری طرف وہ بیٹھی تھیں، ایک طرف میں تھی، میں نے ان سے بھی کہا کہ کھالو، انہوں نے انکار کیا تو میں نے کہا یا تو کھاؤ ورنہ میں تمہارے منہ پر مل دوں گی، انہوں نے پھر بھی انکار ہی کیا تو میں نے حریرہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے منہ پر خوب لیپ کر دیا، حضور علیہ السلام یہ ماجرا دیکھ کر ہنسے، اور پھر حضرت سودہؓ کے لئے اچھی طرح موقع دینے کے لئے اپنی ران مبارک پشت کر کے ان سے فرمایا، تم بھی بدلہ لو اور ان کے منہ پر ملو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اسی پر بھی حضور ﷺ ہنسے، اتنے میں حضرت عمرؓ آئے اور یا عبد اللہ یا عبد اللہ پکارا، حضور نے خیال فرمایا کہ وہ اندر آئیں گے، تو ہم دونوں سے فرمایا، اٹھو! اپنے اپنے منہ دھولو، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، میں ہمیشہ حضرت عمرؓ سے ڈرتی رہی، کیونکہ حضور علیہ السلام کو ان کا لحاظ کرتے دیکھا (مرقاۃ ۵۴۰/۵)

شیاطینِ جن وانس کا حضرت عمرؓ سے ڈرنا

ترمذی شریف حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور علیہ السلام گھر میں تشریف رکھتے تھے، ہم نے باہر شور اور بچوں کی آوازیں سُنیں، آپ باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک حبشی عورت ناچ رہی ہے اور اس کے چاروں طرف بچے جمع ہیں، آپ نے فرمایا عائشہ آؤ، دیکھو! میں گئی اور آپ کے مونڈھے اور سر مبارک کے درمیان اپنی ٹھوڑی رکھ کر اس کا تماشہ دیکھنے لگی، آپ نے کئی بار پوچھا کیا جی نہیں بھرا؟ اور میں ہر دفعہ نہیں کہتی رہی، تاکہ دیکھوں حضور کے دل میں میری کتنی قدر ہے، اتنے میں حضرت عمرؓ آ گئے، اور سب لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ شیاطینِ جن وانس سب ہی عمر سے بھاگتے ہیں اس وقت میں بھی گھر میں لوٹ آئی۔

حضرت ملا علی قاریؒ نے لکھا:۔ اس حدیث سے حضور علیہ السلام کی غیر معمولی اخلاقی عظمت اور غلبہ صفتِ جمال کا ثبوت ملا، اور ساتھ ہی حضرت عمرؓ پر غلبہ صفتِ جلال کا ہونا معلوم ہوا۔

نیز ابن السمان نے الموافقہ میں حضرت عائشہؓ سے ایک روایت دوسری بھی نقل کی ہے (جو ان دونوں سابقہ روایات کی طرح

ہے) کہ ایک انصاری عورت آئی اور کہا میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر حضور علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوں گی تو آپ کے سر پر دف بجاؤں گی، میں نے حضور علیہ السلام سے اس کا ذکر کیا آپ نے فرمایا اس سے کہہ دو کہ اپنی (نذر یا قسم پوری کرلے) وہ دف لے کر حضور علیہ السلام کے سر پر کھڑی ہوگئی، ابھی دو تین بار ہی دف پر چوٹ لگائی تھی کہ حضرت عمرؓ نے اندر آنے کی اجازت چاہی، تو دف تو اس کے ہاتھ سے گر گیا، اور خود حضرت عائشہؓ کے پاس پردہ میں سرک گئی، انہوں نے پوچھا کیا ہوا؟ کہا حضرت عمرؓ کی آواز سن کر ڈر گئی، اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا، شیطان تو عمرؓ کی آہٹ سے بھی بھاگتا ہے۔ (مرقاۃ ۱۵۵/۵)

شیطان کا حضرت عمرؓ کے راستہ سے کترانا

بخاری و مسلم نسائی وغیرہ میں ہے کہ ایک روز حضرت عمرؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں آنے کی اجازت چاہی تو اس وقت آپ کے پاس قریش کی عورتیں بیٹھی تھیں، جو آپ سے باتیں کر رہی تھیں، اور نفقہ میں اضافہ کا مطالبہ کر رہی تھیں، ان کی آوازیں بلند تھیں، حضرت عمرؓ کی آواز سن کر جلد ہی سب پردہ کے پیچھے چلی گئیں، حضرت عمرؓ اندر پہنچے تو حضور علیہ السلام ہنسنے لگے، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، کیا بات ہوئی؟ آپ نے فرمایا:۔ مجھے ان سب پر ہنسی آگئی کہ ابھی تو سب میرے پاس جمع تھیں، تمہاری آواز سُنتے ہی پردہ کے پیچھے بھاگ گئیں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ سے تو ان کو اور بھی زیادہ ڈرنا چاہیے، پھر حضرت عمرؓ نے ان سب جمع ہونے والیوں سے خطاب کیا کہ اے اپنی جانوں کی دشمنو! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو اور حضور علیہ السلام سے نہیں ڈرتیں، انہوں نے کہا، ہاں! یہی بات ہے، کیونکہ تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سخت اور درشت مزاج ہو، حضور علیہ السلام نے فرمایا اے عمر! اور کہو! یعنی ان کی بات کا خیال نہ کرو اور جو کچھ بھی اس موقع کے مناسب مزید باتیں کہنی ہیں وہ کہہ دو، تاکہ ان کی اصلاح ہو وغیرہ) قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ شیطان جس راستہ پر تمہیں چلتا دیکھتا ہے، ضرور اس سے کترا کر دوسرے راستے پر چلا جاتا ہے۔

محدث علامہ قسطلانیؒ (شارحِ بخاری) نے لکھا کہ وہ جمع ہونے والی عورتیں آپ کی ازواجِ مطہرات حضرت عائشہؓ، حفصہ، ام سلمہ، زینب بنت جحش وغیرہ تھیں، علامہ قسطلانیؒ (حافظ ابن حجر) نے لکھا کہ وہ ازواجِ مطہرات تھیں اور احتمال ہے کہ دوسری قریشی عورتیں بھی ساتھ ہوں (جو اپنے معاملات و شکایات پیش کرنے آئی ہوں گی) لیکن زیادہ نفقہ کا مطالبہ اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ صرف ازواجِ مطہرات تھیں، علامہ داؤدی نے کہا کہ یستکثرن کا مطلب بڑھ چڑھ کر باتیں کرنا ہے (جو شکوے شکایات کے موقع پر عورتوں کی عادت ہے) مگر یہ احتمال روایتِ مسلم کے خلاف ہوگا، جس میں صراحت ہے کہ وہ نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کر رہی تھیں، لہٰذا استکثار کا مطلب متعین ہوگیا۔

علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا کہ یکلمنہ ویستکثرنہ قرینہ اسی امر کا ہے کہ وہ صرف ازواجِ مطہرات سے تھیں، جو حضور علیہ السلام سے بے تکلف تھیں، اور اسی وقت (عارضی طور[1] سے) جذبات سے مغلوب ہو کر آپ کے بلند ترین مقام نبوت و رسالت کے پاس و لحاظ سے غافل ہو کر صرف اپنے مطالبہ کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں، آوازیں بلند ہوئیں، اس پر اشکال ہوا ہے کہ قرآن مجید میں تو مسلمانوں کو حضور علیہ

---

[1] اس قسم کے چند واقعات اور بھی ازواجِ مطہرات کی زندگی میں ملتے ہیں، جو بشری مقتضیات کے تحت عارضی و وقتی طور سے پیش آئے، اُن کی وجہ سے طلاقِ رجعی، تحریم، ایلاء، وغیرہ کی بھی عارضی صورتیں موجود ہیں، بقول علامہ ملا علی قاریؒ ان سے حضور علیہ السلام کے خلقِ عظیم اور جلال کے مقابلہ میں جمال کا غلبہ ثابت ہوتا ہے اور امت کے لئے ان واقعات سے بہت کچھ سبق اور ہدایت بھی ملتی ہے لیکن جن لوگوں نے ایسے واقعات کو نمایاں کر کے غلط رنگ میں پیش کیا ہے وہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے اور ان لوگوں کی علمی خام کاری کی بڑی دلیل ہے اسی طرح اس دور کے بعض اہلِ قلم نے صحابہ کرام کی عظیم شخصیتوں کو موضوع بحث بنا کر ایک بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھول دیا ہے، جس سے اب نام کے کیمونسٹ مسلمانوں نے بھی فائدہ اٹھا کر مذہب کی بنیادیں متزلزل کرنے کا بیڑہ اٹھالیا ہے، حتیٰ کہ انہوں نے حضرتِ عمر فاروقؓ ایسی موقر و مسلّم عظیم ترین اسلامی شخصیت کو بھی لعن و طعن کا ہدف بنالیا ہے، جن کا ہم اس وقت تفصیلی تعارف پیش کر رہے ہیں، والی اللہ المشتکی

السلام کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنے کی ممانعت ہے، حافظ نے دوسرے غیر پسندیدہ جوابات نقل کر کے لکھا کہ ممکن ہے ازواجِ مطہرات میں سے بعض کی آواز خلقی طور سے بلند ہو، یا ممانعت صرف مردوں کو ہو، عورتوں کے لئے کم درجہ کی ہو، یا اس وقت عارضی طور سے سوال وجواب کے اندر آواز بلند ہوگئی ہو، جس کا انہوں نے عمداً ارادہ نہ کیا ہو، یا حضور علیہ السلام کے عفو وکرم پر بھروسہ کر کے ایسا کر بیٹھی ہوں، پھر خلوت کے اندر یوں بھی بعض چیزیں گوارا کر لی جایا کرتی ہیں، جو جلوت میں ناگوار ہوتی ہیں۔

علامہ محدث ملا علیٰ قاری حنفیؒ نے جواب دیا کہ اشکال تو جب ہو کہ ان کی آواز کا حضور علیہ السلام کی آواز سے بلند ہونے کا کوئی ثبوت ہو اور ممانعت اسی کی ہے، لہٰذا مراد یہ ہے کہ اُس وقت اپنی عام عادت کے خلاف انہوں نے اپنی آوازوں کو نسبتہً بلند کر دیا تھا، اور انھیں آپ کے خلقِ عظیم کی وجہ سے بھروسہ ہوگا کہ اتنے سے حضور پر ناگواری کا کوئی اثر نہ ہوگا، لہٰذا جب ناگواری نہیں تو معصیت بھی نہیں۔

علّامہ موصوف نے آخر میں لکھا:۔ اس حدیث سے حضرت عمرؓ کی بہت بڑی منقبت نکلتی ہے تاہم اس سے ان کی عصمت ثابت نہیں ہوتی (جو لازمہ نبوت ورسالت ہے) کیونکہ غیر نبی کو اُن وساوس سے مامون نہیں قرار دیا جاسکتا جو غفلت کا موجب بن سکتے ہیں (گویا یہ شان صرف نبی ہی کی ہے کہ وہ ہمہ وقت غفلت سے مامون ہوتا ہے)

علامہ تورپشتیؒ نے فرمایا کہ **مالقیک الشیطان** الخ میں حضرت عمرؓ کی دینی صلابت اور ہزل ولایعنی امور سے ہٹ کر صرف کام کی باتوں اور خالص حق پر ہی ہمیشہ دھیان وتوجہ دینے کا حال بتلایا گیا ہے، اسی لئے وہ حضور علیہ السلام کی پیشی میں گویا حق کی تلوار تھے، جب حضور علیہ السلام نے چاہا وہ چلی اور جب روکا رک گئی، اس طرح حضرت عمرؓ کا شیطان پر غلبہ وتسلط بھی، درحقیقت حضور علیہ السلام ہی کا غلبہ وتسلط تھا، اور حضرت عمرؓ کی مثال شاہی درباروں کے مارشل کی تھی، جس کے ذریعہ بادشاہ تادیبی یا تعزیری احکام نافذ کرتا ہے (آج کل پارلیمنٹ واسمبلی میں بھی مارشل ہوتا ہے جو صدرِ اجلاس کے حکم سے تادیبی وتعزیری کارروائی کرتا ہے۔)

علامہ نوویؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے الفاظ مذکورہ مظاہر پر محمول ہیں، اور واقع میں حضرت عمرؓ کے رعب وہیبت کی وجہ سے شیطان اس راستہ سے دور ہو جاتا تھا، جس پر آپ چلتے تھے۔

حافظؒ نے لکھا کہ اوسطِ طبرانی میں حدیثِ حفصہؓ ان الفاظ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد سے شیطان جب بھی ان کے سامنے آتا ہے تو منہ کے بل گر جاتا ہے (فتح الباری ۳۳/۷ ومرقاۃ ۳۲۲/۵)

حضرت عمرؓ کا لذاتِ دنیوی سے احتراز! حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک روز میرے ہاتھ میں درہم دیکھا، پوچھا کیا کرو گے؟ میں نے کہا گوشت لاؤں گا، فرمایا کیوں؟ میں نے کہا گھر میں سب لوگوں کا گوشت کھانے کو جی چاہتا ہے آپ نے فرمایا:۔ کیا خوب! جب بھی تمہارا کسی چیز کو جی چاہے تو بس کھا لیا کرو گے، ایسا کرو گے تو کہیں قیامت کے دن تمہیں خدا کی طرف سے **اذھبتم طیباتکم** نہ سُننا پڑے، کہ تم نے دنیا میں ہی ہماری نعمتوں میں سے اپنا حصہ پورا کر لیا، اور ان سے فائدہ اٹھا چکے (ازالۃ الخفاء ۳۴/۱)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ درحقیقت یہ آیت تو کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے، تاہم اس میں چونکہ کفار کے دنیا کے تنعم وراحت پسندی پر تعریض کی گئی ہیں، اس لئے اہل تقویٰ نے جائز تنعم وراحت پسندی سے بھی حتی الامکان احتراز کیا ہے،

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے بہت سی کھانے پینے کی طیبات سے سے احتراز برتا ہے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہ میں بھی کہیں ان لوگوں جیسا نہ ہو جاؤں جن کی حق تعالیٰ نے توبیخ وتقریع کی ہے، اور ابومجاز نے کہا کہ بہت سی قومیں قیامت کے دن اپنی دنیا کے بھلے کاموں کا کچھ وجود ونشان نہ پائیں گی تو ان کو کہا جائے گا کہ تم نے ان کے عوض دنیا کی بہاروں اور لذتوں سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔ (ابن کثیر ۱۶۰/۴)

صاحب روح المعانیؒ نے لکھا:۔ حاکم وبیہقی نے روایت کی کہ حضرت عمرؓ نے حضرت جابرؓ کے ہاتھ میں درہم دیکھا، آپ کے سوال پر انہوں نے گوشت خریدنے کا ارادہ بتلایا تو فرمایا:۔ کیا یہ کچھ اچھی بات ہے کہ جب بھی جس چیز کو جی چاہا خرید لیا آیت اذھبتم طیباتکم سے تم کیوں غافل ہو جاتے ہو!

امام احمد، ابن مبارک، ابونعیم وغیرہ نے روایت کی کہ ایک دفعہ اہل بصرہ کا وفد حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے کھانے پر کسی دن تو گھی لگی روٹی ہوتی (بغیر سالن کے) کسی دن روٹی کے ساتھ زیتون کا تیل ہوتا، کبھی سالن کی جگہ گھی، کبھی دودھ، کبھی سوکھے ٹکڑے کٹوا کر پکوالیتے، اور کبھی کسی دن تازہ گوشت کا سالن بھی ہوتا مگر بہت کم، اور حضرت عمرؓ نے ہم سے فرمایا:۔ واللہ میں تمہارے لذیذ کھانوں کرا کر (سینے کا عمدہ گوشت) اسنمہ (کوہان شتر کا لذیذ گوشت) صلاء (بھنے ہوئے گوشت) صناب (رائی اور روغنِ زیتون سے بنی ہوئی چٹنی) اور سلائق (سبزیوں کی ترکاری) یا چپاتیوں کی لذت سے ناآشنا نہیں ہوں، مگر میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کو ایسی ہی لذتوں کا دلدادہ ہونے پر عار دلائی ہے اور فرمایا **اذھبتم طیباتکم الآیہ** اس لئے مجھے یہ چیزیں پسند نہیں۔

علامہ موصوف نے مزید لکھا کہ یہ زہد صرف حضرت عمرؓ سے منقول نہیں بلکہ حضور علیہ السلام نے بھی ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ یہ میرے اہل بیت ہیں، اور مجھے پسند نہیں کہ یہ اپنے حصہ کی طیبات دنیوی زندگی میں استعمال کرلیں، پھر لکھا کہ دنیاوی زندگی کی طیبات کے بارے میں زہد کی احادیث بہ کثرت وارد ہیں اور رسول اکرم ﷺ کا حال اس کے بارے میں امت میں معلوم ومشہور ہے تاہم اسی کے ساتھ بحر میں حضرت عمرؓ کے حالات زہد بیان کر کے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ یہ سب بابِ زہد سے متعلق ہے ورنہ آیت **اذھبتم طیباتکم** کا نزول کفارِ قریش کے بارے میں ہوا تھا، اور مطلب یہ ہے کہ تم بھی ایمان لاتے تو یہ طیباتِ آخر تمہیں حاصل ہوتیں مگر تم کفر پر جمے رہے اور ایمان کی نعمت سے محروم ہوئے، اور جلدی کر کے اپنے حصہ کی طیبات (نعمتوں) سے دنیوی زندگی میں ہی فائدہ اٹھالیا، پس یہ اشارہ ان کے عدم ایمان کی طرف ہے، اسی لئے اس پر عذاب کا استحقاق ذکر ہوا ہے (الیوم تجزون عذاب الھون) اگر آیت اہل کفر وایمان سب کے لئے عام اور اپنے ظاہر پر ہوتی تو عذاب کا ترتب اس پر کیسے ہوتا؟ اور چونکہ اہل مکہ لذاتِ دنیوی میں بہت ہی زیادہ منہمک تھے اور ایمان وتعلیماتِ نبویہ سے اعراض کرتے تھے، اسی لئے اس کے بعد پہلے زمانہ کے عربوں کا بھی ذکر مناسب ہوا، جو ان موجودہ سے اموال وجاہ وغیرہ میں کہیں زیادہ تھے، لیکن کفر کی وجہ سے ان پر عذابِ الٰہی مسلط ہوا، فرمایا:۔ واذکر اخاعاد الایہ کہ ذرا ان اہلِ مکہ کو ہود علیہ السلام کا قصہ تو سنا دیجئے، جنھوں نے اپنی قوم عاد کو احقاف[1] کے مقام میں ڈرایا اور خدا کی توحید کی طرف بلایا تھا، مگر وہ کفر وشرک سے باز نہ آئے، کہا کہ ہم سے زیادہ قوت وشوکت والا دنیا میں کون ہے؟ بالآخر ان پر پہلے خشک سالی کا عذاب آیا، اور اس پر بھی متنبہ نہ ہوئے تو ہوا کا عذاب کہ مسلسل آٹھ دن تک آندھیوں کے طوفان اور جھکڑ چلے، جس سے وہ خود بھی ہلاک ہوئے اور ان کی بستیاں بھی نیست ونابود ہوگئیں (روح المعانی ۲۶/۲۶)

مزید افادہ! اس سلسلہ میں بحث تشنہ رہے گی اگر تفسیر مظہری کے افادات بھی ذکر نہ کئے جائیں، علامہ بغویؒ نے فرمایا:۔ اگرچہ حق تعالیٰ نے تمتع لذاتِ دنیوی پر کفار کو توبیخ وملامت کی ہے، لیکن ثوابِ آخرت کی امید میں رسول اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے بھی لذاتِ دنیوی سے اجتناب فرمایا ہے، بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بارگاہِ نبوی میں پہنچے دیکھا کہ آپ بوریئے پر لیٹے تھے، جس کے

---

[1] حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ احقاف عمان ومہرہ کے درمیان تھا، ابن اسحٰق نے کہا کہ ان کے مساکن عمان سے حضر موت تک تھے، (روح المعانی ۲۶/۲۴ وتفسیر مظہری ۸/۱۱۳) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے حضر موت کے شمال میں اس طرح واقع لکھا کہ شرق میں عمان، شمال میں ربع خالی تھا، اور قوم عاد کے مفصل حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے (قصص القرآن ۱/۸۷) تفہیم القرآن ۴/۶۱۴ میں نقشہ کے ذریعہ اس مقام کی نشاندہی کی گئی ہے اور ۴/۶۱۵ میں جدید معلومات سے بھی مستفید کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

نشانات پہلوئے مبارک پر ظاہر تھے، تکیہ چمڑا کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری تھی، عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ کی امت کو بھی وسعت وآسائش ملے، روم وفارس والوں پر تو اللہ تعالیٰ نے بڑا انعام کیا ہے حالانکہ وہ اس کی عبادت بھی نہیں کرتے، یہ سن کر حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔ ابن الخطاب! کیا تم ان باتوں کی فکر وخیال میں لگ گئے؟ ان لوگوں کے لئے تو ان کے حصّہ کی ساری طیبات اور نعمتیں دنیا ہی کی فانی زندگی میں دیدی گئی ہیں، دوسری روایت میں ہے کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ ان کے لئے دنیا اور تمہارے لئے آخرت ہو۔

بخاری ومسلم میں حضرت عائشہؓ سے یہ روایت بھی ہے کہ متواتر دو دن تک کبھی بھی حضور علیہ السلام کے اہل بیت نے پیٹ بھر کر جو کی روٹی نہیں کھائی، بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو بکری کا گوشت کھا رہے تھے، ان کو بلایا تو کھانے سے انکار کردیا اور فرمایا:۔ نبی اکرم علیہ السلام تو دنیا سے رخصت ہوئے اور کبھی جو کی روٹی سے بھی پیٹ نہیں بھرا۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ہم پر بعض مہینے ایسے بھی گزرتے تھے کہ چولھوں میں آگ نہ جلتی تھی، صرف کھجور اور پانی پر گزارہ کرتے تھے، البتہ اکثر انصاری عورتیں ہمارے یہاں دودھ بھیج دیا کرتی تھیں، اللہ تعالیٰ ان کو جزاءِ خیر عطا فرمائے۔

حضرت ابن عباسؓ سے ترمذی، ابن ماجہ ومسند احمد میں روایت ہے کہ رسول اکرم علیہ السلام مسلسل کئی رات بھوکے پیٹ سوتے تھے اور آپ کے گھر والوں کے لئے رات کا کھانا نہ ہوتا تھا، اوران کی غذا میں روٹی اکثر جو کی ہوتی تھی۔

ایک دفعہ رسول اکرم علیہ السلام نے مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رکھ کر گھر والوں کے لئے جو حاصل کئے، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام کی نو ازواجِ مطہرات تھیں، مگر کبھی کسی رات میں ان کے پاس پورا ایک صاع گیہوں وغیرہ کا موجود نہیں ہوا (ایک صاع تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے)

نبی کریم علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو فرمایا:۔ تنعم (عیش وراحت پسندی) سے بچتے رہنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے متنعم نہیں ہوئے، بیہقی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ جو اللہ کے دیئے ہوئے تھوڑے رزق پر راضی ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے عمل سے راضی ہوں گے، حدیث جابرؓ میں ہے "تمہارے دلوں میں اس امر کا جذبہ کیوں نہیں پیدا ہوتا کہ خود بھوکے رہ کر اپنے بھوکے پڑوسی اور چچازاد بھائی کا پیٹ بھرو، ایک روز حضرت عمرؓ نے پانی مانگا، پانی میں شہد ملا کر لایا تو فرمایا، یہ طیّب اور اچھا تو ہے لیکن میں تو اللہ عزوجل کا کلام سُنتا ہوں کہ اُس نے ایک قوم کے لذیذ ومرغوب چیزوں کے استعمال پر نکیر کی ہے، اور فرمایا، **اذھبتم طیباتکم الایہ**، لہٰذا میں تو ڈرتا ہوں کہیں ہماری نیکیوں کا بھی یہیں دنیا میں بدلہ نہ چکا دیا جائے، یہ کہہ کر آپ نے اس شربت کو واپس کردیا۔

کتبِ تواریخ میں ہے کہ حضرت عمرؓ شام گئے تو ان کے سامنے ایسے عمدہ کھانے پیش کئے گئے، جو پہلے کبھی دیکھے بھی نہ تھے، آپ نے فرمایا:۔ یہ کیا؟! تمہیں معلوم نہیں کہ پہلے سارے مسلمان فقر وافلاس کی زندگی گزار گئے اور انہوں نے پیٹ بھر کر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی! حضرت خالدؓ نے عرض کیا کہ انھیں جنت میں سب کچھ مل گیا، اس پر حضرت عمرؓ رو پڑے اور فرمایا:۔ اگر ہمارے حصّہ میں یہی کھوٹی پونجی دنیا کی رہی اور وہ سب جنت کی نعمتوں کے حقدار بن گئے، تب تو ہمارے اور ان کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہوجائیگا۔ (تفسیر مظہری ۹۰۴۹/۸)

حضرت حفص بن ابی العاص حضرت عمرؓ کی خدمت میں اکثر آتے تھے مگر کھانے کے وقت چلے جاتے، ایک روز آپ نے پوچھا کیا بات ہے تم ہمارے کھانے میں شرکت نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا! میرے گھر کا کھانا آپ کے گھر کے کھانے سے لذیذ ہوتا ہے، اس لئے میں اسی کو پسند کرتا ہوں، آپ نے فرمایا! افسوس تم لذیذ کھانوں پر دم دیتے ہو، کیا تم نہیں سمجھتے کہ میں بھی اگر اپنے گھر میں حکم دوں تو بکری کا سالم بچہ بریاں کیا جاسکتا ہے اور میدے کی روٹی، مویز منقی کی نبیذ بھی تیار ہوسکتی ہے مگر خدا کی قسم مجھے ڈر ہے کہیں اس کے سبب سے قیامت کے دن میری نیکیاں کم نہ ہوجائیں۔ (ازالۃ الخفاء ۳۴۷/۱ وکنز العمال ۳۴۶/۶)

(نوٹ) ازالۃ الخفاء میں حفص بن عمر غلط چھپ گیا ہے اور اس نام کے آپ کے کوئی صاحبزادے تھے بھی نہیں۔

فضائل عمرؓ! تکمیل بحث کیلئے ہم یہاں کنز العمال سے بھی حضرت عمرؓ کے کچھ فضائل ومناقب ذکر کرتے ہیں، کنز العمال کی قسم الاقوال وقسم الافعال میں بہت زیادہ بلکہ تمام کتب حدیث سے زیادہ ذخیرہ موجود ہے جو مستقل طور سے ترجمہ ہو کر شائع ہو تو بہتر ہے:۔

(۱۴۱/۶) فرمایا (نبی اکرم ﷺ نے) ابوبکر و عمر اس دین اسلام کے لئے بمنزلہ سمع وبصر کے ہیں سر کے لئے۔

فرمایا:۔ میں نے ارادہ کیا کہ اپنے اصحاب کو بادشاہانِ دنیا کے پاس دعوتِ اسلام کے واسطے بھیجوں جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریین کو بھیجا تھا، عرض کیا گیا کہ آپ ابوبکر و عمر کو کیوں نہیں بھیجتے، وہ تو ابلاغِ اسلام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں؟ فرمایا ان سے میں مستغنی نہیں ہوں، ان کا مرتبہ دین اسلام کے لئے ایسا ہی ہے جیسے جسم کے لئے آنکھ اور کان کا،

فرمایا:۔ آسمان والوں میں سے میرے دو وزیر جبرئیل ومیکائیل ہیں، اور زمین والوں میں سے ابوبکر و عمرؓ ہیں۔

فرمایا:۔ (حضرت ابوبکر و عمرؓ سے) اگر تم دونوں کسی مشورہ میں ایک رائے پر اتفاق کرلو تو میں اس کے خلاف نہ کروں گا۔

فرمایا:۔ ابوبکر و عمرؓ میرے لئے ایسے ہی ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہارون تھے۔

فرمایا:۔ ابوبکر و عمرؓ آسمان وزمین والوں سے بہتر ہیں اور ان سے بھی جو قیامت تک آئیں گے۔

(۱۴۴/۴) فرمایا:۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ فرشتوں اور انبیاء میں تمہاری مثال کیا ہے، اے ابوبکر! تم تو فرشتوں میں میکائیل کی طرح ہو جو مخلوق کیلئے رحمت لے کر اُترتے ہیں اور انبیاء میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہو کہ جب ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی اور ان کیساتھ بہت ہی ناروا سلوک کیا تب بھی فرمایا اے رب! جو میرا اتباع کرے وہ مجھ سے ہے اور جو نافرمانی کرے آپ غفور ورحیم ہیں، اور اے عمر! تمہاری مثال فرشتوں میں جبرئیل جیسی ہے، جو اعداءِ دین کے لئے شدت، سختی اور عذاب لے کر اُترتے ہیں، اور انبیاء میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ہو کہ فرمایا:۔ اے رب! روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑ۔

(۱۴۵/۶) فرمایا:۔ ابوبکر و عمرؓ کو برا نہ کہو کہ وہ بجز انبیاء ومرسلین کے تمام اولین وآخرین کہول اہل جنت کے سردار ہیں، اور حسن وحسین کو برا نہ کہو کہ وہ سب جوانانِ اہل جنت کے سردار ہیں، علی کو برا نہ کہو کہ جس نے ان کو برا کہا گویا مجھے برا کہا اور جس نے مجھے بُرا کہا گویا خدا کو بُرا کہا، اور جو خدا کو بُرا کہے گا، اس کو خدا عذاب دے گا۔

فرمایا:۔ عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے سارے لوگوں پر فخر کیا، اور خاص طور سے عمر بن الخطاب پر، اور آسمان میں کوئی فرشتہ ایسا نہیں جو عمر کی توقیر نہ کرتا ہو، اور زمین میں کوئی شیطان ایسا نہیں جو عمر سے بھاگتا نہ ہو۔

(۱۴۶/۶) فرمایا:۔ عمر بن الخطاب اہل جنت کے چراغ ہیں، عمر میرے ساتھ ہیں، اور میں عمر کے ساتھ، اور حق میرے بعد عمر ہی کے ساتھ ہوگا، جہاں بھی وہ ہوں۔

فرمایا:۔ مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا:۔ عمر کی موت پر اسلام گریہ کرے گا۔

فرمایا:۔ سب سے پہلے جس کو حق تعالیٰ سلام ومصافحہ کا شرف عطا کریں گے وہ عمر ہوں گے، اور سب سے پہلے ان ہی کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں داخل کریں گے۔

(۱۴۷/۶) فرمایا:۔ کسی معاملہ میں لوگوں نے کچھ کہا اور عمر نے بھی کہا، تو قرآن مجید میں عمر کے موافق ہی نزول ہوا۔

فرمایا:۔ اگر میں مبعوث نہ ہوتا تو عمر مبعوث ہوتے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید وتوفیق خیر کے لئے دو فرشتوں کو مقرر کر دیا ہے، اگر وہ کسی وقت خطا بھی کریں تو ان کو اس سے صواب کی طرف پھیر دیں گے۔

فرمایا:۔اے عمر! اللہ تعالیٰ نے تم کو دنیا وآخرت دونوں کی خیر وفلاح کی بشارت دی ہے۔

(۱۴۸/۶) فرمایا:۔زمین وآسمان میں انبیاء کے بعد عمر سے بہتر پیدا نہیں ہوا۔

فرمایا:۔میری امت کیلئے فتنہ کا دروازہ بند رہے گا، جب تک عمران میں رہیں گے، جب وہ وفات پائیں گے تو امت کے لئے پے درپے فتنوں کی آمد شروع ہو جائیگی۔

(۳۴۹/۶) ام المومنین حضرت حفصہؓ اور دوسرے صحابہؓ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ اگر آپ اچھا کھائیں اور پہنیں تو بہتر ہوتا کہ کام پر قوت ملے اور لوگوں کی نظروں میں بھی زیادہ وقیع ہوں تو فرمایا تم سب میرے خیر خواہ ہو لیکن میں نے اپنے دونوں صاحب (رسول اللہ ﷺ وابوبکرؓ) کو زندگی کے ایک خاص نہج وطریقہ پر دیکھا ہے، اگر میں اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کروں گا تو منزل پر پہنچ کر ان سے نہ مل سکوں گا، اور حضرت حفصہؓ کو خاص طور سے خطاب کیا کہ تم خود ہی فیصلہ کرو، کیا تمہیں حضور علیہ السلام کی عسرت وتنگی معاش کے حالات یاد نہیں رہے، پھر ایک ایک بات کا ذکر کر کے ان کو خوب رلایا، اور فرمایا جب تم نے مجھ سے ایسی غیر متوقع بات کہہ دی ہے تو سن لو کہ واللہ! میں ضرور ان دونوں جیسی ہی سختی کی زندگی گزاروں گا، اس امید پر کہ شاید آخرت میں ان جیسی خوشگوار زندگی پا سکوں، اسی قسم کا اس سے زیادہ مفصل قصہ ۳۴۹/۶ میں بروایتِ حسن بصریؒ ۵۵۷ والا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عراق وبلادِ فارس وغیرہ فتح ہوئی اور مالِ غنیمت ہر قسم کا مدینہ طیبہ پہنچا تو ان میں انواع واقسام زرد وسُرخ رنگ کے حلوے اور مٹھائیاں بھی تھیں، حضرت عمرؓ نے ان کو ذرا سا چکھا اور فرمایا اچھا ذائقہ اور عمدہ خوشبو ہے لیکن اے مہاجرین وانصار! سمجھ لو کہ ان ہی کھانوں پر تم میں سے بیٹے باپ کو اور بھائی بھائی کو قتل کریں گے، پھر آپ نے وہ سب چیزیں شہداءِ وانصار کے پسماندگان میں تقسیم کرا دیں، پھر مہاجرین وانصار نے جمع ہو کر باتیں کیں کہ اس شخص (حضرت عمرؓ) کو دیکھو کہ ملت کے غم میں کیا حال بنالیا ہے، نہ کھانے کی فکر ہے نہ پہننے کا ہوش ہے دربارِ کسریٰ وقیصر فتح ہوئے اور مشرق اور مغرب سے عرب وعجم کے وفود ان کے پاس آتے ہیں، ان کے بدن پر جبہ دیکھتے ہیں جس میں بارہ پیوند لگا رکھے ہیں، پس اگر اے اصحاب رسول اللہ ﷺ! تم سب اکابرِ امت ہو، حضور کے ساتھ زندگی کا بڑا حصہ گزارا ہے تم سب مل کر ان سے کہو تو بہتر ہے کہ یہ اس جبہ کو بدل کر عمدہ نرم کپڑے کا جبہ بنالیں جس سے رعب قائم ہو اور کھانے کا بھی صبح وشام بہتر انتظام ہو، جس میں اکابر مہاجرین وانصار بھی شریک ہوا کریں، سب نے کہا، یہ بات تو حضرت عمرؓ سے حضرت علیؓ ہی جراءت وہمت کر کے کہہ سکتے ہیں وہ آپ کے خسر بھی ہیں، یا پھر آپ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کہہ سکتی ہیں جو حضور علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ ہیں، اس مشورہ کے بعد حضرت علیؓ سے عرض کیا گیا تو انہوں نے عذر کیا اور فرمایا اس کام کی جراءت ازواجِ مطہرات ہی کر سکتی ہیں کہ وہ امہات المومنین ہیں،

راوی قصہ حضرت احنف بن قیس کا بیان ہے کہ حضرت عائشہؓ وحفصہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ ایک ہی جگہ بیٹھی تھیں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں اس بارے میں حضرت عمرؓ سے درخواست کروں گی، حضرت حفصہؓ نے فرمایا مجھے تو امید نہیں کہ وہ مانیں گے، بہرحال یہ دونوں گئیں، حضرت عائشہؓ نے اجازت لے کر بات کی کہ رسول اکرم ﷺ اس دنیا سے خدا کی رحمت ورضوان میں تشریف لے گئے، نہ انہوں نے خود دنیا کا ارادہ کیا نہ دنیا ہی انھیں اپنی طرف متوجہ کر سکی، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ بھی سننِ نبویہ کا احیاءِ کر کے، کذابین کا قتل کر کے، باطل پرست طاقتوں کا زور توڑ کر رعیت میں عدل اور مساوی تقسیم فرما کر گئے تو حق تعالیٰ نے ان کو بھی اپنی رحمت ورضوان کی طرف بلا لیا، انہوں نے بھی دنیا کا ارادہ نہیں کیا، اور نہ دنیا ان کو اپنی طرف کھینچ سکی، اب اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر قیصر وکسریٰ کے ملک فتح کرائے اور مشرق ومغرب کے کنارے آپ کے لئے قریب کر دیئے گئے، ان کے خزانے اور اموال آپ کے قبضہ میں دے دیئے اور اس سے بھی زیادہ ہم آئندہ امید کرتے ہیں، آپ کے پاس سلاطین عرب وعجم کے وفود آتے ہیں، ایسی صورت میں آپ کے بدن پر جبہ ہے جس میں بارہ

پیوند لگے ہیں، اگر آپ اس کو بدل کر نرم وعمدہ کپڑے کا جبہ بنوالیں، اس کا اثر دوسروں پر بہت اچھا پڑے گا، اور کھانے کا بھی نظم بہتر ہو، جس میں آپ کے پاس بیٹھنے والے مہاجر وانصار بھی شریک ہوا کریں، حضرت عائشہؓ کی یہ سب گفتگو سن کر حضرت عمر رونے لگے، اور بہت زیادہ روئے، پھر کہا میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا تم بتا سکتی ہو کہ رسول اکرم ﷺ نے کبھی دس دن یا پانچ دن یا تین دن تک بھی مسلسل گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کے کھائی ہے یا کبھی آپ نے ایک دن کے اندر صبح وشام دونوں وقت کھانا کھایا ہو، تا آنکہ آپ حق سے جا ملے۔

حضرت عائشہؓ نے کہا نہیں

پھر آپ نے ان سے فرمایا: تم جانتی ہو کہ رسول اکرم ﷺ کے سامنے کھانا کبھی ایسی تپائی پر لگایا گیا ہو جو زمین سے ایک بالشت اونچی ہو؟ آپ کھانے کے لئے فرماتے تو دسترخوان زمین پر بچھا دیا جاتا تھا، اور کھانے کے بعد حکم فرماتے تو اُٹھا لیا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ وحفصہؓ نے فرمایا، اسی طرح ہوتا تھا، پھر آپ نے دونوں سے فرمایا کہ تم رسول خدا ﷺ کی زوجاتِ مطہرہ اور امہات المومنین ہو، تم دونوں کا حق سب مومنوں پر ہے، اور خاص کر مجھ پر ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم مجھے دنیا کی رغبت دلانے کو آئیں، جبکہ مجھے خوب معلوم ہے کہ حضور علیہ السلام نے صوف کا جبہ پہنا تھا، جس کی سختی سے بسا اوقات آپ کی کھال پر خراش ہو جاتے تھے، تم بھی جانتی ہوں گی، انہوں نے فرمایا بیشک ایسا ہی تھا، پھر فرمایا تم یہ بھی جانتی ہوں گی کہ آپ اپنی عباء اکہری بچھا کر اس پر سورہے تھے، اور ایک کمبل تمہارے گھر میں تھا، جس سے دن میں بیٹھنے کے فرش کا اور رات میں بچھونے کا کام لیا جاتا تھا، ہم حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ کے پہلو پر بوریہ کے نشانات دیکھتے اور ہاں اے حفصہ! تم ہی نے تو مجھ سے بیان کیا تھا کہ ایک رات تم نے آپ کے بستر کی تہ ڈبل کر دی تھی، آپ نے اس کی نرمی سے راحت پائی اور سو کر اذان بلال سے پہلے نہ اُٹھ سکے، تو تم سے فرمایا تھا اے حفصہ! تم نے آج کیا کیا کہ میرا بستر ڈبل کر دیا، جس سے میں صبح تک سوتا رہا (یعنی رات کو تہجد کے لئے بیدار نہ ہو سکا) مجھے دنیا سے کیا مطلب! تم نے نرم بستر بچھا کر کیوں خُدا کی یاد سے مجھے غافل کر دیا ہے؟!

اے حفصہ! کیا تم نہیں جانتیں کہ حضور علیہ السلام کے اگلے پچھلے سارے گناہ بخشد یئے گئے تھے، پھر بھی بسا اوقات شام کے وقت بھوکے ہوتے اور اسی حالت میں عبادت کرتے ہوئے سو جاتے، اور ہمیشہ ہی یہ معمول رکھا کہ رکوع، سجود، بکاء وتضرع میں اپنے دنوں اور راتوں کے اوقات بسر فرماتے تھے، تا آنکہ حق تعالیٰ نے اپنی رحمت ورضوان کی طرف بلا لیا'' لہٰذا حضرت عمرؓ نے اپنے دونوں پیشرو صاحبوں کی اقتداء میں نہ کبھی عمدہ کھانا کھایا، نہ نرم کپڑا پہنا، نہ دو سالن جمع کئے بجز نمک وروغن زیتون کے، اور نہ کبھی مہینہ میں ایک بار سے زیادہ گوشت کھایا، آخر عمر تک یہی معمول رہا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ!

(۶/۳۳۰) حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ خدائے تعالیٰ کے مال میں میں نے اپنے کو بمنزلہ ولیِ یتیم کے سمجھا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو بقدر معروف کے لے سکتا ہوں اور جب مجھے مقدرت حاصل ہو تو اس کو واپس کر دوں، اور اگر ضرورت نہ ہو تو اس کے لینے سے اجتناب کروں۔

قیس بن الحجاج کا بیان ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے مصر کو فتح کیا تو بونہ (جولائی؟) کا مہینہ آنے پر وہاں کے لوگوں نے اُن سے آکر کہا کہ ہمارے ملک کے دریائے نیل کے لئے ایک خاص رسم ہے کہ بغیر اس کی ادائیگی کے وہ جاری نہیں ہوتا، انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ کہا کہ اس ماہ کی بارہ تاریخ گزرنے پر ایک کنواری لڑکی اس کے والدین کو راضی کر کے لے لیتے ہیں اور اس کو بہترین اعلیٰ قسم کے زیورات ولباس سے مزین کر کے دریائے نیل میں ڈال دیا کرتے ہیں، حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ یہ بات اسلام کے دورِ اقتدار میں تو نہیں کی جاسکتی، اسلام تو پہلے غلط رسومات کو مٹانے کے لئے آیا ہے وہاں کے لوگوں نے جولائی اگست وستمبر کے مہینوں میں انتظار کیا لیکن نیل کا پانی بند رہا، نہ تھوڑا جاری ہوا نہ زیادہ، تا آنکہ وہاں کے لوگوں نے وطن چھوڑ کر جانے کا ارادہ کر لیا، کیونکہ پانی نہ ملنے سے قحط کی صورت ہو جاتی، حضرت

عمرو نے یہ حال دیکھا تو حضرت عمرؓ کو خط لکھ کر سارے حال سے مطلع کیا، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ تم نے ٹھیک کیا، اسلام پہلے غلط چیزوں کو مٹانے کیلئے آیا ہے، میں ایک بطاقہ (چھوٹا رقعہ) تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، اس کو نیل کے اندر ڈال دینا، حضرت عمرؓ کا مکتوب گرامی پہنچا، اور بطاقہ مذکورہ کھول کر پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا:۔ عبداللہ امیر المومنین کی طرف سے اہل مصر کے نیل کی طرف امابعد! اے نیل! اگر تو اپنی طرف سے جاری ہوا کرتا تھا تو مت جاری ہو، اور اگر ذاتِ واحد وقہار تجھ کو جاری کیا کرتی ہے، تو ہم اسی ذاتِ واحد وقہار سے التجاء کرتے ہیں کہ تجھے جاری کردے، حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس بطاقہ کو یوم الصلیب سے ایک روز قبل نیل میں ڈال دیا، جبکہ اہلِ مصر وطن چھوڑ کر نکلنے کو بالکل تیار ہو چکے تھے، کیونکہ ان کی معیشت کا سارا دارومدار نیل کی روانی پر تھا (اسی کے پانی سے کاشت وغیرہ ہوتی تھی، کیونکہ مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے حضرت عمرؓ[1] کے اس واقعہ کی برکت سے حق تعالیٰ نے یوم الصلیب میں نیل کا پانی اتنی بہتات اور تیزی سے جاری کردیا کہ سولہ ہاتھ گہرا بہنے لگا، اور وہ پرانی بُری رسم ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ (اس کے بعد سے آج تک نیل اسی طرح بہتا ہے)

حضرت عمرؓ ایک مرتبہ بنی حارثہ کی گڑھی میں تشریف لے گئے، وہاں محمد بن مسلمہ سے ملاقات ہوئی، آپ نے ان سے پوچھا میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ کہا واللہ! میں آپ کو جیسا بہتر چاہتا ہوں ویسا ہی دیکھتا ہوں، اور ہر ایک جو آپ کیلئے خیر چاہتا ہے وہ بھی ایسا ہی دیکھتا ہے میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ (بیت المال کے لئے) اموال جمع کرنے میں آپ کامل قوت وتدبیر کے مالک ہیں، اور ساتھ ہی تورّع بھی کرتے ہیں کہ اپنے صرف میں کبھی نہیں لاتے، اور عدل وانصاف کے ساتھ ان اموال کو دوسرے مستحق لوگوں پر صرف کرتے ہیں، اگر آپ اس بارے میں کبھی بھی ناحق کرتے تو ہم آپ کو اس طرح سیدھا بھی کردیتے جس طرح تیروں کو ان کے شکنجہ میں ڈال کر سیدھا کردیا جاتا ہے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر تعجب و پسندیدگی کا اظہار کیا تو محمد بن مسلمہ نے پھر وہی کلمات دہرائے، اور پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ خدا کا بڑا شکر ہے جس نے مجھے ایسی قوم میں خدمت کا موقع دیا جو میری غلطی پر مجھے سیدھا بھی کرسکتی ہے۔

(۶/۳۳۱) حضرت عمرؓ نے ''بقیع'' کے میدان وآراضی کو بیت المال کے گھوڑوں[2] کے واسطے، اور ''ربذہ'' کو صدقہ کے اونٹوں کے لئے محفوظ کردیا تھا، اور ہر سال تیس ہزار اونٹ لوگوں کو ان کی ضرورتوں کے لئے دیدیا کرتے تھے (۶/۳۵۰) میں چالیس ہزار کی بھی روایت ہے۔ سائب بن یزید کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا بیت المال کے گھوڑوں کی رانوں پر ''جیش فی سبیل اللہ کا نشان دیا جاتا تھا۔

(۶/۳۳۲) حضرت عمرؓ ایک عرصہ تک تو خدماتِ خلافت کے ساتھ اپنے طور پر ہی معیشت کا بھی بوجھ اٹھاتے رہے اور بیت المال سے کچھ نہ لیا، لیکن جب خلافت کے کاموں سے وقت بچا ہی نہ سکے، اور گھر کے خرچ میں سخت پریشانی پیش آئی تو صحابہ کرام کو جمع کرکے مشورہ کیا، سب نے طے کیا کہ آپ بیت المال سے اپنا خرچ لیں تو پھر روزانہ دو درہم لینے لگے تھے، جس سے اپنا اور عیال کا گزارہ کرتے تھے

---

[1] حضرت عمرؓ کی دوسری بڑی کرامت کا ذکر کنز العمال ۶/۳۳۲ میں ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ کے درمیان ''یا ساریۃ الجبل'' کی صدا لگادی دو تین بار کہہ کر آگے خطبہ حسب عادت پورا کیا، لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا یہ آج آپ نے درمیان میں کیا کہا تھا؟ فرمایا:۔ میرے دل میں یہ بات گزری کہ مشرکین نے ہمارے بھائیوں کو شکست دیدی ہے اور وہ پہاڑ کی طرف سے بھی آکر حملہ کردیں گے جس سے مسلمان دونوں طرف سے پس جائیں گے، اس لئے میری زبان سے نکل گیا کہ پہاڑ کی طرف خیال کرو، ایک ماہ بعد جب فتح کی خبر لے کر شخص مدینہ طیبہ آیا تو اس نے بتلایا کہ ہم سب نے اُس دن جمعہ کو حضرت عمرؓ کی آواز سُن لی تھی، اور فوراً ہم نے پہاڑ کی طرف رُخ کرکے وہاں کے مورچے سنبھال لئے تھے اور خدا نے ہمیں فتح دی۔ ''مؤلف''

[2] گھوڑوں کی خاص طور سے پرورش وپرداخت فوجی ضروریات کے تحت کرتے تھے، کتب تاریخ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے نو مقامات کو بڑا فوجی مرکز قرار دیا تھا، مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، دمشق، حمص، اردن، وفلسطین ان کے علاوہ تمام اضلاع میں بھی فوجی بارکیں چھاؤنیاں تھیں، جہاں تھوڑی فوج ہمیشہ رہتی تھی) ہر بڑے مرکز میں چار ہزار گھوڑے ہروقت پورے ساز وسامان سے لیس رہتے تھے، اور موسم بہار میں تمام گھوڑے سرسبز وشاداب مقامات میں بھیج دیئے جاتے تھے، خود مدینہ کے قریب جو چراگاہ تیار کرائی تھی، اس کا ذکر اوپر ہوا ہے، اور بعض جگہ نظر سے گزرا کہ صرف مدینہ منورہ کی ہی چھاؤنی میں تیس ہزار گھوڑے تھے، واللہ تعالیٰ اعلم، حضرت عمرؓ کی فوجی وسیاسی خدمات کا کسی قدر قابلِ ذکر حصہ 'الفاروق' اور 'خلفائے راشدین' وغیرہ میں شائع ہوگیا ہے اور آپ کے فقہی مسائل کا تفصیلی تذکرہ ازالۃ الخفاء میں ہوا ہے ''مؤلف''

اور فرماتے تھے میرے لئے اس سے زیادہ موزوں نہیں، اپنے لئے ایک چادر اور ایک تہمد گرمیوں میں بناتے، اور تہمد پھٹ جاتا تو پیوند لگا لگا کر سال پورا کر لیتے، حضرت ابن عمرؓ نے بتلایا کہ جوں جوں ہر سال مسلمانوں اور بیت المال کے لئے اموال کی آمد بڑھتی گئی، اتنا ہی آپ اپنے کپڑے کی حیثیت بجائے بڑھانے کے اور کم کرتے جاتے تھے، حضرت حفصہؓ نے کچھ عرض کیا تو فرمایا: تم جانتی نہیں یہ میں مسلمانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کے مال میں سے لیتا ہوں، اور اتنا مجھے کافی ہے زیادہ کیوں لوں؟!

اہم فائدہ! اوپر جو ہم نے حضرت عمرؓ کی آواز امیرِ لشکرِ مسلمین ساریہ اور ان کے ساتھی مجاہدین تک پہنچنے کا واقعہ کنز العمال سے نقل کیا ہے حالانکہ وہ لوگ مدینہ طیبہ سے سینکڑوں میل دور کے فاصلہ پر تھے اور اس واقعہ کو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی محبّ طبری سے ازالۃ الخفاء ۲/۳۳ میں نقل کیا ہے، یہ واقعہ مکاشفات و کراماتِ فاروقی میں سے ہے کہ آپ کی آواز بغیر کسی مادّی آلہ کے اتنی دور پہنچ گئی، اور کبھی سُننے والے کی فضیلت و خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ دھیمی آواز کو فاصلہ پر سُن لے، جس طرح رسول اکرم ﷺ نے نمازِ ظہر یا عصر میں اپنے ایک مقتدی کی قراءۃ سورۂ اعلیٰ سُنی اور نماز ختم کر کے پوچھا کہ میرے پیچھے سبح اسم ربك الاعلیٰ کس نے پڑھی؟ ایک شخص نے کہا کہ میں نے، اور میری نیت خیر و ثواب حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ تھی، اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں! مجھے معلوم ہوا کہ کوئی میری قراءت میں گڑ بڑ کر رہا ہے (فتح الملہم ۲/۳۴) یا مثلاً فرشتوں کے بارے میں وارد ہے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی کہو کیونکہ آسمانوں کے فرشتے بھی اس وقت آمین کہتے ہیں، اور جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ ساتھ ادا ہوگئی اس کے گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے، حافظؒ نے لکھا کہ مراد زمین کے فرشتے بھی ہو سکتے ہیں جو نماز جماعت میں شرکت کرتے ہیں، یا آسمانوں کے، یا سب کے سب مراد ہیں، کیونکہ روایات میں آسمانی فرشتوں کا بھی ذکر موجود ہے[1] (فتح الملہم ۲/۵۲)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے واسطے جن و انس و طیور مسخر کر دیئے گئے تھے، اور ہوا کو بھی ان کا تابع فرمان کر دیا گیا تھا، ان کے

---

[1] آسمانی فرشتوں کا زمین پر نماز پڑھنے والوں کی آمین سُن کر آمین کہنا یہ بتلاتا ہے کہ سننے سُنانے کے بارے میں فاصلوں کی دوری کوئی معنی نہیں رکھتی اور آج کل اہل سائنس نے مادّی آلات و ذرائع سے جو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور لاسلکی پیغام رسانی وغیرہ کی ایجاد کی ہے وہ انبیاء اولیا اور فرشتوں کے بلا اسبابِ مادّی سماع و اسماع سے زیادہ حیرت زدہ نہیں ہے، کیونکہ ہمارے یہ فاصلے نسبتہً بہت ہی معمولی اور غیر اہم ہیں۔ مثلاً خیال کیجئے! ہماری زمین سے آسمانِ اوّل تک کا فاصلہ کتنا ہے سارے ستارے و سیارے جو اربوں کھربوں کی تعداد میں ہیں سب کے سب آسمانِ اوّل کے نیچے ہیں، اور سورج کی روشنی طلوع کے بعد ۸ منٹ میں زمین تک پہنچتی ہے جو ہم سے ۹ کروڑ ۲۹ لاکھ میل دور ہے اور ہم سے نزدیک ترین سیارہ کوکب سگ ہے جو ہم سے آٹھ نوری سال یعنی ۴۸۰ کھرب میل دور ہے اور اس کی روشنی ہم تک چار سال میں پہنچتی ہے اور بعض ستارے ایسے بھی ہیں جن کی روشنی ہزاروں لاکھوں اور کئی کروڑ برس میں زمین تک پہنچتی ہے، چنانچہ ایک ستارہ حال میں دریافت ہوا ہے جو زمین سے آٹھ سو مہا سنگ میل دور ہے مزید تفصیل نطق انور میں ملاحظہ کریں، غرض اتنا عظیم و وسیع فاصلہ تو صرف زمین اور آسمانِ اوّل کے درمیان ہے اور ہر دو آسمانوں کے درمیان بھی اتنا اتنا ہی فاصلہ ہے اور سب ہی آسمانوں کے فرشتے زمین پر آمین کہنے والوں کی آواز سُنتے ہیں، پھر حیرت ہے کہ ان امورِ غیبیہ پر ایمان لانے والے اور حق تعالیٰ کی اتنی لامحدود و وسیع ترین کائنات کی پیدائش، بقاو فنا پر قدرت اور پورے نظام کے ہزاروں، لاکھوں برس سے کامل و مکمل باضابطگی کے ساتھ چلانے والے کے وجود پر یقین رکھنے والے آج چاند کے سفر پر حیرت کر رہے ہیں حالانکہ وہ زمین سے صرف دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے اور خلائی نظام کے اندر اس کی کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ ہماری نمازوں کی فاتحہ والی دعائیں کتنی عظیم اہمیت رکھتی ہیں کہ اگر ہم ان کو پوری توجہ قلب کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں پیش کریں اور آخر میں آمین کہیں تو زمین و آسمانوں کے لاتعداد فرشتے بھی اپنی سفارشِ قبول کو شامل مسل کر دیتے ہیں اور اس پر حق تعالیٰ کی رضا کا وہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے جس کی برکت سے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اس سے سورۂ فاتحہ کا ''ام القرآن'' ہونا ساری سورتوں سے زیادہ اعظم و اہم ہوگا، نماز کا بغیر اس کے ناقص و ناتمام رہنا، انفرادی نماز میں ہر شخص کا اس کو پیش کرنا، اور نماز جماعت میں صرف امام کا اس ام القرآن و امام القرآن کو اپنی اور سب کی طرف سے پیش کرنا، اور آمین پر امام و مقتدی کے ساتھ زمین و آسمانوں کے فرشتوں کا بھی التجائے قبول کرنا (جو قبولیت و مغفرتِ ذنوب کی امید کو نہایت درجہ قوی کر دیتا ہے) وغیرہ امور اچھی طرح سمجھ میں آجاتے ہیں، ان امور کی اس سے زیادہ وضاحت و تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وبہ نستعین!

حالات سورۂ انبیاء، نمل، سبا، اور ص میں ذکر ہوئے ہیں اور علامہ محدث ابن کثیر، علامہ آلوسی، اور علامہ عثمانیؒ نے فوائد میں عمدہ تشریحات کی ہیں، آپ نے لکھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک تخت تیار کرایا تھا، جس پر مع اعیانِ دولت بیٹھ جاتے اور ضروری سامان بھی بار کرلیا جاتا، پھر ہوا آتی، زور سے اس کو زمین سے اٹھاتی، پھر اوپر جا کر نرم ہوا ضرورت کے مناسب چلتی یمن سے شام اور شام سے یمن کو مہینہ کی راہ دوپہر میں پہنچادیتی، صاحب روح المعانی (متوفی ۱۲۷۰ھ) نے یہ بھی لکھا کہ اہل لندن ایک زمانہ سے ہوائی جہاز ایجاد کرنے کی سعی کررہے ہیں مگر ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکے (۱۷/۷۸)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے لکھا کہ ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے باوجود شدید اور تندو تیز ہونے کے نرم و آہستہ روی کے باعث ''راحت'' ہوجاتی تھی اور تیز روی کا یہ عالم تھا کہ صبح و شام کا جُدا جُدا سفر ایک شہسوار کی مسلسل ایک ماہ کی رفتارِ مسافت کے برابر ہوتا تھا، گویا حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت انجن و مشین وغیرہ اسبابِ ظاہر سے بالاتر، صرف خدائے تعالیٰ کے حکم سے ایک بہت تیز رفتار ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز، مگر سبک روی کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اڑا چلا جاتا تھا (قصص القرآن ۱۰۲/۲)

اس بارے میں مولانا آزاد نے ترجمہ کیا کہ ہم نے (سمندر کی) تند ہواؤں کو بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کردیا تھا کہ ان کے حکم پر چلتی تھیں اور اس زمین کے رُخ پر جس میں ہم نے بڑی ہی برکت رکھ دی ہے یعنی فلسطین اور شام کے رُخ پر جہاں بحرِ احمر اور بحرِ متوسط سے دور دور کے جہاز آتے تھے (ترجمان القرآن ۴۸۰)

علامہ مودودی صاحب نے بھی آیاتِ قرآنی کا مجمل تو بحری سفر ہی قرار دیا ہے تاہم ہوائی سفر بھی مراد لینے کی گنجائش اور اجازت دی ہے کیونکہ یہ بھی اللہ کی قدرت سے بعید نہیں ہے (تفہیم القرآن ۶/۱۷۲)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنی مشہور تصنیف اشاعتِ اسلام ۴۸۰ میں لکھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا مسخر کردی گئی تھی جو کوئی کہیں گفتگو کرتا ہوا اس کو پہنچادیتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہوا میں آواز محفوظ رکھنے کی قابلیت موجود ہے یہ بات حضرت سلیمان علیہ السلام کی خصوصیت میں سے تھی کہ بلا کسی آلہ اور ذریعہ کے آواز دور و نزدیک کی محفوظ پہنچ جاتی تھی، مگر یہ ضرور ہے کہ اہل علم و دانش کو اُس علم نبوت سے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا ہوا تھا، اس کے اصول ضرور معلوم ہوگئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُن اصولوں سے کام بھی لیا گیا ہو، مگر وہ اب زمانہ کے دوسرے ہزار ہا عجائب کے ساتھ نسیاً منسیاً ہوگئے ہوں، غالباً مولانا مرحوم کی اس تحریر کا ماخذ حضرت اقدس علامہ کشمیریؒ کی یہ تحقیق ہے کہ جتنے معجزات انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے تھے، وہ سب آئندہ ہونے والی مادی تحقیقات و ایجادات و ترقیات کا پیش خیمہ تھے اور دونوں میں فرق زمین و آسمان کا ہے کہ ان کو بغیر کسی ظاہری آلہ و ذریعہ کے عطا ہوئے تھے، اس لئے معجزہ قرار پائے اور بعد کے سائنسدانوں نے ظاہری و مادّی ذرائع و وسائل کام میں لاکر ان ہی جیسے عجائب و غرائب پیش کئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۶/۳۳۳) حضرت علیؓ نے فرمایا:۔ میرے علم میں بجز حضرت عمرؓ کے کوئی شخص نہیں جس نے کھلم کھلا ڈنکے کی چوٹ پر ہجرت کی ہو، سب ہی چھپ کر نکلے، مگر آپ نے جب ہجرت کا قصد کیا تو تلوار حمائل کی، کمان کاندھے پر ڈالی، ہاتھ میں تیر لئے، کعبہ معظّمہ کے پاس پہنچے، اشرافِ قریش کعبہ کے گرد صحن میں بیٹھے تھے، آپ نے سات مرتبہ طواف کیا، دو رکعتیں مقام ابراہیم پر پڑھیں، پھر ایک ایک گروہِ قریش وغیرہ کے پاس گئے اور فرمایا:۔

''بد باطن لوگوں کی صورتیں مسخ ہوں، جو چاہے کہ اس کی ماں اس سے محروم ہو، اس کے بچے یتیم ہوں اور اس کی بیوی رانڈ ہو تو وہ مجھ سے اس وادی کے پیچھے ملے'' حضرت علیؓ نے فرمایا:۔ یہ اعلان کرکے آپ نے ہجرت کی اور کسی کو آپ کا پیچھا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

(۶/۳۳۶) حضرت مجاہد نے فرمایا:۔ ہم لوگ آپس میں بات کیا کرتے تھے کہ حضرت عمرؓ کی امارات کے زمانہ میں شیاطین قید تھے ان کی

شہادت پر پھیل گئے، حضرت عمرؓ کی انگوٹھی پر"کفی بالموت واعظاًیا عمر!" کندہ تھا"یعنی اے عمر! موت عبرت ونصیحت کے لئے کافی ہے"

(۶/۳۳۹) حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ایک دن حضرت عمرؓ گھوڑے پر سوار ہوئے اور اس کو دوڑایا تو اس حالت میں ان کی ران کھل گئی، اہلِ نجران نے اس پر جو سیاہ تل تھا دیکھ لیا، اور کہا کہ اس نشان والے آدمی کا ذکر ہماری کتاب میں ہے کہ وہ ہمیں ہماری زمین سے نکال دے گا۔

(۶/۳۴۰) حضرت مجاہد نے فرمایا:۔ حضرت عمرؓ کی جو رائے ہوتی تھی اسی کے مطابق قرآن مجید نازل ہوتا تھا۔

(۶/۳۴۱) حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ میں ۴۴واں شخص اسلام لایا تو آیت"یاایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المومنین نازل ہوئی، اے نبی! آپ کے لئے اللہ تعالیٰ اور جتنے لوگ ایمان لاکر آپ کا اتباع کر چکے ہیں کافی ہیں۔

(۶/۳۴۳) حضرت عمرؓ نے قحط کے سال میں گھی کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا تھا اور زیتون کا تیل کھاتے تھے، جس سے آپ کو نفخِ شکم اور قراقر کی شکایت ہوگئی تھی، اپنے پیٹ پر ہاتھ مار کر کہا کرتے تھے، جتنا جی چاہے قرقر کر، ہمارے پاس اس (روغنِ زیتون) کے سوا کچھ نہیں ہے تا آنکہ سب لوگ قحط کی بلا سے نجات پائیں۔

آپ نے اُس سال گوشت سے بھی اجتناب کرلیا تھا، اور کہا جب تک عام لوگوں کو بھی میسر نہ ہو میں نہیں کھاؤں گا ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر قحط ختم نہ ہوا تو حضرت عمرؓ مسلمانوں کے غم میں ہلاک ہوجائیں گے، حضرت عمرؓ کی بعض ازواجِ مطہرات نے بیان کیا کہ آپ نے قحط کے سال میں کسی سے قربت نہیں کی۔

خلیج عمرؓ! (۱۴/۳۴۴) حضرت عمرؓ نے فاتحِ مصر حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کے اصحاب کو بلا کر فرمایا:۔"میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ ایک خلیج دریائے نیل سے بحرِ قلزم تک کھودی جائے، اس سے اہل حرمین کو غلہ وغیرہ آنے میں بہت سہولت ہوگی کیونکہ برّی راستہ سے دور دراز مسافت طے کر کے ان چیزوں کو لانا پڑتا ہے، تم اپنے اصحاب سے مشورہ کر کے مجھے مطلع کرو" انہوں نے اپنے اصحاب واہل مصر سے جو ساتھ تھے مشورہ کیا، ان سب کو یہ تجویز پسند نہ آئی اور خطرہ محسوس کیا (شاید یہ کہ دشمن سہولت سے ان پر چڑھ آسکتے ہیں) اور کہا کہ آپ امیر المومنین کو اچھی طرح سے ڈرادیں تاکہ وہ اس ارادہ سے باز رہیں، حضرت عمرو بن العاصؓ ان کا جواب لے کر آئے تو حضرت عمرؓ ان کو دیکھتے ہی ہنسے اور (اپنی ایمانی فراست یا کشف کے ذریعہ) فرمایا:۔ واللہ! مجھے تمہاری سب بات معلوم ہوگئی، اسی طرح گویا میں اُس وقت میں تمہارے ساتھ ہی تھا، حضرت عمرو بن العاصؓ کو بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو ساری بات کیسے معلوم ہوگئی اور عرض کیا کہ آپ نے بالکل صحیح فرمایا، واقعہ یہی ہے، پھر حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ جاؤ! خدا کے بھروسہ پر کام شروع کرو اور ایک سال پورا ہونے سے قبل ہی اس کام کو مکمل کرلو گے، ان شاء اللہ، حضرت عمرو لوٹ کر مصر گئے اور خلیج کھدوائی، جو"خلیج امیر المومنین" کے نام سے مشہور ہوئی، اور ایک سال پورا ہونے سے قبل ہی اس میں کشتیاں چلنے لگیں، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لئے غلّہ وغیرہ آنے لگا، اور تمام اہل حرمین کو اس سے نفع عظیم حاصل ہوا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد تک وہ خلیج کام دیتی رہی، پھر بعد کے والیوں نے غفلت برتی، تو اس میں ریت وغیرہ اٹ گیا، اور وہ بند ہوگی، حضرت عمرؓ شام پہنچے تو ایک جگہ آپ کو ایک جھیل یا تالاب سے گزرنا پڑا، آپ اپنے اونٹ سے اتر پڑے، جوتے اتار کر ہاتھ میں لئے، سواری کی نکیل پکڑ کر پانی میں گھس گئے، گورنرِ شام حضرت ابوعبیدہؓ ساتھ تھے، کہنے لگے امیر المومنین یہ تو آپ نے اس ملک کے لوگوں کی نظروں سے گرانے والی بہت بڑی بات کردی کہ اس طرح جوتے اتار کر خود سواری کی نکیل پکڑے ہوئے پانی میں گھس گئے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر حضرت ابوعبیدہؓ کے سینہ پر ہاتھ مارتے ہوئے، افسوس وناخوشی کے لہجہ میں درازنفسی کے ساتھ اوہ کہہ کر فرمایا:۔ کاش! تمہارے علاوہ کوئی اور ایسی بات کہتا، حقیقت تو یہ ہے کہ تم سب (اہل عرب) دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل تھے اور سب سے زیادہ گمراہ، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کے ذریعہ عزت وسربلندی بخشی اور اب جب کبھی تم خدا کے سوا کسی سے عزت طلب کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کرے گا۔

ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو جعلنی الله فداک کہا، آپ نے فرمایا تم اگر میری اتنی زیادہ عزت بڑھاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کرے گا۔

(۳/۳۴۵) حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ اگر آسمان سے کوئی ندا کرے کہ اے لوگو! تم سب جنت میں داخل ہو گے بجز ایک شخص کے، تو مجھے خوف ہو گا کہ شاید میں ہی وہ ایک شخص ہوں، اور اگر وہ یہ ندا کرے کہ تم سب جہنم میں داخل ہو گے بجز ایک شخص کے، تو مجھے خدا سے امید ہو گی کہ شاید میں ہی وہ ہوں (ایمان بین الخوف والرجا ہونا چاہیے اور خوف ورجاء کی صحیح ترین تعبیر اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے؟!)

حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ یزید بن ابی سفیانؓ[1] الوان واقسام کے کھانے کھاتے ہیں، تو آپ نے برقاء غلام سے فرمایا کہ شام کا کھانا لانے کے وقت مجھے خبر کر دینا، جب اُن کا کھانا آنے کا وقت ہوا تو غلام مذکور نے خبر دی، حضرت عمرؓ پہنچ گئے اور شرعی طریقہ پر اجازت طلب کی، مکان میں گئے تو کھانا لایا گیا، ثرید ولحم حضرت عمرؓ نے بھی ساتھ کھایا، پھر بھُنا ہوا گوشت پیش کیا گیا، تو یزید نے ہاتھ بڑھایا مگر حضرت عمرؓ نے ہاتھ کھینچ لیا، اور آپ نے فرمایا:۔ یزید بن ابی سفیان! خدا سے ڈرو! کیا ایک کھانے کے بعد پھر دوسرا بھی کھایا جائے گا۔ واللہ! اگر تم اپنے اسلاف کے طریقہ کی مخالفت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے طریقہ سے دور کر دے گا!

(۶/۳۴۶) اذرعات کے عامل نے بیان کیا کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ ہمارے یہاں آئے، آپ گزی یا دھوتر کا کرتہ پہنے ہوئے تھے مجھ سے فرمایا کہ دھودو اور پیوند لگادو، میں نے تعمیل ارشاد کی اور ایک کرتہ قبطی کپڑے کا آپ کے پرانے کرتہ کے ناپ سے نیا سلوادیا، پھر دونوں کو لے کر حاضر خدمت ہوا، آپ نے نیا کرتہ ہاتھ سے چھو کر دیکھا کہ نرم ہے، فرمایا ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہمارا پہلا کرتہ پسینہ کو زیادہ اچھا جذب کرتا ہے۔

حضرت ربیع بن حارثی کا بیان ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ کو موٹے جھوٹے معمولی کھانے اور گھٹیا قسم کے معمولی لباس وضع قطع کو دیکھ کر آپ کے مرتبہ ومنصب کے خلاف خیال کیا، عرض کیا امیر المومنین ساری دنیا کے لوگوں میں سے سب سے زیادہ حق آپ کا ہے کہ آپ عمدہ کھانا تناول کریں، بہتر لباس پہنیں اور اعلیٰ قسم کی سواری استعمال کریں، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر چھڑی اٹھائی اور ربیع کے سر پر مار کر فرمایا:۔ واللہ! تم نے خدا کو خوش کرنے کے لئے بات نہیں کہی بلکہ میرا تقرب حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے، افسوس ہے مجھے تم سے ایسی توقع بالکل نہ تھی، کیا تم جانتے ہو میری اور جن لوگوں کا میں والی بنا ہوں، ان کی مثال کیا ہے؟ عرض کیا، ارشاد فرمائیں آپ نے فرمایا:۔ ایسی مثال ہے کہ کچھ لوگ سفر پر نکلے، اور انہوں نے اپنے کھانے پینے کا سامان اور دوسری سب نقد وجنس ایک شخص کے سپرد کر دی، اور کہہ دیا کہ ان چیزوں کو ہم پر خرچ کرنا، تو کیا ایسی صورت میں اس شخص کے لئے جائز ہو گا کہ ان کی امانتوں میں سے کچھ چیزوں کو اپنے لئے خاص کر لے؟ عرض کیا نہیں! آپ نے فرمایا میری مثال اور ان سب لوگوں کی بھی ایسی ہی ہے جو میری ولایت کے تحت ہیں۔

حضرت عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک دن بہت موٹے کپڑے پہنے ہوئے نماز پڑھائی۔

حضرت سائب بن یزید نے فرمایا کہ میں نے بہت مرتبہ حضرت عمرؓ کے ساتھ رات کا کھانا کھایا ہے، آپ روٹی گوشت کھاتے، پھر ہاتھوں کی چکنائی اپنے پاؤں پر مل لیتے اور فرماتے تھے یہی عمر وآلِ عمر کا رومال ہے۔

(حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ کا بھی یہی معمول ہم نے دیکھا ہے)

حضرت انسؓ نے بتلایا کہ حضرت عمرؓ سب سے پسندیدہ کھانا کھانا نیچے کی تلچھٹ اور بچا کھچا حصہ تھا۔

---

[1] یہ حضرت ابوسفیانؓ کے سب سے اچھے بیٹے تھے، جن کو یزید الخیر بھی کہا جاتا تھا، فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے، حنین میں حضور علیہ السلام کے ساتھ شریک ہوئے تھے اور حضور نے مالِ غنیمت میں سے ایک سو اونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی ان کو دی تھی، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو گورنری کا عہدہ دیا تھا، اور خاص طور سے نصیحتیں کی تھیں، رخصت کے وقت پیادہ چل کر ان کی مشایعت فرمائی تھی، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو فلسطین واطراف کی گورنری پر مامور فرمایا تھا اور ان کے بعد ان کے بھائی حضرت معاویہ گورنر بنے تھے (استیعاب ۶/۶۱۰) گویا اوپر کے واقعہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے ایک گورنر کی اصلاح فرمائی تھی، اور اسی طرح آپ بڑے بڑے گورنروں، سپہ سالاروں اور ولاۃ وحکام کی بے جھجک اصلاح فرمایا کرتے تھے،" وکان لا یخاف فی الله لومة لائم، رضی الله تعالیٰ عنه "مؤلف"

حضرت ابووائل کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے جب کھانا لایا جاتا تو فرماتے تھے میرے پاس صرف ایک قسم کی چیز لاؤ۔

(۶/۳۴۷) حضرت عمرؓ جب کسی دعوتِ طعام میں شرکت کرتے اور کئی قسم کے کھانے لائے جاتے تو سب کو ملا کر ایک قسم بنا لیتے تھے، معلوم ہوا کہ زیادہ پسندیدہ تو یہی تھا کہ صرف ایک قسم کا کھانا ہو لیکن اگر کہیں عام اور بڑی دعوتوں کے موقع پر اپنی اس محبوب عادت کا اظہار مناسب نہ سمجھتے ہوں گے تو خاموشی سے دو تین قسم کے سالن کو ایک بنا لیتے ہوں گے، واللہ اعلم!

حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے زمانہ خلافت میں اونی جبہ پیوند لگا پہنتے، کاندھے پر درہ رکھتے، بازاروں میں گھومتے اور لوگوں کو ادب، اخلاق وسلیقہ مندی کی تلقین فرماتے تھے، اور راستوں میں سے گٹھلیاں وغیرہ جمع کر کے ضرورت مند لوگوں کے گھروں میں ڈال دیتے تاکہ وہ ان سے نفع حاصل کریں، حضرت حسنؒ کا بیان ہے کہ خلیفہ ہونے کے زمانہ میں ایک روز حضرت عمرؓ نے جمعہ کا خطبہ پڑھا اس حالت میں آپ کے تہمد پر بارہ پیوند تھے۔

حضرت حفص بن ابی العاص کا بیان ہے کہ ہم حضرت عمرؓ کے ساتھ صبح کا کھانا کھایا کرتے تھے، آپ نے کہا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سُنا ہے فرماتے تھے، حق تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا:۔ ویوم یعرض الذین کفروا علی النار اذھبتم طیبٰتکم الآیہ (یہ آیت بھی اگرچہ کفار کے بارے میں ہے، مگر حضرت عمرؓ اپنے غایتِ تورع وزہد کی شان کے باعث چاہتے تھے کہ ایسی کوئی بات بھی ہم نہ کریں، جس کو حق تعالیٰ قیامت کے دن کفار کو ملامت کے طور پر کہیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۶/۳۴۸) حضرت عمرؓ شام پہنچے تو آپ کے لئے وہاں کا خاص قسم کا حلوا تحفوں میں پیش کیا گیا، فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا اس کو شہد اور میدہ سے تیار کرتے ہیں، فرمایا:۔ واللہ! میں اس کو مرتے دم تک بھی چکھوں گا بھی نہیں الا یہ کہ سب لوگوں کا کھانا ایسا ہی ہو، عرض کیا گیا کہ سب لوگوں کو تو یہ چیز میسر نہیں ہے، آپ نے فرمایا پھر ہمیں بھی اس کی ضرورت نہیں۔

(اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے سامنے علاوہ خاص وتورع وزہد کے یہ چیز بھی نہایت اہم تھی کہ بڑے اور بااقتدار لوگ صرف وہی چیزیں استعمال کریں، جو زیردست عوام وغرباء کو بسہولت میسر ہوں)

بحرین سے حضرت عمرؓ کی خدمت میں مشک وعنبر آیا، فرمایا:۔ کاش! کوئی عورت اچھا وزن کرنے والی ہوتی جو وزن کرتی اور میں اس کو ٹھیک طور پر لوگوں میں تقسیم کر دیتا، آپ کی زوجہ محترمہ عاتکہؓ نے فرمایا میں وزن کرنا اچھا جانتی ہوں لائیے! میں وزن کر دوں گی، آپ نے فرمایا نہیں، پوچھا کیوں؟ فرمایا مجھے ڈر ہے کہ تولتے ہوئے تمہارے ہاتھوں میں جو کچھ لگا رہ جائے گا، اس کو تم اس طرح (اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) اپنی کنپٹی اور گردن وغیرہ پر مل لوگی، جس سے اور لوگوں کی نسبت سے میرے حصّہ میں زیادہ آ جائے گا، پھر اس کا حساب خدا کے یہاں دینا پڑے گا۔

(۶/۳۵۰) حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں نے آپ کا نہایت شاندار استقبال کیا تو آپ اونٹ پر سوار تھے، عرض کیا گیا:۔ اس وقت آپ عمدہ گھوڑے پر سوار ہوں تو بہتر ہے کہ ملک شام کے بڑے بڑے عزت ودولت والے آپ سے ملیں گے، آپ نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:۔ کیا بات ہے میں تمہیں وہاں نہیں دیکھتا، کیسی عجیب شان تھی اور ہر وقت کہاں نظر تھی، اور ایک مختصر ترین جملہ میں کتنی بڑی بات فرما دی کہ دوسرا آدمی دس دن میں بھی اتنی بات نہ سمجھا سکتا تھا، واقعی! آپ اس امّت کے محدَّث ومکلّم ہی تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ وکثر اللہ امثالہ!

(۶/۳۵۱) حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے ہمیشہ دیکھا کہ حضرت عمرؓ کو غصہ آتا اور اس وقت کوئی خدا کا ذکر کرتا، اس کا خوف دلاتا، یا قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھتا تو آپ کا غضب وغصہ کافور ہو جاتا اور آپ اس فعل سے رک جاتے جو کرنا چاہتے تھے (یہ بات بھی نہایت دشوار ہے اور صرف خدا کے نہایت برگزیدہ بندے ہی اس پر عمل کر سکتے ہیں، تجربہ کیا جا سکتا ہے)

(۶/۳۵۲)لوگوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے عرض کیا کہ حضرت عمرؓ سے گفتگو کر کے نرم روی پر آمادہ کریں، کیونکہ ان کی ہیبت ورعب لوگوں پر بہت زیادہ ہے حتی کہ پردے میں رہنے والی کنواری لڑکیاں بھی ان سے ڈرتی ہیں، انہوں نے آپ سے بات کی تو فرمایا:۔میں ظاہر میں اس سے زیادہ نرمی نہیں برت سکتا، کیونکہ واللہ اگر ان کو میرے دل کی نرمی اور صحت وشفقت کا علم ہوجائے جوان کے لئے ہے تو وہ مجھ پر حاوی ہوجائیں گے اور میرے کپڑے تک بھی بدن پر سے اتار کرلے جائیں گے۔

(اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کا نظم چلانے کے لئے عوام پر رعب کا رہنا بھی نہایت ضروری ہے، ورنہ عوام کالانعام کسی طرح بھی اپنی بے جا حرکتوں سے باز نہیں رہ سکتے، ہاں رعب ودبدبہ کے ساتھ والی وحاکم کے دل میں رعایا کے لئے نہایت محبت وشفقت بھی ضروری ہے چنانچہ حضرت عمرؓ کے اندر دونوں باتیں کمال درجہ کی تھیں، اور درحقیقت ان دونوں وصف میں کمی ساری خرابیوں کی جڑ بنتی ہے)

(۳۵۳)حضرت عمرؓ اونٹ پر سوار ہوکر شام پہنچے تو لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا، لوگوں کی نظریں ان جباروں کی سواریاں دیکھنا چاہتی ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

(زمانہ خلافت میں)ایک روز لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا، منبر پر بیٹھ کر حمد وثنا کی پھر فرمایا! اے لوگو! مجھ پر ایسا وقت بھی گزرا ہے کہ کھانے کو کچھ نہ تھا، بجز اس کے کہ بنی مخزوم کی اپنی خالاؤں کے لئے میٹھا پانی پینے کے لئے لادیا کرتا تھا، اور وہ مجھے کچھ مٹھی خشک انگور یا کھجور دیدیا کرتی تھیں اتنا کہہ کر منبر سے اتر گئے، لوگوں نے عرض کیا، اس بات کے بیان کا اس وقت کیا مقصد تھا؟ فرمایا:۔میرے دل میں موجودہ امارت وخلافت کا خیال کر کے کچھ بڑائی کا سا تصور آیا تھا، چاہا کہ اس واقعہ کو سنا کر اپنے نفس کو نیچا دکھاؤں، دوسری روایت میں ہے کہ میں ان کی بکریاں چرایا کرتا تھا، جس کے عوض کچھ سوکھی کھجوریں وہ مجھے دیدیا کرتی تھیں۔

ایک روز سخت گرمی کے وقت سر پر چادر رکھ کر باہر چلے گئے، واپسی پر ایک غلام گدھے پر سوار ملا، اس سے کہا مجھے اپنے ساتھ سوار کرلے، غلام اتر گیا، اور عرض کیا اے امیر المومنین! آپ آگے سوار ہوں، فرمایا، اس طرح نہیں، بلکہ تم آگے بیٹھو، میں تمہارے پیچھے بیٹھوں گا، تم چاہتے ہو کہ مجھے نرم جگہ سوار کرو اور خود سخت جگہ بیٹھو، یہ نہیں ہوسکتا، پھر اس غلام کے پیچھے ہی بیٹھ کر مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے اور سب لوگ حیرت سے آپ کی طرف دیکھتے رہے۔

حضرت زرؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو پاپیادہ عیدگاہ جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک دن دودھ منگا کر پیا، پسند آیا، پوچھا کہاں سے لائے؟ کہا کہ میں ایک چشمہ پر گزرا وہاں صدقہ کے اونٹوں کو پانی پلایا جارہا تھا، ان لوگوں نے ہمیں بھی کچھ دودھ دیدیا، اسی کو میں نے اپنے ساتھ لے لیا تھا اور آپ کو پیش کردیا، حضرت عمرؓ نے یہ سنتے ہی اپنی انگلی منہ میں ڈال کر قے کردی۔

(۶/۳۵۴)ایک دفعہ بیمار ہوئے، صحت کے لئے شہد تجویز کیا گیا، بیت المال میں اس کے کپے موجود تھے تشریف لاکر فرمایا اگر تم سب اجازت دو تو کچھ لے لوں، ورنہ میرے لئے حرام ہے لوگوں نے اجازت دی، حضرت عبدالعزیز بن ابی جمیلہ انصاری نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے کرتہ کی آستین آپ کے ہاتھ کی ہتھیلی سے تجاوز نہ کرتی تھی، حضرت ہشام بن خالد نے بیان کیا کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ تہبند ناف کے اوپر باندھتے تھے۔

(۶/۳۵۶)فتح شام وغیرہ کے بعد تو قیصر روم سے خط وکتابت رہتی تھی، قاصد آتے جاتے تھے، ایک دفعہ حضرت عمرؓ زوجہ محترمہ (ام کلثوم) نے ایک دینار (اشرفی) کہیں سے قرض لے کر عطر خریدا اور شیشیوں میں بھر کر ملکہ قیصر کے لئے ہدیۃً ارسال کیا، وہاں سے ملکہ نے

---

۱ (اسی قسم کا دوسرا واقعہ نظر سے گزرا ہے کہ ایک روز آپ کے پاس بہت سے وفود آئے، فارغ ہوکر ایک غریب آدمی کے گھر جا کر پانی بھرا، اور فرمایا:۔اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرا نفس مغرور ہوجاتا، یہ اسکا علاج ہے اس کے علاوہ یوں بھی آپ کی عام عادت تھی کہ امور خلافت کی انجام دہی سے جو وقت بھی بچتا اس میں غریبوں کا کام کرتے تھے اور کاندھے پر مشک رکھ کر بیوہ عورتوں کے گھر جا کر پانی بھرتے تھے، مجاہدین کی بیویوں کے لئے بازار سے سودا سلف خرید کرلا دیتے تھے)''مؤلف''

ان شیشیوں میں قیمتی جواہرات بھر کر بھیج دیئے، آپ کی زوجہ محترمہ ان جواہرات کو فرش پر نکال کر دیکھ رہی تھیں کہ حضرت عمرؓ باہر سے تشریف لائے، پوچھا یہ کیا ہے؟ بتلایا تو آپ نے ان سب جواہرات کو فروخت کر کے سب روپے بیت المال میں جمع کر دیئے، اور صرف ایک دینار اپنی زوجہ کو لوٹا دیا (صرف عطر ان کا تھا، باقی قاصد سرکاری تھا اور اس کے مصارف آمدورفت وغیرہ سب بیت المال ہی سے ادا ہوئے تھے وغیرہ غالباً اسی لئے حضرت عمرؓ نے پوری احتیاط برتی، (واللہ اعلم)!

ایک مخزومی شخص حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ طیبہ پہنچا اور حضرت ابوسفیانؓ کے خلاف استغاثہ کیا کہ انہوں نے میری حدِ ملکیت میں مداخلت کی ہے آپ نے فرمایا میں تمہاری حد کو جانتا ہوں، بسا اوقات بچپن کے زمانہ میں تم اور میں وہاں کھیلا کرتے تھے، جب میں مکہ معظمہ آؤں گا تو میرے پاس آنا جب آپ مکہ معظمہ پہنچے تو وہ حضرت ابوسفیان کو لے کر حاضر ہوا، آپ ان دونوں کے ساتھ اس جگہ گئے اور حضرت ابوسفیانؓ سے فرمایا کہ تم نے حد بدل دی ہے یہاں سے پتھر اٹھا کر وہاں رکھو، انہوں نے کہا واللہ! میں ایسا نہیں کروں گا، آپ نے ان پر درہ اٹھایا اور پھر فرمایا پتھر اٹھا کر وہاں رکھو، حضرت ابوسفیانؓ نے مجبور ہو کر تعمیل کی، حضرت عمرؓ کے دل میں اس واقعہ سے خوشی ہوئی، اور آپ نے بیت اللہ کے سامنے جا کر عرض کیا اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ مجھے موت نہ دی تا آنکہ میں ابوسفیان پر اس کی خواہشِ نفس کے مقابلہ میں غالب نہ ہو گیا، اور اس کو حکم اسلام ماننے کے لئے مجبور ولاچار نہ کر دیا، اس پر حضرت ابوسفیانؓ نے بھی بیت اللہ کے سامنے حاضر ہو کر عرض کیا یا اللہ! تیرے لئے حمد و شکر ہے کہ مجھے اس وقت تک موت نہ دی کہ میرے دل میں اسلام کی اتنی عظمت محبت نہ آ گئی جس سے میں حضرت عمرؓ کے سامنے اپنے کو ذلیل کر سکا۔

حضرت عمرؓ مکہ معظمہ پہنچے تو اس کی گلی کوچوں میں گشت لگایا اور سب گھر والوں کو حکم دیا کہ اپنے گھروں کے صحنوں کو صاف ستھرا رکھو، حضرت ابوسفیانؓ کے مکان پر بھی گئے اور ان کو بھی یہی حکم دیا، انہوں نے کہا نوکر اور خادم آکر صاف کر دیں گے، اس کے بعد پھر ادھر سے گزرے اور صحن میں صفائی نہ دیکھی تو فرمایا اے ابوسفیان! کیا میں نے تم کو صفائی کا حکم نہیں دیا تھا، کہا جی ہاں! امیر المومنین ضرور دیا تھا، اور ہم ضرور تعمیل کریں گے مگر ہمارے نوکر و خدام تو آ جائیں، آپ نے ان کو درہ مارا، حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہ نے مارنے کی آواز سُنی تو نکل کر آئیں اور حضرت عمرؓ سے کہا کیا تم ان کو مارتے ہو، واللہ! وہ دن بھی گزرے ہیں کہ اگر تم اس وقت ان کو مارتے تو سارے شہر مکہ میں تمہارے خلاف ہنگامہ کھڑا ہو جاتا، آپ نے فرمایا تم سچ کہتی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلام کی وجہ سے بہت سی قوموں کو سربلندی عطا کی ہے اور دوسروں کو پست کر دیا ہے۔

حضرت اسید بن حضیرؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سُنا، آپ فرماتے تھے کہ میرے بعد تمہیں نظر انداز کر کے دوسرے تم سے کم مرتبہ لوگوں کو تم پر ترجیح دی جائے گی، پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ایسا ہوا کہ حلّے آئے، آپ نے ان کو تقسیم کیا، اور میرے پاس جو حلّہ آیا وہ مجھے پسند نہ آیا، اور اپنے والد کو دے دیا، میں نماز پڑھ رہا تھا کہ سامنے سے ایک قریشی جوان گزرا جس پر عمدہ حلّہ تھا، میں نے حضور علیہ السلام کی بات یاد کی اور کہا واقعی حضور نے صحیح فرمایا تھا اور آپ کا قول نقل کیا، وہ نوجوان یہ بات سن کر حضرت عمرؓ کے پاس گیا، اور اس واقعہ سے مطلع کیا، آپ تشریف لائے تو اس وقت بھی میں نماز پڑھ رہا تھا، فرمایا نماز پڑھ لو اسید! جب میں فارغ ہوا تو فرمایا تم نے کیا بات کہی تھی؟ میں نے وہ دہرائی، آپ نے فرمایا، دیکھو وہ حلّہ میں نے فلاں شخص کو دیا تھا، جو بدری، احدی، اور عقبی تینوں فضیلتوں کے مالک ہیں، اس نوجوان نے ان سے اس کو خرید کر پہن لیا، جس سے تم نے خیال کیا کہ میرے ہی زمانہ میں حضور علیہ السلام کی وہ پیش گوئی پوری ہو رہی ہے اسید کہتے ہیں کہ میں نے یہ سُن کر عرض کیا کہ میں نے کہا تو یہی تھا مگر واللہ! اے امیر المومنین! خیال میرا بھی یہی تھا کہ آپ کے زمانہ میں ایسا نہ ہو گا۔

حضرت عکرمۃ بن خالد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے ایک بیٹے عمدہ کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھا کئے، آپ کے پاس آئے تو

آپ نے ان کو درّہ سے مارا، یہاں تک کہ وہ رو پڑے، حضرت حفصہؓ نے کہا آپ نے ان کو کیوں مارا؟ فرمایا میں نے دیکھا کہ اس حالت میں اسکو غرور ہوا، اس لئے چاہا کہ اس کے نفس کو ذلیل کروں۔

(۶/۳۵۷) حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت مقدادؓ میں کچھ جھگڑا ہو گیا، جس میں حضرت عبداللہؓ نے ان کی شان میں گستاخی کے الفاظ کہہ دیئے انہوں نے اس کی شکایت حضرت عمرؓ سے کردی، جس پر آپ نے نذر مان لی کہ عبداللہ کی زبان کاٹ دیں گے، ان کو معلوم ہوا تو ڈرے اور لوگوں کو درمیان میں ڈالا کہ آپ کو اس سے باز رکھیں، آپ نے فرمایا مجھے اس کی زبان کاٹنے دو تا کہ میرے بعد یہ سنت بن جائے، جس پر لوگ عمل کریں کہ جو شخص بھی کسی صحابی رسول اللہ ﷺ کے لئے نامناسب الفاظ استعمال کرے، اس کی زبان کاٹ دی جائے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے بیت المال صاف کیا تو اس میں ایک درہم ملا، وہ حضرت عمرؓ کے کسی بچہ کے پاس سے گزرے تو اس کو دے دیا، حضرت عمرؓ نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا، کہا کہ مجھے ابوموسیٰ نے دیا ہے آپ نے ان سے معلوم کیا اور فرمایا کیا سارے شہر مدینہ میں تمہیں میری اولاد سے زیادہ ذلیل مسکین ولاچار کوئی نہ ملا، جس کو دے دیتے، کیا تم نے یہ ارادہ کیا کہ امتِ محمدیہ کا کوئی فرد بھی باقی نہ رہے جو اس درہم کے ناحق لینے پر ہم سے مواخذہ نہ کرے، پھر آپ نے وہ درہم بچہ سے لے کر بیت المال میں ڈلوادیا۔

معلوم ہوا کہ بیت المال کے مال کو غلط طریقہ پر کسی کو دینے سے ساری امت کے افراد قیامت میں لینے والے پر گرفت ومواخذہ کریں گے۔

(۶/۳۶۴) حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ پر موت کی غشی طاری ہوئی تو میں نے آپ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا، کچھ ہوش ہوا تو فرمایا میرا سر زمین پر رکھدو، پھر غشی طاری ہوگئی اور ہوش آیا تو آپ کا سر میری گود میں تھا، فرمایا، میں حکم کررہا ہوں تم میرا سر زمین پر رکھدو، میں نے کہا ابا جان! میری گود اور زمین میں کیا فرق ہے دونوں برابر ہیں اس پر ناگواری کے ساتھ فرمایا نہیں، جیسا میں تمہیں حکم دے رہا ہوں، تم میرا سر زمین[1] پر رکھدو، اور جیسے ہی میری روح قبض ہو جلدی کر کے مجھے قبر میں پہنچا دینا، کہ یا تو میرے لئے بہتری ہے تو جلدی اس تک پہنچ جاؤں گا یا برائی مقدر ہے تو تم اس کو اپنی گردنوں سے جلدی اتار پھینکو گے، رضی اللہ تعالیٰ عنہم ورضواعنہ!

فائدہ! اوپر ہم نے کنز العمال سے کچھ نقل کیا ہے، جس کو اس وقت زیادہ اہم وضروری سمجھا، ورنہ کنز العمال میں جو مناقبِ عمری دوسری جلدوں میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ بہت زیادہ ہیں، ان سب پر نظر کرتے ہوئے، ایسا محسوس ہوا کہ اب تک جو کچھ حالات ومناقب اردو کی تالیفات میں ہمارے سامنے آئے ہیں، وہ پورے حالات کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہیں، چونکہ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بعد حضرت عمرؓ کے حالات ہمارے لئے بہت بڑی مشعلِ ہدایت ہیں، اور آپ چونکہ اس امت محمدیہ کے محدَّث تھے، جو نبی ورسول کے بعد ایک امتی کا سب سے بڑا درجہ ہے اس لئے اگر ان کے حالات روشنی میں آجائیں تو امت کو نفع عظیم حاصل ہو سکتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی غالباً اسی لئے آپ کے حالات کا بہت بڑا ذخیرہ ازالۃ الخفاء میں جمع کردیا ہے، تاہم کنز العمال وغیرہ جدید شائع شدہ کتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ وسیر سے اور بھی زیادہ حالات مل سکتے ہیں، یہاں ہمیں آپ کے زہد وورع کے سلسلہ میں اتنا اور لکھنا ہے کہ آپ نے اپنے لئے جو طریق زندگی ومعیشت اپنایا تھا، اور اس کا مستدل ان آیاتِ قرآنیہ کو بتایا تھا جو کفار کے حق میں نازل ہوئیں، وہ زہد وورع اور دنیا سے بے رغبتی کا گویا آخری درجہ تھا، جس کا وہ نمونہ پیش کرگئے، لیکن فی نفسہ جواز وحلّتِ طیبات میں شرعاً کوئی شدت نہیں ہے اور درمیانی ومعتدل صورت یہ ہے کہ بلاضرورت طیبات کے تناول سے بھی احتراز کیا جائے کیونکہ حسبِ تحقیق علامہ کاشانی صاحبِ بدائع ودیگر اکابر علماء وفقہاءِ دنیا قضاءِ ضروریات کے لئے

[1] حضرت ابن عمرؓ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ میرے والد حضرت عمرؓ نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ جب تم مجھے لحد میں رکھو تو میرا رُخسار زمین پر رکھ دینا اس طرح کہ میری کھال اور زمین کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہے (کنز العمال ۶/۳۶۲) اس کی وجہ غالباً حضرت عمرؓ کی غایتِ تواضع تھی اور ساتھ ہی استرحام بھی کہ اس طرح حق تعالیٰ کے رحم ورحمت کی نہایت عاجزانہ التجا تھی، واللہ تعالیٰ اعلم

ہے قضاءِ شہوات کے لئے نہیں، اورآخرت قضاءِ مشتہیات ومرغوبات کے لئے ہوگی، اس کا عکس کفار کے لئے ہے کہ یہاں وہ خوب مزے اڑائیں اوروہاں عذاب وعقاب اورغیرمرغوبات کا ذائقہ چکھیں۔

اصولی بات تو یہ ہے باقی حسبِ ضرورت ایک مومن کے لئے بھی یہاں حلال طریقہ سے حاصل کردہ مرغوبات، مقویات وغیرہ سب جائز ہیں، صرف کسبِ حرام اورتناولِ محرمات شرعیہ سے اجتناب واحتراز ضروری وفرض ہے۔

اسی کے ساتھ اگر یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ شبع (پیٹ بھر کر کھانا) نہ صرف یہ کہ حسبِ ارشاد حضرت عائشہؓ اسلام میں سب سے پہلی بدعت ہے یہ صحت کے لئے بھی معین ومفید نہیں ہے، اوراگرچہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے تصوف کے ایک جزوقلۃ الطعام کے التزام کو زمانہ کے عام انحطاطِ قوی کے باعث غیرضروری قراردیا ہے لیکن راقم الحروف کی رائے از روئے طب اب بھی یہ ہے کہ اس جزو کا التزام بدستور باقی رکھا جائے، اور کمی قلت کی تلافی اغذیہ کی لطافت، پھلوں اورمقوی ادویہ کے استعمال سے کی جائے، لطیف اغذیہ، موسمی پھلوں، اورمقویٰ ادویہ سے بغیر شبع پورے جسم اورخاص طور سے اعضائے رئیسہ وشریفہ انسانی کو کافی قوت وطاقت مل سکتی ہے، اورقلت طعام کے فوائد بھی بدستور اپنی جگہ باقی رہ سکتے ہیں، حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم اورآپ کے اتباع میں صحابہ کرام کی عادتِ مبارکہ پیٹ بھر کرکھانے کی جگہ بطور ناشتہ تھوڑا کھانے کی تھی، اوراس سے بھی زیادہ پسندیدہ ان کو اختیاری فاقہ تھا، یعنی کھانا میسر ہوتے ہوئے بھی اس کو تناول نہ کرنا، اورجب کبھی کھاناتو وہ بھی بہت کم، جس کو نیم فاقہ کی صورت کہہ سکتے ہیں۔ اندروں از طعام خالی دار تادروں نورِ معرفت بینی!!

غالباً حضرت تھانویؒ کی تشخیص وتجویز مذکور عوام کے لئے ہوگی، ورنہ خواص خصوصاً اہل علم وذکر کے لئے توقلۃ الطعام سے بہتر اکسیری نسخہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا، دوسرے یہ کہ قلۃ الطعام کی گرفت جتنی ڈھیلی کریں گے، قلۃ المنام والا جزو بھی کمزور ہوتا جائے گا کہ شبع، کثرۃ المنام کو مقتضی ہے آگے صرف دو جزو رہ جائیں گے، قلۃ الکلام اورقلۃ الاختلاط مع الانام، اوراس طرح تصوف کے گویا آدھے حصہ سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ وفقنا اللہ تعالیٰ لما یحب ویرضیٰ!

دوسری یہ کہ حضرت عمرؓ کی پوری زندگی تقشف، زہد وقناعت اورانبیاء علیہم السلام کی طرح اختیاری فقروفاقہ کی تھی اوراپنے اہل وعیال اورزیر اقتدار عمال وگورنروں تک کو بھی انہوں نے اسی زندگی کا عادی بنایا تھا، اس کے باوجود آپ کا دوسروں کے لئے بے مثال جودوسخا اورراہِ جہاد وقتال میں اسلامی فتوحات کے لئے اموالِ عظیمہ کا صرف کرنا بھی ثابت ہے، اسی لئے آپ کے اوپر بیت المال کا اسی ہزار روپیہ قرض ہو گیا تھا، اوراس کے لئے آپ نے حضرت عبداللہ کو بطور وصیت کے فرمایا تھا کہ اس قرض کی ادائیگی کے واسطے میری جائداد وغیرہ فروخت کردینا، اگراس سے پورا نہ ہوتو میری قوم بنی عدی سے مدد لینا، اس سے بھی پورا نہ ہوتو قریش سے سوال کرنا، ان کے علاوہ کسی سے نہ لینا، پھر فرمایا کہ تم ابھی اس قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لو، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ذمہ داری لی اورحضرت عمرؓ کی وفات کے بعد دفن ہونے سے قبل ہی انہوں نے اپنی اس ضمانت پر اہل شوریٰ اورچند انصاری حضرات کو شاہد بنالیا، پھر حضرت عمرؓ کے دفن کے بعد دوسرا جمعہ آنے سے قبل ہی انتظام کرکے سارے قرضہ کی رقم خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ کو سپرد کردی اورسب شاہدوں سے دفعِ مال وبراءتِ قرض کی سند حاصل کرلی (کنز العمال ۳۶۲/۶)

چونکہ حضرت عمرؓ کے نجی اورگھریلو زندگی کے بیشتر حالات معلوم نہ ہوسکے، خیال یہ ہے کہ سرکاری مہمانوں کی ضیافت میں اورمسکینوں، حاجت مندوں کی خفیہ امداد میں بہت کچھ وہ اپنی طرف سے اپنی ذمہ داری پر قرض لے کر صرف کرتے رہتے ہوں گے اوریہ بھی ثابت ہے کہ دوسرے مالدارِ صحابہ سے بھی قرض لیا کرتے تھے، اورشاید اس کی ادائیگی اپنی نجی آمدنی اوربیت المال سے قرض لے کر بھی کردیتے ہوں گے، جس کے باعث آخر عمر تک بیت المال کی اسی ہزار کی خطیر رقم کے مقروض ہوگئے تھے، واللہ تعالیٰ اعلم!

بیت المال سے وظیفہ

واضح ہو کہ شروع زمانہ خلافت میں تو حضرت عمرؓ نے بیت المال سے کچھ لیا ہی نہیں ۱۵ھ سے پانچ ہزار سالانہ مقرر ہوا تھا اور یہ وظیفہ بھی خلافت کی خصوصیت سے نہ تھا کیونکہ تمام بدری صحابہ کو پانچ پانچ ہزار درہم سالانہ ملتے تھے، جیسا کہ فتوح البلدان میں ہے اور اس سے زیادہ سالانہ وظیفہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا تھا یعنی بارہ بارہ ہزار درہم، جو حضرت عمرؓ نے ہی مقرر فرمایا تھا جیسا کہ کتاب الخروج میں ہے۔

خدمت خلق کا جذبہ خاص اور رحم لی

حضرت عمرؓ ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ سمجھتے، اور ان کی خدمت ونفع رسانی کو اپنا فرض خیال کرتے تھے، چنانچہ ان کا معمول تھا کہ مجاہدین کے گھروں پر جاتے اور عورتوں سے پوچھ پوچھ کر بازار سے ضرورت کی چیزیں لا کر دیتے، کاندھے پر مشک رکھ کر بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچاتے مقام جنگ سے ڈاک آتی تو فوجیوں کے خطوط ان کے گھروں پر جا کر خود پہنچاتے تھے، اور جس گھر میں کوئی پڑھا لکھا نہ ہوتا خود ہی چوکھٹ پر بیٹھ جاتے اور جو کچھ وہ لکھاتے لکھ دیتے نابینا اور ضعیف لوگوں کے گھروں پر جاتے، ان کی خدمت کرتے تھے اور ان کو یہ بھی خبر نہ ہونے دیتے کہ میں کون ہوں، راتوں کو گشت کر کے شہر کے لوگوں کی حفاظت کا فکر کرتے، اور کسی کو تکلیف ومصیبت میں دیکھتے تو ان کی اسی وقت امداد کرتے، ذمیوں اور کافروں کے ساتھ بھی رحم لی اور شفقت کا معاملہ کرتے بلکہ آخر وقت تک ان کا خیال رکھا، اور وفات کے وقت ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وصیت فرمائی، عراق عجم کے معرکہ میں حضرت نعمان بن مقرنؓ اور دوسرے بہت سے مسلمان شہید ہوئے، آپ کو خبر ملی تو بہت متاثر ہوئے اور زار وقطار روئے بظاہر مزاج میں شدت اور سختی تھی لیکن دل کے اندر نہایت رحم تھا، اور کنز العمال وغیرہ میں ہے خود فرمایا کہ میں حضور علیہ السلام اور صدیق اکبرؓ کی زندگی میں ننگی تلوار تھا، کیونکہ اس وقت اسی کی ضرورت تھی، وہ دونوں نہایت رحم دل تھے، ان کے بعد مجھے ظاہری سختی اور باطنی نرمی دونوں کا مظہر بننا پڑا، اور اگر میں ظاہر میں بھی نرمی اختیار کر لوں تو لوگوں کی بے راہ روی پر قابو پانا دشوار ہو جائے۔

کہول اہل جنت کی سرداری

احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر وعمرؓ اہل جنت کے ادھیڑ عمر والوں کے سردار ہوں گے اور جنت میں ان کے اونچے اونچے محل ہوں گے (ازالہ ۱/۵۸۰)

ترمذی شریف ابن ماجہ، مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ ابوبکر وعمرؓ کہول اہل جنت اولین وآخرین سب کے سردار ہوں گے، بجز انبیاء ومرسلین کے۔ (مشکوٰۃ شریف)

آخرت میں تجلی خاص سے نوازا جانا

احادیث میں ہے کہ حشر کے دن سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ، پھر حضرت ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ حق سے معانقہ کریں گے، یہ بھی مروی ہے کہ سب سے اوّل حق تعالیٰ جس سے مصافحہ کرے گا، جس پر سلام پڑھے گا، اور سب سے پہلے جس کا ہاتھ پکڑ جنت میں داخل کرے گا وہ عمر ہیں (ازالہ ۱/۵۹۱)

مناقب متفرقہ حضرت عمرؓ

آخر میں ہم یہاں آپ کے چند متفرق مناقب کا بھی ذکر کر کے بابِ مناقب کو ختم کرتے ہیں (۱) بہت سے صحابہ اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ اللہ تعالیٰ عمر پر رحم کرے وہ حق بات کہنے سے نہیں چوکتے، اور حق گوئی ہی نے انھیں تنہا کر دیا ہے کہ

ان کا کوئی دوست نہیں (ازالہ۵۹۳/۱)

(۲) صلح حدیبیہ کے موقع پر معیت بیت کا تذکرہ ۱۳۱ مناقب میں ہو چکا ہے، دوسری بیعت فتح مکّہ کے موقع پر ہوئی ہے اس میں حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ کو بیعتِ نسواں کے لئے منتخب فرمایا تھا، (ازالہ۵۹۵/۱)

علامہ محدث سہیلیؒ نے لکھا:۔ حضرت ہند بنت عقبہؓ (زوجہ حضرت ابی سفیانؓ) بھی قابل ذکر ہیں کہ یوم فتح مکہ میں انہوں نے بھی اسلام قبول کر کے حضور علیہ السلام سے بیعت کی تھی، آپ صفا پر تشریف رکھتے تھے، اور حضرت عمرؓ آپ سے نیچے کی جانب عقبہ کے اوپری حصّہ پر تھے، دوسری قریشی عورتوں کے ساتھ اسلام پر بیعت کے لئے حاضر ہوئیں حضور علیہ السلام کی طرف سے حضرت عمرؓ ان عورتوں سے بات کرتے تھے جب ان سے عہد لیا کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی تو ہند بولیں، تم جانتے ہو اگر خدا کے سوا کوئی اور بھی معبود ہونے کے لائق ہوتا تو تمہارے مقابلہ میں ہمارے ضرور کام آتا، جب کہا کہ چوری نہ کریں گی تو وہ بولیں، کون شریف عورت چوری کر سکتی ہے؟ لیکن یارسول اللہ! ابو سفیان (میرا شوہر) بخیل آدمی ہے بسا اوقات بچّوں کی پرورش کے لئے میں اس کے مال میں سے بغیر اس کی اجازت وعلم کے لے لیتی ہوں، یہ جائز ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا مناسب طور پر ضرورت کے مطابق لے سکتی ہو، اس پر حضور علیہ السلام نے آواز پہچان کر فرمایا کیا تم ہند ہو، عرض کیا ہاں یارسول اللہ! مجھے آپ معاف کریں اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے گا، ابوسفیان بھی اس وقت موجود تھے، کہا تم نے جو کچھ میرے مال میں سے لیا ہے وہ میں نے حلال کیا، پھر جب کہا کہ عہد کرو کبھی زنا بھی نہ کرو گی، ہند بولیں، یارسول اللہ! کیا شریف عورت ایسا کر سکتی ہے؟! کہا کبھی احکام شرع کے خلاف بھی نہ کریں گی، اس پر وہ بولیں، آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپ بڑے کریم ہیں اور آپ نے بہت اچھی چیزوں کی طرف بلایا ہے جب کہا کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، تو ہند بولیں، واللہ! ہم نے تو اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا تھا، جن کو آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہی بدر کے میدان میں قتل کیا ہے، اس پر حضرت عمرؓ بہت ہنسے۔ (الروض الانف ۲/۲۷۷)

''سیرۃ النبی'' ۵۲۱/۱ میں طبرانی کی نقل اس طرح ہے:۔ مقام صفا میں حضور ﷺ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آئے تھے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ اُن سے ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا، پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آں حضرت ﷺ دستِ مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے، آپ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

''خلفائے راشدین'' (مطبوعہ اعظم گڑھ) ۱۱ میں اس طرح ہے:۔ پھر حضور علیہ السلام حضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر مقام صفا پر لوگوں سے بیعت لینے کے لئے تشریف لائے، لوگ جوق در جوق آتے تھے، اور بیعت کرتے جاتے تھے حضرت عمرؓ آں حضرت ﷺ سے قریب لیکن کسی قدر نیچے بیٹھے تھے، آں حضرت ﷺ بیگانہ عورتوں کے ہاتھ مس نہیں کرتے تھے، اس لئے جب عورتوں کی باری آئی تو آپ نے حضرت عمرؓ کو اشارہ کیا کہ تم ان سے بیعت کر لو چنانچہ تمام عورتوں نے ان ہی کے ہاتھ پر آں حضرت ﷺ سے بیعت کی، اس واقعہ سے حضرت عمرؓ کی خاص شان نیابت نبوت کی ظاہر ہوتی ہے۔

(۳) حضرت عمرؓ نے وصیت فرمائی کہ میرے بعد ان چھ شخصوں میں سے کوئی خلیفہ ہو جن سے حضور علیہ السلام راضی تھے۔ (مسلم)

(۴) موطا امام محمدؒ میں سالم بن عبداللہ کے واسطہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے:۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس کام کا اہل ہے اور مجھے اس پر مقدم ہونے کا حق نہیں تو میرے نزدیک گردن مارنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ میں امیر رہوں، تو جو شخص میرے بعد خلیفہ ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ عنقریب اس سے قریب وبعید ہٹا دیئے جائیں گے، اور مجھے خدا کی قسم ہے اگر

ل واضح ہو کہ حضرت الامام ابوحنیفہؒ نے اپنی فقہ کا بڑا مدار قرآن وحدیث کے بعد آثار صحابہ خصوصاً خلفائے راشدین کے آراء وتعامل پر رکھا ہے۔ ''مؤلف''!

میں لوگوں سے اپنے لئے لڑوں (۵) حضرت علیؓ سے بدرجہ تواتر یہ روایت نقل ہوئی کہ امت میں سب سے بہتر حضرت ابوبکرؓ پھر عمرؓ ہیں اس کو نقل کرنے والے اسّی افراد ہیں (ازالہ ۶۰۴/۱) (۶) حضرت ابوبکر بن ابی شیبہ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا قول نقل کیا کہ حضرت عمرؓ نہ قبول اسلام میں ہم سے مقدم تھے اور نہ ہجرت میں، مگر ان کی افضلیت ہم نے اس طرح پہچانی کہ وہ ہم سے زیادہ زہد اور دنیا سے بے رغبتی کرنے والے تھے (ازالہ ۶۰۸/۱) زہد وقناعت اور سادگی کے واقعات پہلے ذکر ہوئے ہیں، مورخ ابن خلدون نے کہا جب آپ فتح بیت المقدس کے لئے تشریف لے گئے تو آپ کی قمیص میں ستر پیوند تھے، جن میں ایک چمڑے کا تھا، ایک دفعہ گھر سے دیر میں نکلے وجہ یہ تھی کہ کپڑے نہ تھے، بدن سے اتار کر دھوئے اور سکھائے تب باہر تشریف لائے (۴۰۴/۱ اُردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی نمبرا

(۷) مشہور محدث حضرت عمرو بن میمونؒ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ دو ثلث علم لے گئے، یہ مقولہ سن کر حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ دس حصوں میں سے نو حصّے علم کے لے گئے محدث دارمی اس کے راوی ہیں (ازالہ ۶۱۵/۱)

(۸) حضرت صدیقؓ نے جب اپنی جگہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ آپ ایسے سخت مزاج کو ہم پر خلیفہ بنا رہے ہیں خدا کو کیا جواب دیں گے؟ تو فرمایا:۔ میں خدا کو جواب دوں گا کہ میں نے آپ کی مخلوق پر آپ کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ بہتر آدمی کو خلیفہ بنایا ہے (ازالہ ۶۲۹/۱) ازالۃ الخفاء کی دونوں جلدوں میں حضرت عمرؓ کے متفرق طور سے بے شمار مناقب ذکر ہوئے ہیں، ہم یہاں ان پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ کی سیاسی[1] وملکی خدمات وفتوحات وغیرہ کا تذکرہ اردو میں الفاروق اور خلفائے راشدین وغیرہ میں کافی آچکا ہے (اگرچہ بہت سی اہم چیزیں نظر انداز بھی ہوگئی ہیں، اسی طرح فقہِ عمری کا باب ازالۃ الخفاءِ میں اچھی تفصیل کے ساتھ آگیا ہے، لہٰذا ہم ان دونوں کا ذکر یہاں نہیں کرتے، اور اب صرف موافقاتِ عمری کی تفصیل کرتے ہیں، جن کا تعلق بخاری کی حدیث الباب سے ہے، اور اس کے بعد ملفوظاتِ عمری کے عنوان سے منتخب حصّہ ذکر کر کے اس مقدس تذکرہ کو ختم کر دیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

موافقاتِ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی تعالیٰ اللہ عنہ

جیسا کہ ہم نے مناقب فاروقِ اعظمؓ شروع کرتے ہوئے، آپ کی شانِ محدّثیت کو اوّل نمبر پر رکھ کر دوسرا نمبر آپ کی موافقاتِ وحی الٰہی کو دیا تھا اور تفصیل کے لئے وعدہ کیا تھا، خدا کا شکر ہے اب اس وعدہ کو پورا کرتے ہیں، درحقیقت جس طرح اس امت محمدیہ میں سے آپ کی خاص ممتاز شان آپ کا محدَّثِ امتِ محمدیہ ہونا ہے، اسی طرح دوسرا آپ کا نہایت امتیازی نشان آپ کی آراء مبارکہ کا بہ کثرت وحی الٰہی کے مطابق ہونا بھی ہے جس میں آپ کا کوئی سہیم وشریک نہیں ہے پھر ان موافقات کی تعداد کیا ہے؟

محقق عینیؒ نے لکھا:۔ امام بخاریؒ نے یہاں صرف تین چیزوں کا ذکر کیا ہے لیکن حضرت عمرؓ کی موافقتِ وحی ان کے علاوہ بھی منقول

---

[1] ''ندوۃ المصنفین'' دہلی سے حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط بھی ایک ضخیم جلد میں شائع ہوگئے ہیں، جو نہایت اہم علمی وتاریخی ذخیرہ ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کے مؤلف نے پوری کتاب میں کسی صحابی کے نام کے ساتھ تعظیمی لفظ استعمال نہیں کیا، حتی کہ حضرت عمر وابوبکرؓ وغیرہ کے لئے بھی نہیں، اور رسول اللہ علیہ کے ساتھ بھی نہیں، ایک مقتدر اسلامی ودینی علمی ادارہ سے ایک مسلمان کی تالیف کی اس طرح اشاعت موزوں نہیں معلوم ہوتی، اگر ہم خود ہی اپنے اسلاف واکابر کی قدر وعظمت نہیں کریں گے تو دوسرے کیوں کریں گے؟! بعض اہل قلم محسن اعظم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ صرف صاد یا صلعم لکھ دیتے ہیں، یہ بھی بہت غیر موزوں اور نامناسب ہے کم سے کم علیہ السلام یا صلعم لکھنا چاہیے کہیں نظر سے گزرا تھا کہ جس شخص نے پہلے صلعم لکھا تھا، اس کا ہاتھ شل ہوگیا تھا، تمام انبیاء علیہم السلام، ان کے اصحاب علماءِ واولیاءِ کرام کے عظیم القدر احسانات سے ہماری گردنیں جھکی ہوئی ہیں کہ اُن ہی کے واسطہ سے ہم تک اسلام وعلوم نبوت کی روشنی پہنچی ہے پھر بھی اگر ہم ان کے لئے ایک حرف دعا کے ذریعہ اپنے احسان شناسی کا اظہار نہ کریں تو ہماری یہ بے حسی قابل صد ملامت ہے۔

کتاب مذکور کافی محنت وکاوش سے لکھی گئی ہے، اس لئے اس کے مؤلف وادارہ مذکور مستحقِ شکر ہیں، مگر ایسے اکابرِ امت سے متعلق تالیف کا حق درحقیقت علمائے متقین کا تھا، جو جواب ایرادات وضروری تشریحات کی طرف بھی توجہ کرتے، اب اس حیثیت سے جگہ جگہ خلا پایا جاتا ہے۔ ''مؤلف''

ہے،مثلاً اساری بدر کے حق میں فدیہ نہ لینے کی رائے ،جس پر آیت ماکان لنبی ان یکون له اسری ، یا منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے کی ممانعت ولا تصل علی احدمنهم مات ابدا سے کہ یہ دونوں بخاری میں بھی ہیں،اور آیت ولقد خلقنا الانسان من سلالة (تا)خلقا آخر اتری تو حضرت عمرؓ نے فرمایافتبارك الله احسن الخالقين پھر اسی طرح یہ آیت ہو کر اتری،حضرت عمرؓ کو تحریم خمر پر اصرار تھا، پھر اسکی حرمت نازل ہوئی حضرت عائشہؓ پر اہل افک نے بہتان باندھا تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کا نکاح حضرت عائشہؓ سے کس کے حکم سے ہوا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے حکم سے،عرض کیا پھر اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں آپ سے تدلیس کا معاملہ فرماتے (کہ غیر طاہرہ مقدسہ کا آپ کے نکاح میں لانا پسند فرماتے)سبحنك هذا بهتان عظيم (خدائے برتر کی ذات ہر برائی سے منزہ ہے اور یہ یقیناً لوگوں کا بہتان عظیم ہے) پھر یہی آیت نازل ہوئی، محب طبری نے اس کو ذکر کیا ہے،اور ابوبکر بن العربیؒ نے فرمایا کہ موافقت گیارہ مواضع میں ہوئی ہے، پھر محقق عینیؒ نے لکھا کہ ترمذی کی حدیث ابن عمرؓ سے تو معلوم ہوا کہ جب بھی کسی معاملہ میں لوگوں کی ایک رائے ہوئی اور حضرت عمرؓ کی دوسری،تو قرآن مجید کا نزول حضرت عمرؓ ہی کی رائے کے موافق ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ موافقت بہ کثرت ہوئی ہے (عمدہ ۲/۳۱۹)حافظؒ نے بھی حدیث ترمذی مذکور نقل کر کے لکھا کہ اس سے بہ کثرت موافقت کا ثبوت ملتا ہے اور بالتعیین ہمیں منقول شدہ ذخیرہ میں پندرہ تک کا علم ہوا ہے (فتح ۳/۱۴۱) ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر درس میں فرمایا کہ تلاش وتتبع سے اس پر زیادتی بھی ممکن ہے (بیس تک؟) راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ زیادتی شاید قرآن مجید کے لحاظ سے مراد ہو،ورنہ حسب تحقیق حضرت شاہ ولی اللہؒ قرآن وحدیث دونوں کی موافقت لی جائے تو یہ عدد بہت بڑھ جائے گا،اور ہم یہاں ۱۲۸ مور میں موافقت ذکر کرتے ہیں، واللہ المیسر وبہ نستعین!

مقام ابراہیم کی نماز

بخاری، مسلم، ترمذی ومسند احمد وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ میں نے آں حضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ !اگر مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالیا جائے تو بہتر ہے اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی واتخذ و امن مقام ابراهيم مصلی (بقرہ)

حجاب شرعی کا حکم

اس بارے میں کچھ تفصیل انوار الباری ۴/۱۸۹ تا ۴/۲۰۰ وغیرہ میں گزر چکی ہے، یہاں بھی چند اہم امور ذکر کئے جاتے ہیں حجاب شرعی اور پردہ کے احکام جو اس امت محمدیہ کا بڑا طرۂ امتیاز اور فضیلت وکرامت خاصہ ہے اور اس امت آخر الزماں پر قیامت تک عام عذاب الٰہی نہ اُترے اور اس کی جگہ فتنوں کی کثرت کی خبر دی گئی ہے، ان سب فتنوں میں سے بڑا اور مہلک فتنہ عورتوں کے ذریعہ رونما ہوتا ہے، اسی لئے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ دنیا کی فراوانی اور اس کی دل فریبیوں کے جال میں پھنسنے سے بچتے رہنا اور عورتوں کے شر وفتنہ سامانیوں سے بھی خبر دار رہ کر اپنا بچاؤ کرنا، اللہ تعالیٰ نے ان آزمائشوں سے گزار کر تمہارا امتحان لیا ہے کہ تم کس طرح نگاہ وقلب کے معاصی سے بچ کر اپنے ایمان واسلام اور اپنے دلوں کے نور کو بچا سکتے ہو اور فرمایا میری امت میں مردوں کے لئے سب سے زیادہ ضرر رساں فتنہ عورتوں کا ہوگا، علامہ نوویؒ نے اس حدیث کے تحت لکھا:۔ مراد یہ ہے کہ عورتوں کے فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچتے رہنا، اور عورتوں میں اپنی بیویاں بھی شامل ہیں بلکہ اکثری طور پر فتنے بیویوں کی طرف سے پیش آتے ہیں کہ وہ ہر وقت ساتھ ہوتی ہیں اور زیادہ لوگ ان میں مبتلا ہوتے ہیں (نووی شرح مسلم شریف ۲/۳۵۳) محدث کبیر ابن ماجہ نے مستقل باب فتنۃ النساء کا باندھا ہے اور دوسری مشہور احادیث کے ساتھ اس میں یہ روایت بھی نقل کی کہ ہر صبح کو دو فرشتے یہ ندا کرتے ہیں کہ بڑی ہلاکت ومصیبت پیش آنے والی ہے مردوں کو عورتوں کی وجہ سے اور عورتوں کو مردوں کی وجہ سے (۲۸۸)

حجاب شرعی کا حکم درحقیقت حق تعالیٰ کی غیرت کا تقاضہ ہے اسی لئے اس نے فواحش ومنکرات کو حرام قرار دیا اور ان سے بچنے کا اکسیری

نسخہ حجاب وتستر اور غضِ بصر تجویز فرمایا، پھر سب سے پہلے اس نسخہ اکسیر کا استعمال ازواجِ مطہرات اور بناتِ طیبات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا جو ساری دنیا کی عورتوں میں سب سے زیادہ مکرم ومعظم اور باوجاہت واشرف تھیں، اور ان کے صدقہ وطفیل میں ساری امت کو عطا کیا گیا، ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ حجاب کے احکام تدریجی طور سے اترے ہیں، جن کا ذکر سورۂ نور، سورۂ احزاب، اور سورۂ تحریم میں ہے اور یہ سب احکام حضرت عمرؓ کی بار بار معروضات پر اُترے ہیں بلکہ آپ کی خواہش تو یہ بھی تھی کہ کسی ضرورت ومصیبت کے وقت بھی مومن عورتیں اپنے گھروں کے محفوظ قلعوں سے باہر نہ ہوں، مگر اس کو شریعت نے حرجِ امت کے پیش نظر قبول نہ کیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو مسلمان عورتیں بغیر کسی ضرورت کے یا بلا سخت ابتلاء ومصیبت کے وقت کے گھروں سے نکلتی ہیں وہ حق تعالیٰ کے عتاب وعقاب کی مستحق بنتی ہیں اور حق تعالیٰ، اس کے رسول اور حضرت عمرؓ وغیرہ کی غیرت وحمیت کو چیلنج کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو اس سے محفوظ رکھے،

علامہ بغویؒ نے لکھا کہ آیتِ حجاب (واذاسالتموھن الآیه) اترنے کے بعد کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ازواجِ مطہرات کو دیکھ سکتا، نہ نقاب کی حالت میں نہ بغیر نقاب کے، اور یہ حجاب کا حکم مردوں اور عورتوں سب کے دلوں کو پاک صاف رکھنے کے لئے تھا کہ شیطانی خیالات پاس نہ آئیں۔ (تفسیر مظہری ۷/۳۶۰)

اگر اس مقدس ترین دورِ نبوت کے پاک باز ومتقی مردوں اور عورتوں سب کے لئے پردہ کے احکام ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لئے ضروری تھے، تو ہمارے لئے کتنے ضروری ہیں وہ ظاہر ہے، ازواجِ مطہرات کو سورۂ احزاب میں یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تقویٰ اختیار کرو (کیونکہ اس وصف کے ساتھ تمہارے ازواج النبی ہونے کی عظمت وشرف کو چار چاند لگ جاتے ہیں، لہٰذا تم دوسرے (یعنی نامحرم) مردوں سے بات کرنے میں نرم اور دل کش لہجہ میں گفتگو نہ کرنا، ممکن ہے نفس وشیطان سے متاثر ہونے والا کوئی روگی دل والا برا خیال دل میں لا کر اپنی عاقبت خراب کرلے بلکہ حسبِ ضرورت جتنی بات کہو وہ پوری معقولیت لئے ہوئے ہو (تاکہ کھرے لہجہ کی وجہ سے وہ کسی کو گراں بھی معلوم نہ ہو۔)

عورتوں کی آواز میں فتنہ ہے

عورتوں کی آواز میں نرمی نزاکت اور خاص قسم کی دل کشی ہوتی ہے بلکہ بہت سی آوازوں کا فتنہ تو صورتوں کے حسن وجمال سے بھی زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان کو خاص طور سے ہدایت ہوئی کہ نامحرم مردوں سے گفتگو میں نرم ودلکش لہجہ اختیار نہ کریں بلکہ مصنوعی طور سے کرختگی پیدا کریں تاکہ عدم جاذبیت کے ساتھ مزاج کا کھرا پن بھی محسوس ہو، اور یہ ان کے لئے ہے جو ضروری بات کرنے پر مجبور ہوں، ورنہ مطلقاً بات کرنے ہی سے احتراز کرنا چاہیے اور ضرورت سے زیادہ لمبی گفتگو تو کسی حالت میں بھی نہ چاہیے، اور اس کے بہت مضر اثرات تجربہ میں آچکے ہیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت کی آواز بھی عورت اور قابل ستر ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر امام کو سہو پیش آئے تو اس کو نماز کی حالت میں کسی خطرہ پر دوسرے کو متنبہ کرنا ہو وغیرہ تو مردوں کو سبحان اللہ کہنا چاہیے، اور عورتوں کو تصفیق کرنی چاہیے یعنی داہنے ہاتھ کی ہتھیلی یا انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی پشت پر ماریں اور زبان سے کچھ نہ کہیں یعنی تسبیح وغیرہ، امام بخاری وغیرہ نے مستقل باب کے تحت اس کے لئے احادیث روایت کی ہیں (تصفیق[1] سے مراد تالی بجانا نہیں ہے کہ یہ تو لہو ولعب میں داخل ہے)

ارشاد محقق عینیؒ! عورتوں کے لئے تسبیح اس لئے مکروہ ہے کہ ان کی آواز میں فتنہ ہے اس لئے ان کو اذان، امامت اور نماز میں قراءت بلند آواز سے کرنا جائز نہیں (عمدہ ۳/۷۱۲)

ارشاد حافظ ابن حجرؒ! عورتوں کو تسبیح سے روکنا اس لئے ہے کہ ان کو نماز میں آواز پست رکھنے کا حکم ہوا ہے کیونکہ ان کی آواز فتنہ کا سبب بن سکتی ہے اور مردوں کو تصفیق سے اس لئے روکا گیا کہ اس کو عورتوں کے لئے موزوں قرار دیا گیا ہے (فتح ۳/۵۰)

---

[1] علامہ شوکانی کا مغالطہ! الفتح الربانی ۴/۱۱۱ میں علامہ کا قول نقل کیا گیا کہ احادیث تصفیق نسواں امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کا رد ہونا ہے جن کے نزدیک تصفیق سے عورت کی نماز فاسد ہوجاتی ہے حالانکہ یہ نسبت غلط ہے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک عورتوں کے لئے حکم یا اجازت تصفیق ہی کی ہے صرف امام مالک سے یہ ایک روایت ہے کہ وہ بھی مردوں کی طرح تسبیح کہیں گی۔ ''مؤلف''

عورتوں کا گھر سے نکلنا

ترمذی شریف میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ عورت، عورت ہے جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کے ساتھ لگتا ہے یعنی ساری عورت قابل ستر حصہ جسم کی طرح لائق ستر ہے کہ اس کو دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہیے، پس جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اسکو پوری طرح اپنی زد میں لے لیتا ہے، اس کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ تو ملکہ حُسن ہے اور تجھ سے زیادہ کوئی حسین وجمیل نہیں ہے اور اس خیال کے قائم ہوتے ہی وہ ایسی حرکتیں کرتی ہے جن سے دوسرے لوگ۔ اس کی طرف متوجہ ہیں، مثلاً نزاکت کی چال چلنا، اٹھلانا، اور جذبہ نمائش حسن کے تحت دوسری حرکات، حالانکہ یہ سب امور حرام ہیں (التاج الجامع لااصول ۲۸۹) نیز حضرت میمونہ بنت سعد (خادمہ رسول اللہ ﷺ) نے رسول اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا کہ جو عورت اپنے شوہر کے سوا دوسرے مردوں کے لئے بن سنور کران کے سامنے جائے وہ قیامت کے دن اندھیری وظلمت کی طرح ہے جس میں ذرہ برابر بھی نور نہ ہوگا، (ترمذی شریف) چونکہ عورت کا سارا جسم قابل ستر ہے اس لئے اس کا شوہر کے سوا دوسروں کے لئے زینتوں کے ساتھ اپنے حسن وجمال کی رعنائیاں ظاہر کرنا حرام ہے (کیونکہ یہ سب صرف شوہر کے لئے درست بلکہ مستحب وموجبِ اجر وثواب بھی ہے) لہٰذا عورت کو صرف کسی ضرورت ہی سے باہر نکلنا جائز ہے وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ پوری رکھ رکھاؤ اور شرم وحیاء کا پاس ولحاظ رکھے کہ اس کی کسی حرکت اور چال ڈھال سے بھی دوسرے یہ خیال نہ کرسکیں کہ وہ ان کے برے جذبات کا شکار ہوسکتی ہے اور نہ خوشبو لگا کر نکلے نہ شوقیانہ عورتوں کے اطوار کی مشابہت کرے، کہ یہ سب باتیں خدا اور رسول خدا ﷺ کے غصہ وغضب کو دعوت دیتی ہیں۔

(فائدہ) شارحِ محدث نے مزید لکھا کہ آجکل جو عورتیں کھلے ہوئے سر، چہرے، سینے، ہاتھوں کے ساتھ اور تنگ لباسوں میں باہر نکلتی ہیں یہ شریعتِ محمدیہ کی نظر میں جرم عظیم ہے کیونکہ یہ جاہلیت کے تبرّج کی انتہا ہے، بلکہ پرلے درجہ کی بے حیائی ہے اور اُن قابل ستر اعضاءِ جسم اور مواضعِ زینت کا اظہار ہے جن کے چھپانے کا حکم دیا گیا ہے، اور ان کے مردوں پر بھی ان کے گناہوں کا بڑا حصہ ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ وہ اُن کو باہر نکلنے کی آزادی دیتے ہیں کہ جب چاہیں ضرورت بے ضرورت نکل جائیں۔ (التاج ۲/۲۹۰)

حضرت علامہ محدث ومفسر قاضی ثناءاللہ صاحبؒ نے آیت فلا تخضعن بالقول کے تحت لکھا:۔ جب ازواجِ مطہرات کی فضیلت تمام عورتوں پر ثابت ہوگئی تو ان کو یہ حکم دیا گیا کہ تقویٰ کے خلاف کوئی بات نہ کریں اور اجنبی مرد سے نرم لہجہ میں بات کرنا بھی تقویٰ کے خلاف ہے کیونکہ اس کی وجہ سے مرد کے دل میں بُرا خیال آسکتا ہے اور علامہ جوزیؒ نے نہایہ میں لکھا کہ رسول اکرم ﷺ نے مرد کو بھی ممانعت کی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے سوا کسی اجنبی عورت سے نرم لہجہ میں بات کرے، جس سے اس عورت کو اس کے بارے میں طمع پیدا ہو اور ذکر کیا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص نے دو اجنبی مرد وعورت کو دیکھا کہ باہم لطف ومحبت کے طریقہ پر بات کررہے تھے، تو اس شخص نے اس مرد کو مارا اور زخمی کردیا، حضرت عمرؓ کے پاس یہ مقدمہ گیا تو آپ نے اس کی تنبیہ کو درست قرار دیا، طبرانی میں حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس امر کی ممانعت فرمائی کہ عورتیں اپنے شوہروں کی اجازت کے بغیر کسی اجنبی شخص سے بات کریں، دارقطنی میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس کی بھی ممانعت فرمائی کہ کوئی شخص نماز کے اندر یا عورتوں کے سامنے انگڑائی لے، بجز اپنی بیوی یا باندی کے یہ بہت بڑا ادب سکھایا گیا ہے جو شارع علیہ السلام کی نہایت دقتِ نظر پر دال ہے، الذی فی قلبہ مرض کے تحت حضرت قاضی صاحبؒ نے لکھا:۔ مرض سے مراد شائبہ نفاق ہے، کیونکہ مومن کامل کا دل ایمان کی وجہ سے مطمئن ہوتا ہے اور وہ برہانِ رب کا مشاہدہ کرتا ہے، لہٰذا وہ حرام چیزوں کی طرف رغبت کر ہی نہیں سکتا البتہ جس کا ایمان کمزور ہوتا ہے تو اس کے اندر شائبہ

نفاق ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کی طرف رغبت کرتا ہے، پھر قاضی صاحبؒ نے مسئلہ لکھا کہ بظاہر کسی سے بات کرنے میں سخت لہجہ اختیار کرنا اخلاق اِسلام کے منافی ہے لیکن اس کے باوجود شریعت نے عورت کے لئے اجانب سے گفتگو کے وقت اس بداخلاقی ہی کو مستحب قرار دیا ہے تاکہ دوسری اخلاقی خرابیوں کا سدباب ہوسکے، آگے حضرت قاضی صاحبؒ نے **تبرج الجاهلية الاولىٰ** کی تشریح کی ہے کہ پہلے زمانوں میں کیسی کیسی بے حیائی اور عریانی رائج ہوتی تھی، اور شریعت نے ان جیسی چیزوں کو مسلمان عورتوں میں رائج ہونے سے روکا ہے، نیز آپ نے لکھا کہ حضرت نوح وادریس علیہم السلام کے درمیانی ایک ہزار سال کے زمانہ میں کہیں ایک قوم پہاڑوں پر بسی ہوئی تھی اور دوسری نیچے کے میدانوں میں، پہاڑی قوم کے مرد خوبصورت اور ان کی عورتیں بدصورت تھیں اور نشیبی علاقہ کی قوم کے مرد بدصورت اور عورتیں خوبصورت تھیں۔

ابلیس نے ان دونوں قوموں میں جنسی بداخلاقی پھیلانے کو یہ تدبیر کی کہ نشیبی قوم کے اندر جا کر کسی شخص کے پاس نوکری کر لی، اور پھر ایک آلہ ایجاد کر کے اس کے ذریعہ عجیب قسم کی آواز بلند کی، جس سے دور پاس کے لوگ جمع ہونے لگے اور ایک دن سال میں بطور عید کے مقرر کرادیا، جس میں پہاڑوں اور نشیبی علاقوں کے سب مرد وعورتیں جمع ہوتے عورتیں خوب بناؤ سنگھار کر کے آتیں، اور مردوں کا عورتوں کے ساتھ اختلاط ہو کر ان میں فواحش اور جنسی بداخلاقیاں خوب پھیل گئیں، اسی قسم کے جاہلی دور کے سے اختلاطِ مرد وزن اور عورتوں کے بناؤ سنگھار[1] کر کے باہر نکلنے سے شریعت نے روکا ہے (تفسیر مظہری ۳۶۸/۷)

علامہ محقق آلوسیؒ نے لکھا: نرم ودلکش لہجہ میں عورتوں کا مردوں سے گفتگو کرنا بدچلن اور پیشہ ورعورتوں کا شیوہ ہے اور یہ ممانعت کا حکم بعض علماء کے نزدیک بعض ان اجانب تک کے لئے بھی ہے جو کسی عورت کے ابدی محارم میں سے ہوں یا گویا صرف شوہر اور اس جیسے قریبی تعلق والے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، بعض امہات المومنینؓ سے مروی ہے کہ وہ کسی اجنبی سے وقتِ ضرورت بات کرتے ہوئے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا کرتی تھیں تاکہ آواز بگڑ جائے، اور کسی قسم کی نرمی ودلکشی کا شائبہ بھی نہ آئے، اور شوہر کے سوا کسی دوسرے مرد سے بات کرنے میں اکھڑ پن اختیار کرنا عورتوں کے محاسن اور خوبیوں میں سے گنا جاتا تھا، دورِ جاہلیت واسلام دونوں میں ایسا ہی تھا، جس طرح ان کا بخل وجبن بھی محاسن میں سے سمجھا جاتا تھا، اور عام طور سے اشعار میں جو معشوقہ کی تعریف آواز کی نرمی ودلکشی اور دل آویز طرزِ گفتگو کی آئی ہے، وہ گری ہوئی ذہنیت کی ترجمانی ہے (اور اگر یہی وصف اپنے شوہر اور قریبی محارم کے لئے ہو تو محمود بھی ہے)

زمانہ جاہلیت اولی کی تشریح وتفسیر میں لکھا: حضرت مقاتلؒ نے فرمایا: تبرج یہ تھا کہ عورت اپنے سر پر دوپٹہ ڈال کر چھوڑ دیتی اور اس کو آگے روکنے کا اہتمام نہ کرتی تھی جس سے گلا اور سینہ وغیرہ کھلا رہتا تھا (جیسے آج کل گلے میں ڈال کر دونوں سرے کمر پر ڈال لیتی ہیں اور اب سرڈھانکنے کا اہتمام بھی نہیں رہا حالانکہ وہ گھر کے اندر بھی بہت سے قریبی اعزہ کے سامنے شرعاً ضروری ہے)

میرد نے کہا: ممنوع تبرج یہ ہے کہ عورت اپنے حسن وزیبائش کو ظاہر کرے، جس کا چھپانا ضروری ہے حضرت لیث نے فرمایا: **تبرجت المراة** اس وقت کہا جاتا ہے کہ عورت اپنے چہرہ اور جسم کے حسن وجمال کا مظاہرہ کرے، حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا: تبرج یہ ہے کہ عورت اپنے وہ محاسن ظاہر کرے جن سے مردوں کی رغبت وشہوت ان کی طرف متوجہ ہو پھر علامہ آلوسیؒ نے نمرود کے زمانہ کا بھی ذکر کیا جس میں آبرو باختہ عورتیں باریک کپڑے پہن کر راستوں پر گھوما کرتی تھیں،

---

[1] ہمارے زمانہ میں مسلمان عورتوں کا میلوں ٹھیلوں اور نمائشوں میں شرکت کرنا بھی اسی ممانعت کے تحت آتا ہے، وہاں بے پردگی، اختلاطِ مرد وزن اور نمائشِ حسن کے ساتھ غنڈہ گردی اور فساد جھگڑے کا بھی خطرہ رہتا ہے، خصوصاً ایسی جگہوں پر جہاں مسلمانوں کے جان ومال اور عزت آبرو محفوظ نہ ہو اور دوسرے تیسرے درجہ کے شہری سمجھے جاتے ہوں، وہاں تو مردوں کو بھی احتیاط برتنی چاہیے اور عورتوں کو خاص طور سے ایسی جگہوں پر جانے سے روک دینا ضروری ہے۔ واللہ الموفق ''مؤلف''

حضرت ابوالعالیہ نے فرمایا:۔حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں نمائش حسن کرنے والی نوجوان لڑکیاں موتیوں سے تیار کی ہوئی قمیص پہنتی تھیں، جن کے دائیں بائیں جانب کے چاک کھلے ہوتے تھے تاکہ دونوں طرف سے اندر کا جسم نظر آئے آج کل ہمارے زمانہ میں برقعہ کی نقاب بھی ایسی ایجاد کی گئی ہے جس میں سے چہرہ دونوں طرف سے نظر آتا ہے اور ساتھ ہی ہاتھوں کی کلائیاں بھی کھلی رہتی ہیں، یہ دونوں باتیں بھی جاہلی تبرج کا نمونہ ہیں مبرد نے بیان کیا کہ دورِ جاہلیت[1] میں عورت شوہر اور اس کے دوست دونوں سے علاقہ رکھتی تھی، شوہر کو آدھے اسفل سے اور دوست کو آدھے اوپر کے حصہ سے تمتع کا حق حاصل ہوتا تھا (روح المعانی ۵)

حضرت عمرؓ کے سلوکِ نسواں پر نقد اور جواب

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کا بار بار حجاب کی فرضیت کے لئے اصرار امتِ محمدیہ میں فتنوں کو روکنے کے لئے کتنا ضروری و مفید تھا، اور وہ در حقیقت ہر قسم کے فتنوں کی روک کے لئے بہت ہی مضبوط و مستحکم دروازہ تھے، اور یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ عورتوں کی فطرت اور ان کی اچھائیوں برائیوں سے واقفیت میں یدطولیٰ رکھتے تھے، بعض کتابوں میں اس قسم کے جملے نقل ہوئے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو عورتوں کے معاملہ میں کوئی ہمدردی نہ تھی، یا ان کے بارے میں نظریہ سخت تھا وغیرہ یہ سب غلط فہمی ہے، جس کا ازالہ ضروری ہے، مثلاً الفاروق ۳۴۳ ۲/۱ میں لکھا:۔

"وہ ازواج و اولاد کے بہت دلدادہ نہ تھے، اور خصوصاً ازواج کے ساتھ ان کو بالکل شغف نہ تھا، اس کی وجہ زیادہ یہ تھی کہ وہ عورتوں کی جس قدر ان کی عزت کرنی چاہیے نہیں کرتے تھے وہ ان کو معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے تھے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ان کا سلوک محبت اور رحم کے پایہ پر نہ تھا جیسا اور بزرگوں کا تھا، اور اہل خاندان سے بھی ان کو غیر معمولی محبت نہ تھی"

افسوس ہے کہ علامہ شبلیؒ یہاں خلافِ تحقیق بڑے غیر ذمہ دارانہ جملے لکھ گئے ہیں، البتہ بعد کے حضرات نے ذرا سنبھال کر لکھا ہے، چنانچہ خلفائے راشدین ۱۸۱ میں لکھا:۔ "حضرت عمرؓ کو اولاد و ازواج سے محبت تھی مگر اس قدر نہیں کہ خالق و مخلوق کے تعلقات میں فتنہ ثابت ہو، اہل خاندان سے بھی بہت زیادہ شغف نہ تھا" یہ جملے حقیقت سے بہت قریب ہیں، لیکن علامہ شبلیؒ کا یہ لکھنا کہ حضرت عمرؓ کو ازواج کے ساتھ بالکل شغف نہ تھا، اور عورتوں کی عزت نہ کرتے تھے، یا ان کے ساتھ محبت و رحم کا سلوک نہ کرتے تھے، یہ سب باتیں قطعاً غلط ہیں، حضرت عمرؓ کو اگر ازدواجی زندگی سے دلچسپی نہ ہوتی تو وہ مختلف اوقات میں نو دس عورتوں سے شادی نہ کرتے اور بیک وقت کئی کئی بیویاں ان کے نکاح میں نہ ہوتیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثر بیویاں تیز مزاج بھی تھیں اور ابتداءِ اسلام میں کئی بیویوں کو اس لئے طلاق دینی پڑی کہ وہ اسلام قبول کرنے پر راضی نہ ہوئیں، اور یہ ان کی کج فطرتی کا بڑا ثبوت تھا، جمیلہ بنت ثابت ابن ابی الافلح سے ۷ھ میں شادی کی تھی جن سے عاصم پیدا ہوئے مگر ان کو بھی طلاق دینی پڑی تھی اور حضرت عمرؓ نے عاصم کو اپنے پاس رکھنا چاہا تو ان کی نانی نے جھگڑا کر کے واپس لے لیا تھا (استیعاب ۱۲/۷ ۲/) بظاہر یہ طلاق ان کے نشوز کے سبب دی ہوگی، اس کے بعد آپ کے نکاح میں کئی بیویاں تھیں جن کی آپ نے

---

[1] آج کل یورپ و امریکہ کی تہذیب قدیم دور جاہلیت سے کوسوں آگے بڑھ گئی ہے کہ ہر جنسی آوارگی حدِ جواز میں داخل ہو گئی ہے، بے حیائی کلاب و خنازیر کی طرح عام ہوگی ہے کسی شریف اور باعصمت عورت کے گھر سے باہر ہو کر باعصمت رہنا دشوار ہو گیا ہے، برطانیہ میں تو اب عورتوں کے فواحش سے آگے بڑھ کر قوم لوط والی بدترین بداخلاقی کو بھی قانونی جواز دیدیا گیا ہے اور روسی اشتراکیت نے زر زمین و زن تینوں کو متاعِ مشترک قرار دے دیا ہے، غرض دنیا کے تمام نام نہاد ترقی یافتہ ممالک شرائع و اخلاقِ نبوت کے لحاظ سے دیوالیہ بن چکے ہیں ترقی پذیر ممالک ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اب صرف پسماندہ ملکوں میں آسمانی شریعتوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں کہیں کہیں خصوصاً اسلامی ممالک میں باقی ہیں یا کچھ ان سعید روحوں پر نظر جاتی ہے جو یورپ اور امریکہ میں اسلام قبول کر کے وہاں اخلاق و علوم نبوت کی روشنی پھیلانے میں کوشاں ہیں۔ والامر بید اللہ "مؤلف"

بنتِ خارجہ سے تعبیر فرمایا تھا، صحیح مسلم و مسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ درِ دولت نبویہ پر حاضر ہوئے، پہلے سے اور لوگ بھی دروازہ پر موجود تھے جن کو باریابی کی اجازت نہ ملی تھی، حضرت ابوبکرؓ کو اجازت مل گئی، اندر گئے، پھر حضرت عمرؓ آئے، اجازت طلب کی تو ان کو بھی ملی، دونوں نے دیکھا کہ نبی اکرم علیہ السلام کے گرد آپ کی ازواجِ مطہرات بیٹھی ہیں، اور آپ غمگین خاموش بیٹھے ہیں، حضرت عمرؓ نے کہا میں ضرور ایسی بات[1] عرض کروں گا، جس سے حضور علیہ السلام کی فکر و خاموشی ختم ہو اور آپ ہنس پڑیں، چنانچہ کہا یا رسول اللہ! کاش آپ (میری بیوی) بنت خارجہ[2] کو دیکھتے کہ اس نے مجھ سے نفقہ کا مطالبہ کیا تو میں نے اس کے پاس جا کر اس کا گلا دبایا، (یعنی مرمت کر دی) یہ سن کر رسول اللہ علیہ السلام ہنس پڑے اور فرمایا ان سب کو بھی تم دیکھ رہے ہو یہ بھی مجھ سے نفقہ کا مطالبہ کر رہی ہیں، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اُٹھ کر حضرتِ عائشہؓ کا گلا دبایا اور حضرت عمرؓ اُٹھ کر حضرتِ حفصہؓ کا گلا دبانے لگے، مسند احمد میں ہے کہ دونوں حضرات، اُن دونوں کو مارنے کے لئے کھڑے ہوئے مگر حضور علیہ السلام نے روک دیا (دونوں) ان سب سے کہہ رہے تھے کہ تم رسول اللہ علیہ السلام سے ایسی چیز کا مطالبہ کر رہی ہو جو ان کے پاس نہیں ہے، انہوں نے کہا واللہ! آئندہ ہم کبھی آپ سے ایسی چیز کا سوال نہیں کریں گی جو آپ کے پاس نہ ہوگی، پھر حضور علیہ السلام نے ایک ماہ کے لئے ان سب ازواج سے علیحدگی اختیار فرمالی، اور اس کے بعد آیتِ تخییر نازل ہوئی الخ (نووی باب بیان ان تخییر امراتہ لایکون طلاقا الا بالنیۃ ۴۸۰/ اوالفتح الربانی ۲۳۶/۱)

پھر حضرت عاتکہؓ بنتِ زید سے ۱۲ھ میں شادی کی جو نہایت حسین و جمیل تھیں، ان کا پہلا نکاح حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ سے ہوا تھا، ان کی غایتِ محبت جہاد وغیرہ میں شرکت سے مانع ہوئی، تو حضرت ابوبکرؓ نے بیٹے کو طلاق کا حکم دیا، وہ راضی نہ ہوئے اور اشعار میں شکوہ کیا اور محبت کے ہاتھوں اپنی مجبوری ظاہر کی، اس پر بھی حضرت ابوبکرؓ کی رائے نہ بدلی اور طلاق پر زور دیا، انہوں نے مجبوراً طلاق دیدی اور پھر اشعار میں اپنی بے جرمی اور مظلومی کا اظہار کیا اور پھر حضرت عاتکہؓ کے محاسن بھی گنائے، اور کہا کہ میرے جیسے شخص کو اس جیسی سے چھڑایا جائے یہ بہت بڑا ظلم ہے، اس پر حضرت ابوبکرؓ کا دل نرم ہوگیا اور مراجعت کی اجازت دے دی، اس کے بعد حضرت عبداللہؓ غزوۂ طائف میں شہید ہوگئے اور حضرت عاتکہؓ نے نہایت فصیح و بلیغ اشعار میں ان کا مرثیہ کہا، اس میں یہ بھی قسم کھائی کہ میں آخر دم تک تمہارا غم کرتی رہوں گی، اس کے بعد حضرت عمرؓ کے بھائی حضرت زید بن الخطابؓ سے ان کا نکاح ہوا، وہ یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے تو تیسرا نکاح حضرت عمرؓ سے ہوا۔

لطیفہ! دعوتِ ولیمہ میں اکابر صحابہ مدعو تھے، حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے ایک بات کہنے کی اجازت لے کر حضرت عاتکہؓ کو پردہ کے پیچھے سے کہا کہ تمہیں وہ شعر بھی یاد ہے جس میں وہ قسم کھائی تھی، یہ سن کر وہ حضرت عبداللہ کو یاد کر کے رونے لگیں، حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: آپ کو اس موقع پر اُس بات کے یاد دلانے کی کیا سوجھی؟ پھر فرمایا ساری ہی عورتیں ایسا کہتی اور کیا کرتی ہیں، اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کی شہادت ہوئی ان کا بھی بڑا صدمہ کیا، روئیں اور بہت دردناک فصیح و بلیغ مرثیہ کہا، اس کے بعد ان کا چوتھا نکاح حضرت زبیر بن العوام سے ہوا ہے اور ان دونوں کے ساتھ مسجد میں جا کر نماز ادا کرنے پر اختلاف کا قصہ کتاب التمہید میں ذکر ہوا ہے، پھر حضرت زبیر شہید ہوئے تو ان کا مرثیہ بھی کہا ہے ان سب مرثیوں کے چند چند شعر استیعاب میں نقل کئے گئے ہیں، پھر حضرت علیؓ نے بھی نکاح کا پیام دیا تھا، مگر حضرت عاتکہؓ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ اے رسول اکرم علیہ السلام کے چچازاد بھائی! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ بھی شہید نہ ہوں، یعنی جس طرح اور سب میرے شوہر شہید ہوئے ہیں اور آپ کی اس وقت امت کو بڑی ضرورت ہے۔ (استیعاب ۷۴۷/۲)

---

[1] علامہ نوویؒ نے لکھا کہ ایسے وقت کسی کا غم غلط کرنے اور اس کو خوش کرنے کا استحباب معلوم ہوا، نیز اس سے حضرت عمرؓ کی فضیلت بھی نکلتی ہے۔

[2] مطبوعہ الفتح الربانی میں بنت خارجہ کی جگہ بنت زید امراۃ عمر ہے، بظاہر صحیح بات صحیح مسلم ہی کی ہے کیونکہ بنت زید (عاتکہ) سے حضرت عمرؓ کا نکاح ۱۲ھ میں (وفاتِ نبوی کے بعد) ہوا ہے۔

جس قصّہ کی طرف اوپر اشارہ ہوا وہ یہ ہے کہ حضرت عاتکہؓ مسجد نبوی میں جا کر نماز باجماعت پڑھنے کی عادی تھیں، جس کو حضرت عمرؓ پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ وہ عورتوں کے لئے گھروں میں رہنے کو ہی بہتر سمجھتے تھے اور حضور علیہ السلام نے چونکہ ایک دفعہ یہ فرمایا تھا کہ اللہ کی بندیوں کو مسجدوں کی نماز سے نہ روکو، اس ارشاد سے حضرت عاتکہؓ فائدہ اٹھاتی تھیں، حالانکہ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمادیا تھا کہ عورتوں کی نماز گھروں میں زیادہ بہتر ہے حتی کہ مسجد نبوی کی نماز سے بھی، معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ حجابِ نسواں کے بارے میں بہت سخت تھے، اور عورتوں کی فطرت جانتے تھے کہ ان کا پاؤں گھر سے نکلا تو پھر رُکنے والا نہیں، ساتھ ہی زمانہ کے فساد سے بھی واقف تھے کہ دن بدن اخلاقی گراوٹ بڑھ رہی ہے، یہ بھی جانتے تھے کہ پہلے زمانہ میں بنی اسرائیل کی عورتوں کو بھی مساجد کی نماز سے روک دیا گیا تھا، ان سب حالات میں ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عاتکہؓ کے مسجد آنے جانے کو کتنا کچھ ناپسند کیا ہوگا، مگر حضور علیہ السلام کے ارشاد مذکور کی ظاہری مخالفت بھی کسی طرح گوارہ نہ تھی اس لئے اس کو حکماً روک دینا پسند نہ کرتے تھے اور حضرت عاتکہؓ کہتی تھیں کہ آپ مجھے حکم دیں گے تو میں رُک جاؤں گی، پھر یہی صورت بعد کو حضرت زبیرؓ کو بھی پیش آئی ہے کہ وہ بھی حضرت عاتکہؓ کا مسجد جانا پسند نہ کرتے تھے اور وہ جاتی تھیں اور یہی کہتی تھیں کہ آپ حکم دیں گے تو رُک جاؤں گی۔

اس قصہ سے واضح ہوا کہ حضرت عمرؓ عورتوں کے معاملہ میں بہت زیادہ حلیم تھے کہ اپنی ذاتی رائے ورجحان کے خلاف حضرت عاتکہؓ کا مسجد جانا گوارہ کیا، حالانکہ حضرت عاتکہؓ کا استدلالی پہلو نہایت کمزور تھا، اور یوں بھی نوافل ومستحباب کے عمل وترک میں شوہر کا اتباع شرعاً مطلوب ہے (صرف فرائض وواجبات کے خلاف شوہر کا اتباع درست نہیں) اور مسجد میں جانا تو فرض وواجب کیا مستحب کے درجہ میں بھی نہ تھا پھر بھی حضرت عمرؓ ایسے بااصول اور باوقار شوہر کے مقابلہ میں اپنی مرضی کا کام کرتے رہنا، اس امر کی بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ دوسرے صحابہ سے زیادہ عورتوں کے معاملے میں نرم اور رحم دل تھے، جبکہ ان کی سختی اور تشدد ہر معاملہ میں مشہور ومعروف ہے۔

ان کے علاوہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی ام کلثوم کو بھی پیام دیا تھا، جو حبیبہ بنت خارجہ کے بطن سے تھیں، مگر انہوں نے قبول نہ کیا اور کہا کہ حضرت عمرؓ بڑے غیرت والے اور معاشی تنگی کے ساتھ گزارہ کو پسند کرنے والے ہیں، حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا تو ان کا خیال چھوڑ دیا (استیعاب ۱۵۷/۴)

دوسری ام کلثوم نامی حضرت علیؓ وحضرت فاطمہؓ کی صاحبزادی تھیں، ان کے لئے حضرت علیؓ کے پاس پیام بھیجا تو انہوں نے صغرسنی کا عذر کر کیا، آپ نے فرمایا، میں خاندانِ نبوت سے قریبی تعلق پیدا کرنا چاہتا ہوں، اور جتنی قدر وعزت میں ان کی کرسکتا ہوں، دوسرا نہیں کرے گا حضرت علیؓ نے فرمایا میں اس کو تمہارے پاس بھیجوں گا، اگر تمہیں پسند ہو تو میں نے نکاح کردیا، پھر ایک چادر دے کر بھیجا اور کہا حضرت عمرؓ سے کہنا کہ یہ چادر ہے جس کے لئے میں نے آپ سے کہا تھا، حضرت ام کلثومؓ نے وہی بات جا کر کہہ دی، حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم جا کر حضرت علیؓ سے کہہ دینا کہ میں راضی ہوں اور چونکہ پسندیدگی کی شرط پر حضرت علیؓ کی طرف سے نکاح کی منظوری ہو چکی تھی، حضرت عمرؓ نے بیوی بن جانے کے سبب سے بے تکلفی کی بات کی تو ان کو ناگوار ہوئی، اور جا کر حضرت علیؓ سے شکایت کی، انہوں نے سب قصہ سُنایا اور کہا کہ تم ان کی بیوی ہو چکی ہو، پھر حضرت عمرؓ نے اکابر صحابہ کو بلا کر اس واقعہ سے مطلع کیا اور فرمایا کہ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا قیامت کے دن ہر نسب وسبب منقطع ہو جائے گا بجز میرے نسب وسبب اور دامادی رشتہ کے، تو میرا نسب وسبب تو حضور سے متصل تھا ہی، چاہا کہ دامادی رشتہ بھی ملحق کرلوں، اس پر سب نے آپ کو مبارک باد دی، آپ نے مہر چالیس ہزار درہم مقرر کیا تھا (استیعاب ۷۷۲/۲)

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں بھی عورتوں کے تفقدِ احوال اور خبر گیری کا پورا حق ادا کیا ہے اور کتنی ہی بیواؤں کے گھر جا جا کر ان کے کام اور ضرورتوں کا خیال کیا کرتے تھے، پھر یہ کہنا کہ کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ وہ عورتوں کی عزت نہیں کرتے تھے، یا ان کا سلوک محبت ورحم کے پایہ نہ تھا،

علامہ شبلی کے استدلال پر نظر

علامہؒ نے آگے بڑھ کر اپنے استدلال میں جو بخاری کی حدیث باب اللباس (۸۶۸) کی پیش کی ہے وہ اس وقت ہمارے سامنے ہے، افسوس ہے کہ کئی جگہ عبارت کا ترجمہ غلط کیا ہے اور پوری بات بھی پیش نہیں کی ہے، جس سے مغالطہ لگتا ہے آپ نے لکھا کہ خود حضرت عمرؓ کا قول بخاری میں مذکور ہے پھر ترجمہ اس طرح کیا:۔ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے، جب قرآن نازل ہوا، اور اس میں عورتوں کا ذکر آیا تو ہم سمجھے کہ وہ بھی چیز ہیں حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ جب اسلام آیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا تو ہم نے اس کے ذریعہ ان کے حق کو سمجھا بوجھا جو ان کا ہم پر ہے بغیر اس کے کہ اپنے معاملات میں بھی ان کو دخل دیں یعنی اسلامی ہدایات کی روشنی میں ہم نے ان کے حق و مرتبہ کو پہچان لیا، پھر بھی یہ حق ہم پر عائد نہیں ہوا کہ اپنے دوسرے معاملات میں سے بھی کسی امر میں ان کو دخیل کریں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کوئی چیز ہیں کسی موجودہ لفظ کا ترجمہ نہیں ہے اور اس کو علامہؒ نے اپنی طرف سے لکھ دیا، اور جو لفظ حدیثِ بخاری میں ہیں وہ بہت اہم اور معنی خیز ہیں، چنانچہ آگے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ (اس کے بعد) کسی معاملہ میں میری اپنی بیوی سے کچھ بات ہوئی تو وہ سخت کلامی سے پیش آئی، میں نے اس پر کہا کہ اوہو! تم اتنی دور تک پرواز کرنے لگیں!

اس نے کہا کہ تم مجھ سے ایسا کہتے ہو حالانکہ تمہاری بیٹی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچاتی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا میں اتنا سن کر حفصہؓ کے پاس گیا اور اس سے کہا میں تجھے خدا اور خدا کے رسول کی نافرمانی کے بُرے انجام سے ڈراتا ہوں اور ایذاءِ نبوی سے گھبرا کر سب سے پہلے حفصہؓ ہی کے پاس پہنچا تھا (دوسرا مطلب تقدمت الیھا فی اذاہ کا علامہ محدث عینیؒ نے یہ بیان کیا کہ میں نے غصہ کے عالم میں حفصہ کی بابت سنی ہوئی بات پر اس کو مار پیٹ وغیرہ کی سزا بھی دینی چاہی، عمدہ ۲۰/۲۲ حافظؒ نے یہاں اس اہم جملہ کی کچھ شرح نہیں کی)

ترجمہ کی غلطی! علامہؒ نے ترجمہ یہ کیا کہ "ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو سخت کہا، انہوں نے بھی برابر کا جواب دیا" حالانکہ حدیث سے سخت کلامی کا صدور حضرت عمرؓ کی بیوی کی طرف سے ثابت ہوتا ہے، پھر یہ کہ حضرت عمرؓ نے تو اسلام سے پہلے کی بات بتلائی تھی اور وہ بھی صرف اپنی نہیں بلکہ سب ہی کے متعلق بتلایا تھا کہ پہلے ہم عورتوں کا کچھ حق و مرتبہ نہ سمجھتے تھے، اور اسلام کے بعد سمجھے، تو اس بات کو حضرت عمرؓ کے خلاف استدلال میں پیش کرنے کا کیا جواز ہے، دوسرے یہ کہ حضرت عمرؓ کے ارشاد مذکورِ بخاری سے معلوم ہوا کہ اسلام کے بعد عورتوں کا حق و مرتبہ تو مان لیا گیا، لیکن مردوں کے دوسرے معاملات میں دخل دینے کا ان کو حق حاصل نہ ہوا تھا، پھر کسی معاملہ میں ان کے دخل دینے اور گفتگو میں سخت کلامی پر اُتر آنے کا جواز تو کسی طرح بھی نہ تھا، دوسرا واقعہ علامہ شبلیؒ نے موطا امام مالکؒ سے حضرت جمیلہ کے مطلقہ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کا اپنے بچہ عاصمؓ کو گھوڑے پر اپنے ساتھ سوار کر کے قبا سے مدینہ منورہ لے آنے کا لکھا ہے یہاں بھی عاصم کی ماں کو خبر ہونا اور مزاحم ہونا غلط ترجمہ کیا ہے، کیونکہ حضرت عاصم کی نانی نے مزاحمت کی تھی، ماں نے نہیں اور جھگڑے کے طول کھینچنے کی بات بھی اضافہ قصہ صرف اتنا ہے کہ حضرت عمرؓ قبا گئے تھے صحنِ مسجد قبا میں عاصم کھیل رہے تھے جو ۴ یا ۶ سال کے تھے، حضرت عمرؓ نے پدری شفقت کی وجہ سے ان کا بازو پکڑ کر گھوڑے پر سوار کر لیا، نانی نے چاہا کہ اپنے ساتھ رکھیں، انہوں نے اور حضرت عمرؓ نے خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے یہاں مرافعہ کیا اور ہر ایک نے اپنا پرورش کا حق جتلایا، آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ بچہ نانی ہی کو دے دو، حضرت عمرؓ نے اس پر کوئی رد و کد نہیں کیا امام مالکؒ نے اس پر فرمایا کہ میں بھی یہی مسلک اختیار کرتا ہوں کہ باپ کے مقابلہ میں پرورش کا حق نانی کو زیادہ ہے۔ (زرقانی ۳ ۷/۴)

شارح موطا محدث زرقانیؒ نے فما راجعه عمر في الكلام کا مطلب لکھا کہ حضرت عمرؓ نے حق بات کو مان کر بچہ نانی کو دے دیا، علامہ شبلیؒ نے لکھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے خلاف فیصلہ کیا اور اس لئے وہ مجبور رہ گئے، معلوم نہیں یہ مجبوری کی بات کہاں سے نکال لی گئی؟

یہ بھی شارحِ مذکور نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ سے طلاق ملنے کے بعد حضرت جمیلہ نے یزید بن جاریہ سے شادی کر لی تھی، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ اس لئے بھی حضرت عمرؓ اپنے بچہ کو ساتھ رکھنا چاہتے ہوں کیونکہ دوسرے عقد کے بعد پہلے بچہ کی ماں کی توجہ عام طور سے کم ہو جایا کرتی ہے اگر چہ شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے، اور شرعاً بہر صورت بچہ کی پرورش کا حق پہلے ماں اور پھر نانی کا ہی مقدم ہے، البتہ لڑکا سات سال کا ہو جائے گا اور لڑکی سیانی یا نو سال کی تو باپ ان کو لے سکے گا، یعنی اس عمر کے بعد ماں اور نانی کو اپنے پاس رکھنے کا حق ختم ہو جاتا ہے، وغیرہ (کتاب الفقہ ۵۹۸/۴)

ممکن ہے ہمارا مذکورہ ریمارک کچھ طبائع پر گراں ہو، یا ہماری اس جسارت کو خطاءِ بزرگاں گرفتن کا مصداق سمجھیں اس لئے گزارش ہے کہ بخاری اور موطا امام مالکؒ کی عبارت سامنے رکھ کر فیصلہ کریں تو بہتر ہے، ہم خدانخواستہ علامہ شبلیؒ کی اہم علمی، مذہبی و تاریخی خدمات کے منکر ہرگز نہیں ہیں بلکہ ان کی پوری وسعتِ قلب کے ساتھ قدر کرنے والوں میں سے ہیں، جزاہم اللہ خیر الجزاء، لیکن غلطی تو جس کی بھی اور جو بھی ہو اس کی نشاندہی کرنی ہی پڑے گی اگر ہم حضرت عمرؓ ایسی ملّت کی عظیم ترین اور جامع کمالات شخصیت کو بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر گرا دیں گے تو امت کی مثال بے ستون قلعہ کے ہو جائیگی، اگر ہماری دماغی سانچے اور زاویے، صحابہ و سلف کے دماغی سانچوں اور زاویوں سے مختلف ہیں اور ہم ان کے فکر و نظر کے تابع و مطابق ہو کر نہیں بلکہ مخالف طریقے پر سوچتے سمجھتے ہیں اور اسی لئے ان پر تنقید کی راہ اپناتے ہیں تو یہ دین و علم کی صحیح خدمت نہیں ہو سکتی، وہی بات اب ترقی کر کے صحابہ و سلف پر تنقیدی بحث کھولنے کا بڑا سبب بن گئی ہے، اور شیعی بھائیوں کی طرح سے سُنّی بھی نیم تبرائی بننے کے قریب ہو گئے ہیں۔

صحابہ کرام معیارِ حق ہیں یا نہیں؟

آج کل یہ بحث بہت چل رہی ہے حالانکہ نہ کبھی پہلے زمانہ میں صحابہ کے اقوال و افعال کو قرآن مجید و حدیث کے درجہ میں رکھا گیا اور نہ اب کوئی سمجھتا ہے لیکن صحابہ و سلف کے تعامل کو نظر انداز بھی کبھی نہیں کیا گیا اور نہ صحابہ پر تنقید کا دروازہ کھولا گیا، پھر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ خود رسولِ اکرم ﷺ نے خلفائے راشدین اور خاص طور سے حضرت ابوبکر و عمرؓ کے طریقہ کی پیروی کا حکم دیا ہے اور اپنے سارے صحابہ کو عدول فرمایا، لیکن بعض حضرات نے کسی معاملہ میں اپنی رائے کے خلاف دیکھا تو اکابر صحابہ کو بھی تنقید سے نہ بخشا اس کی مثالیں بہت ہیں لیکن موضوعِ بحث کی مناسبت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ کی ہوا سے متاثر ہو کر معاملہ نسواں میں مساواتِ مرد و زن کا نظریہ اپنا کر اور اس کو اسلامی نظریہ قرار دے کر امیر المومنین حضرت عمرؓ تک کے طرزِ عمل کو مجروح بنا کر پیش کیا گیا ہے اور اس کیلئے احادیث کا ترجمہ تک غلط طرز میں پیش کیا ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے، اس کے بعد علامہ ابوالکلام آزاد آئے تو انھیں یہ امر نہایت ناگوار تھا کہ عورتوں کی طرف اخلاقی کمزوریوں یا کید و مکر وغیرہ کی نسبت کی جائے، اور اپنے خاص نظریہ کو قرآن مجید کی سورۂ یوسف کی تفسیر خصوصاً آخری طویل نوٹوں میں لکھ کر احقاقِ حق کا نمونہ دے گئے یعنی جس سورت کا بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ ایک نہایت پاکباز مرد، عورت کے مکر و کید کے جال میں گرفتار ہو کر کیسی کیسی سخت آزمائشوں سے گزر سکتا ہے اور سبق دیا گیا تھا کہ مرد کو ہر حالت میں ثابت قدم رہنا ضروری ہے، اسی کی تفسیر میں یہ بتلانا ضروری سمجھا کہ قرآن مجید کی رو سے کسی وصف میں بھی مرد و عورت کی تفریق نہیں، نہ کسی وصف میں کسی کو دوسرے پر فضیلت ہے دونوں میں اخلاقی مساوات موجود ہے اور اگر تفریق ہی کرنی ہے تو نفس پرستیوں اور مکاریوں کی حیوانیت مرد کے حصّہ میں آئے گی اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی عورت کے لئے ثابت ہوگی، فی الحقیقت سب سے بڑا کید تو مرد ہی کا کید ہے جو پہلے اس کا مجوئیوں کا آلہ بناتا ہے اور جب بن جاتی ہے تو خود پاک بنتا اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ اس معصوم کے سر ڈال دیتا ہے، دنیا میں کوئی عورت بُری نہ ہوتی اگر مرد اسے بُرا بننے پر مجبور نہ

کرتا، عورت کی بُرائی کتنی ہی سخت اور مکروہ صورت میں نمایاں ہوتی ہو، لیکن اگر جستجو کرو گے تو تہ میں ہمیشہ مرد ہی کا ہاتھ دکھائی دے گا، اور اگر اس کا ہاتھ نظر نہ آئے تو ان برائیوں کا ہاتھ ضرور نظر آئے گا، جو کسی نہ کسی شکل میں اس کی پیدا کی ہوئی ہیں (ترجمان ۲۶۶/۲) کیا علامہ مرحوم کے معتقدین و مستفیدین میں سے کوئی صاحب جستجو کر کے بتلا سکتے ہیں کہ سورۂ یوسف کے واقعہ میں مرد کا ہاتھ کسی کو دکھائی دیا گیا یا نہیں، اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو ایسے بے معنی لمبے لمبے دعووں سے آخر کیا فائدہ نکلا؟

آگے علامہ مرحوم نے ایک دوسری خلش کو بھی دور کر دیا اور لکھا:۔ تورات میں ہے کہ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی ترغیب حضرت آدم علیہ السلام کو حضرتِ حواؑ نے دی تھی، اس لئے نافرمانی کا پہلا قدم جو انسان نے اٹھایا وہ عورت کا تھا، اور اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہوگیا کہ عورت کی خلقت میں مرد سے زیادہ برائی اور نافرمانی ہے اور وہی مرد کو سیدھے راستے سے بھٹکانے والی ہے، لیکن قرآن نے اس قصّہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی، بلکہ ہر جگہ اس معاملہ کو آدم و حواء دونوں کی طرف منسوب کیا۔

اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ یہ ان حضرات کا عجیب حال ہے کہ جہاں ضرورت دیکھتے ہیں صرف قرآن مجید کا ذکر کر کے بات ختم کر دیتے ہیں، اور احادیث یا آثارِ صحابہ و سلف سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں، حالانکہ مولانا آزاد مرحوم تو اہلِ حدیث تھے اہل قرآن یا چکرالوی نہ تھے لیکن یہ دیکھا گیا کہ فقہاء و مجتہدین خصوصاً امام اعظم کا مسلک گرانے کے لئے تو حدیث سامنے کو دیتے ہیں اور جب نئے لوگوں کے سامنے کوئی خاص جدید نظریہ پیش کرتے ہیں تو صرف قرآن مجید کا حوالہ دیتے ہیں، یہاں شجرِ ممنوعہ والی اوپر کی بات صرف تورات سے نہیں بلکہ حدیث سے بھی ثابت ہے، جس کی روایت مشہور مسلم مفسر و محدث حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں علامہ محدث ابن جریرؒ کے واسطہ سے نقل کی ہے، اور یہ دونوں مفسر و محدث وہ ہیں جن کی توثیق و برتری کے مولانا آزاد بھی قائل تھے، اور آپ نے مقدمہ تفسیر ترجمان القرآن میں ان کے مقابلہ میں دوسرے مفسرین کو مرتبہ اعتبار سے گرانے کی بھی سعی فرمائی ہے، یہ رعایت حضرت ابن عباسؓ سے اس طرح ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے شجرہ ممنوعہ کا پھل کھالیا تو حق تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوا کہ تم نے باوجود میری نہی و ممانعت کے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ حواء نے مجھے اس پر آمادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کے لئے سزا یہ ہے کہ حمل و وضع میں تکلیف اٹھائے گی، چنانچہ وہ اس تکلیف کے وقت روئیں اور کراہیں تو ان کو کہا گیا کہ یہ رونا کراہنا نہ صرف تمہارے لئے بلکہ تمہاری اولاد کے لئے بھی ہوگا (تفسیر ابن کثیر ۲۰۶/۲ و تفسیر مظہری ۵۷/۱) یہ روایت بھی بخاری و مسلم کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت نہ سڑا کرتا اور حضرت حواء نہ ہوتیں تو کبھی کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی (مشکوٰۃ ۲۸۰ باب عشرۃ النساء) بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ من و سلویٰ کا ذخیرہ نہ کریں۔

مگر انہوں نے خدا پر بھروسہ نہ کیا اور گوشت سڑنے لگا، یہ ان کی نافرمانی کی سزا تھی ورنہ اس سے پہلے نہ سڑتا تھا اور حضرت حواءؑ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ترغیب دے دے کر شجرۂ ممنوعہ کھانے پر آمادہ کیا، اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر کو غلط کام کے لئے آمادہ نہ کرتی (مرقاۃ)

مولانا کا استدلال اس سے بھی ہے کہ قرآن مجید نے اس معاملہ کو دونوں کی طرف منسوب کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ نافرمانی دونوں نے کی، اس لئے دونوں کی طرف اس کو منسوب ہونا ہی تھا، اس سے اس امر کی نفی کیسے نکل آئی کہ شیطان نے ورغلانے کی کوشش تو دونوں کے لئے کی مگر پہلے حضرت حواء متاثر ہوئیں اور انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی متاثر کر کے آمادہ کر لیا ہوگا، جیسا کہ اب بھی بیویوں کے ذریعہ شوہروں کو کسی کام کے لئے آمادہ کرنے کی مہم سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور جو کام مردوں کے ذریعہ انجام نہیں پاتے بہت آسانی سے عورتوں کے وسیلہ سے مردوں کو ان کے لئے ہموار کر لیا جاتا ہے۔

آخر میں مولانا نے لکھا:۔ بہرحال! یہ بات یاد ہے کہ سورۂ یوسف کی اس آیت سے جو استدلال کیا جا رہا ہے وہ قطعاً بے اصل ہے اور جہاں تک عورتوں کے جنسی اخلاق کا تعلق ہے قرآن مجید میں کہیں کوئی ایسی بات موجود نہیں ہے جس سے مترشح ہوتا ہو کہ عورت کی جنس مرد سے

فروتر ہے یا بے عصمتی کی راہوں میں زیادہ مکاراور شاطر ہے (ترجمان ۲/۲۶۷)

عرض ہے کہ اگر سورۂ یوسف کے قصہ سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ عورت بے عصمتی کی راہوں پر چل پڑے تو اس کے کید ومکر کے جال سے کوئی فرشتہ یا نبی معصوم ہی بچ سکتا ہے تو بچے دوسرے عام مردوں کا کام نہیں، تو یوں کہیے کہ دنیا میں کوئی بات بھی ثابت نہیں کی جاسکتی۔

جس جنسِ لطیف کے مکر وکید کی بے پناہ اور بھیانک دارو گیر کا یہ عالم ہو کہ اس سے سخت گھبرا کر حضرت یوسف علیہ السلام جیسا آہنی عزم وحوصلہ والا جلیل القدر پیغمبر بارگاہِ خداوندی میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہو گیا ہو کہ اے میرے رب! قید وبند کی مصیبت میں مبتلا ہو جانا میرے لئے اُس عمل سے ہزار جگہ زیادہ عزیز وپسندیدہ ہے جس کی طرف وہ مجھے بلا رہی ہیں اور اگر آپ نے (میری مدد نہ کی اور) ان عورتوں کی مکاریوں کے دام سے نہ بچایا تو عجب نہیں کہ میں ان کی طرف جھک پڑوں اور جاہلوں کی طرح غلط روش کا شکار ہو جاؤں، اس پر حق تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دعاءِ مذکور قبول فرمالی اور ان عورتوں کی مکاریاں دفع کر دیں، بیشک وہی سب کی سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے کیا اس کے باوجود صاحبِ ترجمان کا اوپر کا دعویٰ کسی طرح بھی صحیح ہو سکتا ہے؟!

اگر یہ کوئی اچھا وصف ہے کہ آدمی اپنے خداداد زورِ تقریر وتحریر سے سیاہ کو سپید اور سپید کو سیاہ ثابت کر دے تو ہمیں اس اعتراف میں تامل نہیں کہ مولانا آزاد میں یہ وصف موجود تھا، واللہ المستعان!

مولانا مودودی! ہم اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ مساواتِ مرد وزن کے اصول کو علامہ مودودی بھی اپنائے ہوئے ہیں وہ بھی نہیں چاہتے کہ عورتوں کی کسی سرشت یا عادت کو بُرا کہا جائے، حالانکہ ہم اگر مردوں کی بہت سی بُری عادات خصائل واخلاق کے اقرار واعتراف سے گریز نہیں کرتے تو چند باتیں صنفِ نازک میں بھی کمزوریِ اخلاق اور برائیاں اگر موجود ہیں تو ان کی تسلیم سے انکار کیوں ہو، بلکہ کسی بُرائی کی اصلاح جب ہی ہو سکتی ہے کہ ہم اس کا وجود تو پہلے تسلیم کر لیں ابھی جس حدیث اکل شجرہ ممنوعہ والی کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے، اس کے بارے میں علامہ مودودی عم فیضہم کا ریمارک بھی ملاحظہ کرتے چلیئے!

''عام طور پر یہ جو مشہور کیا گیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حواء کو دامِ فریب میں گرفتار کیا، اور پھر انھیں حضرت آدم علیہ السلام کو پھانسنے کے لئے آلہ کار بنایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے، اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور دونوں اس سے دھوکا کھا گئے، بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حواء کے متعلق اس مشہور روایت نے دنیا میں عورت کے اخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبے کو گرانے میں کتنا زبردست حصّہ لیا ہے، وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر وقیمت سمجھ سکتے ہیں'' (تفہیم القرآن ۲/۱۶)

مولانا آزاد نے کچھ احتیاطی الفاظ استعمال کئے تھے کہ قرآن مجید نے اس قصّہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی لیکن علامہ مودودی نے آگے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کر دیا ہے کہ قرآن مجید اس کی تردید کرتا ہے اور دلیل تردید کی بھی وہی ہے جو عدم تصدیق کی ہے، دونوں کی طرزِ بیان کا معنوی فرق اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں۔

معلوم نہیں علامہ مودودی بدء الحیض والی اس حدیث کیلئے کیا توجیہ کریں گے جس کو حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۵۷/۲۷۱ میں حضرت ابن مسعودؓ وحضرت عائشہؓ سے سندِ صحیح نقل کیا کہ بنی اسرائیل کی عورتیں بھی مردوں کے ساتھ مساجد میں نماز باجماعت کے لئے جایا کرتی تھیں، عورتوں نے یہ کیا کہ نماز کے وقت میں مردوں کی طرف تاک جھانک لگانی شروع کر دی، جس کی سزا میں ان پر اللہ تعالیٰ نے حیض کی عادت مسلط کر دی اور مساجد کی حاضری سے روک دیا، کیا اس حدیثِ صحیح سے بھی عورتوں کی خلاقی گراوٹ ثابت نہیں ہوتی، اور کیا اس سے بھی انکار کیا جاسکتا ہے کہ بیشتر انبیاء علیہم السلام کو عورتوں کی طرف سے ابتلاء پیش آئے ہیں اور ان کے قصّے قرآن مجید اور احادیث صحاح وسیر سے ثابت ہیں۔

الرجال قوامون کی تفسیر! بڑی حیرت ہے کہ مولانا آزادؒ اور علامہ مودودیؒ نے آیتِ قرآنی ''الرّجال قوامون علی

النساء کی تفسیر میں بھی ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ان کے مزعومہ نظریہ مساواتِ مردوزن پر کوئی زد نہ پڑ سکے، اور وہ مردوں کے لئے عورتوں پر حاکمیت وافضلیت کا مرتبہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں، مولانا آزاد نے تو فضیلت جزئی والا گھماؤ دیا ہے اور علامہ نے فرمایا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے فضیلت سے شرف، کرامت وعزت کا ارادہ نہیں فرمایا[۱] ہے یہ مطلب فضیلت والا تو ایک عام اُردو خواں لے گا، یہاں مطلب (اعلیٰ قابلیت والوں کے نزدیک یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک جنس کو طبعاً الگ الگ خصوصیت عطا کی ہیں، اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد قوام ونگہبان ہونے کی اہلیت رکھتا ہے، اور عورت فطرتاً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت وخبر گیری کے تحت رہنا چاہیے (تفہیم القرآن ۳۴۹/۱) گویا خانگی نظام چالو رکھنے کے لئے ایسی تقسیم کار کردی گئی ہے، اس کا تعلق کسی کی کسی پر فضیلت وشرف وغیرہ سے کچھ نہیں۔

گزارش ہے کہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری ۷۸۳ میں مستقل باب آیت الرجال قوامون علی النساء پر قائم کرکے نبی اکرم ﷺ کے ایلاء والی حدیث روایت کی ہے، اور حافظ نے وجہ مطابقت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ امام بخاریؒ کا مطمح نظر اگلی آیات **فعظوهن واهجروهن في المضاجع واضربوهن** ہیں کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اور ان کو عورتوں پر فضیلت بھی ہے، اگر عورتیں کسی بداخلاقی کا مظاہرہ کریں تو مردوں کو نصیحت کرنے تنبیہ کرنے اور مارنے تک کا بھی حق حاصل ہے، اگر صرف صلاحیتِ کار کے تحت تقسیم کار کی بات تھی اور حاکمیت وافضلیت کا تعلق کچھ نہ تھا تو تنبیہ وغیرہ کے یکطرفہ اختیارات مردوں کو دے دینا کیا مناسب تھا؟!

شانِ نزول! حافظ ابن کثیرؒ اور صاحبِ روح المعانی نے حضرت مقاتل اور حسن بصری وغیرہ سے روایت نقل کی کہ سعد بن الربیع جو فقہاء میں سے تھے، ان کی بیوی حبیبہ بنت زید ابی زہیر نے نافرمانی کی تو شوہر نے تھپڑ مار دیا اور وہ اپنے باپ کو لے کر حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں گئیں باپ نے کہا کہ میں نے اپنی نورِ نظر اس کے نکاح میں دی تھی، اس نے ایسا کیا، آپ نے فرمایا یہ جا کر اس سے بدلہ لے، وہ اپنے باپ کے ساتھ لوٹی کہ (نظریہ مساواتِ مردوزن کے تحت) شوہر سے بدلہ لے گی۔ اتنے ہی میں وحی آ گئی اور حضور علیہ السلام نے ان باپ بیٹی کو بلا کر فرمایا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ آیت نازل کی ہے "الرجال قوامون علی النساء" پھر فرمایا کہ ہم نے کچھ ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے دوسری بات چاہی اور جو کچھ اس نے چاہا وہی بہتر ہے (ابن کثیر ۴۹۱ وروح المعانی ۲۳/۵)

جنس رجال کی فضیلت

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر ۴۹۱/۱ میں لکھا کہ مرد کے قیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کا رئیس، کبیر وحاکم ہے اور اگر وہ ٹیڑھی چلے تو تادیباً سزا بھی دے سکتا ہے کیونکہ وہ عورت سے بہتر ہے اور افضل ہے اور اسی لئے نبوت اور بڑی بادشاہت مردوں کے لئے خاص کی گئی، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جو عورت کو اپنا والی وحاکم مقرر کرے۔ (بخاری شریف)

اسی طرح منصبِ قضاء وغیرہ بھی صرف مردوں کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ وللرجال علیهن درجة (مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ[۲] (فضیلت وفوقیت کا) دیا گیا ہے) حضرت علامہ عثمانیؒ نے لکھا:۔ یعنی یہ امر تو حق ہے کہ جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں جن کا قاعدہ کے موافق ادا کرنا ہر ایک پر ضروری ہے تو اب مرد کو عورت کے ساتھ بدسلوکی یا اس کی حق تلفی ممنوع ہوگی، مگر یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت اور فوقیت ہے تو اس لئے رجعت میں اختیار مرد ہی کو دیا گیا۔ (۴۵)

---

[۱] اس پر حیرت نہ کیجئے کہ ایک عالم کس طرح ایسی بات لکھ سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے فضیلت کا لفظ بول کر بھی فضیلت وشرف کا ارادہ نہیں کیا بلکہ ایسے معنی مراد لئے ہیں جن سے فضیلت کی نفی ہو سکتی ہے۔ "مؤلف"

[۲] اس پر کوئی وضاحت نوٹ نہ مولانا آزادؒ نے اپنی تفسیر میں دیا نہ مولانا مودودیؒ نے، دونوں خاموشی سے گزر گئے کہ "درگفتن نمی آید"

حافظ ابن کثیرؒ نے آیت مذکورہ کے تحت مسلم شریف کی یہ حدیث ذکر کی:۔رسول اکرم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا:۔عورتوں کے بارے[1] میں خدا سے ڈرو کیونکہ تم نے ان کو بطور امانت خداوندی اپنے قبضہ میں لیا ہے اور خدا کے ایک کلمہ کے ذریعہ وہ تم پر حلال ہوئی ہیں اور تمہارا ان پر بڑا حق یہ ہے کہ جس کو تم ناپسند کرو اس کو وہ تمہارے یہاں ہرگز نہ آنے دیں، اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو اعتدال کی حد تک مار بھی سکتے ہو، اور ان کا تمہارے ذمہ حسبِ دستور نان نفقہ ہے، دوسری حدیث میں ہے کہ آپ سے بیوی کے حق کو دریافت کیا گیا تو فرمایا:۔جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، جب پہنو تو اس کو بھی پہناؤ، چہرہ پر مت مارو، سخت الفاظ مت کہو، اور (ناراضگی کے وقت) گھر کے اندر ہی رہ کر اس سے کلام وغیرہ ترک کرو، مرد کے لئے عورت پر درجہ ہے یعنی فضیلت، خَلق، خُلق، مرتبہ، طاعتِ امر، انفاق، قیام بہ مصالح اور فضل دنیا وآخرت کے لحاظ سے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله الآیہ (ابن کثیر ۲۷۱/۱)

علامہ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے تحت لکھا:۔حضرت ابن عباسؓ نے قوامون کا مطلب بتلایا کہ مرد عورتوں پر بطور امراء کے ہیں کہ ان پر مردوں کی اطاعت فرض ہے اور وہ یہ کہ مرد کے گھر والوں کے ساتھ وہ بہتر سلوک کرے اور اس کے مال کی حفاظت کرے،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیک بیویاں قانتات ہوتی ہیں یعنی شوہروں کی اطاعت شعار، حافظات للغیب ہوتی ہیں یعنی شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے مال اور اپنی آبرو کی حفاظت کرتی ہیں (نہ مال کو بے جا لٹاتی ہیں نہ غیر مردوں سے تعلق کرتی ہیں)

حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔عورتوں میں سب سے بہتر وہ بیوی ہے کہ اس کو دیکھ کر شوہر کا دل خوش ہو جائے، جب کوئی حکم اس کو دے تو اطاعت کرے اور جب اس کو گھر چھوڑ کر جائے تو اس کے مال وآبرو کی حفاظت کرے، اور فرمایا:۔اگر عورت پانچ وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، عفت و پاکدامنی کی زندگی بسر کرے، شوہر کی مطیع ہو تو قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا کہ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔

واللا تی تخافون نشوزھن کا مطلب یہ ہے کہ جن بیویوں کے بڑا پن کا تمہیں خیال وڈر ہو کہ وہ اپنے کو شوہر سے مرتبہ میں بڑا اور برتر سمجھیں گی اس کے حکم کی اطاعت نہ کریں گی، یا اس سے اعراض، بغض وغیرہ کا طریقہ اختیار کریں گی اگر ایسی علامات ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو سمجھا کر اور خدا وآخرت کی یاد دلا کر اصلاحِ حال کی سعی کریں الخ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:۔اگر میں کسی کے لئے سجدہ کا حکم کرتا تو عورت کو اپنے شوہر کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا، اور فرمایا:۔جو عورت (ناراضی کے سبب) اپنے شوہر سے الگ ہو کر رات گزارتی ہے تو صبح تک خدا کے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں (تفسیر ابن کثیر ۴۹۱/۱)

ضروری فائدہ! ہم نے یہ سب تفصیل اس لئے ذکر کی کہ عورتوں کے حقوق پر بھی روشنی پڑ جائے کہ وہ ہماری شریعت میں مردوں کے برابر ہیں اور دنیا کا کوئی قانون یا مذہب اس بارے میں اسلام کی ہمسری نہیں کر سکتا لیکن اسی کے ساتھ مرتبہ کے لحاظ سے دونوں صنف میں برابری کو بھی جو لوگ اسلامی اصول و نظریہ قرار دیتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں، اور اسی غلطی کی وجہ سے ان کو موقع ملا ہے کہ حضرت عمرؓ وغیرہ پر عورتوں کے بارے میں نقد و جرح کریں، حضور علیہ السلام یا سابق انبیاء علیہم السلام یا بہت سے اولیائے امت کے خُلق عظیم کی بات تو اور رہی کہ انہوں نے اپنی ازواجِ مطہرات کی نسوانی کمزوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اپنے فرائض منصبی سے کام رکھا اور ان سے پہنچنے والی غیر معمولی روحانی تکالیف کو بھی دوسری جسمانی وروحانی تکالیف کی طرح حسبۃً اللہ انگیز کیا، تاہم یہ بھی سب کے سامنے ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت حفصہؓ کو طلاق رجعی دی، اور اس کو بحکم خداوندی واپس بھی لے لیا، یہ بھی فرمایا کہ مجھے جبرئیل علیہ السلام برابر عورتوں کے ساتھ مدارات وحسنِ خلق ہی کی نصیحت کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ خیال ہو گیا کہ طلاق دینے کی کسی حال میں کوئی جائز شکل باقی ہی نہ رہے گی، نیز

[1] اتقوا النساء سے مراد اکابر امت کے نزدیک یہ ہے کہ ان کے کید و مکر سے ڈرو اور ہوشیار رہو۔"مؤلف"

تحریم، ایلاء اور تخییر کے واقعات بھی پیش آ کر ہی رہے وغیرہ وغیرہ سب کچھ اپنی جگہ ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کا خانگی نظام زندگی عامہ امت کے لئے ایک بہت معتدل طریقہ پر ہی چل سکتا ہے اور وہ وہی ہے جس کو حضرت عمرؓ نے اپنے وقول وعمل سے پیش کر دیا ہے، اس میں عورتوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی قدر و منزلت پہچاننا اوّل نمبر پر ہے، لیکن ان کو سر پر چڑھانا، ہر قسم کی آزادی دینا، یا ان کی بے حجابی بد اخلاقی، زبان درازی برابر سے جواب دینا، بیرونی معاملات میں دخل اندازی وغیرہ اسلامی معاشرت کے قطعاً خلاف ہے بیوی کتنی ہی حسین وجمیل ہو لیکن اگر وہ دیندار نہیں، شوہر کے لئے خوش اخلاق نہیں، دوسروں کے لئے زینت کرتی ہے یا بدکردار مردوں، عورتوں سے تعلق پسند کرتی ہے تو وہ اسلامی نقطہ نظر سے دوکوڑی قیمت کی بھی نہیں ہے اسی طرح اگر مرد دیندار نہیں، اپنی بیوی کے ساتھ خوش اخلاق نہیں، غیر عورتوں سے تعلق یا میلان رکھتا ہے، یا اپنی بیوی کو غیروں کے سامنے لانا پسند کرتا ہے تو وہ بھی شرعی نقطہ نظر سے کسی قدر و قیمت کا مستحق نہیں ہے، حضرت عمرؓ کے پورے حالات پڑھ جائیے آپ کو یہی چیز ملے گی، اور قرآن مجید و رسول اکرم ﷺ کی ساری تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

مردوں اور عورتوں کی تین قسمیں

مرد تین قسم کے ہیں:۔کامل، اس سے کم، لاشیئ محض، کامل وہ ہے جو خود صاحبِ رائے ہو اور عمدہ لوگوں سے مشورہ بھی لے ان کی رائے کو اپنی رائے کے ساتھ ملالے، کامل سے کم وہ ہے جو صرف اپنی رائے سے کام کرے اور دوسروں سے رائے نہ لے لاشیٔ وہ ہے جو نہ خود صاحبِ رائے ہو اور نہ لوگوں سے مشورہ حاصل کرے، اور عورتوں کی بھی تین قسم ہیں، ایک وہ جو زمانہ کی سختیوں پر اپنے شوہروں کی مدد کریں اور شوہروں کے خلاف زمانہ کی مدد نہ کریں، اور ایسی عورتیں بہت کم ہیں، دوسری وہ جو بچوں کا ذریعہ ہیں اور ان میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں، تیسری بدخو اور بداخلاق عورتیں، خدا ان کو جس کی گردن میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے، اور جب چاہتا ہے ان سے رہائی دلا دیتا ہے (ازالۃ الخفاء ۲/۳۹۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا دل و دماغ صرف سیاسی سوجھ بوجھ کے ہی لحاظ سے اعلیٰ قسم کا نہیں تھا بلکہ معاشرتی زندگی پر بھی وہ بڑی وسیع نظر رکھتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی رفعتِ شان

ہمارے اردو لٹریچر کی بڑی کمی یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے صرف سیاسی حالات سے روشناس کرایا گیا، اور ان کے دوسرے علمی و عملی کمالات کو پیش نہیں کیا گیا اس وقت ہمارے سامنے صرف ازالۃ الخفاء ایسی کتاب ہے جو اردو ہو کر اب سامنے آئی ہے اور اس میں بہت بڑا حصہ ان ہی کے حالات سے متعلق ہے، ہم اس وقت ان کے موافقاتِ وحی سے متعلق ذخیرہ یکجا کر کے پیش کر رہے ہیں اور یہ بھی اس درجہ کی پہلی کوشش ہے اللہ تعالیٰ اس سے امت کو فائدہ پہنچائے اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو جمعِ قرآن والی منقبت ہی سے آپ کی شانِ رفیع کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے اور ساری امتِ محمدیہ کی گردنیں اس احسانِ عظیم سے جھکی ہوئی ہیں، اگر وہ یہ اقدام نہ کرتے تو ہم قرآن مجید ہی کی موجودہ صورت سے محروم ہو جاتے، تو جس خدا نے نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے بعد بھی اتنا بڑا کام آپ سے لیا، اس سے آپ کے عظیم ترین فضل وشرف کا ثبوت ملتا ہے۔

فضیلت ومنقبت جمع قرآن

امام بخاریؒ نے باب جمع القرآن (۷۴۵) میں حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت نقل کی کہ حضرت ابوبکرؓ نے مجھے بلایا، اُس وقت حضرت عمرؓ بھی ان کے پاس تھے، فرمایا کہ دیکھو! یہ حضرت عمرؓ میرے پاس آئے ہیں، اور کہا جنگِ یمامہ کے شدید قتال میں قرآن مجید کے قراء شہید ہو گئے ہیں مجھے ڈر ہے کہ دوسرے معرکوں میں بھی ایسا ہو گا اور اس طرح قرآن مجید کا بڑا حصہ ہم سے جاتا رہیگا، اس لئے میری رائے ہے کہ آپ قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم دیں، میں نے اِن سے (یعنی حضرت عمرؓ سے) کہا کہ آپ کیسے ایسا کام کرنے کی رائے دے رہے

ہیں جو حضور علیہ السلام نے نہیں کیا، انہوں نے کہا خدا کی قسم یہی بات بہتر ہے، پھر یہ برابر مجھے اس کام کے لئے آمادہ کرتے رہے یہاں تک کہ میرا اس کیلئے شرحِ صدر ہو گیا، اور میری بھی اب وہی رائے ہوگئی جو حضرت عمرؓ کی ہے حضرت زید بن ثابتؓ نے بیان کیا کہ اس تمہید کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تم جوان آدمی ہو عاقل ہو، تم پر ہمیں پورا بھروسہ ہے تم وحی رسول اکرم علیہ السلام لکھا کرتے تھے، لہٰذا پوری کوشش وتلاش کر کے قرآن مجید کے منتشر حصّوں کو ایک جگہ جمع کرلو، خلیفہ رسول اکرم علیہ السلام یہ حکم سنکر میں سخت متفکر ہو گیا، اور واللہ! اگر وہ مجھے ایک پہاڑ کو دوسرے پہاڑ تک منتقل کرنے کو فرماتے تو وہ بھی مجھ پر اتنا بھاری نہ ہوتا جتنا یہ حکم جمع قرآن کے بارے میں تھا، اور میں نے عرض کیا کہ آپ حضرات کس طرح وہ کام کرنا چاہتے ہیں جو حضورِ اقدس علیہ الصلوات والتسلیمات نے اپنی زندگی میں نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا، واللہ! یہ کام ہر طرح بہتر ہے اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ بھی مجھے برابر اس خدمت کے لئے آمادہ کرتے رہے تا آنکہ میرا دل بھی اس کام کے لئے کھُل گیا جس کے لئے حضرت ابوبکر و عمرؓ دونوں کا کھُل گیا تھا، چنانچہ میں نے کوشش شروع کردی اور قرآن مجید کو کھجور کی ٹہنیوں، پتوں، اور پتلے سفید پتھروں وغیرہ اور لوگوں کے سینوں (یعنی حفاظ) سے جمع کرنے لگا، حتی کہ سب سے آخر میں سورۂ توبہ کی آخری آیات (**لقد جاء کم رسول** سے آخر سورت تک) مجھے ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس سے ملیں جو اور کسی کے پاس سے مجھے نہیں مل سکی تھیں، یہ جمع شدہ مکمل صحیفے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آپ کی وفات تک رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس آپ کی زندگی میں رہے پھر آپ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس رہے، بخاری ۷۴۶ میں یہ دوسری روایت بھی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک قراءتوں کا اختلاف باقی تھا جو قرآن مجید میں بھی لکھا ہوا تھا حضرت حذیفہؓ ابن الیمانؓ کی تحریک پر اس اختلافِ قراءت کو بھی قرآن مجید میں سے ہٹانے کی تجویز ہوئی، تا کہ اس کی وجہ سے بعد کے لوگوں میں تشویش واختلاف کی صورت رونما نہ ہو، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے ان صحائف کو منگوا کر صرف لسانِ قریش والی قراءت پر قرآن مجید کا نسخہ تیار کرالیا، اور حضرت عثمانؓ نے پھر اسی کی اشاعت پوری دنیائے اسلام میں کرادی۔

صنف نسواں حدیث کی روشنی میں

ہم چاہتے ہیں کہ بحث کی تکمیل کے لئے یہاں معتد بہ حصہ، احادیث نبوی کا بھی یکجا کر کے پیش کردیں، واللہ المفید:۔

(۱) ارشاد فرمایا کہ جتنی شرطیں نکاح کے وقت عورتوں سے کی جائیں، وہ سب پوری کی جائیں، کیونکہ جو چیز پہلے حرام تھی وہ نکاح کے ذریعہ خدا کے حکم سے حلال کردی جاتی ہے لہٰذا دوسری سب شرطوں سے زیادہ نکاح کی شرطوں کو پورا کرنا ضروری ہے (بخاری ۷۷۴ کتاب النکاح وترمذی)

امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ اسی حدیث پر بعض اہل علم اصحاب النبی علیہ السلام کا عمل ہے اور ان میں حضرتِ عمرؓ بھی ہیں اور حضرت علیؓ کی رائے یہ ہے کہ خدا کی شرط عورت کے نکاح کی شرط سے مقدم ہے۔ مثلاً اگر عورت کے نکاح کے وقت یہ شرط کرے کہ شوہر اس کو گھر سے باہر نہ لے جائے گا تو اس شرط کا پورا کرنا ضروری نہیں، گویا حضور علیہ السلام کے ارشاد کا تعلق صرف ان شرطوں سے ہے جو نکاح کے خاص فوائد ومنافع سے متعلق ہیں، دوسری خارجی باتوں سے نہیں، لیکن حضرت عمرؓ ہر قسم کی شرطوں کا فائدہ عورتوں کو دیتے تھے، چنانچہ بخاری ۷۷۴ ہی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ نکاح کی تمام شرطیں مردوں کے سابقہ حقوق کو ختم کردیتی ہیں مثلاً ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ سفر کرے یا ترک وطن کرے اور بیوی کو ساتھ لے جائے لیکن اگر نکاح کے وقت عورت شرط کردے کہ وہ اپنے گھر یا شہر سے باہر نہ جائے گی تو وہ اپنی شرط کو پورا کراسکتی ہے ایک شخص نے اپنا ایسا ہی واقعہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا کہ ایسی شرط کرلی تھی اور اب مجھے باہر جانا ضروری ہو گیا ہے، کیا کروں؟ آپ نے فرمایا، عورت کو اپنی شرط پوری کرانے کا حق ہے اس شخص نے کہا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مرد تباہ ہو جائیں گے اور عورتیں جب بھی چاہیں گی وہ ایسی ہی کسی شرط پر ضد وہٹ کر کے طلاق لے لیا کریں گی کیونکہ مرد کو مثلاً سفر یا ترکِ وطن ضروری ہوگا تو اس کو

مجبور ہوکر طلاق دینی ہی پڑے گی، اس پر بھی حضرت عمرؓ نے یہی فرمایا کہ مردوں کو شرطوں کے مقابلہ میں اپنے حقوق سے دست بردار ہونا پڑے گا، اور عورتوں کو اپنی شرطیں پوری کرانے کا پورا حق ہے (فتح الباری وعمدۃ القاری) عورتوں پر رحم وشفقت نہ کرنے یا ان کی قدر عزت دوسرے اکابر کی نسبت کم کرنے کا الزام حضرت عمرؓ پر لگانے والے اس واقعہ پر غور کریں۔

(۲) امام بخاریؒ نے باب المداراۃ مع النساء ۷۷۹ ارشادِ نبوی ذکر کیا کہ عورت پسلی کی طرح (ٹیڑھی) ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو اس کو توڑ دو گے، اور اگر اس کے ٹیڑھے پن کے باوجود اس سے نفع حاصل کرنا چاہو گے تو نفع حاصل کرسکو گے، پھر اگلے باب الوصاۃ بالنساء میں ارشاد ہے کہ جس کا ایمان خدا اور یوم آخرت پر ہو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے، اور عورتوں کے معاملہ میں بہتر سلوک کی نصیحت قبول کرو، کیونکہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہیں اور پسلیوں میں بھی سب سے زیادہ ٹیڑھی اوپر کی پسلی ہوتی ہے، پس اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی فکر میں سر کھپاؤ گے تو (فائدہ کیا؟) اس کو توڑ دو گے، اور اگر اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی، لہٰذا عورتوں کے بارے میں اچھے برتاؤ کی ہی راہ اختیار کرو، بخاری، مسلم وترمذی کی دوسری روایات میں یہ ہے کہ عورت سب سے زیادہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور وہ سب سے اوپر والی ہوتی ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ اس کو توڑنا اس کو طلاق دینا ہے، دارمی کی حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے اگر سیدھا کرنے کی سعی کرو گے تو اس کو توڑ دو گے، لہٰذا اس کے ساتھ مدارات (رواداری) کا معاملہ کرو، کیونکہ اس میں گو کجی ہے مگر گزارہ کی صورت بھی ممکن ہے (جمع الفوائد ۲۲۷/۱)

حافظؒ نے فتح الباری میں لکھا:۔ یہ بھی احتمال ہے کہ حضور علیہ السلام نے عورت کے اعلیٰ حصّہ جسم کے معنوی طور سے ٹیڑھے ترچھے ہونے کی تعبیر اس طرح کی ہو، کیونکہ وہ اعلیٰ حصہ سر ہے، جس میں زبان بھی ہے، اور اسی سے زیادہ اذیت وروحانی تکلیف مرد کو پہنچتی ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس حدیث سے صنفِ نازک کے بارے میں شارع کی طرف سے بہت کافی روشنی مل جاتی ہے اچھے برتاؤ اور رواداری کے ساتھ معتدل طریق اصلاح اپنانے کی ہدایت کی گئی ہے، کیونکہ اس کے حال پر بالکل آزاد چھوڑنے سے کجی بدستور رہی گی، اور پوری کجی کو ختم کرنے کی سعی لاحاصل بتلائی کیونکہ وہ بغیر طلاق کے حاصل نہ ہوگی، لہٰذا درشتی ونرمی کے بین بین راہ اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اگر غلطیوں پر گرفت بالکل نہ کی جائے تو وہ رفتہ رفتہ مردوں پر اتنی حاوی ہوجائیں گی کہ ان کو اپنے کاموں کے قابل بھی نہ رہنے دیں گی، اور اگر ہر وقت گرفت کی گئی تو اس سے بھی جھگڑے بڑھ کر زندگی کا سکون ختم ہوجائے گا، اور آخری راہ طلاق کی اختیار کرنی ناگزیر بن جائیگی حضرت عمرؓ بھی یہی اعتدال کی راہ اختیار کئے ہوئے تھے۔

(۳) عورت اگر خودسری اختیار کر کے شوہر کی قربت ترک کردے تو جب تک وہ اس حرکت سے باز نہ آئے گی، سارے فرشتے اس پر لعنت کریں گے۔ (بخاری ۷۸۲)

(۴) آج میں نے نہایت مہیب منظر دیکھا کہ دوزخ میں زیادہ عورتوں کو پایا، صحابہ نے سوال کیا، ایسا کیوں؟ فرمایا کفر کی وجہ سے، پوچھا کیا وہ خدا کی منکر ہیں؟ فرمایا نہیں بلکہ اپنے شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان فراموش ہوتی ہیں (یہ بھی کفر ہے) اگر تم ساری عمر کسی عورت کے ساتھ احسان کرو گے اور پھر کبھی تم سے کوئی بات ناگواری کی ہوجائے تو کہے گی کہ میں نے تجھ سے کبھی کوئی خیر وبھلائی کی بات نہیں دیکھی (بخاری باب کفران العشیر ای الزوج ۷۸۲) مساواتِ مرد وزن والے اس تفاوتِ فطرت پر بھی غور کریں تو بہتر ہوگا۔

(۵) بخاری، مسلم وترمذی میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ خبردار! عورتوں کے پاس آمدورفت نہ کرنا، ایک انصاری نے عرض کیا، کیا دیور جیٹھ اپنی بھاوج کے پاس آجاسکتے ہیں؟ فرمایا، وہ تو موت ہیں، (کیونکہ زیادہ قرب کے سبب بے تکلف ہوں گے، جس سے اور بھی زیادہ خطرہ ہے) یہ بھی فرمایا:۔ کوئی بھی کسی وقت کسی عورت کے پاس تنہائی میں نہ رہے، بجز اس کے کہ اس عورت کا ذی رحم محرم بھی

وہاں موجود ہو، ایک شخص نے کہا یارسول اللہ! میری بیوی تو حج کے لئے گئی ہے اور میرا نام فوج میں لکھا گیا ہے، فرمایا، جاؤ! اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو (بخاری ؤمسلم) حضور علیہ السلام نے ضرورت کے وقت کسی عورت کے پاس جانے سے بھی بغیر اجازت شوہر کے ممانعت فرمائی (ترمذی)

حضور علیہ السلام کے پاس نابینا صحابی حضرت ابن مکتومؓ آئے، اس وقت آپ کے پاس حضرت میمونہ وام سلمہ دونوں تھیں آپ نے ان سے فرمایا، پردہ میں چلی جاؤ، انہوں نے کہا یہ تو نابینا ہیں، آپ نے فرمایا تم تو نابینا نہیں ہو! (ترمذی وابوداؤد)

معلوم ہوا کہ پردہ کی پابندی مردوں اور عورتوں کیلئے یکساں[1] ہیں اور کسی ایک کی بھی اہمیت نہیں ہے قرآن مجید (سورۂ نساء) میں جو چوری چھپے دلی دوست بنانے کی ممانعت ہے، وہ بھی دونوں صنف کے لئے ہے، اور تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ میلانِ جنسی کے شکار دونوں برابر[2] ہوتے ہیں۔

ضروری مسئلہ! پردہ کی پابندی سے جو بارہ قسم کے مرد اور عورتیں مستثنیٰ ہیں وہ آیتِ قرآنی ولا یبدین زینتھن (سورۂ نور) میں گنا دیئے گئے ہیں، شوہر، باپ، شوہر کا باپ، بیٹا، شوہر کا بیٹا، بھائی، بھائی کا بیٹا، بہن کا بیٹا، اپنی عورتیں، (یعنی آزاد مسلمان) اپنی مملوکہ باندیاں، کمیرے خدمت گار، جو میلانِ جنسی سے عاری ہوں، اور وہ نوعمر لڑکے جن میں ابھی جنسی میلان پیدا نہیں ہوا، ان سب کے سامنے علاوہ چہرہ اور ہاتھوں کے اور جسم وزیبائش کو بھی چھپانے کی ضرورت نہیں اور ناف سے گھٹنے تک کا حصّہ ایسا ہے جو بجز شوہر کے ہر ایک سے چھپانا فرض ہے اور صرف چہرہ اور ہاتھ اجنبی مردوں کے سامنے بھی بوقتِ ضرورت وعدم فتنہ کھولنا جائز ہے،

تفسیر مظہری ۲۹۳/۴۹۴/٦ میں ہے کہ بوجہ روایت ترمذی شریف چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، وامام احمد چاروں کے نزدیک مستثنیٰ ہیں اور ایک روایت میں قدم بھی مستثنیٰ ہیں، اور مشہور امام شافعی سے صرف چہرہ کا استثناء ہے لہٰذا چہرہ تو باتفاقِ علماء اربعہ مستثنیٰ ہے اور مختلفات قاضی میں ہے کہ ہتھیلی کا ظاہر وباطن پہنچے تک کھلا رہ سکتا ہے علامہ بیضاوی نے کہا کہ یہ صرف نماز کا مسئلہ ہے نظر کے جواز کا نہیں، کیونکہ حرہ کا بدن سب ہی قابل ستر ہے غیر زواج ومحرم کے لئے البتہ ضرورۃً علاج کے لئے جتنا حصّہ کھولنا پڑے وہ جائز ہے لیکن کتبِ حنفیہ میں ہے کہ چہرہ کا خارج از عورت ہونا نماز کے ساتھ خاص نہیں تاہم فتنہ اور شہوت کا اندیشہ ہو تو چہرہ کا کھولنا بھی درست نہیں اور اگر شک ہو یا غالب گمان تب بھی مباح نہیں شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ شہوت کا شبہ ہو تو عورت اور مرد دونوں کے چہرہ کی طرف نظر کرنا حرام ہے اس لئے عورت کو بھی ایسی صورت میں اپنا چہرہ اجنبی مرد کے سامنے کھولنا حرام ہوگا۔الخ!

علامہ مودودی کا تفرد! آپ نے اونساءھن کا ترجمہ مفسرین وسلف وخلف سے الگ ہوکر اپنے میل جول کی عورتوں سے کیا اور لکھا کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں، غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذمی ہوں ان سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پردہ کرنا چاہیے جس طرح

---

[1] علامہ آلوسیؒ نے آیت قل للمومنات یغضضن (سورۂ نور) کے تحت لکھا:۔ زواجر ابن حجر میں ہے کہ جس طرح مردوں کو عورتوں کی طرف نظر کرنا درست نہیں، عورتوں کو مردوں کی طرف نظر کرنا درست نہیں، خواہ شہوت اور خوفِ فتنہ بھی نہ ہو، البتہ اگر دونوں میں محرمیت نسب ورضاع ومصاہرت کا علاقہ ہو تو علاوہ ناف تارکبہ کے نظر جائز ہے، دوسرے حضرات کی رائے ہے کہ اس کے ماسوا بھی شہوت سے حرام ہے، اور اجانب سے پوری طرح غضِ بصر کرنا ہی اولی ہے، زواجر میں اجنبی عورت کے کٹے ہوئے ناخن وغیرہ کی طرف نظر کو بھی حرام لکھا ہے کیونکہ ایسی چیزوں سے بھی غلط میلانِ جنسی کے جذبات کو قوت ملتی ہے۔ (روح المعانی ۱۴۰/۱۸)

[2] صاحبِ مرقاۃ نے لکھا:۔ محدث علامہ نوویؒ نے لکھا:۔ مرد کا اجنبی عورت کی طرف اور عورت کا اجنبی مرد کی طرف دیکھنا حرام ہے خواہ شہوت سے ہو یا بغیر اس کے، اور ایسے ہی مرد کی طرف دیکھنا حرام ہے جبکہ وہ اچھی صورت کا ہو، فتنہ ہو یا نہ ہو، یہی مذہب صحیح اور محققین کا مختار ہے امام شافعیؒ نے اور آپ کے حاذق اصحاب نے اس کی تصریح کی ہے الخ اور ہمارا اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ نظر اگر شہوت سے ہو تب حرام ہے، اور علامہ نوویؒ نے جو لکھا وہ دین میں احتیاط کی بات ہے الخ (مرقاۃ ۴۰۹/۳)

[3] حافظ ابن کثیر نے آیت وخلق منہا زوجہا کے تحت حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد نقل کیا:۔ مرد کی پیدائش زمین سے ہے اس لئے اس کی بڑی رغبت زمین کی طرف ہوتی ہے اور عورت کی پیدائش مرد سے ہوئی ہے، اس لئے اس کا بڑا میلان مرد کی طرف ہوتا ہے، لہٰذا اپنی عورتوں کو روکے رہو، یعنی اختلاطِ رجال وغیرہ سے (ابن کثیر ۴۴۸/۱) اس ارشاد سے برابری کی بات بھی قابل تامل ہوگئی۔ واللہ اعلم! ''مؤلف''

مردوں سے کیا جاتا ہے(کہ چہرہ اور ہاتھوں کے سوا اور بدن کو ان کے سامنے نہ کھولا جائے)ابن عباس، مجاہد،اور ابن جریج کی یہی رائے ہے لیکن معقول رائے اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر یہ ہے کہ اس سے مراد میل جول کی عورتیں ہوں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم (تفہیم القرآن ۳/۳۸۹)

اکابر صحابہ و مفسرین حضرت ابن عباس، مجاہد اور ابن جریج وغیرہ، اور دیگر علمائے سلف کے مقابلہ میں اپنی رائے کو معقول کہنے کی جسارت کا تو علامہ مودودی ہی کو حق پہنچتا ہے کیونکہ معقول کے مقابلہ میں دوسری رائے کو غیر معقول نہ سمجھیں تو اور کیا سمجھیں دوسرا دعویٰ قرآن کے الفاظ سے قریب تر ہونے کا کیا ہے جس کی صداقت بغیر علمائے عربیت کی گواہی وتوثیق کے محل نظر ہے، پھر یہ کہ حضرات صحابہ سے زیادہ قریب تر و بعید تر کو پرکھنے والا کوئی ہوسکتا ہے؟ جنھوں نے او نساء ھن کا مقصداق اپنی مسلمان عورتوں کو سمجھا تھا، تیسرے درجہ میں استدلال ازواج مطہرات کے پاس ذمی عورتوں کی حاضری سے کیا گیا ہے، لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوگیا، کہ ازواج مطہرات ان کے سامنے صرف چہرہ اور ہاتھ بلکہ اور جسم وزیبائش بھی ظاہر کرتی تھیں، کیونکہ عورتوں پر مردوں کی طرح گھروں میں آنے جانے پر تو پابندی شرعاً ہے نہیں اس لئے صرف ان کے ازواج مطہرات کے پاس آنے سے استدلال پورا نہیں ہوسکتا، حیرت ہے کہ اس قدر جلیل القدر اکابر امت کے مقابلہ میں اتنا کمزور اور بودا استدلال کیا گیا، اور ایسے تفردات تفہیم القرآن میں بہ کثرت ہیں، فیاللاسف! یہ بھی کہا گیا کہ ''اس معاملہ میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جائے گا وہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی حالت ہے'' (تفہیم ۳/۲۹۰) کیسی عجیب بات ہے کہ غیر مسلم عورتیں جن کے پاس کوئی اخلاقی معیار نہیں اور اسی لئے حضرت عمرؓ نے حماموں میں ان کے ساتھ اختلاط کو سختی سے روک دیا تھا، اور وہ کتابیات کے ساتھ نکاح کو بھی ناپسند کرتے تھے، ان کے ساتھ میل جول کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جبکہ علامہ پر یہ بھی ضرور روشن ہوگا کہ خاص طور سے اس دورِ ترقی میں غیر مسلم عورتوں کے ذریعہ سے مسلمان عورتوں کے اخلاقی و مذہبی کردار کو کس طرح نقصان پہنچانے کی کوششیں ہورہی ہیں اور عرب ممالک میں تو یہودی عورتوں کو گھروں میں داخل کر کے جاسوسی کے بھی جال پھیلا دیئے گئے ہیں، جن سے مسلم ممالک کو غیر معمولی سیاسی نقصانات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اور بعض غیر اسلامی ملکوں میں در پردہ یہ اسکیم بھی چلائی جارہی ہے کہ مسلمان عورتوں کو غیر مسلم عورتوں کے ذریعہ متاثر کر کے دوسری بداخلاقیوں میں مبتلا کرنے کے علاوہ ان کا ارتداد بھی عمل میں لایا جائے اور اس کے لئے ان دونوں کے میل جول اور تعلقات کے بڑھانے کی ترقی پذیر کوشش ہورہی ہے۔

ان حالات میں تو میل جول والی بات کو معقول قرار دینا کسی طرح بھی معقول نہیں معلوم ہوتا اور ہمارا یقین یہ ہے کہ علامہ کی یہ تحقیق قرآن مجید سے بھی کسی طرح قریب نہیں ہے بلکہ بعید سے بعید تر تو ہوسکتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

ارشاداتِ اکابر! مزید فائدہ کے لئے اکابر مفسرین کی تحقیق بھی ملاحظہ کریں:۔(۱) حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا: مسلمان عورتیں اپنی زینت مسلمان عورتوں کے سامنے بھی ظاہر کرسکتی ہیں، اہل ذمہ عورتوں کے سامنے نہیں تاکہ وہ ان کا حال اپنے مردوں سے نہ بتلائیں، کیونکہ مسلمان عورتوں کے حالات بابتہ حسن و جمال وغیرہ کا اظہار غیر مردوں کے سامنے کرنا اگرچہ سب ہی عورتوں کے لئے شرعاً ممنوع ہے مگر غیر مسلم ذمی عورتوں کے حق میں اور بھی زیادہ شدت سے منع ہے کیونکہ ان کو اس بات سے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی، بخلاف مسلم عورت کے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ایسا کرنا شرعاً حرام ہے اور اس لئے وہ اس سے رُک جائے گی، بخاری و مسلم میں حدیث ہے کہ کوئی عورت کے ساتھ بے تکلف میل جول کے باعث اس کے حسن و جمال اور دوسری خوبیوں سے واقف ہوکر اس کا حال اپنے شوہر سے جاکر نہ بتائیے جس سے وہ اس کے حالات سے اس طرح واقف ہوسکے کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے، اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کسی ایماندار مسلمان عورت کے لئے جائز نہیں کہ اس کا سراپا بجز اس کے اہل ملت کے دوسری عورت دیکھ سکے، حضرت مجاہد نے فرمایا کہ او نسـاء ھن سے مراد اپنی مسلمان عورتیں ہیں، مشرکہ نہیں، اور مسلمان عورت کو اس کے سامنے بدن کھولنا جائز نہیں نہ اپنے سر کا دوپٹہ اس کے سامنے اتارے کیونکہ وہ اپنی عورتیں نہیں ہیں، حضرت ابن عباسؓ کا

ارشاد ہے کہ اس سے مراد مسلمان عورتیں ہیں، یہودی، نصرانی عورت کے سامنے مسلمان عورت کو اپنا سینہ، گردن وغیرہ کھولنا جائز نہیں، حضرت مکحول وعبادہ اس بات کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ یہودی، نصرانی یا مجوسی عورت مسلمان عورت کے لئے دایہ گری کرے، حضرت ابن عطاء اپنے والد سے راوی ہیں کہ جب صحابہ کرام بیت المقدس پہنچے تو وہاں کی عورتوں کے لئے قابلہ کا کام یہودی ونصرانی عورتیں کیا کرتی تھیں، اگر یہ صحیح ہو تو ضرورت سے مجبوری کے سبب ہوگا، (کہ وہاں اس وقت تک مسلمان عورتیں قابلہ نہ ہوں گی) یا یہ کام گراوٹ کا تھا، ان سے لیا جاتا رہا، لیکن قابلِ ستر جسم کو ان سے بہر حال چھپانا ضروری ہے۔ اوما ملکت ایمانھن میں مراد باندیاں ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمہ، غلام مرد مراد نہیں، یہی سعید بن المسیب کا مذہب ہے الخ (تفسیر ابن کثیر ۲۸۴/۳)

(۲) علامہ آلوسیؒ نے لکھا کہ اونسآء ھن سے مراد صحبت وخدمت میں پاس رہنے والی آزاد مسلمان عورتیں ہیں، کیونکہ کافر عورتوں کو ان مسلمان عورتوں کے حالات اپنے مردوں کے سامنے بیان کرنے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی، لہٰذا وہ اجنبی مردوں کی طرح ہیں اور ذمی عورت اور دوسری سب برابر ہیں، یہی اکثر سلف کا مذہب ہے، روضۃ النووی میں امام غزالی شافعی سے اجازت نظر ذمیہ الی المسلمہ کی منقول ہے مگر بغوی شافعی سے ممانعت مروی ہے اور منہاج میں بھی حرمت کا ہی قول ہے اور بہت سے شافعی حضرات نے اسی کو اختیار کیا ہے، ابن حجرؒ نے کہا کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ مسلم عورت کے بدن کا وہ حصّہ جو کام کاج کے وقت نہیں کھلتا، اس کی طرف ذمی عورت کا نظر کرنا حرام ہے (بجز اس کے سیّدہ اور محرم کے) اور ذمی عورتیں جواز واجِ مطہرات کے پاس آتی جاتی تھیں اس میں بھی یہی صورت ہوتی ہوگی، لہٰذا اتنے حصہ جسم کا ضرورۃ کھلنا اس کی دلیل نہیں بن سکتا کہ ان کا حکم باقی جسم کے لئے اجنبی مردوں کا سا نہیں ہے او ماملکت ایمانھن میں مراد باندیاں ہیں اگر چہ وہ کافر ہوں اور مرد غلام مثل اجنبی مردوں کے ہیں، یہی مذہب امام ابوحنیفہ کا ہے، اور امام شافعی کے بھی دو قول میں سے ایک ایسا ہی ہے اور اس کو اکثر شافعیہ نے صحیح قرار دیا ہے الخ (روح المعانی ۱۴۳/۱۸)

(۳) علامہ محدث پانی پتیؒ نے لکھا کہ او نساءھن میں ایک قول عام ہے، دوسرا یہ کہ صرف مومن عورتیں مراد ہیں، لہٰذا غیر مسلم عورتوں کے سامنے مسلمان عورتوں کی طرح کھل کر آنا جائز نہیں کیونکہ وہ ہماری عورتوں میں سے نہیں ہیں کہ وہ دین کے لحاظ سے اجنبی ہیں، دوسرے اس لئے کہ ان پر کوئی مذہبی پابندی اس امر کی نہیں کہ وہ اِن مسلمان عورتوں کا حال اپنے مردوں سے جا کر نہ کہیں گی اور ہمارے مذہب میں چونکہ اس امر کی سخت ممانعت ہے اس لئے مسلمان عورتیں ایسا نہ کریں گی ابن جریج سے منقول ہے کہ اس سے مراد مسلمان آزاد عورتیں ہیں اور او ماملکت سے مراد باندیاں ہیں مرد غلام نہیں، حضرت سعید ابن المسیب اور حسن وغیرہ نے فرمایا کہ سورۂ نور کی آیت او ما ملکت ایمانھن تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے، کیونکہ وہ عورتوں کے بارے میں ہے مردوں کے متعلق نہیں، لہٰذا مذہب حنفی کی رو سے مسلمان عورت کا کافرہ کے سامنے بے محابا آنا جائز نہیں ہے، اور حضرت فاطمہؓ کا غلام ممکن ہے صغیر السن ہوگا، اس لئے اس سے استدلال قوی نہیں، البتہ امام مالکؒ کے نزدیک باندی اور غلام کا حکم ایک الخ (تفسیر مظہری ۴۹۸/۶)

(۶) ارشاد فرمایا:۔ اونٹوں پر سوار ہونے والی (عربی) عورتوں میں سے قریشی عورتیں سب سے بہتر ہیں جو بچوں پر بہت شفقت کرتی ہیں اور شوہروں کے مال میں ہمدردی وخیر خواہی کا بہت خیال کرتی ہیں۔ بخاری شریف ۸۰۸

(۷) حضرت جابرؓ نے کہا کہ میرے باپ کا انتقال ہوا تو انہوں نے سات یا نو لڑکیاں چھوڑیں، اس لئے میں نے ایک ثیبہ عورت سے شادی کی، حضور علیہ السلام کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ تم نے کنواری سے شادی کیوں نہ کی، جو تم سے زیادہ کھل کھیلتی اور دونوں کی دلبستگی کا سامان زیادہ ہوتا، میں نے عرض کیا کہ اس طرح والد نے لڑکیاں چھوڑی ہیں، مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ اِن ہی جیسی نوعمر ناتجربہ کار بیوی لاؤں، لہٰذا ایسی تجربہ کار، دانا بینا عورت سے شادی کی جو اِن کی ضرورت کی دیکھ بھال اچھی طرح کر سکے، آپ نے فرمایا، بارک اللہ، اچھا کیا (بخاری ۸۰۸)

حافظؒ نے لکھا کہ اس سے امام بخاریؒ نے یہ استدلال کیا کہ بیوی کو شوہر سے متعلق بچوں کی خبر گیری کر کے اس کی مدد کرنی چاہیے (فتح ۳۱۳/۹)
علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باکرہ سے نکاح کرنا زیادہ بہتر ہے اور یہ کہ شوہر کے ساتھ ملاعبت مستحب ہے، علامہ طیبی نے کہا کہ ملاعبت کامل الفت و موانست کی نشاندہی کرتی ہے، اور ثیبہ کا دل اکثر سابق شوہر کے ساتھ وابستہ رہتا ہے اس لئے اس کی نئے شوہر کے ساتھ محبت کامل نہیں ہوتی اور اسی لئے وارد ہے" علیکم بالا بکار فانھن اشد حُباً واقل خِباً" (باکرہ لڑکیوں سے شادی کیا کرو کہ وہ نہایت محبت کرنے والی اور کم دھوکہ و کید والی ہوتی ہیں) دوسری حدیث ابن ماجہ، جامع صغیر و بیہقی کی ہے" علیکم بالا بکار فانھن اعذاب انواھا وانتق ارحاما وارضی بالیسیر" (ابکار سے شادیاں کرو کیونکہ وہ شیریں دہن شیریں زبان اور پاکیزہ مہذب کلام والی ہوتی ہیں، شوہر کے ساتھ بے ہودہ بات زبان درازی سے پیش نہیں آتیں اس لئے کہ ان میں لحاظ و حیا باقی رہتی ہے (جو بیوہ و مطلقہ میں باقی نہیں رہتی) ان سے اولاد بھی زیادہ ہوتی ہے (حرارت وقوتِ رحم کی وجہ سے) نیز وہ تھوڑے حصّہ سے راضی اور خوش ہو جاتی ہیں (کہ دوسرے گھروں میں رہ کر وہ زیادہ کی عادی نہیں ہو چکی ہوتیں) ایک روایت میں واسخن اقبالا بھی ہے کہ شوہر کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کرتی ہیں، احیاء میں "فوائدِ بکارت" سے لکھا کہ وہ شوہروں سے صحیح معنوں میں محبت و الفت کرتی ہیں کیونکہ طبائع کی جبلت میں اوّل محبوب کے ساتھ مانوس ہونا ہے، اور جو طبائع پہلے اور مردوں کو آزما چکیں اور دوسرے حالات سے گزر کر ان سے مانوس ہو چکیں وہ بسا اوقات بعد کے بعض مخالف و غیر مانوس احوال کو پسند کرتی ہیں، اس لئے نئے شوہروں سے بھی نفرت کرنے لگتی ہیں، اسی طرح شوہر بھی باکرہ عورتوں سے مانوس زیادہ مانوس ہوتے ہیں، اور ثیبات سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ طبائع فطرۃً بیوہ مطلقہ بیوی کے سابق شوہر کے تعلق کا تصور کر کے اس سے نفرت کرتی ہیں، اور بعض طبائع تو اس امر کا بہت ہی زیادہ احساس کرتی ہیں (مرقاۃ ۴۰۶ و ۳/۴۰۷) ان سب وجوہ سے ابکار و ثیبات کا فرق کیا گیا ہے لیکن دنیا میں قاعدہ کلیہ کوئی نہیں ہے سب قاعدے اکثری ہیں اسی لئے معاملہ برعکس بھی ہو سکتا ہے اگرچہ کم اور بہت کم ہی سہی،

حضور اکرم ﷺ کی ایک (حضرت عائشہؓ) کے سوا سب ازواجِ مطہرات ثیبات تھیں اور بیشتر صحابہ کرام نے بھی بیوہ و مطلقہ عورتوں سے شادیاں کی تھیں، لیکن اُن سب حضرات اور ان کی ازواج کے سے قلوبِ طاہرہ مزکیہ و مقدسہ کی نظیر کم ہی مل سکتی ہے۔

(۸) امام بخاریؒ نے باب ترک الحائض الصوم ۴۴ اور باب الزکوٰۃ علی الاقارب ۱۹۷ میں حدیث روایت کی رسولِ اکرم ﷺ نماز عید کے بعد عید گاہ میں مجمع نسواں کی طرف تشریف لے گئے، اور ان کو یہ وعظ فرمایا:۔ اے جماعت نسواں! صدقہ و زکوٰۃ دینے کا اہتمام کرو، کہ داخلِ جہنم ہونے والوں میں تمہاری اکثریت مجھے دکھائی گئی ہے عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا تم دوسروں پر لعنت پھٹکار بہت[1] کرتی رہتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو، میں نے تم عورتوں کے عقل اور دین کے لحاظ سے ناقص ہونے کے باوجود تم سے زیادہ ایک عاقل سمجھ دار پختہ کار مرد کی عقل و فہم کو برباد کرنے والا اور کوئی نہیں دیکھا، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے دین و عقل میں نقصان کیا ہے؟ (یعنی ہمارا دین تو وہی ہے جو مردوں کا دین ہے نیز وہ اور ہم دونوں ہی ذوی العقول میں داخل ہیں) فرمایا کیا عورت کی شہادت کو اللہ تعالیٰ نے مرد کی شہادت کا آدھا نہیں قرار دیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا ٹھیک ہے آپ نے فرمایا، یہ عقل کے نقصان کی وجہ سے تو ہے، پھر فرمایا کہ حیض کے دنوں میں عورت نماز و روزہ (ایسی افضل عبادات) سے محروم نہیں ہو جاتی؟ انہوں نے عرض کیا درست ہے، آپ نے فرمایا یہ اس کے دین کا نقصان ہے، صحیح بخاری باب کفران العشیر ۸۲ ۷ کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ عورت شوہر اور ہر کسی کے احسان کو بھلا دیتی ہے یہاں تک کہ تم اگر عمر بھی کسی عورت کے ساتھ احسان کرو اور پھر کسی روز تم سے کسی بات پر ناراض ہوگی تو کہے گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی خیر و بھلائی نہیں دیکھی۔

---

[1] حضرت جابر بن سلیمؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا مجھے نصیحت فرمائیں، آپ نے فرمایا:۔ ہرگز کبھی کسی کو برا لفظ نہ کہنا، جابر کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کبھی کسی آزاد یا غلام شخص یا اونٹ یا بکری کو بھی بُرا لفظ نہیں کہا (ترمذی و ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ ۱۶۹ باب فضل الصدقہ)

حافظؒ ابن حجرؒ نے لکھا کہ لب[1] عقل سے اخص ہے، یعنی مردِ عقل کے بہترین حصہ عقل وفہم کوخراب کر دیتی ہے، حازم سے مراد پختہ کار جو اپنے کاموں پر پوری طرح ضبط و کنٹرول کر سکتا ہو، اور یہ مبالغہ ہے عورتوں کی فطرت بیان کرنے میں کہ اعلیٰ عقل، فہم و تجربہ والا مرد بھی ان کے مقابلہ میں لاچار و مجبور ہو جاتا ہے، تو دوسرے لوگوں کا حال ظاہر ہے، حافظؒ نے لکھا کہ عورتوں کا حضور علیہ السلام سے وما نقصان دیننا؟ کا سوال خود ان کے نقصان فہم کو بتلا رہا ہے کہ کیونکہ انہوں نے بات بات پر دوسروں کو لعنت و پھٹکار کرنا، ناشکری کرنا، اور مردوں کی عقل خراب کرنا، حضور علیہ السلام کی ذکر فرمودہ تینوں باتوں کو تسلیم کر لیا تھا کہ یہ سب عورتیں ان کے اندر ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ سب نقصان عقل کی دلیل ہیں پھر بھی حضور علیہ السلام سے سوال کر بیٹھیں کہ ہم میں عقل کا نقصان کیونکر ہے؟ تاہم حضور علیہ السلام نے ان کو سختی سے جواب نہیں دیا، نہ کچھ ملامت فرمائی، اور بقدر ان کی عقل وسمجھ کے جواب دیا کہ قرآن مجید میں آیت ۲۸۲ سورۂ بقرہ پڑھ لو جس میں حکم ہے کہ دو مرد گواہ ہو سکتے ہیں اگر وہ نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تا کہ ایک عورت معاملہ کے کسی جز کو بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے، اس سے معلوم ہوا کہ ان میں بھول کا مادہ ہے اور معاملہ کو اچھی طرح ضبط نہیں کر سکتیں جس سے ان کی عقل وفہم میں کمی ثابت ہوتی ہے۔

حدیثی فوائد! حافظؒ نے آخر میں حدیث مذکور کے یہ علمی فوائد بھی ذکر کئے:۔ کفرانِ نعمت حرام ہے، دوسروں کے لئے تکلیف دہ برے الفاظ کا استعمال حرام ہے جیسے لعنت کرنا، گالی دینا وغیرہ، علامہ نوویؒ نے کہا کہ یہ دونوں کبیرہ گناہ ہیں، کیونکہ ان پر جہنم کی وعید ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ نصیحت میں سخت الفاظ استعمال کر سکتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بری عادت وعیب دور ہو سکے جس کی وجہ سے نصیحت کی جارہی ہے صدقہ کرنے سے عذاب ٹل جاتا ہے اور کبھی اس سے وہ عذاب بھی دور ہو جاتا ہے جو حقوق العباد کے سبب سے ہوتا ہے عورتوں کے بارے میں نقصِ مذکور بیان کرنے سے یہ غرض نہیں کہ ان کو اس پر ملامت کی جارہی ہے کیونکہ وہ تو ان کی خلقت و جبلت ہے (اور اسی لئے عذاب ناشکری وغیرہ اعمال پر ہوگا، مذکورہ نقص وعیب کی وجہ سے نہ ہوگا) بلکہ یہ اس لئے بیان کیا کہ ان کے سبب سے کوئی فتنہ میں مبتلا نہ ہو (اور عورتوں کی فطرت پر مطلع رہے) پھر حافظؒ نے لکھا کہ حالتِ حیض میں نماز نہ پڑھنے پر یہ تو ظاہر ہے کہ عورتوں پر گناہ نہیں ہے، البتہ اس میں بحث ہے کہ ترک نماز کے دنوں کا ثواب بھی ملے گا یا نہیں، جس طرح مریض کی نفل نمازیں مرض کی وجہ سے رہ جائیں تو ان کا ثواب ملتا ہے، اگر وہ حالتِ صحت میں ان کا عادی تھا) علامہ نوویؒ کی رائے ہے کہ نہیں ملے گا، کیونکہ دونوں میں فرق ہے، مریض کی نیت ہمیشہ نوافل پڑھنے کی ہوتی ہے، اور اس میں اس کی اہلیت بھی ہوتی ہے، مگر حیض والی میں حیض کے دنوں میں نماز پڑھنے کی اہلیت ہی باقی نہیں رہتی، حافظؒ نے لکھا کہ مجھے اس فرق کو تسلیم کرنے میں تامل ہے (فتح ۱/۲۷۹)

لمحہ فکریہ! اس حدیث کو پوری تفصیل سے امام بخاریؒ نے کتاب الحیض اور کتاب الزکوٰۃ میں بیان کیا اور کتاب النکاح میں بیان نہیں کیا جہاں ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں اس کی ضرورت زیادہ تھی، حالانکہ امام بخاریؒ نے وہاں اور بہت سے عنوانات قائم کر کے اس بارے میں کافی رہنمائی فرمائی ہے، اسی طرح صاحبِ مشکوٰۃ نے ادنیٰ مناسبت سے اس کی حدیث کو صرف کتاب الایمان میں ذکر کیا، کیونکہ کفرانِ عشیر کا ذکر ہے، حالانکہ وہ کفر عقائد وایمان کا نہیں ہے اس طرح متداول کتبِ حدیث میں بسا اوقات احادیث غیر مظان میں درج ہوئی ہیں، جس کی وجہ سے تلاش واستفادہ میں دقت ہوتی ہے۔

---

[1] عقل وہ فطری قوت ہے جس سے معانی وکلیات کا ادراک کیا جاتا ہے اور جو برائیوں سے روکتی ہے اور مومن کے قلب میں وہ بطور نورِ خداوندی کے کام کرتی ہے (غالباً اسی سے ہے واتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله (مومن کی فراست سے خبردار رہو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے لب اس عقل کو کہتے ہیں جو ہوائے نفسانی سے پاک صاف ہو جاتی ہے (مرقاۃ ۱/۸۱) معلوم ہوا کہ ایمان کے اثر سے انسان کی عقل اور لب دونوں کی خاص قسم کا جلا حاصل ہو جاتا ہے، جس سے غیر مومن محروم ہوتا ہے۔ ''مؤلف''

دوسری مثال اس وقت قابل ذکر حدیثِ مسلم بروایتِ جابر ہے۔جس میں حضور علیہ السلام کے گردِ ازواجِ مطہرات کا جمع ہونا، نفقہ کا سوال کرنا اور حضرت ابوبکر وعمر کا حاضر ہو کر حضرتِ عائشہؓ وحفصہؓ کو تنبیہ کرنا مذکور ہے، وہ باب عشرۃ النساء میں درج ہوتی جس طرح مشکوٰۃ میں ہے لیکن یہ حدیث بخاری میں تو ہے نہیں اور امام مسلم اس کو کتاب الطلاق باب تخيير المراة لايكون طلاقا میں لائے ہیں، پھر یہ کہ سب سے بہتر یہ ہوتا کہ ایسی سب احادیث حضور علیہ السلام کی ازدواجی زندگی کا مستقل عنوان دے کر ایک جگہ جمع کر دی جائیں، ایسا بھی نہیں کیا گیا، گویا بیان اِحکام کا اہتمام ہی زیادہ رہا، حالانکہ حضور علیہ السلام کی پوری زندگی باب وار آنی بھی ضروری تھی کہ وہ بھی تو احکام سے ہی متعلق ہے ''لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنة'' غرض ناظرین انوارالباری کا ان امور پر متنبہ رہنا ضروری ہے۔

(۹) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد کوئی فتنہ مردوں کے لئے عورتوں سے زیادہ نقصان وضرر پہنچانے والا نہ ہوگا (بخاری ومسلم ترمذی وغیرہ) یعنی ان سے زیادہ فتنہ، بلا اور مصیبت میں ڈالنے والی کوئی چیز نہ ہوگی، کیونکہ طبائع کا میلان ان کی طرف زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا، اور وہ ان کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہوں گے، لڑائی جھگڑے، قتل وقتال اور باہمی عداوتیں پیش آئیں گی اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کو دنیا کی حرص ومحبت پر مائل کریں گی، اور اس سے زیادہ کونسا فتنہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کی محبت ساری گناہوں کا ایک گناہ ہے، اور میرے بعد اس لئے فرمایا کہ آپ کی زندگی کے بعد ہی اس فتنہ نے ضرر رسانی کی صورت زیادہ اختیار کی ہے یا پہلے آپ کی برکت سے یہ فتنہ دبا ہوا تھا، آپ کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ (مرقاۃ ص۳)

(۱۰) فرمایا:۔ دنیا میٹھی اور خوش منظر ہے (یعنی ذائقہ بھی عمدہ اور آنکھوں کے لئے بھی تازگی بخشنے والی، جنتِ نگاہ وفردوسِ گوش ہے اور اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی دے کر تمہیں اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی دے دیا، تاکہ دیکھے کہ کون کس طرح کے عمل کرتا ہے (خدا کی مرضی کے کام کرتا ہے یا شیطان کو خوش کرنے والے اعمال میں زندگی گزارتا ہے پس دنیا کی محبت اور اس کے جاہ وجلال سے دھوکہ نہ کھا جانا (کہ آخرت کی زندگی تباہ ہو جائے) اور نہ عورتوں سے زیادہ سروکار رکھنا (جس سے محرّمات ومنہیات کا ارتکاب کر بیٹھو اور اپنے دین کو نقصان پہنچا دو) اور یاد رکھو سب سے پہلا فتنہ[1] بنی اسرائیل میں عورتوں ہی کی وجہ سے ظاہر ہوا تھا (مسلم شریف)

(۱۱) فرمایا: نحوست کی علامتیں عورت گھر اور گھوڑے میں ظاہر ہوسکتی ہیں (بخاری ومسلم) صاحبِ مرقاۃ نے لکھا کہ عورت میں اس طرح کہ اس سے اولاد نہ ہو یا اس کا مہر وغیرہ زیادہ ہو (کہ مردادانہ کرسکے) یا وہ بداخلاق بدزبان وغیرہ ہو، گھر میں تنگی اور بُرے پڑوس کے سبب سے، اور گھوڑے میں اس طرح کہ وہ سرکش منہ زور ہو، آسانی سے سواری کا کام نہ دے اور جہاد میں بھی کام نہ آئے جو شرعاً گھوڑا پالنے کا بڑا مقصد ہونا چاہیے، دوسرا مطلب حدیث کا یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے حضور علیہ السلام نے اپنی امت کو ہدایت کی ہے کہ اگر گھر کسی وجہ سے اچھا نہ ہو تو اس کو بدل دے، بیوی اگر موافقِ مزاج اور رکھنے کے قابل نہ ہو تو اس کو طلاق دے دے اور گھوڑا اگر ٹھیک نہ ہو تو اس کو فروخت کر دے، لہٰذا اس حدیث سے بدفالی لینے کا جواز نہیں نکلتا اور دوسری حدیث میں اس کی صراحت سے ممانعت آئی ہے اور حضرت عائشہؓ سے شوم (نحوست) کا مطلب سوءِ خلق (بدخلقی) وارد ہے یعنی ان چیزوں کی وجہ سے سوءِ خلق کی نوبت آتی ہے اس کے علاوہ یہ کہ امام مالک، احمد اور بخاری نے اس حدیث کو بہ لفظ ان كان الشوم فى شيئى ففى الدار الخ روایت کیا ہے، یعنی اگر نحوست ہوا کرتی تو ان تین چیزوں میں ہوتی (مرقاۃ ص۴۰۵)

(۱۲) فرمایا:۔ اے نوجوانو:۔ اگر تم مہر بان ونفقہ کی استطاعت رکھتے ہو تو ضرور نکاح کرو کہ اس سے نگاہ وشرم گاہ کی حفاظت

---

[1] یہاں بھی فتنہ کی ابتداء عورتوں سے ہوئی، مردوں سے نہیں، معلوم نہیں علامہ آزادؒ نے اس کی کیا تاویل سوچی ہوگی، اور علامہ مودودیؒ دام فیضہم اس حدیث مسلم کا کیا جواب دیں گے جو کہتے ہیں کہ اس قسم کے تخیل سے عورتوں کی پستی ثابت ہوتی ہے جس کی جوابدہی میں ہمیں دقت پیش آتی ہے، حالانکہ خود ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کے مطابق اسلامی احکام کی تعبیر کرنا سخت غلطی ہے وغیرہ ملاحظہ ہو پردہ ص۳۵۳، ص۳۵۵، ۳۸۵، ۳۹۰! ''مؤلف''

ہے(بخاری ومسلم) یعنی بُری نگاہوں سے بچو گے جو زنا کا پیش خیمہ ہوتی ہیں، اور زنا سے بھی جو شریعت و اخلاق کی رو سے جرم عظیم ہے، قرآن مجید میں ہے یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور (اللہ تعالیٰ نگاہوں کی خیانت کو بھی جانتے ہیں اور دلوں کے بُرے ارادوں سے بھی واقف ہیں) مفسرین نے لکھا کہ اجنبی عورتوں پر جو نفسانی و شہوانی قسم کی نظریں پڑتی ہیں، اور ان کے زیر اثر جو دلوں میں ناجائز جنسی میلانات پیدا ہوتے ہیں، ان سب کو خدا دیکھتا اور جانتا ہے اور ان سب پر آخرت میں مواخذہ ہوگا، اور اگر اتفاقاً نگاہ کا گناہ سرزد ہو جائے تو اس سے فوراً توبہ کرنی چاہیے تا کہ اس کی خرابی کا اثر دلوں تک نہ پہنچے اور دل کے مبتلا ہونے پر بھی اگر تنبیہ ہو جائے تو استغفار کر کے اس کے سیاہ داغ مٹا دے اور اس کے آگے ظاہری جوارح (ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ) کے ذریعہ اس معصیت کو ہرگز نہ بڑھنے دیں، کیونکہ زنا تک پہنچانے والی سب باتیں زنا کے حکم میں ہو جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب سے محفوظ رکھے اور غضبِ الٰہی میں مبتلا ہونے سے بچائے، درحقیقت بری نظریں ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ہیں، جن سے انسان کے اخلاق و روحانیت مسموم ہوتی ہیں۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جس طرح مردوں کی نظریں اجنبی عورتوں پر پڑ کر خیانت کرتی ہیں، عورتوں کی نظریں بھی اجنبی مردوں پر پڑ کر خیانت کی مرتکب ہوتی ہیں، اسی لئے بری نگاہیں ہٹانے کا حکم دونوں کو برابر سے ہوا ہے اور فتنے کے اسباب دونوں کی طرف سے مہیا ہو سکتے ہیں، کسی ایک جنس کو زیادہ پاکدامن یا زیادہ بداطوار قرار دینا درست نہیں ہے۔

حدیثِ مذکور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص باوجود استطاعت کے نکاح نہ کرے، یا نکاح کے بعد بھی بدنظری وغیرہ کے گناہوں میں مبتلا ہو تو دونوں صورتوں میں گناہ گار ہوگا، اسی طرح اگر عورت نکاح کے بعد غیر مردوں کو تانکتی جھانکتی ہے یا ان کے سامنے اظہارِ زینت کرتی ہے یا کسی اور طور طریقہ سے ان کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے تو وہ بھی گناہ گار ہوتی ہے۔

(۱۳) ارشاد فرمایا: کسی عورت سے نکاح چار وجہ سے کیا جاتا ہے، مال کی وجہ سے (کہ عورت مالدار ہو یا بہت سا جہیز لائے گی، حسب نسب کی وجہ سے (کہ بڑے خاندان یا وجاہت والی ہے) حسن و جمال کی وجہ سے، اور دین کی وجہ سے (کہ دینداری اور حسن سیرت و کردار کی حامل ہو) پھر فرمایا کہ ان سب میں بہتر دیندار عورت ہے اس سے تمہیں دین و دنیا کی فلاح حاصل ہو سکتی ہے اگر تم نے اس پر دوسرے اوصاف کو ترجیح دی تو تم بہت بڑی خیر و فلاح سے محروم رہو گے (بخاری ومسلم) تربت یداک کا یہی مطلب صاحبِ مرقاۃ نے بیان کیا ہے اور قاضیؒ کا قول شرحِ حدیث کے لئے نقل کیا کہ عام طور سے لوگ عورتوں کے نکاح میں ان چار باتوں میں سے کوئی بات دیکھا کرتے ہیں، لیکن شرافت و دیانت کا صحیح تقاضہ یہ ہے کہ اوّل درجہ میں عورت کا دین و اسلامی سیرت مطمعِ نظر ہو، اور باقی اوصاف کا لحاظ ثانوی درجہ میں ہو، محقق ابن الہمامؒ نے فرمایا کہ اگر نکاح کے وقت عورت کی صرف عزت مال وحسب نسب پر نظر ہو تو وہ نکاح شرعاً ممنوع ہوگا (یعنی اگر دین کا لحاظ بالکل نظر انداز کیا گیا تو وہ شریعت کی نظر میں کسی طرح پسندیدہ نہیں ہو سکتا جبکہ نکاح ایک شرعی چیز ہے اور اس میں شریعت کی پسندیدگی کو پہلا درجہ ملنا چاہیے) چنانچہ اوسطِ طبرانی کی حدیث ہے کہ جو کوئی عورت کی عزت و منصب کی وجہ سے نکاح کرے گا اس کے نصیب میں اللہ تعالیٰ ذلت دیں گے، جو مال کی وجہ سے کرے گا اس کو فقر و افلاس میں مبتلا کریں گے، جو حسب و نسب کی وجہ سے کرے گا، اس کو پستی میں ڈال دیں گے، اور جو صرف اس بہتر مقصد کے لئے کرے گا کہ اپنی نگاہ کو پاک رکھے اور عفت و تقویٰ اختیار کرے یا صلہ رحمی کے لئے کرے تو اللہ دونوں میاں بیوی کو خیر و برکت سے نوازے گا ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ حسن و جمال کی وجہ سے نکاح مت کرو، ان کا حسن و جمال تکبر و غرور میں مبتلا کر کے ان کو برباد کرنے کا سبب ہو سکتا ہے اور مال کی وجہ سے بھی نہ کرو اس کی وجہ سے ان میں سرکشی پیدا ہو جاتی ہے، البتہ دین کی حیثیت سے جو بہتر ہو اس سے نکاح کرو، کیونکہ دیندار عورت اگر کالی صورت کی اور جسمانی عیب والی بھی ہو تو وہ سب سے افضل و بہتر ہے، شرح السنہ میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت حسنؓ سے اپنی بیٹی کے بارے میں مشورہ طلب کیا کہ رشتے بہت سے آئے ہیں کس سے

کروں؟ آپ نے فرمایا ایسے شخص سے کرو جو خدا سے ڈرتا ہو، کہ وہ اگر اس کو پسند کرے گا تو اس کا اکرام کرے گا، اگر ناپسند ہوگی تب بھی ظلم سے تو باز رہیگا، یعنی جو دیندار و متقی نہ ہوگا، وہ ظلم و زیادتی تک بھی نوبت پہنچادے گا (مرقاۃ ۳۰۳؍۳)

(۱۴) ارشاد فرمایا کہ دنیا کی ساری نعمتیں محدود، عارضی اور تھوڑے وقت کے فائدہ کی ہیں، اور ان میں سب سے بہتر دنیا کی نعمت نیک بیوی ہے (مسلم شریف) کیونکہ وہ آخرت والی ہمیشہ کی زندگی سُنوارنے میں مدد دیتی ہے، اسی لئے حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ میں حسنہ سے مراد نیک بیوی ہے اور فی الاخرۃ حسنۃ سے مراد حورِ جنت ہے اور وقنا عذاب النار سے مراد زبان دراز و بدزبان عورت ہے، علامہ طیبی نے کہا کہ صالحہ کی قید نے بتلایا کہ اگر عورت میں صلاح نہ ہو تو وہ موجب شر و فساد ہے۔ (مرقاۃ ۴۰۴؍۳)

(۱۵) فرمایا:۔ جب کبھی تمہیں کسی اچھے دین و اخلاق والے لڑکے یا لڑکی کا رشتہ میسر ہو، اس کو قبول کر کے نکاح میں جلدی کرو، اگر ایسا نہ کرو گے تو بڑے فساد و فتنہ کا اندیشہ ہے (ترمذی شریف) یعنی اگر تم مال و جاہ کی تلاش میں رہ کر تاخیر کرو گے تو بہت سے لڑکے اور لڑکیاں بغیر نکاح کے رکی رہیں گی، جس سے بداخلاقی زنا وغیرہ کا شیوع ہوگا اور اس کی وجہ سے تباہی و بربادی آئے گی، علامہ طیبی نے کہا کہ اس حدیث سے امام مالکؒ کی دلیل ملتی ہے جو کہتے ہیں کہ کفاءت میں صرف دین کا اعتبار ہے اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ چار چیزوں میں برابری دیکھی جائے، دین، حریت، نسب اور پیشہ لہٰذا مسلمان عورت کا نکاح کافر سے، نیک عورت کا فاسق فاجر سے، آزاد عورت کا غلام سے، اعلیٰ نسب والی کا کم نسب سے تاجر یا اچھے پیشہ والی کی لڑکی کا اس مرد سے جو کوئی خبیث و گندہ پیشہ کرتا ہو، نکاح درست نہیں ہوتا، لیکن اگر خود عورت یا اس کا ولی غیر کفو میں نکاح پسند کرے تو نکاح ہو جائے گا۔ (مرقاۃ ۴۰۶؍۳)

(۱۶) تقوائے خداوندی کے بعد سب سے بڑی نعمت ایک مومن کے لئے نیک بیوی ہے جس کو حکم کرے تو وہ فرمانبرداری کرے، اور اس کو دیکھے تو شوہر کا دل خوش کر دے، اگر اس کے بھروسہ پر شوہر کوئی قسم اٹھالے تو وہ بیوی اس کو پورا کر دکھائے اور اگر شوہر باہر چلا جائے تو وہ بیوی اپنے بارے میں پاکدامن اور شوہر کے مال میں خیرخواہ ثابت ہو (ابن ماجہ)

اطاعت کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کا حکم حدِ شرح میں ہو کیونکہ شریعت کے خلاف امور میں اطاعت جائز نہیں، دل خوش کرے یعنی اچھی صورت وسیرت وحسنِ معاشرت سے ہنس مکھ اور بااخلاق ہو، قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم اٹھالے جو بیوی کو ناپسند ہو پھر بھی وہ شوہر کی قسم پوری کرنے کو اپنی مرضی کے خلاف اس کام کو کر دے یا ترک کر دے کیونکہ اس سے وہ شوہر کی موافقت کے لئے اپنی مرضی پر اس کی مرضی کو ترجیح دینے کا ثبوت پیش کرے گی (مرقاۃ ۴۰۸؍۲)

(۱۷) فرمایا:۔ سب سے بڑی برکت و خیر والا نکاح وہ ہے جس میں بوجھ بار کم سے کم ہو (بیہقی) یعنی مہر ونفقہ وغیرہ کا بار زیادہ نہ ہو (مرقاۃ ۴۰۸؍۳)

(۱۸) فرمایا نکاح کے ذریعہ آدھا دین محفوظ ہو جاتا ہے چاہیے کہ خدا سے ڈر کر باقی نصف دین کی بھی حفاظت کرے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ دین میں خرابی بدکرداری یا حرام خوری دو طریقوں سے آتی ہے نکاح کرنے سے نفس و شیطان کے مکائد سے بچ سکتا ہے کہ نگاہ کے گناہ اور بدچلنی کی راہ سے دور ہو جاتا ہے، آگے روزی کمانے اور کھانے پینے کے حرام طریقوں سے بچنا آدھے دین کی حفاظت کا سبب ہو جائے گا۔ (مرقاۃ ۴۰۸؍۳)

(۱۹) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی اجنبی عورت پر اچانک بلا ارادہ نظر پڑ جانے کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا آئندہ نظر کو ہٹالو (مسلم شریف) یعنی دوبارہ نظر مت ڈالو، کیونکہ پہلی نظر بلا اختیار ہونے کی وجہ سے معاف ہے اور اگر دیکھے جائیگا تو گناہ ہوگا، قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ اگر عورت اپنا چہرہ بھی نہ چھپائے تب بھی مرد کو اپنی نگاہ نیچی کرنا ضروری ہے صرف ضرورتِ شرعی صحیح کے وقت نظر جائز ہے (مرقاۃ ۴۱۰؍۳)

(۲۰)فرمایا:۔عورت سامنے سے آئے یا پیچھا پھر کر جائے شیطان کی صورت میں ہوتی ہے (کہ اس سے بھی دل میں بُرے خطرات ووساوس آتے ہیں اور گمراہی، فتنہ وفساد کا سروسامان ہوتا ہے، لہٰذا اگر اتفاقاً کوئی عورت سامنے آجائے اور قلب ونظر کو اچھی معلوم ہو اور برے خیالات آئیں تو چاہیے کہ اپنی بیوی کا خیال وتصور کرے اور اسکے پاس جائے اس سے وہ دل کے بُرے خیالات ختم ہوجائیں گے (مسلم شریف)

علامہ نوویؒ نے لکھا کہ عورت کو شیطان سے مشابہت اس لئے ہے کہ وہ بھی بُرائی وشر کی طرف بلاتا ہے اور برائی کو مزیّن کرکے پیش کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو بلاضروت کے اپنے گھر سے نکلنا نہ چاہیے اور نہ لباس فاخرہ پہنے، اور مردوں کو چاہیے کہ اس کی طرف اور اس کے لباس کی طرف نہ دیکھیں الخ (مرقاۃ ۱۱۰/۳)

(۲۱)ارشادفرمایا:۔عورت جب باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو مردوں کی نظروں میں حسین وجمیل بنا کر پیش کرتا ہے (ترمذی شریف) یا اس کو شیطان امید وطمع کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کو بھی گمراہ کرے گا، اور اس کی وجہ سے دوسروں کو بھی (کہ دونوں طرف جنسی میلانات کو ابھارے گا، اسی لئے عورتوں کو شیطان کے جال بھی کہا گیا، یا شیطان سے مراد انسانوں میں کے شیطان ہیں اہل فسق وفجور میں سے کہ جب وہ عورت کو باہر نکلتے دیکھتے ہیں تو شیطانی وساوس وخیالات دل میں ڈالتے ہیں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ عورت جب باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کے خیالات وجذبات پر تسلط کرکے اس کو خبیثات کے زمرے میں داخل کرادیتا ہے، حالانکہ وہ پہلے سے طیبات میں سے تھی (مرقاۃ ۱۱۱/۳)

(۲۲) کوئی شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے، کیونکہ ان کا تیسرا شیطان وہاں ضرور ہوتا ہے (ترمذی شریف) یعنی شیطان اس موقع پر ضرور دونوں کے خیالات خراب کرکے گناہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرے گا، اس لئے ایسی صورت سے سخت اجتناب کرنا چاہیے (مرقاۃ ۱۱۳/۳)

(۲۳)ایسی عورتوں کے پاس ہرگز نہ جاؤ، جن کے شوہر گھر پر نہ ہوں، کیونکہ شیطان تمہاری رگوں میں خون کی طرح دوڑتا پھرتا ہے (یعنی تم محسوس بھی نہیں کرسکتے اور وہ اپنا کام شروفساد پر آمادہ کرنے کا برابر کرتا رہتا ہے) صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپ کے لئے بھی شیطان ایسا ہی ہے؟ آپ نے فرمایا! ہاں! میرے لئے بھی، مگر حق تعالیٰ نے میری مدد فرمائی کہ اس کے شر سے مامون رہتا ہوں (مرقاۃ ۱۱۳/۳) اس حدیث کی مکمل ومفصل شرح مرقاۃ ۱۱۶/۱ میں ہے۔

(۲۴)ارشادفرمایا کہ حق تعالیٰ بری نظر ڈالنے والے پر اور اس پر بھی جو بغیر کسی عذر وضرورت کے اپنے کو دکھائے لعنت بھیجتا ہے یعنی ان دونوں کو اپنی رحمت سے دور کردیتا ہے (بیہقی) معلوم ہوا ہر ناجائز نظر لعنت کی مستحق ہے (مرقاۃ ۱۱۵/۳)

(۲۵)فرمایا:۔جس مسلمان مرد کی پہلی نظر اتفاقاً کسی عورت کے حسن وجمال پر پڑجائے اور وہ اپنی نظر ہٹالے، تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسی عبادت کی توفیق عطا فرمائے گا جس کی حلاوت اس کو محسوس ہوگی۔ (مسند احمد) علامہ طیبی نے فرمایا کہ ایسے شخص کے لئے عبادات کی مشقت وتکلیف باقی نہیں رہتی اور ایسے مقام سے سرفراز ہوجاتا ہے، جس میں نماز وغیرہ عبادات آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہیں (مرقاۃ ۱۱۴/۳) پہلے بدنظری کے نقصانات ومضرتیں معلوم ہوئی تھیں اور یہاں اس سے بچنے پر انعام عظیم بتلایا گیا ہے۔ وللہ الحمد والمنہ۔

(۲۶)ارشادفرمایا:۔اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت نہ سڑا کرتا، اور اگر حواؑ نہ ہوتیں تو کوئی عورت ساری عمر کبھی اپنے شوہر کی خیانت نہ کرتی (بخاری ومسلم) یعنی بنی اسرائیل نے حکم خداوندی کے خلاف بٹیروں کا گوشت ذخیرہ کیا تھا اس لئے سزا ملی کہ وہ سڑنے لگا، اس سے پہلے کتنے ہی دن رکھا رہتا تھا تب بھی نہ سڑتا تھا، قال تعالیٰ ان اللہ لا یغیر مابقوم حتی یغیر وا ما بانفسھم اور حضرت حواؑ نے حکم خداوندی کے خلاف شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانے کا پہلے ارادہ کیا پھر حضرت آدم علیہ السلام کو بھی رغبت دے دے کر آمادہ کرلیا، پھر دونوں نے ساتھ کھایا، اور نافرمانی کی، جس پر عتاب الٰہی کے مستحق ہوئے، خیانت کا صدور اُسی عوج وٹیڑھ پن کے سبب ہوا جو عورت کی طینت

ودیعت میں رکھا گیا ہے بعض نے کہا کہ خیانت یہ تھی کہ حضرت حواءؓ نے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے اس پھل کو کھایا تھا، حالانکہ انہوں نے بھی حضرت حواؓ کو اس سے روکا تھا، پھر حضرت حواءؓ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی کھانے پر آمادہ کرلیا (مرقاۃ ۲۶۱ ۳)

بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت حواءِ کو سب سے پہلے گناہ کا مرتکب قرار دینا عورت کے مرتبہ کو گرانا ہے، وہ لوگ بخاری ومسلم کی اس حدیث کا کیا جواب دیں گے؟ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے ابتداء نہیں کی تو کیا حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلا مرتکبِ گناہ قرار دیا جائے گا، جو سب سے پہلے خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے، رہا یہ احتمال کہ دونوں نے ایک وقت آنِ واحد میں گناہ کا ارتکاب کیا ہوگا، تب بھی تو اولیت کی نسبت دونوں ہی کی طرف ہوگی، اور ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمت و عصمت کی رعایت غیر پیغمبر کی عصمت کے مقابلہ میں فرق مراتب کے اصول سے بھی نہایت ضروری ہے معلوم نہیں صنف نازک کی اس قدر حمایت کا بے پناہ جذبہ دل ودماغ کی گہرائی میں کیسے اتر گیا کہ نہ صرف مرد کے مقابلہ میں بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر کے مقابلہ میں بھی اس کو ابھار کر آگے لانے کی سعی کرنی پڑی، والد نیا دار العجائب ہم اس بارے میں پہلے بھی کچھ لکھ آئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۲۷) ارشاد فرمایا:۔ جو شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے، اور وہ بغیر کسی عذرِ شرعی کے انکار کردے اور شوہر کو ناراض کرے تو فرشتے صبح تک اس عورت پر لعنت بھیجتے ہیں (بخاری ومسلم) ایک روایت ہے کہ حق تعالیٰ آسمان پر اس عورت سے ناراض ہوتے ہیں یہاں تک کہ شوہر اس سے راضی ہوجائے، جب شوہر کی مذکورہ حاجت کے لئے اطاعت نہ کرنے پر حق تعالیٰ کی ناراضی اس طرح متوجہ ہوتی ہے تو ظاہر ہے اگر شوہر کسی دینی امر کے لئے حکم کرے اور بیوی تعمیل نہ کرے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا غضب وغصہ کس قدر ہوتا ہوگا؟! (مرقاۃ ۴۶۳/۳/۲)

(۲۸) حضور اکرم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ سے سخت غم وغصہ کے تحت ایک ماہ تک علیحدہ رہنے کی قسم کھائی تھی (بخاری ۷۸۲) یہ واقعہ بخاری وغیرہ میں تفصیل سے آیا ہے اور مشہور ہے اس کے بعد آیتِ تخییر نازل ہوئی جس میں ازواجِ مطہرات کو اختیار دیا گیا کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ رہنا ہے تو تنگی ترشی سے جس طرح بھی آپ چاہیں گے گزارہ کرنا پڑیگا کیونکہ آپ کو اختیاری طور سے فقر وفاقہ کی زندگی ہی محبوب وپسندیدہ تھی، ورنہ ان کو آپ سے الگ ہوجانے کا اختیار ہے، اس پر سب نے حضور علیہ السلام کی رفاقت ہی کو اختیار کرلیا تھا۔

معلوم ہوا کہ عورتوں کی طینت وسرشت میں حبّ جاہ ومال اور شوق زیب وزینت رکھدیا گیا ہے، اور جب بھی اس جذبہ کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے یہ ضرور ابھرتا ہے حتی کہ اس سے سید المرسلین علیہ افضل الصلوات والتسلیمات کا گھرانہ بھی محفوظ و مستثنیٰ نہیں رہا، اور بڑی آزمائشوں کے بعد آخری دورِ نبوت میں ازواجِ مطہراتؓ کے مزاج پوری طرح سے مزاج نبوت کے موافق ہوسکے، اور آپ کی گھریلو زندگی کے واقعات سے بہت بڑا سبق اور ہدایت کا سرچشمہ ملتا ہے اور ان واقعات سے حضورِ اکرم ﷺ کی انتہائی اولوالعزمی اور صبرِ عظیم کا ثبوت ملتا ہے۔

ومایلقها الا الذین صبروا وما یلقها الا ذوحظ عظیم !صبرِ عظیم اور حظِ عظیم والے ہی اس آزمائش میں کامیاب ہوسکتے ہیں) مرقاۃ ۴۶۰/۳ میں ایک قول نقل کیا گیا ہے، الصبر عنهن الیسر من الصبر علیهن، والصبر علیهن اهون من الصبر علی النار، قال تعالیٰ وان تصبر واخیر لکم (نساء) ای علیهن اور عنهن، یعنی عورتوں کے بغیر اس دنیا میں گزر کرنا بھی دشوار تو ہے مگر اس سے آسان ہے کہ ان کے ساتھ رہ کر ان کی وجہ سے پیش آنے والی تلخیوں پر صبر کرے، اور ان پر صبر کرنا آگ پر صبر کرنے سے آسان ہے گویا عورتوں کے ابتلاء سے بڑا ابتلاء صرف آگ یا دوزخ ہی کا ابتلاء ہوسکتا ہے یا یہ کہ اس سے بڑا ابتلاء دنیا میں دوسرا نہیں ہے اس لئے کہ یہ اپنوں سے اور اپنے گھروں میں پھر ہر وقت اور خلافِ توقع پیش آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۲۹) ارشاد فرمایا:۔ اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم کرتا تو عورت کو حکم کرتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے اور فرمایا کہ جو عورت شوہر کو راضی چھوڑ کر مرجائے وہ جنت کی مستحق ہوجاتی ہے (ترمذی شریف) یعنی عورت پر اپنے شوہر کے اتنے زیادہ حقوق ہیں کہ وہ ان کو ادا

کرنے سے عاجز ہیں اور صرف سجدہ سے اس کی ادائیگی یا شکر بجا آوری ہوسکتی تھی، جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ یہ حق صرف معبودِ حقیقی کے لئے مخصوص ہو چکا، یہ مجبوری نہ ہوتی تو عورت اپنا حقِ شکر ادا کر دیتی، اور عورت کا شوہر اگر عالم متقی ہو تو ظاہر ہے اس کی اطاعت و رہنمائی میں عورت نے تمام حقوقِ خداوندی و حقوقِ عباد ادا کئے ہوں گے اس لئے اس کا مستحق جنت ہونا بھی بے شبہ ہے (مرقاۃ ۴۶۷/۳)

(۳۰) حضرت لقیط بن صبرہؓ راوی ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! میری بیوی زبان دراز اور بدزبان ہے آپ نے فرمایا کہ اس کو طلاق دے دو، میں نے کہا اس سے میرے بچے ہیں اور ایک مدت سے میرا اس کا ساتھ ہے (یعنی طلاق دینا مصلحت و مروت کے خلاف ہے) فرمایا اچھا اس کو نصیحت کرو، سمجھاؤ، اگر اس میں خیر کا کچھ جزو ہے تو تمہاری نصیحت قبول کریگی اور دیکھو کبھی اپنی بیوی کو باندیوں کی طرح نہ مارنا (ابوداؤد) دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ کی بندیوں کو مت مارو، حضرت عمرؓ نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کیا کہ (آپ کے ارشاد پر) عورتیں مردوں پر اور زیادہ حاوی ہوگئی ہیں آپ نے مارنے کی اجازت دے دی تو پھر بہت سی عورتوں نے حضور علیہ السلام کے گھروں میں جا کر اپنے شوہروں کی مار کی شکایت کی، اس پر آپ نے فرمایا کہ میرے اہل وعیال کے پاس بہت سی عورتیں اپنے ازواج کی شکایت لے کر آئی ہیں، ایسے لوگ اچھے نہیں ہیں۔ (ابوداؤد) یعنی تم میں سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کی باتوں پر صبر و تحمل کریں، اور بغیر مار پیٹ کے ہی سمجھا بجھا کر کام لیں، ان کو ادب و سلیقہ بتائیں، اور اتنی مار پیٹ تو کبھی بھی نہ کریں جس کی وہ شکایت کرتی پھریں، ترتیب احکام اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام نے پہلے مارنے سے روکا ہوگا، اس پر وہ اور دلیر ہوگئیں، اور حضرت عمرؓ کو اس امر کی حضور علیہ السلام کی خدمت میں شکایت کرنی پڑی تو آپ نے مارنے کی اجازت دی اور اس کی موافقت میں آیت بھی اتری جس میں دوسری تدابیر موثر نہ ہونے کی صورت میں مارنے کی اجازت ہوئی، پھر جب لوگوں نے زیادہ مار پیٹ کی اور اس کی شکایت آئی تو آخر میں آپ نے فرمایا کہ گو عورتوں کی بداخلاقی وغیرہ پر ان کو مارنا مباح ہے لیکن ان کے اس طرزِ عمل کے مقابلہ میں بھی تحمل و صبر کرنا اور نہ مارنا ہی زیادہ بہتر و افضل ہے، امام شافعیؒ سے بھی یہی مراد نقل ہوئی (مرقاۃ ۴۶۸/۳)

(۳۱) مومنوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہوں اور جو اپنے اہل کے ساتھ زیادہ لطف و محبت سے پیش آنے والے ہوں دوسری حدیث میں فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لئے بہتر ہیں (ترمذی شریف) اس لئے کہ کمالِ ایمان حسنِ خلق اور تمام انسانوں کے ساتھ احسان کرنے کا مقتضی ہے (مرقاۃ ۴۶۸/۳)

(۳۲) فرمایا جس شخص کو چار چیزیں مل گئیں، اس کو دنیا و آخرت کی خیر و فلاح مل گئی، شکر گذار دل خدا کو یاد کرنے والی زبان، دنیا کی مصیبتوں اور بلاؤں پر صبر کرنے والا بدن اور پاکدامن ہمدرد بیوی (بیہقی) یعنی ایسی پاک دامن اور عفت مآب ہو کہ وہ دوسرے مرد کو نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھے اور نہ اس سے کسی قسم کی خیانت کا احتمال و خطرہ ہو، اور شوہر کے مال و سامان کے بارے میں پوری طرح خیر خواہ و ہمدرد ہو (مرقاۃ ۴۷۱/۳)

(۳۳) فرمایا:۔ علیحدگی پسند اور خلع و طلاق سے رغبت رکھنے والی عورتیں منافقوں میں شمار ہیں (نسائی شریف) یعنی جو عورتیں دل سے اپنے شوہروں کی محبت نہیں کرتیں، یا ان کے تعلق کو پسند نہیں کرتیں، اور جو عورتیں بغیر کسی معقول سبب کے خلع و طلاق کے لئے موقع اور بہانہ ڈھونڈتی رہتی ہیں، (ان کا یہ عمل منافقانہ ہے اس لئے) وہ منافقوں کی طرح گنہگار ہیں (مرقاۃ ۴۸۱/۳)

(۳۴) ایک شخص نے عرض کیا، میری بیوی غیر مردوں سے احتیاط نہیں کرتی، حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کو طلاق دے دو اس نے کہا مجھے اس سے بہت تعلق و محبت ہے، فرمایا، ایسا ہے تو اس کو روکو (ابوداؤد و نسائی شریف) اس سے معلوم ہوا کہ کسی مجبوری میں ایسی عورت سے بھی شادی کر سکتے ہیں جس سے فجور یا بدچلنی کا اندیشہ ہو مجبوری مثلاً یہ کہ دوسری اس کو پسند یا میسر نہ ہو اور بغیر نکاح کے زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، وغیرہ ایسی صورت میں واجب ہے کہ اس کو ہر طرح سے سمجھائے اور پوری کوشش اس کی حفاظت میں کرے (مرقاۃ ۵۰۵/۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بہتر یہی ہے کہ ایسی عورت کو طلاق دے دو، جس طرح حضور علیہ السلام نے بدزبان عورت کے لئے بھی طلاق ہی کا مشورہ دیا تھا، مگر حالات کی مجبوری سے رکھ لینا بھی حدّ جواز میں ہے بشرطیکہ صبر وتحمل اور حفاظت پر قادر ہو۔

(۳۵) ارشاد فرمایا:۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو مال ودولت عطا کرے تو پہلے اسکو اپنے اوپر اور اپنے اہل بیت (ازواج واولاد) پر خرچ کرے (مسلم شریف)

(۳۶) ایک عورت دوسری سے اتنی بے تکلف نہ ہو جائے کہ اپنے شوہر کی راز وتنہائی کی باتیں بھی اس سے کہہ دے اور اس غیر مرد کے علم میں وہ باتیں اس طرح آ جائیں جیسے وہ خود ان کو دیکھ رہا ہو (ابو داؤد وترمذی) معلوم ہوا کہ اس طرح کا راز افشاء کرنا شرعاً حرام ہے، اور چونکہ شرعی حکم کی قیمت واہمیت صرف مسلمان عورتیں ہی سمجھ سکتی ہیں، اسلئے علماءِ نے لکھا کہ غیر مسلم عورتوں کے سامنے بھی مسلمان عورتوں کو بے محابا وبے حجاب نہ آنا چاہیے اور اپنی خاص زیب وزینت اور جسمانی زیبائش ان پر ظاہر نہ کرنی چاہیے کہ وہ اپنے مردوں سے کہیں گی، جس سے خرابیوں کا دروازہ کھلے گا، اسی طرح بدچلن عورت کا بھی حکم ہے خواہ وہ مسلمان ہی ہوں کیونکہ اول تو ان کی صحبت وزیادہ اختلاط سے بھی احتراز چاہیے، دوسرے وہ بھی اس کی عادی ہوتی ہیں کہ عورتوں کے محاسن، غیر مردوں تک پہنچاتی ہیں۔

(۳۷) سب سے زیادہ بدترین اور خدائے تعالیٰ کی نظر میں گرا ہوا وہ مرد یا عورت ہے جو زن وشوہر کی راز کی باتیں دوسروں سے کہے (مسلم وابوداؤد)

(۳۸) جو شخص حالتِ حیض میں اپنی بیوی سے مقاربت کرے اور پھر اس سے جو بچہ پیدا ہو وہ جذام میں مبتلا ہو جائے تو اسے اپنے ہی نفس کو ملامت کرنی چاہیے۔ (اوسط)

(۳۹) جو عورت اپنے شوہر کو تکلیف دیتی ہے اس کو حورِ جنت کہتی ہے کہ خدا تیرا بُرا کرے اس کو ایذا مت دے، وہ تو تیرے پاس چند روز کا مہمان ہے، جلد ہی تجھ سے جُدا ہو کر ہمارے پاس آ جائے گا (ترمذی شریف)

(۴۰) دو آدمیوں کی نماز سر سے اوپر نہیں جاتی (یعنی قبول ہو کر خدا کے حضور نہیں جاتی) ایک غلام مالک سے بھاگا ہوا، دوسرے وہ عورت جو شوہر کی نافرمانی کرے، جب تک وہ دونوں باز نہ آئیں (اوسط وصغیر بحوالہ جمع الفوائد ۱/۲۲۷)

(۴۱) حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میری نظر میں وہ عورت مبغوض ہے جو اپنے گھر سے نکل کر دوسروں سے اپنے شوہر کی شکایتیں کرتی پھرے (کبیر واوسط)

(۴۲) فرمایا:۔ عورتیں حمل وولادت کی سختیاں جھیلتی ہیں اور بچوں کو رحم وشفقت سے پالتی ہیں، اگر وہ شوہروں کے ساتھ بدسلوکی وکج خلقی وغیرہ کی باتیں نہ کریں تو ان میں سے نماز پڑھنے والیاں تو ضرور ہی جنت میں داخل ہو جائیں گی (قزوینی)

(۴۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک دن حضور علیہ السلام کے لئے حریرہ تیار کیا، حضرت سودہؓ بھی موجود تھیں میں نے ان سے کھانے کو کہا تو انکار کر دیا، میں نے کہا یا تو کھاؤ ورنہ یہ حریرہ تمہارے منہ پر مل دوں گی، اس پر بھی انہوں نے انکار ہی کیا تو میں نے حریرہ کے پیالہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے منہ پر خوب اچھی طرح سے مل دیا، حضور علیہ السلام یہ دیکھ کر ہنسے اور پھر حضرت سودہ سے فرمایا کہ اب تم اسی طرح عائشہ کا منہ خراب کرو، انہوں نے ایسا ہی کیا، اور حضور دیکھ کر ہنستے رہے اتنے میں حضرت عمرؓ آ گئے آپ نے فرمایا جاؤ! اٹھ کر اپنے اپنے منہ دھولو، اس کے بعد میں حضرت عمرؓ سے ڈرنے لگی، کیونکہ حضور علیہ السلام کو ان کا لحاظ کرتے دیکھا (موصلی ۱/۲۲۹)

(۴۴) حضرت رزینہؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت سودہؓ حضرت عائشہؓ وحفصہؓ کے پاس عمدہ لباس وزینت میں آئیں، حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ یہ اس طرح آئی ہیں اور ایسی حالت میں حضور علیہ السلام آ جائیں گے تو ہم کو پھٹے پُرانے کپڑوں میں بُرے حال سے دیکھیں گے اور یہ ہمارے بیچ میں زرق برق لباس پہنے بجی بیٹھی ہوگی، دیکھو! میں اس کا علاج کروں گی، پھر حضرت سودہؓ سے کہا تمہیں کچھ خبر بھی ہے وہ کانا دجال نکل آیا، وہ یہ سُن کر ڈر گئیں اور سارا بدن کپکپانے لگا، اور کہنے لگیں میں کہاں چھپوں؟ حضرت حفصہؓ نے کہا کہ یہ سامنے خیمہ

ہے اس میں چھپ جاؤ، وہ جا کر اس میں گھس گئیں اور وہاں گندگی اور مکڑی کے جالے وغیرہ تھے، اتنے ہی میں حضور علیہ السلام تشریف لے آئے اوران دونوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا کہ بات نہ ہوسکتی تھی، آپ نے پوچھا ہنسنے کی کیا بات ہے؟ تین مرتبہ دریافت کرنا پڑا، تب انہوں نے ہاتھوں سے اشارہ کر کے بتلایا کہ خیمہ میں جا کر ملاحظہ کریں، آپ وہاں گئے تو حضرت سودہ وہاں موجود ہیں اور کپکپی سے ان کا بُرا حال ہے، آپ نے فرمایا، سودہ! تمہیں کیا ہوا، یہاں کیوں چھپی ہو؟ کہا یا رسول اللہ! کانا دجال ظاہر ہوگیا ہے، آپ نے فرمایا نہیں، کہیں نہیں نکلا! البتہ کبھی نکلے گا ضرور، پھر آپ نے ان کو خیمہ کے اندر سے نکالا اور ان کے کپڑوں پر سے گرد وغبار اور مکڑی کے جالوں کو جھاڑا (موصلی وطبرانی)

فائدہ! اس قسم کے حضور علیہ السلام اور ازواجِ مطہرات کے خوش طبعی کے واقعات میں بھی بہت کچھ سبق اور ہدایت ملتی ہے کہ کچھ وقت اگر غم غلط کرنے کے لئے یا کسی کا دل خوش کرنے میں صرف ہوجائے تو وہ بھی دین ودیانت کے خلاف نہیں اسی لئے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ سے مزاح اور خوش طبعی کا ثبوت بھی ملتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ غلط یا جھوٹی بات نہ کہی جائے، دوسرے یہ کہ اُس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اگر کسی کا دل دکھایا گیا تو جائز نہ ہوگا، کتبِ حدیث میں کتاب الادب کے تحت مزاح کا باب بھی باندھتے ہیں، امام بخاریؒ نے باب الانبساط الی الناس (۹۰۵) میں بھی دو حدیث روایت کیں، ایک حضرت انسؓ سے کہ حضور علیہ السلام ہم سے بے تکلف ہو کر گھل مل کر رہتے تھے اور ہمارے ایک چھوٹے سے بھائی کو مزاحاً فرمایا کرتے تھے اے ابوعمیرؓ! کیا ہوا تمہارا نُغیر؟ اس نے لال پال رکھا تھا اور اس سے کھیلا کرتا تھا، دوسری حضرت عائشہؓ کی روایت پیش کی کہ جب میں حضور علیہ السلام کے پاس (شادی کے بعد شروع زمانہ میں) رہی تو لڑکیوں کے ساتھ گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی تھی، اگر حضور اس حالت میں آجاتے تو وہ میری سہیلیاں دوڑ کر پردہ کے پیچھے چلی جاتیں، اور آپ انھیں پکڑ کر میرے پاس لاتے اور وہ پھر میرے سامنے کھیلنے لگتی تھیں، اس کے علاوہ امام بخاریؒ نے جو مستقل کتاب ''الادب المفرد'' کے نام سے لکھی ہے وہ دو ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے، اس میں سب احادیث اخلاق ومعاشرت ہی سے متعلق ہیں، اس میں بھی مستقل بابِ مزاح لائے ہیں اور احادیث ذکر کی ہیں، کتاب فضل اللہ الصمد شرح الادب المفرد ۱/۳۶۳ میں شرح الاحیاء وغیرہ سے نقل کیا کہ بطورِ حسنِ معاشرت اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ تواضع وحسنِ اخلاق وغیرہ کا ثبوت پیش کرنے کو خوش طبعی ومزاح میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ تو مزاح وملاطفت کا برتاؤ کرنا اخلاقِ نبوت سے ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا ''آدمی کو اپنے گھر میں بچوں کی طرح بے تکلف رہنا چاہیے (یہ نہیں کہ منہ چڑھا ہوا ہو اور سب پر رعب وہیبت طاری کی جائے) پھر جب ضرورت پیش آجائے تو وہ ہر طرح مرد ثابت ہو''، یعنی مردانگی، جراءت اور کمالِ عقل کا بھی بہترین نمونہ نکلے، یہی بات حضرت لقمان حکیم سے بھی نقل ہے، امام غزالیؒ نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ مزاح اور بے تکلفی اختیار کرنے میں اعتدال ہونا چاہیے، یعنی اتنا انبساط اور ضرورت سے زیادہ خوش خلقی بھی نہ برتے کہ وہ بالکل نڈر ہو کر بداخلاقیوں پر اُتر آئیں، اور ان کی کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہوسکے، یا ہو تو بے اثر ہو، اسی لئے اگر کسی وقت بھی ان کا کوئی غلط رویہ علم ومشاہدہ میں آئے تو اس پر اپنے انقباض وناراضگی کا صاف طور سے اظہار کردے اور کسی حالت میں بھی برائیوں کا دروازہ ان کے لئے نہ کھلنے دے، نہ شریعت کی مخالفت کو برداشت کرے، ایسے وقت بھی اگر مزاح اور خوش طبعی کا ہی رویہ جاری رکھا جائے تو اس کو حضرت عمرؓ نہایت ناپسند کرتے تھے، اور فرماتے تھے، یہ مزاح، زاح عن الحق سے ہے جو حق وطریقِ شرعی مستقیم سے دور ہونے کا مرادف ہے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کی نظر کتنی گہری تھی اور وہ ہر معاملہ میں اعتدال کی کتنی رعایت کرتے تھے اور شریعت کا مقصود

لہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ تو حضور علیہ السلام نے ایک سفر میں دوڑ کا مقابلہ بھی کیا ہے جس میں وہ جیت گئی تھیں، پھر بعد کو ان کا بدن بھاری ہوگیا تھا اور دوسری دوڑ میں حضور علیہ السلام جیت گئے تھے، اور آپ نے فرمایا کہ یہ پہلے کا بدلہ ہوگیا (مشکوٰۃ ۲۸۱ عن ابی داؤد)

ومنشاء سمجھنے میں وہ کس قدر آگے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

(۴۵) حضرت عائشہؓ وحفصہؓ دونوں ایک سفر میں حضور علیہ السلام کے ساتھ تھیں، سفر عموماً رات کے وقت طے ہوتا تھا اور حضرت عائشہ حضور علیہ السلام کے ساتھ اونٹ پر ہوتی تھیں تو آپ ان سے باتیں کرتے ہوئے چلتے تھے، حضرت حفصہؓ کو اس کا خیال ہوا اور حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آج ایسا نہ کریں کہ تم میرے اونٹ پر سوار ہونا میں تمہارے اونٹ پر، پھر مناظرِ سفر کا مشاہدہ کریں، انہوں نے کہا اچھا ایسا ہی کریں گے رات کو سفر شروع کرنے کے وقت حضور علیہ السلام حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے، جس پر حضرت حفصہ تھیں، آپ سلام مسنون کے بعد ان کے ساتھ سوار ہو گئے، سفر پورا ہونے کے بعد اُتر گئے، حضرت عائشہؓ کی یہ رات بڑی مشکل سے کٹی، کیونکہ وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ سفر کی عادی تھیں، اور حالتِ سفر میں بہت سی کام کی باتیں بھی سُننے میں آتی تھیں وہ اپنی علمی ودینی مذاق میں سب پر فائق تھیں، اس لئے بڑا صدمہ گزرا اور اونٹ سے اُتر کر اذخر گھاس پر پاؤں ڈال کر بیٹھ گئیں اور لگیں بددعا کرنے، اے میرے رب! کوئی سانپ بھیج دے جو مجھے ڈس لے اور میرا کام تمام ہو جائے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس وقت غم وغصہ اور غیرت کے جذبہ سے میں اتنی متاثر تھی کہ زبان سے اس بددعا کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکتی تھی (بخاری ۷۸۴ ومسلم)

(۴۶) حضرت عائشہؓ نے فرمایا:۔ میرے علم میں حضرت صفیہؓ سے بہتر کھانا پکانے والی نہ تھی، ایک دن انہوں نے حضور علیہ السلام کے لئے کوئی چیز پکائی، اور وہ لے کر آئیں کہ آپ اس روز میرے گھر میں تھے اور میں رشک وغیرت کے شدید جذبہ کا شکار ہو گئی، اس برتن کو جس میں کھانا تھا، زمین پر دے مارا اور توڑ دیا، پھر ندامت ہوئی اور حضور علیہ السلام کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ اس فعل کا کفارہ بتلائیں، آپ نے فرمایا، اسی جیسا برتن اور ویسا ہی کھانا دو (ابوداؤد ونسائی)

بخاری شریف ۷۸۶ میں یہ بھی ہے کہ کھانا لانے والے خادم کے ہاتھ سے پیالا گرا اور ٹوٹ گیا تو حضور علیہ السلام نے اس پیالہ کے ٹکڑے زمین سے اٹھا کر جمع کئے اور وہ کھانا بھی زمین پر سے اٹھایا اور فرمایا کوئی بات نہیں، تمہاری امی کو غیرت آ گئی، پھر خادم کو روک کر دیا ہی پیالہ منگوا کر دیا اور ٹوٹا ہوا توڑنے والی بیوی کے گھر میں رہنے دیا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کے مزاج میں غیرت، زود تاثری وانفعال کا مادہ کچھ زیادہ تھا، اس لئے اور واقعات بھی اس قسم کے پیش آئے ہیں جن کی حیثیت محض وقتی وہنگامی تھی اور جلد ہی وہ اثر زائل بھی ہو جاتا تھا (جیسے یہاں برتن توڑنے کے بعد فوراً ہی ندامت کا اظہار فرما دیا) مثلاً قصہ افک میں آتا ہے کہ جب براءت کی آیات نازل ہوئیں اور حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کو اِس کی خوش خبری سنائی تو انہوں نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں، مگر آپ کا اور آپ کے صاحب کا نہیں جنھوں نے آپ کو بھیجا ہے۔

اکثر احادیث میں اسی قدر ہے مگر ازالۃ الخفاء ۷۸۵/۱ میں کسی روایت سے یہ اضافہ بھی ہے کہ پھر حضور علیہ السلام بھی ان کے پاس تشریف لائے اور ان کا بازو پکڑ کر بات کی تو انہوں نے آپ کا دستِ مبارک پکڑ کر جھٹک دیا، اور اس پر حضرت ابوبکرؓ نے جوتہ اٹھا کر ان کو مارنا چاہا، یہ دیکھ کر حضور علیہ السلام کو ہنسی آ گئی اور حضرت ابوبکرؓ کو قسم دے کر مارنے سے روک دیا۔

ایسا ہی دوسرا واقعہ مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے حضور علیہ السلام کے درِ دولت پر حاضر ہو کر اجازت طلب کی، اندر سے حضرت عائشہؓ کی آواز سُنی جو حضور علیہ السلام سے اونچی آواز میں بول رہی تھیں، حضور علیہ السلام نے ان کو اندر آنے کی اجازت دی تو انہوں نے حضرت عائشہ کو سخت لہجہ میں پکارا اے ام رومان کی بیٹی! تو حضور اکرم ﷺ سے اپنی آواز بلند کر کے بات کرتی ہے اور پکڑ کر مارنا چاہا، حضور علیہ السلام نے ان کا غصہ دیکھا تو ان کے درمیان ہو گئے اور حضرت عائشہ کو بچا دیا، جب حضرت ابوبکرؓ چلے گئے تو بطور مزاح وتلطف کے ان سے کہا دیکھو! میں نے آج کس طرح آڑے آ کر تمہیں بچا دیا، اس کے بعد پھر کسی دن حضرت ابوبکرؓ آئے اور اجازت طلب

کی آپ نے سنا کہ حضور علیہ السلام حضرت عائشہؓ سے ہنس کر باتیں فرمارہے تھے، اجازت پر اندر گئے تو حضور علیہ السلام سے گزارش کی کہ یارسول اللہ! مجھے آپ دونوں اپنی صلح میں بھی شریک کریں، جس طرح آپ دونوں نے مجھے اپنی لڑائی میں شریک کیا تھا۔ (الفتح الربانی ۲۳۳/۱۶)

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ایک بار حضور علیہ السلام میری باری کے دن شب کو بعد (عشاء) تشریف لائے (حسبِ معمول) چادر ایک طرف رکھی، جوتے نکالے اور تہمد کا کچھ حصہ بستر پر بچھا کر لیٹ گئے، کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مجھے سوتا ہوا خیال کر کے آہستہ سے چادر اٹھائی، نرمی سے جوتے پہنے، آہستہ سے کواڑ کھولے اور باہر ہو کر آہستگی کے ساتھ ہی کواڑ بند کئے اور چل دیئے، میں نے یہ ماجرا دیکھا تو اپنا کرتہ پہنا، دوپٹہ اوڑھا اور تہمد سے چادر کی طرح بدن کو لپیٹ کر آپ کے پیچھے ہولی، آپ بقیع پہنچے، دیر تک کھڑے رہے تین بار دونوں ہاتھ اُٹھائے، پھر لوٹ پڑے اور میں بھی لوٹی آپ نے جلدی کی اور میں نے بھی جلدی کی، آپ تیز قدم چلے تو میں بھی تیز قدم چلی، آپ اور تیز چلے تو میں دوڑ کر آپ سے آگے بڑھ گئی اور گھر میں داخل ہو کر جلدی سے لیٹ گئی، آپ تشریف لائے تو فرمایا، عائشہ! کیا ہوا تمہارا سانس کیوں چڑھا ہوا ہے؟ میں نے کہا کچھ نہیں، آپ نے فرمایا تو بتادو، ورنہ مجھے حق تعالیٰ جو لطیف وخبیر ہے وہ بتلادے گا، میں نے کہا یارسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں ساری بات ایسی تھی اور سب سنادی، آپ نے فرمایا، اچھا تم ہی آگے آگے چلتی نظر آرہی تھیں، میں نے کہا جی ہاں! اس پر آپ نے میرے سینہ پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا چلو بھی کیا تم نے سوچا کہ خدا اور اس کا رسول تمہارے ساتھ ناانصافی کریں گے؟ میں نے کہا، جو بات لوگوں سے چھپائی جاسکتی ہے اس کو بھی خدا جانتا ہے، میں اس کو خوب جانتی ہوں، آپ نے فرمایا اُس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے تھے تمہارے کپڑے اتارنے کی وجہ سے وہ اندر تو آنہیں سکتے تھے، پھر تمہاری ہی وجہ سے انہوں نے مجھے آہستہ سے پکارا تاکہ تمہاری نیند خراب نہ ہو، میں اٹھا اور خیال کیا کہ تم سوگئی ہو اس لئے اٹھانا پسند نہ کیا، اور یہ بھی خیال کیا کہ جاگ جاؤ گی تو تنہائی کی وجہ سے گھبراؤ گی، لہذا بہت خاموشی سے نکل کر چلا گیا تھا، حضرت جبرئیل علیہ السلام حق تعالیٰ کا یہ حکم لے کر آئے تھے کہ اہل بقیع کے پاس جا کر ان کے لئے دعائے مغفرت کرو، حضرت عائشہؓ نے فرمایا، پھر میں نے مردوں کے لئے دعاءِ مغفرت کس طرح ہوئی ہے آپ سے دریافت کی الخ (مسلم شریف، نووی ۳۱۳/۱)

دوسری حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے واپسی پر گفتگو میں حضرت عائشہؓ سے یہ بھی جملہ فرمایا تھا، اَغِرْتِ؟ یعنی کیا تمہیں غیرت آگئی تھی؟ (اس لئے میرے پیچھے گئیں، کہیں میں کسی دوسری بیوی کے یہاں نہ چلا جاؤں) حضرت عائشہؓ نے کہا کہ مجھ جیسا آپ جیسے پر غیرت کیسے نہ کرے گا؟! (مسلم، نسائی، جمع الفوائد ج۱)

اسی طرح حضور ﷺ کے مرضِ وفات میں بھی واراء ساہ' والا قصہ مروی ہے، جس کی تفصیل بخاری ۸۴۶ اور السیرۃ النبویہ (ابن ہشام ۲۶۶/۲) میں مذکور ہے۔

حضرت خدیجہؓ کے ذکر پر بھی حضرت عائشہؓ کی غیرت کا واقعہ مشہور ہے وغیرہا، اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم اور قابلِ اتباع بات یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ایسے مواقع میں کتنی بڑی وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے تھے اور کسی قسم کی تلخی اور ناگواری کا اظہار نہ فرماتے تھے۔

الفتح الربانی ۱۵۰/۲۲ میں ہے:۔ ابویعلی نے حضرت عائشہؓ ہی سے مرفوعاً حضور علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے کہ غیرت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر عورت اونچ نیچ کبھی نہیں دیکھتی اور بزار وطبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حصہ میں غیرت اور مردوں کے حصہ میں جہاد لکھ دیا پس جو شخص عورتوں کی غیرت کے جذبہ کی تلخ باتوں پر صبر کرلے گا اس کو شہید کا اجر ملے گا (ذکرہ الزرقانی شرح المواہب)

نسائی شریف میں یہ حدیث بھی مروی ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ انصاری عورتوں سے شادی کیوں نہیں فرماتے؟ آپ نے فرمایا:۔ ان میں غیرت کا مادہ بہت زیادہ ہے (جمع الفوائد ۲۱۵/۱)

بخاری ومسلم وغیرہ میں یہ حدیث بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ حضرت خولہ بنت حکیمؓ نے اپنے کوحضورعلیہ السلام کے لئے ہبہ کیا تو مجھے بڑی غیرت آئی اور کہا کہ عورتوں کوشرم نہیں آتی مردوں کے لئے پیش ہوتی ہیں، پھر جب آیت **ترجی من تشاء اتری** تو میں نے کہا یارسول اللہ! آپ کا رب بھی آپ کی خوشنودی چاہتا ہے الخ (جمع الفوائد ۱/۱۰۹)

(۴۷) حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں ایک سفر(حج) میں حضورعلیہ السلام کے ساتھ تھی، حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہوگیا، اور حضرت زنیبؓ کے پاس سواری کے زائد اونٹ تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ صفیہ کا اونٹ بیمار ہوگیا ہے تم ان کوایک اونٹ دیدو تو اچھا ہے، انہوں نے کہا میں اس یہودیہ کودوں گی؟ اس پر حضور اکرم ﷺ کوغصہ آگیا، اور آپ نے باقی ماہ ذی الحجہ، اور پورے محرم وصفر اور کچھ دن ربیع الاوّل میں ان سے کلام نہیں کیا، حتی کہ وہ مایوس ہوکر اپنا سامان اور چارپائی بھی اٹھا کر لے گئیں اور خیال کرلیا کہ آپ ان سے تعلق نہ رکھیں گے، اس کے بعد ایک دن ایسا ہوا کہ وہ دوپہر کے وقت بیٹھی تھی اچانک کسی آدمی کا سایہ اپنی طرف آتے ہوئے محسوس کیا (یہ رحمتِ دوعالم کا ظلِ شفقت تھا جو پھر ان کی طرف متوجہ ہوگیا تھا، اور حضرت زنیبؓ اپنا سامان وچارپائی لے کر خدمتِ اقدس میں باریاب ہوگئیں۔

(ابوداؤد واوسط جمع الفوائد ۱/۲۳۰) مسند احمد کے حوالہ سے مجمع الزوائد ۴/۳۲۳ میں یہ ہے کہ حضورعلیہ السلام ان کے پاس آئے اور خوداُن کی چارپائی اٹھا کر لے گئے اور ان سے راضی ہوگئے۔

فائدہ! یہ وہی حضرت زینبؓ تھیں، جن کا نکاح حق تعالیٰ نے عرش پر آپ سے کیا، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سفیر بن کر اس کی خبر دی تھی، اور یہ رشتہ میں آپ کی بنتِ عمّہ بھی تھیں، ان کے علاوہ ازواجِ مطہرات میں کوئی آپ کی رشتہ دار نہ تھیں، خود بھی فخر سے کہا کرتی تھیں کہ میرا نکاح سب سے اونچا، اور رشتہ حضور سے قریب کا تھا، اور کہتی تھی کہ سب سے زیادہ پردہ کا التزام واہتمام کرنے والی بھی میں ہی ہوں (گویا یہ بھی فخر کی چیزوں میں داخل تھا، اور حضرت عائشہ فرماتی تھیں کہ تمام بیویوں میں سے وہی اپنے حسن وجمال اور قربِ نبوی کے سبب میری مدمقابل تھیں، ایک دفعہ تقسیم غنیمت کے وقت حضرت زینبؓ نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں جسارت کر کے کچھ کہہ دیا تو حضرت عمرؓ نے ان کوڈانٹ دیا، اس پر حضور نے فرمایا:۔عمر! ان کو کچھ نہ کہو، یہ اوّاھہ ہیں، یعنی بارگاہِ خداوندی میں خشوع وخضوع کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حلم والے اور اوّاہ ومُنیب تھے (الفتح الربانی ۲۲/۱۳۵)

باوجود ان سب فضائل ومناقب کے بھی حضورعلیہ السلام نے ان کی بے جابات پر کئی ماہ تک ترکِ تعلق کو ترجیح دی، یہ سب اس لئے تھا کہ عورتوں کے اخلاق وکردار کی اصلاح ہرممکن بہتر طریقے سے ہوسکے، اور ان میں جو غیرت اور رشک وحسد کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، اس کو حدِ اعتدال میں لایا جاسکے، اور یہ اصلاح کا معاملہ اب بھی ہرمرد کے حلم وعقل پر چھوڑ دیا گیا ہے، کیونکہ ان کے بغیر بھی گزارہ نہیں، اور ان کو ہرطرح کی آزادی بھی نہیں دی جاسکتی، ہرمعاملہ میں سختی بھی ان کی افتادِ طبع وسرشت کے منافی، اور حد سے زیادہ ملاطفت وانبساط اور نرمی بھی نقصان دہ، کیا عجیب وغریب صورت ہے اور مشکلات والجھنوں سے عہدہ برآ ہوکر دین ودنیا کی سلامتی کا تمغۂ زریں حاصل کرلینا ہرمرد کے بس کی بات نہیں، واللہ الموفق۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۴۸) ایک دفعہ مسجد نبوی سے فراغتِ نماز کے بعد مردعورتیں باہر نکلیں تو اختلاط ہوگیا، حضورعلیہ السلام نے عورتوں کو حکم دیا کہ تم رک جاؤ اور پیچھے چلو اور تمہیں راستوں کے بیچ نہ چلنا چاہیے بلکہ کنارے پر سے گزرنا چاہیے، اس کے بعد عورتوں نے ارشادِ نبوی پر اتنی سختی سے عمل کیا کہ سڑک کے کنارے دیواروں سے اتنی رگڑ کھا کر گزرتی تھیں کہ کپڑے دیواروں سے اُلجھ جاتے تھے (ابوداؤد)

(۴۹) حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ کسی راستہ سے گزر رہے تھے، اور آپ کے آگے آگے، ایک عورت چل رہی تھی، آپ نے اس سے فرمایا کہ بیچ راستہ سے ہٹ کر چلو، اس نے کہا راستہ تو بہت چوڑا ہے آپ نے ساتھیوں سے فرمایا اس کو چھوڑ دو، یہ

ہماری بات نہیں سنے گی، اونچے دماغ والی ہے (رزین، جمع الفوائد ۱/۲۳۱) آج کل بیچ سڑک میں ناز وانداز کے ساتھ چلنے والی اونچے دماغ والیوں کی کثرت روزافزوں ہے اللہ رحم کرے۔

(۵۰) ارشاد فرمایا:۔ تین قسم کے آدمی کبھی جنت میں داخل نہ ہوں گے، دیوّث، عورت جو مردوں کا سا لباس وغیرہ اختیار کرے، اور شراب کا عادی، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! دیوّث سے کیا مراد ہے؟ فرمایا:۔ جو مرد اس کی پروانہ کرے کہ اس کی بیوی کے پاس کون کون آتا ہے، کبیر، بحوالہ جمع الفوائد ۱/۱۳۱) یعنی مرد کو اس امر کی پوری احتیاط رکھنی چاہیے کہ اجنبی و بدچلن مرد وعورتیں اس کے گھر میں نہ آئیں نہ اس کے گھر والے ایسے لوگوں کے گھروں میں جائیں، اگر وہ اپنی بیوی بیٹیوں کو غیروں کے اختلاط اور میل جول سے نہیں روکتا تو وہ دیوث ہے جو حق تعالیٰ اور اس کے رسول کی غیرت کو چیلنج کرتا ہے، اس لئے اس کے واسطے آخرت میں گرم جگہ (جہنم ہی موزوں ہے، جہاں سب اوباش و آبرو باختہ بداطوار لوگ ہی جمع ہوں گے، جنت جو پاکباز متقی پرہیزگاروں کے لئے ہوگی، وہاں ایسے لوگوں کا کام نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم!

(۵۱) حضرت انسؓ (خادم خاص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ حد بلوغ کو پہنچنے پر صبح ہی کو میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور بلوغ سے مطلع کیا تو آپ نے فرمایا کہ اب تم گھروں میں عورتوں کے پاس نہ جانا، مجھے اس سے اتنا رنج ہوا کہ اس دن سے زیادہ سخت دن مجھ پر نہیں گزرا (اوسط وصغیر بحوالہ جمع الفوائد ۱/۱۳۰)

اس سے معلوم ہوا کہ لڑکے جوان ہو جائیں اور پندرہ سال کی عمر کے ہوں تو دوسرے گھروں میں ان کو اپنی آمدورفت بند کر دینی چاہیے، اور عورتوں کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ تو بچپن سے ہمارے گھر آتا ہے اس سے کیا پردہ؟ یہ جہالت کی بات ہے اور اس میں کسی کی رعایت کی ضرورت نہیں، حضرت انسؓ سے زیادہ پاکباز کون ہو سکتا ہے اور وہ زمانہ بھی نہایت مقدس نبوت کا تھا، خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے اور ان کو حضرت انسؓ کے خادم خاص ہونے کی وجہ سے آپ کے گھروں میں جانے کی ضرورت بھی تھی، پھر ازواج مطہرات دنیا کی افضل ترین صنفِ نسواں اور ساری امت کے لئے ماؤں کے درجہ میں تھیں، اس پر بھی حضور علیہ السلام نے بلاتوقف ان پر پابندی لگادی، تاکہ ساری امت اس سنتِ نبویہ کی پیروی کرے، پھر خاص طور سے جبکہ حضرت انسؓ کو آپ کے حکم مذکور سے سخت صدمہ بھی ہوا کہ آئندہ کے لئے آپ کی خدمت میں کمی و کوتاہی کا خیال آیا ہوگا، اور اس کا بھی امہات المومنین اور ان کے مقدس و منور گھروں کی حاضری سے محروم ہوئے، رنج و صدمہ کی بات اپنی جگہ بجا تھی اور یقیناً ایک حد تک اس کا افسوس و خیال خود ازواجِ مطہرات کو بھی ہوا ہوگا، مگر شریعت کے احکام میں رعایت کسی کی نہیں، اس لئے رحمتِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی پرواہ ان سب کے رنج و صدمہ کی نہیں کی اور شریعت کے حکم کو جاری فرمادیا، علیہ وعلی آلہ وازواجہ افضل الصلوٰات والتسلیمات المبارکات۔

(۵۲) ارشاد فرمایا:۔ وہ ہم میں سے نہیں جو کسی عورت کو اس کے شوہر کے خلاف بھڑکائے اور بدگمان کرے، یا غلام کو اس کے مالک کے خلاف اُکسائے (ابوداؤد) یعنی وہ امتِ محمدیہ سے خارج ہوگا، جو اس قسم کا کام کرے گا، مثلاً کسی عورت سے اس کے شوہر کی برائیاں کرے یا کسی غیر مرد کی خوبیاں بیان کرے، جس سے اس کا دل اپنے شوہر سے پھر جائے مرقاۃ ج ۳ اس زمانہ میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ کسی عورت سے خیر خواہی جتانے کو یا شوہر سے کسی مخالفت کی وجہ سے اس کے سامنے شوہر کی برائیاں کھود کرید کر نکالتی اور بتلاتی ہیں، اور کبھی دوسرے شوہروں کے بہتر حالات اس کو سُناتی ہیں جس سے اپنے شوہر کی وقعت اس کے دل میں کم ہو کر فساد و فتنہ اور خرابیوں کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے بلکہ بعض مرتبہ خود بیٹی کے باپ اور ماں بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر ایسا کر گزرتی ہیں، یہ سخت ممنوع اور حرام ہے، اور اس سلسلہ میں حضور اکرم[1] صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریقہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایک دفعہ کسی شکر رنجی کے تحت حضرت فاطمہؓ نے حاضرِ خدمتِ نبویہ ہو کر حضرت علیؓ کی

---

[1] حضرت حفصہؓ کو کسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی تھی، اس کا علم حضرت عمرؓ کو ہوا تو ان کو اور دوسرے عزیزوں نیز سب ہی صحابہ کو غیر معمولی صدمہ ہوا، اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام اترے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ حضرت عمرؓ پر رحم کی نظر کر کے حفصہ سے رجوع کر لیں، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شکایت کی تو آپ نے فرمایا ''بیٹی! تم یہ تو سوچو کہ دنیا میں کون سا مرد ایسا ہے جو اپنی بیوی کے پاس خاموش چلا آتا ہے''؟

علماءِ نے لکھا ہے کہ اس کے بعد پھر وہ کبھی حضور علیہ السلام کے پاس حضرت علیؓ کی شکایت لے کر نہیں آئیں، سب جانتے ہیں کہ زن وشوہر کے تعلق کی نوعیت نہایت نازک ہوتی ہے، اس لئے ذرا سی بات پر بگاڑ کی صورت بن سکتی ہے اسی پر بند لگانے کو حضور علیہ السلام نے مذکورہ بالا ارشاد صادر کیا ہے، اور دونوں کے تعلقات خراب کرنے والے کو سخت وعید سے ڈرایا ہے، اس کے علاوہ یہ کہ بہت سے احادیث میں دو مسلمانوں کے مابین جھوٹ بول کر بھی صلح وصفائی کرادینے کی ترغیب وارد ہوئی ہے، تو میاں بیوی میں تو اس امر کی رعایت اور بھی زیادہ ہونی چاہیے اور افساد کی بات اتنی ہی زیادہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہوگی اور اسی لئے شیطان کو سب سے زیادہ محبوب وپسندیدہ صرف یہی بات ہے کہ کسی طرح بھی میاں بیوی کے تعلقات خراب کرادیئے جائیں اور شیاطین الجن والانس اس کے لئے ہر قسم کے دھوکے فریب جھوٹ وغیرہ کے حربے استعمال کرتے ہیں، جس کا ذکر اگلی حدیث میں ہے۔

(۵۳) ارشاد فرمایا:۔ ابلیس اپنا تختِ شاہی پانی پر بچھا کر بیٹھتا ہے اور اپنے لشکروں کو لوگوں کی گمراہی کے لئے سب طرف بھیج دیتا ہے پس اس سب سے زیادہ مقرب ومحبوب شیطان وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا گمراہی کا کارنامہ انجام دے کر آوے، پھر سب اس کے پاس جمع ہو کر اپنی اپنی کارگزاریاں سناتے ہیں، ایک آتا ہے کہ میں نے یہ گناہ فلاں شخص سے کرادیا، دوسرا بھی اسی طرح (مثلاً چوری کرائی، ڈاکہ ڈلوایا، شراب پلوائی، جھوٹ بلوایا، غیبت کرائی، نماز ترک کرائی، وغیرہ وغیرہ) ایک کہتا ہے کہ میں ایک میاں بیوی کے پیچھے لگا رہا، اور ان میں سے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتا رہا، اور دونوں کو لڑانے کے لئے ہر قسم کے ظاہری باطنی حربے استعمال کرکے بالآخر ان دونوں میں تفریق کرادی، حضور علیہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی کارگزاری سن کر شیطانوں کا بادشاہ ابلیس خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اس کو قریب بُلا کر کہتا ہے کہ ہاں! تو میرا سب سے لائق بیٹا اور میرا نہایت قابل قدر معین ومددگار رہے راویِ حدیث اعمش کہتے ہیں کہ غالباً حضرت جابرؓ نے یہ بات بھی حضور علیہ السلام سے نقل کی کہ ابلیس تفریق زوجین کے عمل سے اتنا زیادہ خوش ہوتا ہے کہ اس شیطان کو اپنے سینہ سے لپٹا لیتا ہے، یعنی معانقہ کرتا ہے (مسلم شریف)

وجہ یہ ہے کہ ابلیس کو زنا کی کثرت اور دنیا میں اولادِ زنا کا غلبہ بہت زیادہ پسند ہے، کیونکہ ایسے بدنسل لوگ ہی زیادہ شر وفساد زمین پر پھیلاتے ہیں اور حدودِ شرعیہ کے خلاف محاذ بنواتے ہیں، اسی لئے حدیثِ دارمی میں ہے کہ جنت میں حرامی بچے داخل نہ ہوں گے کہ ان پر کریمانہ اخلاق وفضائل کا حاصل کرنا دشوار، اور کمینہ اطوار وعادتیں حاصل کرنا آسان ہوتا ہے، (مرقاۃ ۱۸/۱۱) جو بچے بہتر تربیت وتعلیم سے آراستہ ہوسکیں وہ خود ہی اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

جائز وشرعی طریق پر نکاح والے جوڑوں میں تفریق کرادینے سے، وہ بھی مجبور ہو کر زنا کے راستوں پر چل پڑیں گے اور اس طرح زنا اور اولادِ زنا کی تعداد میں ترقی اور اضافہ در اضافہ ہوتا رہے گا، جو شیاطینِ انس وجن کو سب سے زیادہ محبوب اور حق تعالیٰ، اس کے برگزیدہ بندوں اور فرشتوں کو زیادہ سے زیادہ مبغوض وناپسندیدہ ہے، قال تعالیٰ ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس (لوگوں کے بُرے کرتوتوں ہی کے سبب سے ہر جگہ فساد پھیلتے ہیں)

غرض موجودہ دنیا میں جو شر وفساد اور علوم نبوت کے خلاف دوسرے نظریات پھیل رہے ہیں وہ سب کثرتِ زنا اور اولاد الزوانی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) حضرت عمرؓ اس طرف سے مطمئن ہو کر حضرت حفصہ کے پاس گئے دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں، آپ نے کہا کیوں روتی ہو، اس لئے کہ حضور علیہ السلام نے تمہیں طلاق دے دی ہے، دیکھو! اب تو انہوں نے طلاق کے بعد میری وجہ سے رجوع کرلیا ہے، واللہ! اگر پھر انہوں نے تمہیں طلاق دی تو میں تم سے کبھی کلام نہ کروں گا۔

دوسری روایت اس طرح ہے کہ حضرت حفصہؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ گھر میں تشریف لائے تو میں نے (طلاق کی وجہ سے) چادر اوڑھ لی، آپ نے فرمایا، میرے پاس ابھی جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا حفصہ سے رجوع کرلو، وہ صوّامہ اور قوّامہ (بہت روزے رکھنے والی، اور بہت نمازیں پڑھنے والی) اور جنت میں بھی آپ کی زوجہ رہنے والی ہے (الفتح الربانی ۱۴۱/۲۳)

غلبہ واقتدار کے نتائج ہیں، اللہ تعالیٰ امتِ محمدیہ کو ان کے شرور وفتن سے محفوظ رکھے، اس وقت زنا اور دواعیِ زنا کی روک تھام کے لئے ہر قسم کی کوشش کرنا عالم انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے، اور علماءِ امت کو خاص طور سے اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ واللہ المیسر !

(۵۴) ارشاد فرمایا:۔ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو اپنا امیر کسی عورت کو بنائے گی، (بخاری ۶۳۷)

حافظؒ نے لکھا کہ امارت وقضا سے ممانعت جمہور کا قول ہے، امام مالک سے ایک روایت جواز کی ہے، امام ابوحنیفہؒ سے روایت ہے کہ جن معاملات میں عورت کی شہادت جائز ہے ان کی حاکم بن سکتی ہے (فتح الباری ۹۰) محقق عینیؒ نے لکھا کہ اس حدیث کی روایت امام بخاریؒ نے ابواب الفتن ۱۰۵۲ میں بھی کی ہے اور امام ترمذی نے فتن میں، امام نسائی نے فضائل میں کی ہے الخ (عمدہ ۵۹)

(۵۵) ایاکم وخضراء الدمن (کوڑیوں پر اُگی ہوئی سبزی وہریالی سے بچو) علامہ محدث صاحبِ مجمع البحار نے لکھا کہ اس سے مراد وہ خوبصورت عورت ہے جو خراب ماحول میں پلی بڑھی ہو، جس طرح گندی جگہوں میں درخت اُگ آتے ہیں اور وہ دیکھنے میں خوش منظر ہوتے ہیں، اس کو کمینہ اخلاق ومنصب والی حسینہ وجمیلہ سے تشبیہ دی گئی ہے (۲/۵۰) معلوم ہوا کہ صرف ظاہری حسن وجمال پر نظر نہ کرنی چاہیے، بلکہ باطنی خلاق وفضائل کو معیارِ انتخاب وترجیح بنانا چاہیے۔

(۵۶) حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک دن حضور علیہ السلام نے مجلس صحابہ میں سوال کیا کہ عورتوں کے لئے سب سے بہتر کیا چیز ہے؟ سب خاموش رہے میں نے حضرت فاطمہؓ سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ بتایا کہ ان پر مردوں کی نگاہیں نہ پڑیں میں نے یہ جواب حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا تو تصویب کے طور پر فرمایا، وہ میری لختِ جگر ہے یعنی وہی صحیح جواب دے سکتی تھی (مجمع الزوائد ۲۵۵ وجمع الفوائد ۲۱۷)

اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کا ارشاد بھی یادداشت میں رہے کہ آپ نے ازواجِ مطہرات کے لئے فرمایا تھا "اگر میری بات مانی جائے تو میری تمنا تو یہ ہے کہ تمہیں کوئی آنکھ نہ دیکھ سکے، اس کے بعد ہی پردہ کا حکم نازل ہوا تھا (الادب المفرد للبخاری ۴۹۶)

حضرت حسن بصریؒ کا یہ ارشاد بھی قابل ذکر ہے کہ اگر تم سے ہوسکے تو اپنے گھر والیوں کے بالوں پر نظر نہ ڈالو بجز اپنی بیوی کے یا چھوٹی بچی کے (الادب المفرد ۲/۶۱) لہٰذا مردوں عورتوں سب کو اس کی احتیاط چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی مریض کی عیادت کو گئے، آپ کے ساتھ اور لوگ بھی تھے، ان میں سے ایک شخص اس گھر کی عورت کو دیکھنے لگا تو آپ نے فرمایا:۔ تمہاری آنکھ پھوٹ جاتی تو تمہارے لئے بہتر ہوتا (الادب المفرد ۶۲۸) یعنی اس گناہ کے ارتکاب سے آنکھ کا پھوٹ جانا بہتر تھا۔

(۵۷) ارشاد فرمایا:۔ میں تمہیں بتلادوں مردوں میں سے کون جنت میں جائے گا؟ نبی جنت میں جائیں گے، صدیق بھی اور وہ شخص بھی جو صرف خدا کے لئے اپنے ایک بھائی کی ملاقات کے لئے شہر کے دوسرے کنارے تک جائے، اور عورتوں میں سے ہر بچے جننے والی، ان سے محبت کرنے والی، جب شوہر کی کسی بات کی وجہ سے غصہ کرے، یا نافرمانی کا ارتکاب کرے تو نادم ہو کر اُس سے کہے کہ یہ میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں ہے، مجھ پر نیند حرام ہے جب تک تو مجھ سے راضی نہ ہو جائے (مجمع الزوائد ۳۱۲/۴)

(۵۸) ارشاد فرمایا:۔ کسی عورت کو جائز نہیں کہ اپنے شوہر کے گھر میں ایسے شخص کو آنے دے جس کو وہ ناپسند کرے، اور نہ یہ کہ گھر سے بغیر رضامندی شوہر کے باہر جائے، اور شوہر کے بارے میں کسی اور کی بات ماننا بھی جائز نہیں ہے نہ اپنے شوہر کو غصہ دلا کر اس کے دل کو بھڑکائے، نہ اس کے بستر سے دور ہو، نہ اس کو مارے اگرچہ وہ ناحق پر ہی ہو، اور اس کو ہر طرح راضی کرنے کی کوشش کرے، پھر اگر وہ عذر قبول کر کے راضی ہو جائے تو بہتر ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس عورت کو معاف کرے گا، اور اس کو سرخرو کرے گا، اور اگر اس پر بھی شوہر راضی نہ ہو تو عورت اپنا فرض ادا کر چکی، رواہ الطبرانی (مجمع الزوائد ۳۱۳)

(۵۹)ارشادفرمایا:۔ جوشخص خداپر بھروسہ کر کے اور صحیح طور سے خالص نیتِ ثواب کر کے نکاح کرے گا، تو اللہ تعالیٰ ضرور اپنی اعانت اور خیر و برکت سے نوازیں گے (جمع الفوائد ۲۱۶) یہ بھی روایت ہے کہ غنی کر دیں گے۔

(۶۰)فرمایا:۔ سب سے بہتر سفارشوں میں سے یہ ہے کہ دو آدمیوں میں نکاح کی کوشش کر دے (جمع الفوائد ۲۱۷) یعنی دونوں کو صحیح حالات بتلا کر ترغیب دے، ایسا نہیں کہ غلط سلط باتیں کہہ کر آمادہ کر دے۔

(۶۱)ارشادفرمایا:۔ دو محبت کرنے والوں کے لئے نکاح جیسی اچھی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی (جمع الفوائد ۲۳۱) یعنی اگر شرعی موانع نہ ہوں، اور دونوں میں محبت جڑ پکڑ چکی ہو تو نکاح ہی بہتر ہے، اگر چہ اسکی وجہ سے کچھ دنیوی نقصانات بھی برداشت کرنے پڑیں کیونکہ اس نکاح کی وجہ سے بہت سے دوسرے مفاسد اور خرابیوں سے بچا جا سکے گا، خاص حالات میں اہل علم و دانش کے مشورہ سے اس حدیث کی روشنی میں عمل کرنا چاہیے۔

(۶۲)امام بخاریؒ نے مستقل باب میں عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک وحسنِ اخلاق کی تاکید والی مشہور حدیث ۷۷۹ میں ذکر کرنے کے بعد اگلا باب قول باری تعالیٰ قوا انفسکم و اھلیکم نارا پر قائم کیا ہے، جس سے یہ بتلایا کہ ان کے ساتھ نرمی و اخلاق کا برتاؤ کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو فرائض و واجبات کے لئے بھی تاکید نہ کی جائے بلکہ مسلمان مردوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھ اہل وعیال کو بھی مستحقِ جہنم بنانے والی باتوں سے روکتے رہیں، یعنی جہاں تک عورتوں کے اخلاق و مزاج کی کجی و خرابی کا تعلق ہے وہ کم و بیش جتنی بھی جس میں ہے اس کو بالکل ختم کرنا ممکن نہیں، اس لئے اس کی فکر تو بے سود ہے لیکن فرائض و واجباتِ شرعیہ کی ادائیگی اور معاصی و فواحش سے احتراز کیلئے تاکید و تنبیہ تو ضرور ہی کرنی ہے ورنہ ان کی بے راہ روی اور مستحق نار ہونے کی ذمہ داری سے تم بھی نہ بچو گے۔ (کذا فی الفتح والقسطلانیؒ)

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ شوہر کیلئے چار باتوں پر بیویوں کو مارنا بھی درست ہے، ترکِ زینت پر بشرطیکہ شوہر زینت کا مطالبہ کرے، بحالت طہارت (عدم حیض و نفاس) مقاربت سے انکار پر ترکِ نماز و دیگر فرائض و واجبات پر، گھر سے بغیر اجازت شوہر نکلنے پر، (امام محمدؒ نے فرمایا کہ ترکِ فرائض پر مارنے کا حق نہیں اور تنبیہ کر سکتا ہے (انوار المحمود ۲/۳۲)

مسندِ احمد میں حدیث ہے کہ "عورت تمہارے لئے ایک عادت وخصلت پر مستقیم نہیں رہ سکتی، وہ تو پسلی کی طرح سے ٹیڑھی ہے اگر بالکل سیدھا کرو گے تو توڑ دو گے، بالکل اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو کجی کے باوجود تمتع کر لو گے" اس سے اشارہ نکلا کہ پہلے نرمی کے ساتھ سیدھا کرنا چاہیے، کیونکہ سختی کے ساتھ ٹوٹ جائے گی، لیکن یہ ان امور میں ہے جو شوہر کے اپنے حق معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں، پس اگر وہ حد سے تجاوز کرے اور ارتکابِ معصیت بھی کرنے لگے تو اس کو کجی کی حالت پر چھوڑ دینا جائز نہیں، اور اسی کی طرف حق تعالیٰ نے قوا انفسکم و اھلیکم نار سے اشارہ فرمایا ہے اور اس وقت طلاق دینا بھی صحیح ہوگا (الفتح الربانی ۳/۳۳۴)

(۶۳)امام بخاریؒ نے مستقل باب حسنِ معاشرتِ اہل قائم کر کے ۷۷۹ میں ام زرع والی مشہور حدیث روایت کی ہے جس میں گیارہ عورتوں نے ایک مجلس میں جمع ہو کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنے اپنے شوہروں کے صحیح وسچے احوال بلا رد رعایت یا خوف وڈر کے بیان کریں گی اور کوئی بات نہ چھپائیں گی، پھر سب نے نمبر وار نہایت فصیح وبلیغ زبان میں بیان دے کر یہ داستان مکمل کی، اور حضرت عائشہؓ نے یہ پوری داستان حضور علیہ السلام کو سنائی، پوری حدیث طویل ہے اسلئے اس کا مکمل ترجمہ و مطلب اپنے موقع پر آئے گا، یہاں صرف گیارہویں عورت ام زرع کا بیان کردہ حال مختصر کر کے پیش کیا جاتا ہے کیونکہ اس کا ہمارے موضوع بحث سے تعلق ہے، اس نے کہا کہ میرا شوہر ابو زرع اس کا تو کہنا ہی کیا، اس نے زیور، مال مویشی وغیرہ ہر نعمتِ دنیوی سے میرا جی خوش کر دیا، اس کی ماں (میری ساس) بھی ہر لحاظ سے قابلِ تعریف اور بڑی لائق فائق عورت تھی، اس کا بیٹا چھریرے بدن کا کم خوراک، اس کی بیٹی ماں باپ کی فرمانبردار، فربہ اندام اور خوبصورت خوب سیرت ایسی کہ جلنے والیاں اس کو دیکھ کر جلا کریں، اس کی باندی بھی قابل تعریف کہ ہمارے گھر کی بات باہر نہ کہتی، نہ چوری چکوری کی

عادت، نہ گھر کی ستھرائی میں کمی کرتی تھی، پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن ابوزرع صبح کو گھر سے نکلا، ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوگیا اور مجھے طلاق دے دی، پھر میں نے ایک دوسرے مالدار شخص سے شادی کرلی، جس نے مجھے بہت کچھ دیا اور پوری آزادی بھی دی کہ جس کو چاہوں کھلاؤں پلاؤں، مگر اس کا سارا دیا ہوا مال بھی ابوزرع کے تھوڑے مال کے برابر نہ ہوگا۔

حضرت اقدس رسول اکرم ﷺ نے پوری داستان سُن کر اس پر حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ میں بھی تمہارے لئے ابوزرع جیسا ہوں، بجز اس کے کہ اس نے ام زرع کو طلاق دیدی تھی، اور میں طلاق نہیں دوں گا، اس پر حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ تو میرے لئے ابوزرع سے کہیں بہتر ہیں۔

حافظؒ نے لکھا کہ روایتِ ہثیم بن عدی میں یہ زیادتی بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میں تمہارے لئے ابوزرع ہی جیسا ہوں بہ لحاظ اس کی ابتدائی الفت ووفاشعاری کے نہ کہ آخری فرقت وبے وفائی کے لحاظ سے (اسی کو دوسری روایت میں الا انــه طــلــقهــا وانـی لا اطــلــقك سے بیان کیا گیا ہے دونوں کا مفہوم ایک ہے درحقیقت میاں بیوی کا ایک دوسرے کے لئے وفاشعار ہونا اور باہمی الفت کا نباہنا، اور جنسی میلانات کسی بھی دوسری طرف متوجہ نہ ہونے دینا ہے سب سے بڑا زوجیت کا شرف ہے، دوسرے درجہ میں بیوی کے لئے شوہر کے گھر کا ماحول بھی بہتر ہونا ضروری ہے کہ بیوی اپنے نہایت مانوس ماحول، ماں، باپ، عزیز، بھائی، بہنوں اور دوسرے قرابت داروں سے جدا ہوکر شوہر کے گھر میں بالکل اجنبی ماحول میں پہنچتی ہے اس لئے صرف شوہر کی محبت والفت اور بہتر سلوک ہی کافی نہیں بلکہ شوہر کے گھر والوں خصوصاً ماں، باپ، بہن، بھائی، بھاوجوں، کا سلوک بھی محبت، خلوص وحسن اخلاق کا ہونا چاہیے، اور اس کے لئے بھی شوہر کی بڑی ذمہ داری ہے خصوصاً جبکہ وہ بیوی کو سب سے الگ گھر میں نہ رکھ سکتا ہو، اور چونکہ گیارہ عورتوں میں سے اور کسی عورت نے شوہر کے گھر والوں کے احوال ذکر نہیں کئے تھے، صرف ام زرع نے کئے تھے، اس لئے تشبیہ کا ایک بڑا جزو وہ بھی تھا، تیسری بات مال ودولت کی فراوانی تھی، جس کو ام زرع نے اتنی زیادہ اہمیت دی تھی کہ اپنے بعد والے مالدار بہترین شوہر کو بھی اس لحاظ سے کنڈم کردیا تھا، اور باوجود طلاق کے بھی اس کی زیادہ دولت کا ہی دم بھرتی رہی یہ اس کی زنانہ فطرت کا قصورِ فہم تھا کہ عورت پہلے بُرے شوہر کا دوسرے، بہتر شوہر کے مقابلہ میں تعریف سے ذکر کرتی ہے! خواہ اس سے لڑ جھگڑ کر اس سے طلاق ہی لے آئی ہو، اور اس کے لئے اس کی فطرت کے علاوہ شیطان بھی آمادہ کرتا ہے تاکہ نئے شوہر سے بھی تعلقات بہتر نہج پر نہ چل سکیں، خود حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ عورت کا عجیب حال ہے کہ طویل مدت تک بغیر نکاح کے اپنے ماں باپ کے گھر میں پریشانی کے دن گزار کر بھی جوانی ونکاح کی بیشتر عمر گزار چکتی ہے اگر اس کو شوہر نصیب ہوتا ہے اور اس سے مال سرپرستی کے علاوہ بچوں جیسی نعمت بھی اس کو مل جاتی ہے تب بھی اس کی فطرت ایسی ہی ہے کہ شوہر کی طرف سے کوئی ناگوار یا خلافِ مزاج بات ہوجائے تو کہنے لگتی ہے کہ اس سے تو میں نے کسی دن بھی خیر وبھلائی نہیں دیکھی۔ (الفتح الربانی ۲۲۹/۱۶) یعنی غصہ وغضب سے مغلوب ہوکر ناشکری جیسے گناہ کا ارتکاب کرلیتی ہے۔

مجمع الزوائد ۳۱۲/۴ میں بھی طبرانی سے حدیث نقل ہوئی کہ حضور علیہ السلام نے عورتوں کو خطاب میں فرمایا، تم میں زیادہ جہنم کا ایندھن بنیں گی، انہوں نے پوچھا کس لئے؟ آپ نے فرمایا:۔ تمہیں دیا جائے تو شکر نہیں کرتیں اگر دینے میں کمی ہوجائے تو شکوے شکایات کے دفتر کھولتی ہو، کسی مصیبت یا مرض میں مبتلا ہوتی ہو تو صبر نہیں کرتیں، تمہیں ان سب بری عادتوں کو ترک کرنا چاہیے اور خاص طور سے کفرِ منعمین سے بچنا چاہیے! سوال کیا وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایک عورت اپنے شوہر کے پاس رہتی ہے اور اس سے دو تین بچے بھی ہوجاتے ہیں، پھر وہ غصّہ میں اس کو کہتی ہے کہ تجھ سے کوئی خیر میں نے نہیں دیکھی، سلمٰی بنت قیسؓ کہتی ہیں کہ میں نے دوسری انصاری عورتوں کے ساتھ حضور علیہ السلام سے بیعت کی تو آپ نے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ تم اپنے شوہروں کی خیانت نہ کروگی، ہم چلے آئے، راستہ میں کہا کہ ہمیں اس بات کا مطلب دریافت کرنا چاہیے تھا، تو ہم پھر لوٹ کر گئے اور پوچھا کہ شوہروں کی خیانت کیا ہے آپ نے فرمایا وہ یہ ہے کہ تم

شوہروں کے مال میں سے غیروں کو ہدیے تحفے دو، یعنی بلا اجازت شوہر کے گھر کی چیز کسی کو دینی نہیں چاہیے۔

اوپر کی احادیث سے معلوم ہوا کہ اولاد بھی بہت بڑی نعمت ہے اور میاں بیوی دونوں کو اس کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کی قدر کرنی چاہیے اور اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ حضرت خدیجہؓ کا ذکر اکثر کرتے اور ان کی خوبیاں بیان کرتے تھے، بعض مرتبہ حضرت عائشہؓ کا جذبہ غیرت ابھرتا تو وہ کچھ کہہ بیٹھتیں، آپ ان کا ذکر کیوں کرتے ہیں تو آپ فرماتے میں ان کے فضائل اخلاق واحسانات کیسے بھول سکتا ہوں، پھر یہ کہ یہ میری ساری اولاد بھی صرف ان سے ہے، دوسری کسی بیوی سے مجھے اولاد نصیب نہیں ہوئی، حضرت عائشہؓ خاموش ہوگئیں اور یہ بھی مروی ہے کہ چند مرتبہ کے بعد آپ نے عرض کیا واللہ آج کے بعد میں آپ کو ان کے بارے میں ناراض نہیں کروں گی (استیعاب ۷۲۱/۲) گویا آپ کے دل میں اولاد کی وجہ سے بھی ان کی بڑی قدر ومنزلت تھی، غرض ام زرع کی بیان کردہ شوہر کی خوبیوں میں سے مال ودولت والی بات کو آپ نے کچھ اہمیت نہیں دی جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ آپ کا فقر وفاقہ اختیاری تھا، اور وہ آپ کو نہایت محبوب تھا، ورنہ آپ کے پاس بھی بہت بڑی دولت ہوسکتی تھی، آپ کی عادت تھی کہ جو بھی دولت آتی، دوسروں کو تقسیم کردیتے تھے۔

حرفِ آخر! ''صنفِ نسواں'' سے متعلق ''احادیثِ نبویہ'' کا اکثر حصّہ نہایت ضروری ومفید سمجھ کر ہم نے حوالوں کے ساتھ ایک جگہ پیش کر دیا ہے تاکہ ان کی روشنی میں گھریلو زندگی سنوارنے میں مدد ملے، حضور اکرم ﷺ نے اپنے اقوال وافعالِ مبارکہ سے ان کے بارے میں سب اونچ نیچ اور جلی وخفی کو نمایاں فرمادیا ہے، اور خود آپ کے طرزِ عمل کو بھی مجسم رحمت وشفقت ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کے تعامل سے الگ یا مختلف قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ہجران، طلاق، ایلاء، اور تخییر کے مراحل سے حضور علیہ السلام کو بھی گزرنا پڑا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم! حدیث نبوی "ماترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء" کی روشنی میں گہری غور وفکر کی ضرورت ہے۔

نکتہ! ایک نہایت اہم نکتہ قابل گزارش یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے بہ نسبت دیگر ازواجِ مطہرات کی حضرت عائشہؓ کے ساتھ تعلق ورعایت کا معاملہ زیادہ رکھا ہے اس کی بہت سی وجوہ ذکر کی گئی ہیں، جن کا تعلق ان کے ذاتی محاسن وفضائل سے ہے لیکن سب سے بڑی وجہ وہ ہے جس کا ذکر حضور علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ ان کے ساتھ رہتے ہوئے ان کے لحاف کے اندر وحیِ خداوندی کا نزولِ اجلال ہوا ہے، یہ فضیلت کسی اور زوجہ محترمہ کو نصیب نہیں ہوئی، اور یہ اتنی عظیم الشان منقبت ہے کہ اس کی عظمت کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو عظمت وحی سے واقف ہو یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم!

عنوان ''حجابِ شرعی'' اور حضرت عمرؓ کی موافقتِ وحی الٰہی کے تحت ہم نے کوشش کی ہے کہ صنفِ نسواں کی صحیح اسلامی پوزیشن سامنے آجائے، اور جن حضرات نے موجودہ دور کی آزادیٔ نسواں سے مرعوب ہوکر مساواتِ مرد وزن کے نظریہ کو اسلامی نظریہ قرار دینے اور کسی ایک کی فضیلت دوسرے پر غیر ثابت ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اسکی غلطی بھی واضح ہوجائے، چنانچہ ارشاد خداوندی الرجال قوامون الآیہ اور وللرجال علیھن درجہ پھر حدیثِ نبوی کہ اگر خدائے تعالیٰ کے بعد کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز ہوتا تو عورتوں کو اپنے شوہروں کے لئے جائز ہوتا، اور عورت کی گواہی کا آدھا ہونا، بعض امور میں ان کی گواہی کا بالکل معتبر نہ ہونا، میراث میں صرف آدھے حصّہ کا استحقاق، امامتِ صغریٰ وکبریٰ کی اہلیت نہ ہونا، طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہونا اور عورت کے لئے نہ ہونا، وغیرہ وغیرہ[1] کتنے ہی امور ہیں جن سے

---

[1] عورتوں کی عقل وسمجھ پر بھروسہ کرکے اگر ان کو کوئی اختیار دیا جاتا تو سب سے زیادہ موزوں ان کے لئے اپنی اولاد کے نکاح کرانے کا اختیار ہوسکتا تھا، کیوں وہ لڑکوں لڑکیوں کے حالات سے بظاہر مردوں سے بھی زیادہ واقف ہوتی ہیں لیکن ان کی قوتِ فیصلہ کے نقص اور بعد کی ذمہ داریوں کا بار نہ سنبھال سکنے کے باعث یہ اختیار بھی ان کو سب سے آخر میں بدرجہ مجبوری دیا گیا ہے، چنانچہ ولی نکاح بننے کی ترتیب حسب ذیل ہے:۔ باپ، دادا، سگا بھائی، سوتیلا بھائی، بھتیجہ، بھتیجے کا لڑکا، پوتا، سگا چچا، سوتیلا چچا، سگے چچا کا لڑکا، پوتا، سوتیلے چچا کا لڑکا، پوتا، باپ کا چچا، اس کی اولاد، دادا کا چچا، اس کی اولاد، جب ان سب مردوں میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تب ماں ولی ہوگی، پھر دادی، پھر نانی وغیرہ۔ (درمختار ۱۹۳/۱)

مساوات مرتبہ کی نفی اور فضیلتِ رجال کا ثبوت ہوتا ہے غرض فضیلت واختیار میں کون زیادہ ہے یہ بحث الگ ہے اور حقوق کی مد الگ ہے کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، ان کے بھی مردوں پر ہیں، اور ہر ایک کو دوسرے کے حقوق پوری طرح ادا کرنا فرض وواجب ہے، اوران کی تفصیل اورادائیگی کی تاکید بھی شریعتِ محمدیہ میں اتنی زیادہ ہے کہ کسی اور مذہب وملت میں اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔

ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ حضور علیہ السلام میں چونکہ رحمت وشفقت کا وجود بے حد وبے حساب تھا، اور حضرت سیدنا عمرؓ میں ان کی نسبت سے شدت وسختی تھی، اس لئے دونوں کے نظریات میں بھی فرق سمجھ لیا گیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، پھر حضور علیہ السلام کے زمانہ سعادت میں جتنی نرمی نبھ گئی، آپ کے بعد بھی اس کو باقی رکھا جاتا تو مفاسد کے دروازے کھل جاتے، خود حضرت عائشہؓ ہی نے اپنی بعد کی زندگی میں فرق ملاحظہ فرمالیا تھا، اوراسی لئے فرمایا کہ اب جو کچھ عورتوں نے اپنے اندر تبدیلیاں کرلی ہیں وہ اگر حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ظاہر ہوجاتیں تو آپ ان کو مساجد کی نماز سے ضرور روک دیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو بعد میں روک دیا گیا تھا۔

ایسے ہی جامع مسانید الامام الاعظم ۲۲۲/۲ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ سے روایت مروی ہے کہ حضور علیہ السلام کے دور میں ایک جنازہ کے ساتھ عورتیں بھی تھیں، حضرت عمرؓ نے چاہا کہ ان کو گھروں کی طرف واپس کردیں لیکن حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ انھیں رہنے دو[1] کیونکہ ابھی ان کا صدمہ وغم تازہ ہے، یعنی میت سے دور ہوکر ان کو تکلیف زیادہ ہوگئی کچھ دیر غم والم کی کیفیت میں کمی رہی تو اچھا ہے، یہ حضور علیہ السلام کی غایتِ رافت ورحمت کی بات تھی، جو آپ کی موجودگی میں نبھ بھی گئی کیونکہ آپ کے سامنے کوئی فتنہ رونما نہیں ہوسکتا تھا، حضرت عمرؓ دور تک دیکھ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ ایسی چیزوں کی روک تھام حضور کے سامنے ہی سے ہونے لگے تو بہتر ہے، آں حضرت ﷺ بھی ان سب امور کی اہمیت اور آگے آنے والے واقعات کا اندازہ فرماتے تھے اس لئے ایک عام حکم دے گئے کہ میرے بعد ابوبکر وعمرؓ کا اتباع کرنا، آپ جانتے تھے کہ شریعت کا اصل مزاج یہ دونوں حضرات اچھی طرح سمجھ چکے ہیں، یہ نہ خود غلطی کریں گے نہ غلطی کرنے دیں گے، حضرت ابوبکرؓ کا دور خلافت اور حضور علیہ السلام کے بعد زندگی بہت تھوڑی تھی پھر ارتداد وغیرہ کے فتنے فرد کرنے میں مشغولیت زیادہ رہی، حضرت عمرؓ نے اُن کے مختصر دور میں بھی اور پھر اپنے طویل دور میں شریعت کے تمام تقاضوں کو صحیح طور سے پورا کرانے میں اپنی ساری صلاحیت صرف کردی تھی، اس لئے آپ کے تمام ہی فیصلوں کی بڑی اہمیت ہے، اور خاص طور سے ''صنفِ نسواں'' کے سلسلہ میں ان کی آراء اور فیصلوں کو حرفِ آخر سمجھنے کے سوا چارۂ کار نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ نصف امتِ محمدیہ (صنف نسواں) کے بارے میں ہم شریعت محمدیہ کے مزاج کی تشخیص صحیح ومکمل طریقہ پر کرلیں، اور باقی نصف (رجال) کے بھی حقوق، اختیارات اور فرائض کو اچھی طرح سمجھ لیں تو پوری امت کی فلاح وبہبودی کا مسئلہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہوجاتا ہے، اور ہم ہر غلط قدم اٹھانے سے باز رہ سکتے ہیں، ورنہ بیشتر مصائب ومشکلات کا باعث وسبب ہم خود بنیں گے۔ وفقنا اللہ لما یحب ویرضیٰ!

ازواجِ مطہرات کا نعم البدل؟

امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں آیتِ عسی ربہ ان طلقکن پر مستقل باب ۷۳۱ میں باندھا ہے اور حضرت عمرؓ کی روایت نقل کی کہ نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات نے غیرتِ نسوانی کے جذبہ سے متاثر ہوکر اجتماعی تحریک کی تو میں نے ان سے کہا اگر نبی علیہ السلام تمہیں سب کو طلاق دیدیں تو جلد ہی ان کا پروردگار تم سے بہتر بیویاں آپ کو بدلہ میں عطا کرے گا، چنانچہ بعینہ ان ہی الفاظ میں اوپر کی آیت

---

[1] خیال کیجئے کہ آج بھی اگر عورتوں کو جنازہ کے ساتھ جانے کی اجازت باقی رکھی جائے تو کتنی خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں، یا حضور علیہ السلام کے زمانہ میں عورتیں عیدگاہ جاتی تھیں، اگر آج بھی ان کے لئے جانے کی شرعاً اجازت سمجھی جائے جیسا کہ اس زمانہ کے اہلِ حدیث حضرات سمجھتے ہیں تو فتنہ کی روک تھام کون کرسکے گا؟!'' مؤلف''

کا نزول ہوا، مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ واللہ! ہم ایام جہالت میں عورتوں کو کچھ اہمیت نہ دیتے تھے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خاص ہدایات واحکام نازل فرمائے، اور ان کو مال میں بھی حصّہ دار ٹھیرایا، ایک دن میں اپنے طور پر کسی کام کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میری بیوی نے کہا کہ تم اس اس طرح کرو تو اچھا ہے میں نے کہا تمہیں ان معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے اور ہم تمہیں اپنے کاموں کے فکر کی تکلیف دینا بھی نہیں چاہتے، اس نے کہا! عجیب بات ہے آپ کی بھی، میرا بولنا تو آپ کو ناگوار گزرا اور آپ کی بیٹی حضور ﷺ کو برابر کا جواب دیتی ہے حتی کہ حضور علیہ السلام پورا پورا دن غم وغصّہ میں گزارتے ہیں، حضرت عمرؓ نے بیان کیا کہ یہ سُنتے ہی میں نے فوراً اپنی چادر سنبھالی اور سیدھا حفصہؓ کے پاس پہنچ گیا، اور اس سے کہا بیٹی! یہ کیا معاملہ ہے تو حضور علیہ السلام کو جواب دیتی ہے اور ان کو سارے دن غم وغصہ میں مبتلا رکھتی ہے؟ حفصہؓ نے کہا، واللہ! بات تو صحیح ہے ہم حضور علیہ السلام کو جواب دیتے ہیں، میں نے کہا دیکھ! میں تجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے غضب سے ڈراتا ہوں، اور تو دوسری (بیوی حضرت عائشہؓ) کی وجہ سے دھوکہ میں نہ رہنا کہ اس سے تو حضور علیہ السلام کو خاص طور سے محبت ہے، پھر میں نکلا کہ ام سلمہ کے پاس جاؤں کیونکہ وہ میری رشتہ دار تھیں (توقع زیادہ تھی کہ بات مانیں گی) ان سے بات کی تو انہوں نے کہا ابن الخطاب! تمہاری بھی عجیب بات ہے کہ تم ہر معاملہ میں دخل دیتے ہو، اور حد ہوگئی کہ اب تم چاہتے ہو کہ حضور علیہ السلام اور آپ کی بیویوں کے معاملات میں بھی مداخلت کرو، حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ان کا یہ جواب سن کر میرا دل ٹوٹ گیا، حوصلہ پست ہوگیا، اور عجیب شش وپنج میں مبتلا ہوگیا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں، آگے قصہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے کا ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ جب میں ام سلمہ والی بات پر پہنچا اور آپ کو سُنائی تو آپ مسکرائے الخ! نووی ۴۸۱/۱

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے بھی کچھ ایسا ہی جواب دیا تھا، اور شاید اُس پر بھی آپ مسکرائے ہوں گے بلکہ مسلم شریف کی طویل حدیث میں تو یہ بھی ہے کہ آپ کسی بات پر کھکھلا کر بھی ہنسے تھے۔

بخاری شریف ۶۴۴ اور تفسیر ابن کثیر ۳۹۰ میں یہ روایت بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے جب ازواجِ مطہرات سے حضور علیہ السلام کی ناراضی کا علم ہوا تو میں ان کے پاس ایک ایک کے گھر گیا اور سمجھایا کہ یا تو تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کو تمہارے بدلے میں تم سے بہتر ازواجِ عطا فرماوے گا، اور جب آخر میں ایک[1] کے پاس پہنچا تو وہ کہنے لگیں:۔ اے عمر! کیا خود رسول اکرم ﷺ اپنی بیویوں کو نصیحت نہیں فرماسکتے کہ تم اس فریضہ کو ادا کرتے چلے ہو؟ میں یہ سُن کر رُک گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت عسى ربه ان طلقكن ان يبدله ازواجا خيرا منكن مسلمات الخ نازل فرمائی۔

مسلم شریف میں زیادہ تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ جب نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات سے علیحدگی اختیار کی تو میں مسجد نبوی میں گیا، دیکھا کہ لوگ غمگین بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے یہ واقعہ حکم حجاب سے پہلے کا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں ابھی اس معاملہ کی تحقیق کرونگا چنانچہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس گیا اور کہا مجھے معلوم ہوا کہ تم رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیتی ہو، انہوں نے کہا تمہارا مجھ سے کیا کام، تم اپنے گھر کی خبر لو، پھر میں حفصہ کے پاس گیا اور کہا تمہارے بارے میں بھی مجھے معلوم ہوا کہ تم رسول اکرم ﷺ کو ایذا پہنچاتی ہو، مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ تمہاری ان باتوں کو پسند نہیں کرتے، اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ

---

[1] علامہ قسطلانیؒ نے کہا کہ یہ جواب دینے والی حضرت ام سلمہ تھیں جیسا کہ تفسیر سورۂ تحریم (بخاری ۷۳۰) میں ہے اور خطیب نے کہا کہ وہ زینب بنت جحش تھیں، امام نووی نے بھی یہی کہا (حاشیہ بخاری ۶۴۴) سب ازواجِ مطہرات کے جوابات کہیں نظر سے نہیں گزرے، صرف حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینبؓ کے نقل ہوئے، اور حضرت حفصہؓ خاموش رہیں کچھ جواب نہیں دیا، اور بہت زیادہ روئیں، شاید اس لئے کہ ان چاروں میں سے سب سے زیادہ اپنی غلطی کا احساس ان ہی کو ہوا تھا، اور اس میں حضرت سیدنا عمرؓ کی تربیت کا بھی خاص اثر معلوم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! "مؤلف"

تمہیں طلاق بھی دے چکے ہوتے، اس پر وہ بہت روئیں، میں نے پوچھا، رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں؟ کہا وہ بالا خانہ پر ہیں، میں وہاں گیا تو رباح غلام رسول علیہ السلام کو دیکھا کہ بالا خانہ کے دروازہ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے، میں نے کہا حضور علیہ السلام سے میرے حاضر ہونے کی اجازت لے، اس نے اندر کی طرف دیکھا، پھر میری طرف دیکھ کر چپ ہوگیا، میں نے پھر کہا اجازت لے، اُس نے پھر اسی طرح اندر دیکھا اور میری طرف دیکھ کر خاموش رہا، پھر میں نے بلند آواز سے پکار کر کہا کہ میرے لئے حضور سے اجازت لے، شاید آپ کو یہ خیال ہو کہ میں حفصہ کی سفارش کو آیا ہوں، واللہ! اگر حضور علیہ السلام اس کی گردن مار دینے کا حکم کریں گے تو میں اس کی بھی فوراً تعمیل کروں گا، اِس پر اُس نے میری طرف اشارہ کیا کہ آجایئے، میں رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا کہ آپ ایک بوریئے پر لیٹے تھے میں بیٹھ گیا، آپ نے اپنا تہمد درست کیا، اس کے سوا اس وقت اور کوئی کپڑا آپ کے بدن پر نہیں تھا، اور بوریئے کے نشان پہلوئے مبارک پر نمایاں تھے۔ اس کمرے میں نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک صاع کے قریب جو رکھے ہوئے تھے، اور ایک کھونٹی پر نیم دباغت شدہ کھال لٹکی ہوئی تھی، یہ دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، حضور علیہ السلام نے فرمایا، روتے کیوں ہو؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں کیوں نہ روؤں، دیکھتا ہوں کہ چٹائی کے نشان آپ کے پہلوئے مبارک پر نمایاں ہیں اور آپ کے گھریلو سامان کا کمرہ ہے جس میں کچھ بھی قابل ذکر چیز نہیں، یہ قیصر وکسریٰ تو دنیا کی عیش و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور آپ خدا کے برگزیدہ رسول ہیں، آپ کے پاس دنیا کا کچھ بھی سامان نہیں، آپ نے فرمایا، اے ابن الخطاب! کیا تم اس بات کو پسند نہ کرو گے کہ ہمارے لئے آخرت اور اس کی ابدی نعمتیں ہوں اور ان کے لئے صرف دنیا کی عارضی لذات ہوں، میں نے عرض کیا کیوں نہیں، یعنی مجھے تو آخرت ہی پسند ہے۔

حضرت عمرؓ نے آگے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے کے وقت میں نے آپ کے چہرہ پر غضب وغصہ کے آثار دیکھے تھے، اس لئے میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! آپ کو عورتوں کے بارے میں کسی فکر وغم میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اگر آپ ان کو طلاق دے چکے ہیں تو آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے فرشتے اور خاص طور سے حضرت جبرئیل ومیکائیل علیہ السلام اور میں اور ابوبکرؓ اور سارے مومن آپ کے ساتھ ہیں، پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ میں خدا کا بڑا شکر کرتا ہوں کہ میں نے جب بھی کوئی بات کہی ہے اللہ تعالیٰ سے ضرور امید رکھی کہ وہ میری بات کی تصدیق کریگا، چنانچہ یہ آیت آیتِ تخییر، عسی ربہ ان طلقکن اور وان تظاھرا علیہ فان اللہ ھو مولاہ الایہ اتریں، اور حضرت عائشہؓ وحفصہؓ دونوں ہی مل کر باقی دوسری ازواجِ مطہرات کے مقابلہ میں مظاہرے کیا کرتی تھیں، میں نے حضور سے سوال کیا کہ کیا آپ نے ان کو طلاق دے دی ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، میں نے کہا یا رسول اللہ! میں جب مسجد میں آیا تو سارے لوگ غمگین بیٹھے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے، کیا مجھے اجازت ہے کہ ان کو جا کر خبر کر دوں کہ آپ نے طلاق نہیں دی ہے، آپ نے فرمایا ہاں! تم چاہو تو ایسا کر سکتے ہو۔

اس کے بعد میں برابر آپ سے باتیں کرتا رہا، یہاں تک کہ آپ کے چہرۂ مبارک سے غضب وغصہ کے آثار جاتے رہے بلکہ آپ کو کسی بات پر ہنسی بھی آگئی، اور میں نے آپ کے نہایت خوبصورت دندان مبارک دیکھ لئے، پھر میں آخری دن بھی حضور علیہ السلام کے پاس ہی تھا، جب آپ بالا خانہ سے اترے اور میں بھی ساتھ اترا، مگر میں تو زینہ کی لکڑی کا سہارا لے کر اترا اور آپ اس طرح بے تکلف بغیر کسی سہارے کے اترے جیسے زمین پر چل رہے ہوں، میں نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ تو صرف ۲۹ دن بالا خانہ میں رہے آپ نے فرمایا، ہاں! مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے، اسی درمیان میں نے مسجد نبوی کے دروازہ پر بلند آواز سے اعلان کر دیا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی ازواجِ مطہرات کو طلاق نہیں دی ہے۔

اور چونکہ میں نے حضور علیہ السلام سے واقعہ کی تحقیق کرنی چاہی تھی لہذا یہ آیت بھی نازل ہوئی تھی واذا جاء ھم امر من الامن اوالخوف الایہ (ان لوگوں کو جب کبھی کوئی امن یا خوف کی بات پہنچتی ہے تو بلا تحقیق) اس کو مشہور کر دیتے ہیں، اگر وہ اس کی جگہ رسول

اللہ علیہ ﷺ اور اہل حل وعقد یا ذمہ دار سمجھدار حکام کی طرف رجوع کرتے تو وہ صحیح بات کی کھوج نکال کر بتا دیتے (پھر اسی کے موافق جتنی بات عام لوگوں میں مشہور کرنے کی ہوتی اس کو مشہور کیا جاتا، اور جس کا چرچا کرنا بے سود یا مضر ہوتا اس کے کہنے سُننے میں احتیاط برتی جاتی) لہذا میں استنباط کر کے صحیح علم حاصل کرنے والا تھا، (نووی ۴۸۰ کتاب الطلاق) اس طویل ومفصل حدیثِ مسلم شریف سے کئی امور میں حضرت سیدنا عمرؓ کی موافقتِ وحی ثابت ہوئی جن میں ایک کا تعلق آیاتِ قرآنی عسیٰ ربہ ان طلقکن الا یہ سے ہے۔

اہم سوال وجواب! یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات ساری دنیا کی عورتوں سے افضل اوراعلیٰ مرتبہ کی تھیں تو ان کا نعم البدل کہاں سے ملتا؟ محقق عینیؒ نے صاحبِ کشاف سے یہ سوال اور پھر اس کا جواب بھی ان سے نقل کیا کہ اگر حضور علیہ السلام ان کو نافرمانی اور ایذاء دہی کے باعث طلاق دیدیتے تو پھر وہ افضل ہی کب باقی رہتیں، بلکہ دوسری عورتیں آپ کے شرفِ زوجیت کے ساتھ آپ کی طاعت ورضامندی وخوشنودی کے اوصاف کی بھی جامع ہوتیں تو وہ اس سے بھی یقیناً بہتر ہو جاتیں۔

علامہ نسفیؒ نے کہا کہ آیتِ مذکورہ میں صرف قدرت کی خبر دی گئی ہے، وقوع کی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان طلقکن (اگر طلاق دیدیں) اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ وہ طلاق نہیں دیں گے، لہذا اس قدرت کے اظہار کا موقع بھی نہیں آئے گا، جس طرح آیت وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم میں بھی صرف اخبارِ قدرت اور امت محمدیہ کو ڈرانا ہے کہ تم روگردانی کرو گے، تو تمہاری جگہ دوسری قوم کو دیدی جائے گی جو تم سے بہتر ہوگی، یہ نہیں کہ واقع میں کوئی دوسری امت یا قوم امت محمدیہ سے بہتر عالم وجود میں تھی، جس کو امتِ محمدیہ کا مرتبہ دیا جا سکتا تھا۔ (عمدہ ۲۲/۲)

ایلاء کے اسباب: حضور اکرم ﷺ نے حسبِ روایت امام بخاریؒ شدتِ غضب وغصہ کی وجہ سے جو ایک ماہ کے لئے ازواجِ مطہرات سے علیحدہ رہنے کا حلف کیا تھا اس کے وجوہ واسباب کیا تھے اس کے بارے میں آراء واقوال مختلف ہیں اور حافظؒ نے ان سب کو ایک جگہ نقل کر دیا ہے پھر اپنی یہ رائے بھی لکھی ہے کہ ممکن ہے یہ سب ہی اسباب جمع ہونے کے بعد حضور علیہ السلام نے ایسا اقدام فرمایا ہو، کیونکہ حضور علیہ السلام کے مکارمِ اخلاق، وسعتِ صدر اور کثرت مسامحت وصلح کی عادت سے ایسی ہی توقع ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اسباب تو سب جمع ہو چکے ہوں لیکن اشارہ صرف اہم واقعہ کی طرف کیا گیا ہو پھر حافظؒ[1] نے لکھا کہ یہ بھی لطائف میں سے ہے کہ حضور علیہ السلام میں جو ایک ماہ کی قسم کھائی حالانکہ تین دن سے زیادہ کسی مسلمان سے نہ بولنا یا قطعِ تعلق کرنا مشروع نہیں ہے اس کی حکمت یہ ہے کہ سب ازواجِ مطہرات کی تعداد نو تھیں اِن کے ۲۷ دن ہوئے اور حضرت ماریہؓ کے دو دن کہ وہ باندی تھیں اس طرح کل ۲۹ دن ہوئے (اور وہ مہینہ بھی اتفاق سے اتنے ہی دن کا تھا) وہ سب اسباب یہ ہیں۔

(۱) مسلم شریف میں ہے کہ حضور ﷺ کے پاس سب ازواجِ جمع ہوئیں اور نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کیا، اور آپ ناراض ہو کر ایک ماہ کے لئے ان سے الگ رہے، اور پھر آیتِ تخییر اتری۔

(۲) قصہ تحریم عسل، کہ ازواجِ مطہرات کی وجہ سے حضور علیہ السلام نے شہد کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

(۳) قصہ تحریم ماریہؓ کہ حضرت عائشہ وحفصہؓ کی وجہ سے آپ نے حضرت ماریہ کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

(۴) حضرت حفصہؓ نے حضور علیہ السلام کی ایک بات کا افشاء کر دیا تھا، جس کو پوشیدہ رکھنے کی آپ نے ان کو تاکید فرمائی تھی۔

(۵) حضور علیہ السلام کے پاس کوئی چیز ہدیہ میں آئی، جو آپ نے سب ازواجِ طیبات کے پاس حصہ رسدی بھیج دی لیکن حضرت زینب بنتِ جحش نے اپنے حصہ کی چیز کو کم سمجھ کر واپس کر دیا، دوبارہ آپ نے بھیجی اس کو بھی واپس کر دیا، حضرت عائشہؓ نے حضور علیہ السلام

---

[1] فیض الباری ۲۲ میں یہ توجیہ حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب ہوگئی ہے، غالباً حضرتؒ نے حافظ کا حوالہ دیا ہوگا جو ضبط نہ ہو سکا، ورنہ حضرتؒ دوسروں کی تحقیق اپنی طرف سے بیان فرمانے کے عادی نہ تھے، واللہ تعالیٰ اعلم! "مؤلف"

سے کہا کہ دیکھئے! انہوں نے آپ کو آپ کا ہدیہ واپس کر کے ذلیل کیا، آپ نے فرمایا: تم سب مل کر بھی خدائے تعالیٰ کے یہاں اتنی بڑی عزت نہیں رکھتیں کہ وہ تمہاری وجہ سے مجھے ذلیل کرائے، میں تم سے ایک ماہ تک نہ ملوں گا (رواہ ابن سعد عن عائشہؓ) دوسری روایت زہری کی بھی حضرت عائشہؓ سے اسی طرح ہے اتنا فرق ہے کہ اس میں ہے آپ نے کوئی ذبیحہ کیا اور اس کا گوشت ازواجِ مطہرات کے پاس بھیجا، حضرت زینبؓ کو بھی ان کا حصہ ارسال کیا تو انہوں نے اس کو واپس کر دیا، آپ نے فرمایا زیادہ کرے کے بھیج دو، اس طرح تین بار بھیجا، مگر ہر مرتبہ انہوں نے واپس کر دیا، اس پر آپ ناراض ہوئے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا خاص ریمارک

اوپر کے اقوال ذکر کر کے حافظؒ نے کہا کہ ابن الجوزیؒ نے ذبیحہ کا قصہ بغیر اسناد کے ذکر کیا، حالانکہ وہ ابن سعدؒ نے سند کے ساتھ نقل کیا ہے تحقہ والے واقعہ کو مبہم کر دیا حالانکہ وہ صحیح مسلم میں ہے اور راجح سب اقوال میں سے حضرت ماریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے کیونکہ اس کا تعلق خاص طور سے حضرت عائشہ وحفصہؓ دونوں کے ساتھ ہے، بخلاف قصہ عسل کے کہ اس میں تو ازواجِ مطہرات میں سے ایک جماعت نے شرکت کی تھی۔ (فتح الباری ۲۳۲)

مظاہرہ پر تنبیہ اور حمایتِ خداوندی

حضرت عائشہ وحفصہؓ نے جو مظاہرہ کی صورت اختیار کی تھی، اس پر ان کو متنبہ کیا گیا اور توبہ وانابت کی تلقین کی گئی، حضرت علامہ محدث صاحبِ تفسیر مظہری نے آیت وان تظاهرا علیه کے تحت لکھا ہو کہ اگر تم دونوں آپس میں تعاون کر کے ایسی باتیں کرتی رہیں جن سے حضور علیہ السلام کو قلبی اذیت ہو خواہ وہ غیرت کی غیر معمولی افراط وزیادتی کے سبب ہو یا افشاءِ راز کی صورت میں ہو اور تم اس سے توبہ نہ کرو گی تو تمہیں ناکامی ونامرادی کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کی مدد پر ہیں، اور حضرت جبرئیل ونیکوکار مسلمان سب ہی ان کے معین ومددگار ہیں، اور پھر سارے ہی فرشتوں کی امداد آپ کو حاصل ہوگی۔

بظاہر یہ سب تنبیہ اور حضرت عائشہؓ وحفصہؓ کے مقابلہ میں نصرت وحمایت کی ضمانت ان کی سابقہ غلطی کا احساس دلانے اور آئندہ کے لئے ایسی ہر بات سے روکنے کے واسطے تھی جس سے حضور علیہ السلام کے قلبِ مبارک کو اذیت ہو اور اکثر مفسرین نے اتنا ہی لکھا ہے لیکن سیرۃ النبی ۷۵۵ میں اس کے پس منظر میں منافقوں کی شرانگیزی کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، جس کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا، اور نہ اب تک ہماری نظر سے گزری، مگر وہ بات دل کو لگتی ہے، اس لئے یہاں ذکر کی جاتی ہے:۔ "روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں، اور اگر حضرت ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں، لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں؟ اور حضرت عائشہ وحفصہؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پر خطر ہو سکتی ہے، جس کی مدافعت کے لئے ملاءِ اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو۔

اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا، جس کی تعداد چار سو تک بیان کی گئی ہے یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود آں حضرت ﷺ کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوا دیں (ابن حجر نے اصابہ میں ام جلدح کے حال میں لکھا ہے وکانت تحرش از واج النبی ﷺ، یعنی وہ ازواجِ مطہرات کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں) افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آ چکی تھی، رسول اللہ ﷺ پندرہ دن تک حضرت عائشہؓ سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسان افک میں شریک ہو گئے تھے، آں حضرت ﷺ کی سالی حمنہ (حضرت زینبؓ کی بہن) سازش میں آ گئی تھیں، چنانچہ اس بات کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے قریبی عزیز (مسطح) کو جو شریکِ تہمت طرازی تھے، مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا، غرض اگر حضرت عائشہؓ کی براءت پر وحی نہ آ جاتی تو ایک فتنہ عظیم برپا ہو چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواجِ مطہرات کی کشش خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دے کر بھڑکانا چاہا ہوگا، چونکہ مظاہرہ کے ارکانِ اعظم حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں ان کو خیال ہوا ہوگا کہ ان کے ذریعہ سے ان کے والدین (حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ) کو بھی اس سازش میں شریک کر لینا ممکن ہے لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اکرم ﷺ کی خاک پر قربان کر سکتے تھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذن نہ ملا تو انہوں نے پکار کر کہا کہ ارشاد ہو تو حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا سر لے کر آؤں۔

آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے یعنی اگر عائشہ وحفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن سازش بھی کریں گی اور منافقین اس سے کام لیں گے تو خدا پیغمبر کی اعانت کے لئے موجود ہے اور خدا کے ساتھ جبرئیل وملائکہ بلکہ تمام عالم ہے''۔

ضروری فائدہ! مذکورہ بالا واقعہ اگر صحیح ہے تو اس سے ایک بڑا سبق یہ بھی ملتا ہے کہ دوسری غیر عورتوں کا مسلمان گھروں میں آنا جانا اور گھریلو معاملات میں دراندازیاں کرنا نہایت مضر ہوتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے صرف او نسائھن (اپنی عورتوں) کو حجاب کے احکام سے مستثنیٰ کیا ہے ان کے علاوہ غیر مسلم عورتوں اور بدچلن، شر پسند اور تفریق بین الازواج کی خوگر عورتوں سے اجتناب واحتراز ضروری ہے اور خاص طور سے غیر مسلم عورتوں کی دراندازیوں سے بچانا اس لئے بھی ضروری تر ہے کہ وہ بداندیش وشر پسند مردوں کی آلہ کار بن سکتی ہیں، نیز مسلمان گھرانوں کے بھید بھاؤ سے واقف ہو کر دوسرے نقصانات بھی پہنچا سکتی ہیں۔

عورتوں میں تاثر وانفعال کا مادہ بہ نسبت مردوں کے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لئے جہاں وہ اچھی تعلیم وصحبت کے بہتر اثرات جلد قبول کر سکتی ہیں، بری تعلیم وصحبت کے برے اثرات بھی بہت جلد قبول کرتی ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

''ہم قریش کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ عورتوں پر ہماری بالادستی تھی، لیکن جب مدینہ میں آئے تو ہم ان لوگوں کے ساتھ رہے سہے جن میں عورتوں کو بالادستی حاصل تھی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ہماری عورتیں بھی یہاں کی عورتوں کے اثرات قبول کرنے لگیں اور ان کے اطوار واخلاق سیکھنے لگیں، ایک دن میں نے اپنی بیوی پر غصہ کا اظہار کیا تو خلافِ توقع وہ جواب دینے لگی، اور مجھے یہ عجیب سی نئی بات محسوس ہوئی تو وہ کہنے لگی کہ آپ میری جوابدہی کا برا ماننے لگے، حالانکہ رسول اکرم ﷺ کی ازواج بھی تو آپ کو برابر کا جواب دیتی ہیں، اور کوئی تو آپ سے سارے سارے دن بات کرنا بھی چھوڑ دیتی ہیں۔ الخ (ابن کثیر ۳۸۸/۴)

حافظؒ نے حضور علیہ السلام کے واقعہ ایلاء کے ذیل میں لکھا کہ حضور علیہ السلام چونکہ عورتوں پر سختی کرنے کو پسند نہ فرماتے تھے اس لئے آپ نے انصار کی سیرت وعادت اختیار فرمائی تھی جو ان کی اپنی بیویوں کے بارے میں تھی، اور اپنی قوم (قریش) کی سیرت وطریقہ کو آپ نے ترک فرما دیا تھا۔ (فتح الباری ۲۳۴/۹)۔

حافظؒ کے اس تبصرہ سے بہت سی چیزوں کا جواب خود بخود مل جاتا ہے، اور عورتوں کے بارے میں جو کچھ فرق حضور علیہ السلام اور حضرت عمرؓ وغیرہ، صحابہ کے طور وطریقہ میں معلوم ہوتا ہے، اس کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے درحقیقت حضور علیہ السلام رحمت ورافتِ مجسم تھے، اور آپ کا طرۂ امتیاز خلق عظیم تھا، پھر یہ کہ آپ کی ہر قسم کی حفاظت وصیانت حق تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی، اور آپ ہی کا اتنا عظیم حوصلہ بھی تھا کہ ساری کدورتوں کے اسباب جمع ہو کر بھی آپ کی یکسوئی وسکونِ خاطر کو پراگندہ نہیں کر سکتے تھے اور صبر واستقامت[1] کے لئے وہ

---

[1] اسی سے ہے کہ حضور اکرم ﷺ ازواجِ مطہرات کے آپسی جھگڑوں پر بھی صبر کرتے اور ان میں مصالحت واصلاح کی سعی فرماتے تھے (الفتح الربانی ۱۵۳/۲۲) اور حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے اپنے بعد تمہارے احوال ومعاملات کی بڑی فکر ہے اور تمہارے بارے میں بڑی صبر والے اور اصحابِ صدق وصفا ہی کامیاب ہو سکتے ہیں (الفتح الربانی ۱۵۴) بظاہر روئے سخن سب ہی عورتوں کی طرف اور عام ہے کہ تمہارے اوپر صبر واستقامت کے ساتھ شفقت ورافت کا برتاؤ صرف صادق الایمان صبر والے ہی کر سکیں گے واللہ اعلم!

اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ اولوالعزمی کا تامل تھا، جو سارے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں بھی فائق تھا، ایسی صورت میں اس فرق پر کوئی تشویش ونکارت نہ ہونی چاہیے، اورعورتوں کے بارے میں معتدل راہ وہی اختیار کرنی بہتر ہوگی جو حضور علیہ السلام کے ارشادات، اور حضرات صحابہ کرامؓ کے تعامل کی روشنی میں منقح ہو کر سامنے آئے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

استنباطِ سیدنا عمرؓ! اس بارے میں موافقت وحی (آیت لعلمه الذين يستنبطونه منهم۔ سورۂ نساء) سے اوپر کی احادیث میں ثابت ہو چکی ہے

اساریٰ بدر سے فدیہ نہ لینے کی رائے

اس واقعہ کی پوری تفصیل حضرت علامہ عثمانیؒ نے فوائدِ قرآن مجید ۲۴۰ میں آیت ما كان لنبي ان يكون له اسرىٰ کے تحت بیان کردی ہے، جس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کی رائے بابتہ قتل اُساریٰ بدر زیادہ صواب تھی بہ نسبت رائے صدیق اکبرؓ کے کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس وقت کفار خصوصاً کفارِ قریش کے ساتھ زیادہ سختی کا معاملہ کرنا ہی زیادہ موزوں ومناسب تھا، پھر ان کو چھوڑ دینا رحم وشفقت کے جذبہ تک بھی کسی قدر معقول بات تھی، لیکن اسی کے ساتھ مالی ضروریات کا بھی لحاظ بالکل مناسب نہ تھا کہ کفر کا زور توڑنے کی وقتی اہم ترین ضرورت کے مقابلہ میں اس کی کچھ قیمت نہ تھی، پھر اسی کے ساتھ آئندہ ستر مسلمانوں کی شہادت کی شرط بھی قبول کر لینا اور بھی سخت بات تھی، جو مسلمانوں کو ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے تھی، ایسی حالت میں عذابِ الٰہی کا آجانا مستبعد نہ تھا، چنانچہ حضور علیہ السلام کو وہ عذاب متمثّل کر کے دکھا بھی دیا گیا، اور اس عذاب کو روکنے والی جو چیزیں ہوسکتی تھیں وہ بطور احتمال مندرجہ ذیل تھیں:۔

(۱) مجتہد کو اجتہادی خطا پر عذاب نہیں دیا جاتا (۲) جب تک کوئی حکم امرونہی کا پوری طرح واضح نہ ہو اس کے خلاف کرنے پر عذاب نہیں ہوتا (۳) اہل بدر کی خطاؤں سے حق تعالیٰ نے درگذر کرنے کا وعدہ فرمالیا تھا (۴) فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کا جواز حق تعالیٰ کے علم میں طے شدہ تھا اور اس کا اجراء جلد ہی ہونے والا تھا، اس لئے اس سے قبل بھی قابلِ درگزر قرار دیدیا گیا (۵) پیغمبر علیہ السلام کی موجودگی میں عذاب نہ اتارنے کا وعدہ کیا گیا تھا، وما كان الله ليعذبهم وانت فيهم (سورۂ انفال) (۶) جب تک لوگ استغفار کرتے رہیں گے اُن پر عذاب نہ آئے گا، وما كان الله معذبهم وهم يستغفرون (سورۂ انفال) ان قیدیوں میں سے بہت سے لوگوں کی قسمت میں اسلام لانا خدا کے علم میں تھا ان وجود میں سے اکثر کا ذکر تفسیر ابن کثیر، تفسیر روح المعانی اور تفسیر مظہری میں بھی ہے اور صاحب روح المعانی نے اس اعتراض کا بھی جواب دے دیا ہے کہ چوتھی وجہ کو وجہ رفعِ عذاب بنانا درست نہیں کیونکہ جب تک کسی چیز کا جواز مشروع نہ ہو جائے، عدم جواز ہی کے احکام نافذ ہوتے ہیں، لہٰذا آئندہ خدائے تعالیٰ کے علم میں فدیہ کا جواز ہونے والا تھا، اس لئے پہلے ہی عذاب رک جائے، یہ بات بظاہر معقول نہیں معلوم ہوتی[1]، جواب یہ ہے کہ یہاں مراد آیت میں عذابِ دنیوی ہے جو رفع کر دیا گیا، باقی مواخذۂ اخروی کا ترتب وہ ضرور ہر غیر مشروع کے ارتکاب پر ہوگا، حاصل یہ ہے کہ جو تم نے (اخذِ فدیہ کا عمل) کیا وہ فی نفسہ بہت ہی بڑی غلطی ہے جو عذابِ عظیم کی مستوجب ہے، لیکن اس سے درگذر کرنے اور عذابِ دنیوی کو روکنے والی وجہ یہ ہے کہ اس کو عنقریب تمہارے لئے حلال وجائز کیا جانے والا ہے، کیونکہ میری رحمت عذاب پر سبقت کرنے والی ہے پھر صاحبِ روح المعانی نے لکھا کہ اعتراض مذکور کے لئے جواب مذکور کا تکلف کرنے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ محدث ابن ابی حاتم، اور ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اور محدث بیہقی، ابن جریر، ابن المنذر وغیرہم نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی اس وجہ کو نقل کیا ہے (روح المعانی ۳۵/۱۰)

---

[1] اس اعتراض کو تفہیم القرآن ۱۵۹ میں بھی نقل کیا گیا ہے لیکن آگے جو صاحبِ روح المعانی اور حافظ ابن کثیر نے جواب نقل کیا ہے، اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور پھر صاحبِ تفہیم نے جو جواب اپنی طرف سے لکھا ہے وہ خود محلِ نظر ہے ہم اس کو بھی لکھیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ "مؤلف"